چونکا دینے والی کہانیاں
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
فروری 2012
PDFBOOKSFREE.PK

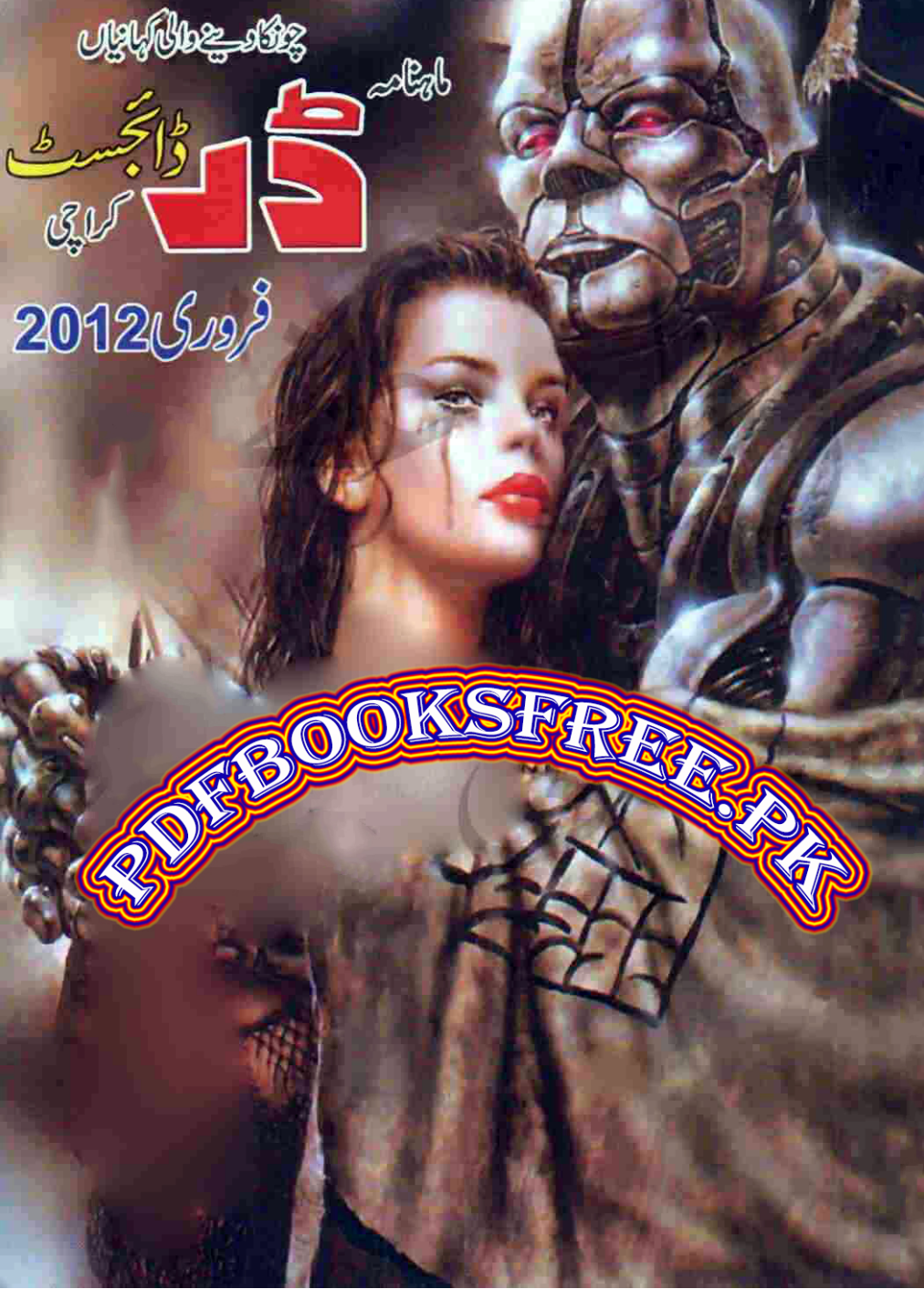

قبلائی خان — 16
اسلم راہی ایم اے
اپنے ہم وطنوں کے فلاح و بہبود کے لئے ایک سفاک جنگجو کا خونی داستان حیرت

کھڑکی — 49
ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی
شعور اور لاشعور کا آپس میں گہرا تعلق ہے اس موضوع پر ایک سبق آموز کہانی

دشمن جاں — 55
شرجیل تصور
خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک حیرت انگیز اور تحیر انگیز دل دہلاتی کہانی

رولوکا — 64
اے وحید
وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

بھوت کی تلاش — 89
ناصر محمود فرہاد
حقیقت کو جھٹلانے والے اکثر اپنی زندگی درگور کر لیتے ہیں، ثبوت کہانی میں موجود ہے

مندر کا حصار — 97
ایس امتیاز احمد
اچنبھے میں ڈالتی، عقل و شعور میں نہ آتی اور چونکا دینے والی ایک پراسرار حقیقی کہانی

ٹھک ٹھک — 111
ذیشان اقبال عظمی
دنیا میں انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اپنے لئے کرتا ہے، اس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

شہر وحشت — 116
ایم اے راحت
دل و دماغ کو بہوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

لاحاصل — 139
ذوالقرنین خان
رات کی تاریکی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں رونگٹے کھڑے کرتی دہشت ناک کہانی

غلطی — 155
عروفیہ ملک
دانستہ غلطی انسان کو موت سے بھی ہمکنار کر دیتی ہے، جس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

عفریت یا موت — 162
نظارت نصر
زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا چاہئے اور جو اس سے انحراف کرتے ہیں وہ پچھتاتے ہیں

حیرت انگیز — 179
اقصیٰ رباب
دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش کہانی

چندرا دیوی — 184
ایم الیاس
پر تحیر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ذہن سے محو نہ ہونے والی ایک اچھوتی کہانی

حیوان — 207
محمد عثمان علی
کیا یہ حقیقت ہے کہ شیطان کمزور انسان کو دین و دنیا میں عبرت کا نشان بنوا دیتا ہے

شیطانی کھیل — 212
ایس حبیب خان
خوف کے لبادے میں لپٹی ہوئی.....ایک لرزہ خیز لہولہان.....اور دہشت ناک کہانی

موت کی لوری — 222
صائمہ حمید
خوف کے شکنجے میں جکڑی ہوئی دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی.....لرزہ خیز کہانی

قوس قزح — 236
ادارہ
قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....

بدروح کی تلاش — 242
محمد عرفان رامے
رات کی تاریکی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں رونگٹے کھڑے کرتی دہشت ناک کہانی

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆ تو جب قیامت کا غل مچے گا اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹے سے۔ ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہوگا جو اسے مصروفیت کے لئے بس کرے گا۔ اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے خنداں وشاداں، یہ نیکوکار ہیں اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی یہ کفار بدکردار ہیں۔ (سورۃ عبس 80 آیت 33 سے 42)

☆ جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب بیانے والی اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور جب وحشی جانور جمع کئے جائیں گے اور جب دریا آگ ہو جائیں گے اور جب روحیں بدنوں سے ملا دی جائیں گی اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہو۔ پوچھا جائے کہ وہ کس گناہ پر ماردی گئی۔ اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے۔ اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی اور جب دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی اور بہشت جب قریب لائی جائے گی تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ (سورۃ تکویر 81 آیت 1 سے 14)

☆ جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی اور زمین اپنے (اندر کے) بوجھ نکال ڈالے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا ہے؟ اس روز وہ اپنے حالات بیان کر دے گی کیونکہ تمہارے رب نے اس کو حکم بھیجا (ہوگا) اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھا دیئے جائیں تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا۔ (سورۃ زلزال 99 آیت 1 سے 8)

☆ کھڑکھڑانے والی۔ کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟ اور تم جانو کہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے وہ قیامت ہے جس دن لوگ ایسے ہونگے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔ اور پہاڑ ایسے ہو جائے گے جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اون تو جس کے اعمال کے وزن بھاری نکلیں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے اس کا مرجع ہاویہ ہے اور تم کیا سمجھے کہ ہاویہ کیا چیز ہے (وہ) دہکتی ہوئی آگ ہے۔ (سورۃ عادیات 100 ایت 1 سے 11)

☆ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے شب تاریک میں آگ جلائی جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کیں تو اللہ نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 17)

☆ جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ (سورۃ نساء 4 سے آیت 10)

☆ اور جنوں کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔ (سورۃ حجر 15 آیت 27)

☆ ہم نے حکم دیا، اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر سلامتی بن جا۔ (سورۃ انبیاء 21 آیت 69)

☆ جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے میں وہاں سے (رستے کا) پتہ لاتا ہوں یا سلگتا ہوا انگارا تمہارے پاس لاتا ہوں تاکہ تم تاپو۔ جب موسیٰ اس کے پاس آئے تو ندا آئی کہ وہ جو آگ میں تجلی دکھاتا ہے بابرکت ہے اور وہ جو آگ کے اردگرد ہے اور اللہ جو تمام عالم کا رب ہے پاک ہے۔ (سورۃ نمل 27 آیت 7 سے 8)

☆ بھلا دیکھو تو جو لوگ تم درخت سے نکالتے ہو۔ کیا تم نے اس درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرتے ہیں ہم نے اسے یاد دلانے اور مسافروں کے برتنے کو بنایا ہے۔

☆ مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتش جہنم سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں۔ جو ارشاد اللہ ان کو فرماتا ہے ان کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (سورۃ تحریم 66 آیت 6)

☆ کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی ہوا میں گھرے ہوئے اڑتے رہتے ہیں ان کو اللہ ہی تھامے رکھتا ہے ایمان والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ نحل 16 آیت 79)

☆ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں اللہ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ اور پر پھیلائی ہوئے جانور بھی اور سب اپنی نماز اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، سب اللہ کو معلوم ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 41)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی"، بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطوط

آسیہ شاھین وہاڑی کرم پور سے، امید کرتی ہوں کہ ڈرکا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ میں ڈرڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہوں، دسمبر کا سمارہ ملا، بہت خوشی ہوئی، قرآن پاک کی باتوں کی تو مثال نہیں۔ اور کہانیوں میں کٹھن مراحل، زرگزیدہ، قبلہ درست، رولوکا، شہر وحشت، چندرا دیوی بہت اچھی تھی اور یقین کا تو جواب نہیں، بہت ہی اچھی تھی اور دوسری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا اور آخر میں یہ کہ میں ڈر میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ مجھے مایوس نہیں کریں گے اور شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔ اللہ پاک ڈرکو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

☆☆ آسیہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم ڈرڈائجسٹ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کیجئے۔ امید ہے آئندہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔

ایس حبیب خان کراچی سے، امید ہے کہ ڈر کی پوری ٹیم اور اس کے چاہنے والے خیریت سے ہوں گے، میری سب کے لئے دعا ہے کہ نیا سال سب کے لئے بہترین ثابت ہو، پروردگار عالم ہم سب پر اپنی رحمت نازل کرے، ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ساتھ یہ نیا سال میرے ارض پاک کے لئے بھی امن وسلامتی کا پیغام لے کر آئے۔ (آمین) اب بات ہوجائے ''ڈر'' کی۔ جنوری 2012ء کا جگمگاتا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے جو کہ نئے سال کا تحفہ ثابت ہوا، سال نو کے پہلے شمارے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، ڈبل خوشی تو اس بات کی ہے کہ میری تحریر بھی اس کا حصہ بنی۔ خطوط کی محفل میں اس دفعہ کافی لوگ نظر نہیں آئے۔ جیسے فرزانہ عابد، رضیہ عارف، حمیرا غلام حسین کیریو وغیرہ..... کہانیوں میں میرے مطابق ''حصار'' سب سے بہترین رہی اور نمبرون کی حقدار ٹھہری، ایس امتیاز احمد نے لاجواب انداز سے اسے پیش کیا، دوسرے نمبر پر جو تحریر رہی وہ تھی ''چگاڈ کا خون'' سادہ مگر نہایت عمدہ تحریر تھی اور انجام تو بہت ہی اچھا تھا۔ تیسرے نمبر پر ''خوشبو کا انتقام'' رہی، معاشرے کی تلخ حقیقت لئے عبرتناک انجام کی زبردست تحریر لگی۔ اس کے علاوہ ''آخری خراج'' بھی اچھی لگی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ کہ راحیلہ مشتاق صاحبہ سے گزارش ہے کہ وہ جلد ڈرڈائجسٹ کے لئے کچھ لکھیں۔ ان کے فین شدت سے ان کی کمی محسوس کر رہے ہیں۔ آخر میں ڈر کے لئے یہ کہوں گی کہ نیا سال ڈر کو مزید کامیابیاں عطا کرے۔ (آمین)

☆☆ ایس حبیب صاحبہ: اللہ کرے کہ سال نو 2012ء ہم تمام پاکستانیوں کے لئے خوشحالی کا سال ثابت ہو اور ہمارے ملک سے تمام خودغرض اور میلی نگاہ رکھنے والے ختم ہوجائیں۔ قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کے لئے ڈھیروں شکریہ۔ امید ہے راحیلہ صاحبہ اپنے چاہنے والوں کی خواہش کا سوچتے ہوئے اپنی مصروفیات سے تھوڑا سا وقت نکالیں گی۔ آپ کی نئی کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

فرزانہ عابد لاہور سے، السلام علیکم! نیا سال جنوری 2012ء کا چمکتا دمکتا ڈرڈائجسٹ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ملا، دیکھ کر بہت دلی خوشی ہوئی، ویسے بھی دسمبر 2011ء کا ڈرڈائجسٹ بھی بہت خوب تر تھا، ان دونوں شماروں کی جتنی بھی تعریف کی جائے بہت کم ہے۔ اگر حقیقی طور پر خلوص دل سے تجزیہ کیا جائے تو ڈرڈائجسٹ ملک کا وہ واحد رسالہ ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے تمام رسالوں پر فوقیت رکھتا ہے اس لئے کہ ہر ماہ ایک ہی موضوع پر اتنی ساری کہانیاں بنا سنوار کر قارئین کے ذوق وشوق کے مطابق بنا سنوار کر پیش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ملک میں بے شمار رسالے ہر ماہ جلوہ گر ہوتے ہیں جس میں کئی طرح کے ملے جلے موضوع پر کہانیاں ہوتی ہیں اور میری نظر میں یہ کوئی کمال نہیں۔ کمال تو ڈرڈائجسٹ کی ہے جو کہ صرف اور صرف ایک ہی موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے پڑھنے والوں کی دلی تسکین کے لئے کوشاں رہتا۔ ڈرڈائجسٹ میں چھپنے والی کہانیاں خوب سے خوب ترقی ہوتی ہیں، سلسلے وار کہانیاں اپنے پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں اور خاص طور سے مقبول ومشہور، انفرادیت میں سب سے آگے، ہر پڑھنے والوں کی پسندیدگی، دل ودماغ پر قبضہ جماتی اور ذہن کو مسہور کرتی اپنی مثال آپ جس کا کوئی ثانی نہیں اور کوئی کہانی مدمقابل نہیں، ہر خاص وعام کی دل پسند اور ایسی کہانی جس کا ہر ماہ بہت ہی بے چینی سے انتظار ہوتا

ہے، وہ ہے ''رولوکا'' جس نے 80ء سے مسلسل چھپتے ہوئے اپنی کامیابی وچاہت کا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ اس کہانی کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ یہ کہانی ہر چھوٹے بڑے بلکہ ہر عمر والے کو دلی طور پر پسند ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کوئی بھی کہانی جب زیادہ طویل سفر اختیار کرتی ہے تو اپنے اصل محور سے ہٹ جاتی ہے مگر یہ کہانی اول قسط سے ابھی تک اپنے محور پر رواں دواں ہے۔ خیر رولوکا کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جیسے سورج کو چراغ دکھلانا، بہرحال تمام رسالہ اپنی خوبیوں کا حامل ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈرڈائجسٹ کو دن دگنی اور رات آٹھ گنی ترقی دے۔ تاکہ یہ ہر ماہ ہمارے ذوق وشوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہار کہانیاں پیش کرتا رہے۔

☆☆ فرزانہ صاحبہ: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے قلبی لگاؤ سے ڈرڈائجسٹ کی تمام کہانیوں اور خاص طور سے رولوکا کی تعریف کی۔ امید ہے آپ آئندہ بھی خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گی۔

نسیم اختر ضلاباغ آزاد کشمیر سے، السلام علیکم، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عملہ ڈرڈائجسٹ اور تمام قارئین پر اپنا افضل وکرم کرے۔ یوں تو میں بچپن سے ڈرڈائجسٹ پڑھتی ہوں، لیکن جب میں نومبر کا شمارہ لینے کے لئے ایک شاپ پر پہنچی تو میری نظر ڈر ڈائجسٹ پر پڑی تو میں نے ڈرڈائجسٹ خرید لیا، گھر آکر جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو بہت دلچسپ لگی اور اس کو میں نے بار بار پڑھا، عرض ہے کہ سلسلہ وار کہانیوں میں گزشتہ اقساط کا خلاصہ بھی لکھ دیا کریں تو نئے پڑھنے والوں کے لئے آسانی ہوگی اب آپ کی مرضی خط شائع کریں یا نہ کریں۔ آپ کی خدمت میں اپنے لکھے ہوئے دو اشعار بھیج رہی ہوں اگر چاہیں تو شائع کردیں میری حوصلہ افزائی ہوگی اور ساتھ یہ عرض کروں کہ آزاد کشمیر کی سرزمین پر خاص طور پر ضلاباغ کے ایریا میں ڈرڈائجسٹ کے لئے سچے واقعات موجود ہیں، اگر آپ نے چاہا تو میں آپ کو لکھ کر بھیج دوں گی۔

☆☆ نسیم صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم، آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ بچپن سے ڈرڈائجسٹ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی آرہی ہیں اور شوق سے پڑھتی ہیں، آپ ضلاباغ کے سچے واقعات جلد از جلد لکھ کر ارسال کردیں تاکہ یہ واقعات کہانی کی صورت میں ڈر ڈائجسٹ کی زینت بن سکیں۔

ناصر محمود فرھاد فیصل آباد سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے، اس مرتبہ قدرے تاخیر سے ایک نئی کہانی پیش خدمت ہے، یہ کہانی ان لوگوں کے لئے ہے جو مادر ائی قوتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ امید ہے آپ کو اور قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔ آج ہی تازہ شمارے کی اعزازی کاپی موصول ہوئی واقعی ''ڈرڈائجسٹ'' نے باقاعدگی اور پابندی وقت کا ریکارڈ قائم کردیا ہے۔ تازہ شمارے کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی انشاء اللہ اس پر علیحدہ سے تبصرہ کرسکتا ہوں۔ گزشتہ شمارے میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ مصنفین حضرات کا فون نمبر بھی شائع کیا جائے جس کا آپ نے مناسب اور شافی جواب دیا تھا میں بھی آپ کی بات سے متفق ہوں کہ فون نمبر شائع کرنا مناسب نہیں، مگر میری رائے یہ ہے کہ جو مصنفین مناسب سمجھیں ان کا E-mail ایڈریس علیحدہ سے یا ساتھ ہی شائع کیا جاسکتا ہے تاکہ ان سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ ہوسکے اور ان کی مصروفیات میں بھی خلل واقع نہ ہو۔ باقی جیسے آپ مناسب سمجھیں۔

☆☆ ناصر صاحب: خط لکھنے اور نئی کہانی کے لئے ویری ویری تھینکس۔ آپ کا جواب بہت موزوں اور مثبت ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! آپ اور قارئین کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، پیدل ہی شدید سردی میں شہر جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں بک اسٹال پر سب سے پہلے ڈرڈائجسٹ ماہ جنوری 2012ء کے تازہ پرچے سے ملاقات ہوگئی سرورق بڑے کمال کا تھا جتنی تعریف کی جائے کم ہے، ایسا معیاری اور خوب صورت پرچہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول ہو۔ آپ جس خلوص سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ بہت بڑی بات ہے۔ غزل اور خطوط میں یاد آوری پر میں بے حد ممنون ہوں۔ دن بدن پرچہ بہت بہتر ہوتا جاتا ہے اور مقررہ تاریخ پر پرچہ ہمیں مل جاتا ہے۔ ''ملکہ مصر'' پر اسلم راہی کی تحریر بہت اچھی تھی ان کی تحریریں کامیابی کی ضمانت ہیں، قوس قزح کے اشعار اچھے تھے غزلیں بھی اپنی اپنی جگہ پر خوب صورت تھیں، کہانیوں میں حصار، خوشبو کا انتقام، محبت کی قربانی، یقین خوب سے خوب تھیں، قرآن کی باتیں ایک یادگار سلسلہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ چند غزلیں ارسال کررہا ہوں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں، بشرطِ آپ کا تعاون ساتھ رہے۔ پہلے کی طرح اب بھی حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ آپ کی چاہت ڈر ڈائجسٹ سے واقعی قابل دید ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

منیر احمد ساغر میاں چنوں سے، السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ اپنی شاعری اور محفل قارئین میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، میں پہلے بھی کہتا تھا اور اب بھی کہوں گا کہ ہمارا ڈر ڈائجسٹ کسی قاری کا دل نہیں توڑتا اور نہ ہی کسی کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ بشرطیہ کہ لکھنے والے کے مواد (لکھائی) میں کچھ نہ کچھ جان ہو۔ بہرحال 2011ء کے آخری سال کی رخصتی کے بعد 2012ء کا پہلا اور نیا شمارہ 28 دسمبر کو مارکیٹ سے مل گیا۔ کہانیوں میں ملکہ مصر، رولوکا، شہر وحشت، ''چندرا دیوی'' ''لنگڑی چڑیل، یقین، خلائی قانون پڑھیں جو کہ بے حد پسند آئیں، باقی کا مطالعہ جاری ہے۔ حصہ شاعری میں حکیم خان حکیم، فریدہ خانم، عمر قدیر بھٹی، لاہوتی عماد کی نظم اور شعیب شیرازی کا انتخاب بے حد پسند آیا۔ بقیہ شاعری بھی اچھی تھی، قارئین میاں چنوں کو حصہ قوس و قزح اور محفل قارئین میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، اپنی نئی شاعری لے کر حاضر ہوں، امید ہے کہ شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ آخر میں ڈر کے لئے دعا گو اور دلی طور پر نیک تمنائیں۔

☆☆ منیر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کیلئے شکریہ، غزل شامل اشاعت ہے۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

محمد سلیم کود، میرا نام یقیناً ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ اور ڈر کے پرانے قارئین کے لئے نیا نہیں ہے۔ 2005ء سے لے کر 2006ء تک ڈر میں میری تحریریں شائع ہوچکی ہیں اور میں ڈر ڈائجسٹ کے دفتر کا چکر بھی لگا چکا ہوں۔ اب تقریباً پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد ڈر کے لئے ایک کہانی تحریر کرچکا ہوں۔ امید قوی ہے کہ قابل اشاعت پائیں گے، ویسے اس طویل دوران میرا ڈر سے مطالعے کی حد تک تعلق رہا ہے۔ زیر نظر کہانی ماہنامہ ''ڈر'' کے معیار پر دیکھنے میں پورا اترتا نظر نہیں آئے گا۔ لیکن زیر نظر کہانی میں ایک ایسا خوف وڈر موجود ہے جو پڑھنے والے پڑھنے کے دوران اور پڑھنے کے بعد یقیناً محسوس کریں گے۔ ایک عرض آپ سے یہ بھی ہے کہ میرے نام کے ساتھ میرے علاقے کا نام شائع نہ کرنا۔ امید ہے کہ عرض پر غور فرمائیں گے، انشاء اللہ آئندہ لکھتا رہوں گا۔

☆☆ محمد سلیم صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ نے ایک طویل عرصہ بعد دوبارہ رابطہ کیا، اس کے لئے شکریہ، امید ہے آئندہ بھی شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔

شعیب شیرازی جوہر آباد سے، ڈر ڈائجسٹ جنوری 2012ء میرے ہاتھوں میں ہے، اس دفعہ ٹائٹل بہت پسند آیا، میں کہانیوں پر ڈسکس نہیں کرنا چاہتا کیونکہ ساری کہانیاں لاجواب ہوتی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ کی پروقار مجلس میں حاضری دینا ضروری ہے تاکہ ایک ماہ ہمیں یہ امید لگی رہے کہ ڈر ڈائجسٹ کے کسی ایک صفحے پر ہمارا نام ہوگا اور ہمارا نام بھی ڈر ڈائجسٹ کے قارئین میں شامل اشاعت ہوگا۔ شمارے میں اپنی ایک عدد غزل دیکھ کر کافی خوشی ہوئی، جس کے لئے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں اور تہہ دل سے مشکور ہونے کے لئے پرتول رہا ہوں اگر آپ میری کہانی کو ڈر ڈائجسٹ کی زینت بنالیں، ورنہ ایک عدد غزل تو بھیج بھی رہا ہوں اور قوی امید ہے کہ ضرور شائع کریں گے۔ شکریہ۔

☆☆ شعیب صاحب: خط لکھنے کے لئے تھینکس، آپ کی کہانی کمپوز ہوچکی ہے، آنے والے شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ امید ہے آئندہ بھی کہانی بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

سکندر علی رضا فیصل آباد سے، السلام علیکم، امید کرتا ہوں کہ ڈر کا پورا اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا، 28 نومبر کو پیارا ڈر ڈائجسٹ ملا، ٹائٹل بہت خوب تھا، اتنا خوفناک دہشت ناک کہ میرا سر چکرا گیا، خیر ورق پلٹا تو کہانیوں کی فہرست میں پہنچا تو یہ دیکھتے ہی اتنی خوشی ملی کہ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں میرا دل خوشی سے ناچنے لگا کہ میری کہانی موجود تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈر والے کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتے۔ میرے خیال میں پاکستان میں کوئی بھی ڈائجسٹ والے ایسا نہیں کرتے ہوں گے، میرا دل بہت خوش ہوا۔ ایک کہانی عنقریب مکمل ہونے والی ہے جب بھی پوری ہوجائے گی جلد از جلد ارسال کردوں گا کہانی کچھ

زیادہ ہی لمبی ہوگئی ہے۔ جس کی وجہ سے ابھی تک زیر قلم ہے۔ اچھا اب آتے ہیں دسمبر ڈر کی طرف تمام کی تمام کہانیاں قابل ذکر تھیں۔ پر پھر بھی جو دل کو بھا گئی وہ ہے بہادر شاہ ظفر، چندرا دیوی اور اس کے بعد بے حد اچھی کہانی رولوکا جو کہ بہت پسند آئی، میں ڈر کے لئے شب و روز دعا ہوں گے۔

☆☆ سکندر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، اب نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ امید ہے پہلی فرصت میں کہانی ارسال کردیں گے۔ Thanks۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، نئے سال کا پہلا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں آیا اور ہم خطوط کی محفل میں جا پہنچے۔ آغاز تو بسم اللہ، انجام خدا جانے، رسالہ حسب معمول بہترین کہانیوں کے ساتھ رواں دواں ہے، قلوپطرہ کے موضوع پر ڈر میں بہت کچھ شائع ہوچکا ہے۔ 22 سے 24 کو ملنے والا ڈر 19-12-2011 کو ملا تو بہت خوشی ہوئی، یقین کی پہلی قسط کی طرح دوسری قسط بھی دلچسپ رہی، نئے سال کی طرح سرورق رنگ وروپ میں بہت ہی پیارا تھا، رولوکا کی طرح کیا چندرا دیوی شہر وحشت بھی رسالے کی جان ہوگی؟ ہم رسالے پر گہری نظر رکھتے ہیں، ہماری طبیعت تو ٹھیک ہے مگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی، آپ نے پرانا خط شامل کیا ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ آپ قارئین کے خطوط ضائع نہیں کرتے، راحیلہ مشاق سے گزارش ہے کہ قسط وار کہانی شروع کریں، قارئین وادارہ ڈر کو دعائیں سلام۔

☆☆ شرف الدین صاحب: خلوص نامہ کے لئے قلبی لگاؤ کے ساتھ شکریہ، اگر ہم مثبت سوچ کو اپنا کر عملی قدم اٹھاتے رہیں تو انجام یقیناً بخیر ہوگا۔ آپ کی دعا سے میری طبیعت بخیر ہے۔ اگر خط ہی دیر سے موصول ہو تو...... لیکن ہم پھر بھی یاد رکھتے ہیں، چاہے نیا سے یا پھر پرانا سے۔ آئندہ ماہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔

شاھد حسین لاہور سے، میری طرف سے ڈر کی تمام ٹیم کو سلام قبول، میں دوسری بار ڈر کی محفل میں شرکت کررہا ہوں، 2 سال قبل بھی ڈر کی محفل میں شریک رہ چکا ہوں، اپنی غزلوں کے ساتھ اس غیر حاضری کے دوران بھی ڈر کا طلسم نہیں ٹوٹ سکا۔ ہر شمارہ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک رہی۔ اس بار بھی ایک غزل ارسال کررہا ہوں اور قوی امید ہے کہ آپ ضرور شائع کریں گے، آئندہ بھی ڈر میں ملاقات ہوتی رہے گی۔ انشاء اللہ۔

☆☆ شاہد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں دوبارہ بھی خوش آمدید، امید ہے آئندہ بھی ڈر ڈائجسٹ کو یاد کرتے ہوئے خلوص نامہ ارسال کریں گے۔

آصف شہزاد الہ آباد قصور سے، السلام علیکم، سب سے پہلے میں معذرت خواہ ہوں کہ پچھلے چند ماہ سے ڈر کی محفل میں شرکت نہ کرسکا، آپ کے شمارہ کے توسط سے میں آپ کو اور اپنے تمام دوستوں کو نئے سال کی آمد پر ہیپی نیو ایئر، Happy New Year کہتا ہوں، خدا کرے کہ نیا سال ترقی کی نئی جہتیں اور ڈھیروں خوشیاں لائے، (آمین ثم آمین)۔ اب آتے ہیں ڈر کے شمارہ کی طرف جو جناب جنوری 2012ء کا شمارہ جگمگاتا اچھلتا کودتا، ہنستا مسکراتا رنگارنگ دیدہ زیب تمام ڈائجسٹوں میں نمایاں مقام پر دیکھا تو پہلے تو یقین ہی نہ آیا کہ یہ ڈر ڈائجسٹ ہے، ٹائٹل بہت ہی بھلا لگا، سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، ایمان میں تازگی اور پختگی آئی، پھر خطوط کی محفل میں پہنچا۔ تو نئے پرانے سب دوستوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا، محمد عثمان علی صاحب کی وضاحت پڑھی، پھر کہانیاں پڑھیں، کہانیوں میں مجھے ملکہ مصر، رولوکا، گنتارا، شہر وحشت، محبت کی قربانی، خوشبو کا انتقام، لنگڑی چڑیل، آخری خراج اور یقین اچھی لگیں۔ رولوکا اور شہر وحشت نے تو اس دفعہ جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ قوس قزح میں مجھے محمد بشیر احمد پرواز، محمد اسحاق انجم، لاہوتی عمار، حکیم خان حکیم، رانا ظفر اقبال، قدیر رانا، راغب عثمان کیانی، منیر احمد ساغر کا کلام پسند آیا، محترم سر ایک عدد غزل آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہے، شائع کر کے بندہ کو از حد مشکور فرمائیں، پچھلے ماہ کی غیر حاضری پر ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں، مصروفیت بہت زیادہ تھی لیکن ڈر کا مطالعہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ میری دعا ہے کہ ڈر شب و روز ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔

☆☆ آصف صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں غیر حاضری کی معذرت قبول کرتے ہوئے دوبارہ ڈر ڈائجسٹ میں آپ کو خوش آمدید، آئندہ بھی آپ ڈر ڈائجسٹ کو یاد رکھیں گے، اس کے لئے شکریہ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محمد نوید انجم چکوال سے، ''السلام علیکم'' امید ہے کہ ڈرڈائجسٹ کی پوری ٹیم خدا کے فضل وکرم سے اور ہم سب کی دعاؤں سے بالکل خیریت سے ہوگی۔ اس دفعہ ''ڈر'' 22 تاریخ کو ملا، ٹائٹل بہت ہی اچھا لگا۔ میری طرف سے ادارہ ڈر ڈائجسٹ کے تمام اراکین اور محترم رائٹر حضرات کو میری طرف سے نیا سال بہت بہت مبارک ہو، اور میں دعا کرتا ہوں کہ یہ نیا سال ہمارے ملک وقوم کے لئے خوشیوں کا پیام لائے اور ہر طرف خوش حالی کا دور دورہ ہو، محترم مینجنگ ایڈیٹر خالد علی صاحب آپ نے خطوط کے شروع میں بہت اچھی اچھی باتیں کہی ہیں اگر ہم اس پر عمل کریں تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہمارا پیارا ملک پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہو اور کوئی بھی میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کی حفاظت کرے۔ (آمین) یقین کہانی بہت پسند آئی، میں تمام رائٹر حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اچھی اچھی کہانیاں لکھتے رہیں تاکہ ڈر مزید ترقی کرے اور ہمارا ڈرڈائجسٹ تمام ڈائجسٹوں سے منفرد نظر آئے، اس کے علاوہ محمد عثمان علی میاں چنوں کا شکر گزار رہوں کہ ہم قارئین کے تعریف وتنقیدی خطوط سے ناراض نہیں ہوتے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خلائی قانون، محبت قربانی، اچھی کہانیاں ہیں اور باقی زیر مطالعہ ہیں۔ غزلوں میں شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار، سکندر علی رضا فیصل آباد اور محمد عثمان علی میاں چنوں کی غزلیں دل کو بہت اچھی لگیں، آخر میں تمام قارئین سے میری التجا، گزارش ہے کہ اس نئے سال میں پیارے ملک پاکستان اور ڈرڈائجسٹ کے لئے ڈھیروں دعائیں کریں اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو سلامت رکھے اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام اراکین اور رائٹر اور قارئین حضرات کو بھی سلامت رکھے۔ (آمین)

☆☆ نوید صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے اور ہمارا ملک ہر طرح سے خوشحال ہو، اللہ تعالیٰ آپ اور تمام قارئین کرام پر بھی اپنا فضل وکرم کرے، آئندہ ماہ بھی خلوص نام کا شدت سے انتظار رہے گا۔

رانا ظفر اقبال جنڈانوالہ سے، السلام علیکم، ڈرڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور تمام قارئین کو نیا سال مبارک ہو، اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سال کو ہمارے اور ہمارے ملک کے لئے امن اور سلامتی والا سال بنائے۔ (آمین) جنوری 2012ء کا ڈرڈائجسٹ 24 دسمبر 2011ء کو ملا، ٹائٹل پر نگاہ پڑتے ہی خوف کی ایک لہر جسم میں دوڑ گئی اور تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتوں کا مطالعہ کیا، ایمان تازہ ہوا، اس کے بعد محفل یاراں میں حاضری دی اور پنالیٹر دیکھ کر دل خوش ہو گیا، تھینکس، محمد عثمان علی فرام میاں چنوں کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، عثمان صاحب سے درخواست ہے کہ جلدی سے کوئی اچھی سی تحریر لکھ کر ڈرڈائجسٹ کی زینت بنائیں۔ قوس قزح میں تمام ساتھیوں نے اچھا لکھا تھا۔ آصفہ پروین سراج لاہور، مس فوزیہ کنول کنگن پور، محمد عثمان علی میاں چنوں کے شعر دل کو بھا گئے۔ غزلیات میں پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی، کائنات بلوچ، صبا اسلم، شعیب شیرازی، سکندر علی رضا، ایم انس نہال، رافع عثمان کیانی، حمیر اغلام حسین کیریو، ذکیہ سلمان اور لاہوتی عماد نے بہت اچھا لکھا ہے۔ انت مام دوستو کے لئے مبارکباد کے پھول، کہانیاں چند ایک پڑھی ہیں۔ ابھی مطالعہ جاری ہے۔ جو پڑھی ہیں ان میں ہمیشہ کی طرح ''چندرا دیوی''، نمبر دن ''رولوکا'' نمبر ٹو اور ''ملکہ مصر'' بھی اچھی کاوش تھی۔ ''خلائی قانون'' ''پراسرار خواب'' ''محبت کی قربانی'' اور ''یقین'' بہت اچھی تھی، ''یقین'' کا اچھا اینڈ ہوا، باقی کا مطالعہ جاری ہے اگلے ماہ تک کے لئے اجازت۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کی طرح ڈرڈائجسٹ کو سال 2012ء میں مزید دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔ (آمین)

☆☆ رانا ظفر صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے، آپ کو کہانیاں اچھی لگیں اس کے لئے Thanks، امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

بشیر احمد بھٹی بہاول پور سے، السلام علیکم جناب، آداب وتسلیمات، جنوری 2012ء نیا سال مبارک ہو، نئے سال کے نئے شمارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ کہانی ذرا طویل ہو، تو شائع کی جاسکتی ہے، آپ سے گزارش ہے کہ میں نے پہلی کہانی (خوفناک مردے) طویل ہی بھیجی تھی۔ مگر شائع نہ ہوئی۔ دوسری کہانی (جنات کی شرارت) مختصر تھی۔ آپ سے گزارش ہے کہ مختصر کہانیاں بغیر اسکیچز بھی تصویروں کے بغیر چند درمیانی صفحات میں شائع کر دیا کریں، کئی قارئین مختصر کہانیاں پسند کرتے ہیں، طویل کہانیاں بھی پڑھتے ہیں، رہی بات تصویروں کی تو عرض ہے کہ ان کی تصویریں مصور سے نہ بنوایا کریں، کیونکہ تصویروں پر

محنت ہوتی ہے۔ جگہ بھی کور کرتی ہیں۔ اگر ڈیڑھ صفحے کی کہانی ہو تو جہاں اس کا کالم ختم ہو، وہاں سے دوسری کہانی شروع ہو جائے۔ اس طرح کالم بھی مکمل ہو جائیں گے۔ کہانی بھیجنے والے کی دل شکنی بھی نہیں ہوگی۔ رہی بات اعزازی شمارے کی۔ طویل کہانیاں بھیجنے والے مصنفین کو اعزازی کاپی بھیج دیا کریں۔ مختصر کہانی بھیجنے والے مصنفین کو بلاشک اعزازی کاپی نہ بھیجا کریں۔ وہ اپنی کہانی دیکھ کر ڈائجسٹ مارکیٹ سے خرید لیا کریں گے۔ کئی ڈائجسٹ بخوشی مختصر کہانیاں شائع کر رہے ہیں۔ آپ بھی کہانیاں ضائع نہ کیا کریں، لکھنے میں محنت ہوتی ہے، کہانیاں محفوظ کر لیا کریں، جس ماہ کم کہانیاں موصول ہوں، جمع شدہ کہانیوں کو شائع کر دیا کریں، وقت ضرورت کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے۔ شکریہ۔

☆☆ بشیر احمد صاحب: آپ کی باتیں صرف آپ کے لئے غور طلب ہیں، لیکن ایسا ہوتا نہیں، امید ہے غور فرمائیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی کراچی سے، ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کا شمارہ جنوری 2012ء گلابی سردی کی طرح قارئین حضرات کو ہشاش بشاش کرنے کے لئے ہاتھوں کی زینت بن گیا ہے۔ ہر ماہ پابندی سے میری رائے اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، دسمبر 2011ء کے شمارے میں میری ارسال کردہ رائے کے خطوط کے جواب میں آپ نے لکھا تھا کہ میری ایک عرصے سے ارسال کردہ کہانی ماہ جنوری 2012ء نئے سال کے شمارے میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ یقین دہانی کے باوجود دل شکستہ کا سامنا کرنا پڑا۔ کہانی شائع ہونے کا بڑی بے چینی سے انتظار ہے۔

☆☆ واجد صاحب: ڈائجسٹ کی تعریف کے لئے خلوص نامہ ارسال کرنے کا بہت بہت شکریہ، جناب آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی اور اگلے شمارے میں، کہانی کمپوز ہو چکی ہے، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد بشیر احمد پرواز جنڈانوالہ سے، ڈرڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور تمام قارئین کو سلام عرض اور ساتھ ساتھ نئے سال کی مبارکباد قبول ہو اور دعا ہے اللہ تعالیٰ یہ سال ہمارے لئے امن اور سلامتی کا سال ہو اور اس سال ہی ہمارے پیارے ملک پاکستان اور ڈرڈائجسٹ کی ترقی کی راہ پر گامزن رکھے، آمین۔ اب آتے ہیں ڈرڈائجسٹ کی طرف، اس دفعہ ڈرڈائجسٹ 24 دسمبر 2011ء کو ملا، ٹائٹل دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور ڈر بھی محسوس ہوا، جلدی سے صفحات نے پلٹ کر محفل یاراں میں اپنا خط ڈھونڈا تو اپنا نام دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی تھینکس ڈرڈائجسٹ، اس کے بعد کچھ کہانیوں کا مطالعہ کیا، جن میں ''چندرا دیوی'' ''رولوکا'' ''خوشبو کا انتقام'' ''ملکہ مصر'' بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ ''خلائی قانون'' ''آخری خراج'' اور ''پراسرار خواب'' بھی اچھی تھیں۔ قوس قزح کا سلسلہ بھی اچھا تھا۔ جس میں محمد اسحاق انجم، مجاہد لیاقت، محمد عثمان میاں چنوں اور ظفر اقبال نے اچھا لکھا تھا۔ باقی مطالعہ جاری ہے جو کیا وہ رسالہ بھرپور تھا، آپ سے ایک بات پوچھنی تھی کہ کیا میں شعر اور غزل، سرائیکی میں بھیج سکتا ہوں، پلیز جواب دیجئے گا اور آخر میں ڈرڈائجسٹ کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ بشیر صاحب: کہانیوں کی تعریف اور نوازش نامہ بھیجنے کے لئے، Thanks، جناب اشعار اور غزل اردو میں ہی بھیجا کریں، کیونکہ کراچی میں کمپوزیٹر حضرات اردو پر عبور رکھتے ہیں۔ شکریہ۔

حاجی محمد اسحاق انجم کنگن پور سے، السلام علیکم، امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے! نئے سال کا نیا شمارہ جنوری ڈرڈائجسٹ ملا، ٹائٹل اچھا لگا، اسلم راہی صاحب ایک بار پھر تاریخ کے اوراق سے ''ملکہ مصر'' حسن وعشق کی داستان لے کر حاضر ہوئے ہمیں پسند آئی، سلسلے وار رولوکا، شہر وحشت اور چندرا دیوی بھی ہمیں پسند ہیں! دیگر کہانیوں میں پراسرار خواب، خلائی قانون، یقین، حصار، چمگادڑ کا خون، آخری خراج، محبت کی قربانی، خوشبو کا انتقام، گفتار، محبت بھرے قوس وقزح، سب ہی اپنی اپنی جگہ پر اچھے انداز میں تھے! رولوکا آپ نے کتابی صورت میں شائع کر کے اچھا کیا اور دوستوں کا کہنا تھا کہ ہم رولوکا شروع سے نہیں پڑھ سکے! تو اس طرح وہ دوست بھی رولوکا کا مطالعہ کر لیں گے، خطوط کی محفل میں موجود دوست ہمیں یاد کرتے ہیں ان کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆ اسحاق انجم صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے اور آئندہ بھی آپ خلوص نامہ بھیجیں گے۔ اس کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کیجئے۔

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قبلائی خان

اسلم راہی-ایم اے

قبلائی کا باپ شاید جنوبی چین کو فتح کرلیتا لیکن ان ھی مہمات کے درمیان موت نے اسے آلیا لھذا یہ مھم ادھوری رہ گئی اب اپنے باپ کے چھوڑے ھوئے کام کی تکمیل کے لئے منگو خان نے اپنے بھائی قبلائی کا انتخاب کیا تھا۔

اپنے ہم وطنوں کے فلاح و بہبود کے لئے ایک سفاک جنگجو کا خونی داستان حیرت

ایک مرتبہ اس کے بھتیجے نے پیغام بھجوایا کہ مجھ کو یہودیوں اور مجوسیوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی کتاب قرآن مجید میں لکھا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو آپ کا اس تعظیم کے متعلق کیا خیال ہے یعنی اگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ہم کو جہاں پائیں قتل کریں تو اس حالت میں مسلمانوں کی قوم کا دنیا میں باقی رہنا اندیشے سے خالی نہیں ہے۔

جب اس نے اپنے بھتیجے کی عرضداشت کو پڑھا تو بڑا فکر مند ہوا اس نے مسلمان علماء کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

کیا قرآن مقدس میں ایسا حکم موجود ہے؟

ان علماء نے جواب دیا۔

ہاں یہ حکم موجود ہے۔

مسلمان علماء کا یہ جواب سن کر وہ بے حد برہم ہوا اور کہنے لگا۔

اگر تمہارے قرآن مقدس میں یہ حکم ہے تو پھر تم اس حکم کی تعمیل کیوں نہیں کرتے پھر تم ہم کو قتل کیوں نہیں کرتے۔

اس کے اس سوال پر مسلمان علماء نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

ہم قوت نہیں رکھتے جب قوت اور قدرت پائیں گے تو تم کو قتل کریں گے۔

وہ کیونکہ اپنے وقت کا شہنشاہ تھا لہٰذا مسلمان علماء کا یہ جواب سن کر بڑا برہم ہوا پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

اگر یہ بات ہے تو پھر سنو کیونکہ ہم قدرت رکھتے ہیں لہٰذا ہم کو چاہئے کہ تمہیں قتل کریں یہ کہہ کر اس نے ان مسلمان علماء کو قتل کردیا اور حکم جاری کیا کہ مسلمانوں کو جہاں پاؤ قتل کردو۔

اس کے اس حکم کو سن کر مسلمان بڑے فکر مند، حیران اور پریشان ہوئے یہاں تک کہ مسلمانوں کے دو عالم اس کی خدمت میں حاضر ہوئے جو دو عالم اس کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں ایک مولانا بدرالدین تھے اور دوسرے مولانا حمید الدین سمرقندی تھے اس شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان دونوں عالموں نے پوچھا۔

آپ نے مسلمانوں کے قتل عام کا حکم کیوں جاری کیا؟

اس پر اس حکمران نے ان دو علماء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہاری مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ جہاں مشرکوں کو پاؤ انہیں قتل کرو اس بناء پر میں نے مسلمانوں کے قتل کا حکم دیا ہے۔

اس پر ان دونوں عالموں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

عرب کے بت پرست جو مسلمانوں کے قتل پر ہمہ وقت آمادہ رہتے تھے ان کی نسبت خدائے تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ اپنے صحابہ اکرامؓ کو حکم دیا تھا کہ اپنی حفاظت کے لئے ان کو قتل کرو لیکن یہ حکم تمہارے لئے تو نہیں ہے کیونکہ تم خدائے تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہو اور اپنے فرمانیں کی پیشانی پر خدا کا نام ہمیشہ لکھتے ہو۔

یہ سنتے ہی اس شہنشاہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ان دونوں علماء کی بات سن کر وہ چونکا بڑا خوش بھی ہوا اور اس وقت حکم جاری کر دیا کہ میرا پہلا حکم جو مسلمانوں کے قتل کی نسبت جاری ہوا تھا اسے فی الفور منسوخ سمجھا جائے۔

یہ حکم دے کر منسوخ کرنے والا چنگیز خان کا پوتا قبلائی خان تھا اور اس کے جس بھتیجے نے اس کی طرف پیغام بھجوایا تھا کہ مجھ کو یہودیوں اور مجوسیوں نے بتایا کہ مسلمانوں کی کتاب میں لکھا ہے کہ مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو ہلاکو خان کا بیٹا ابا قا خان تھا جس نے مراغہ شہر سے چین کی سرزمین تک اپنے چچا قبلائی خان کے نام یہ پیغام بھجوایا تھا۔

قبلائی خان چنگیز خان کا پوتا تھا چنگیز خان کے چار بیٹے تھے بڑے بیٹے کا نام جوچی خان اس سے چھوٹا چغتائی خان پھر اوغدائی خان اور سب سے چھوٹا تولائی خان تھا آگے بڑے بیٹے جوچی خان کے بھی چار بیٹے تھے بڑے بیٹے کا نام باتو خان پھر بوقا، تیمور پھر برقائی خان پھر برکجار اس سے چھوٹے چغتائی خان کے دو بیٹے تھے۔ ایک منکو خان دوسرا موا تو خان، تیسرے بیٹے اوغدائی خان کے پانچ بیٹے تھے ایک کیوک خان، دوسرا کوکان خان، تیسرا کداک انمول، چوتھا کوجو جبکہ پانچوان قاشین تھا سب سے چھوٹے بیٹے تولاتی خان کے چار بیٹے تھے سب سے بڑا منگو خان پھر ہلاکو خان تیسرا قبلائی خان اور چوتھا اریق بوغا۔

چنگیز خان کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا اوغدائی خان منگولوں کا حکمران بنا تھا اوغدائی خان کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا کیوک خان منگولوں کا حاکم مقرر ہوا اور کیوک کے بعد متفقہ رائے سے چنگیز خان کے سب سے چھوٹے بیٹے تولائی خان کے بڑے بیٹے منگو خان کو منگولوں نے اپنا خاقان مقرر کیا تھا۔

خاقان بننے کے بعد اسی منگو خان نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو تو مسلمانوں کے علاقوں پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ کیا تھا اور اپنے دوسرے بھائی قبلائی خان کا اس نے انتخاب کیا تھا وہ چین کی سرزمین پر حملہ آور ہوگا۔

چین کی تاریخ بڑی پرانی اور بڑی عجیب ہے یہاں سے ایسے انسانی ڈھانچے بھی ملے ہیں جو دس لاکھ سال سے زیادہ پرانے خیال کئے جاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال بھی کرتے ہیں کہ کرۂ ارض کے ابتدائی عہد کے انسان چین میں آباد تھے شمالی چین کے میدانوں میں دریائے زرد کی وادی قدیم انسانی تہذیب کا گہوارہ خیال کی جاتی ہے۔

ولادت مسیح سے تین ہزار سال پہلے چین دنیا کا متمدن ترین ملک سمجھا جاتا تھا تاریخ میں چین کے جس پہلے بادشاہ کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے اس کا نام خوبی تھا جو 2852 قبل مسیح سے 2738 قبل مسیح تک حکمرانی کرتا رہا۔

چینیوں نے اسے دیوتا کا درجہ دے دیا تھا اس کے بعد تین شہنشاہوں کا ذکر ملتا ہے جن کی حکومت چوبیسویں صدی قبل مسیح تک رہی۔

2205 قبل مسیح میں ہسیا خاندان کی حکومت چین میں قائم ہوئی اگرچہ اس بارے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا کہ واقعی یہ خاندان کبھی چین پر حکمران رہا ہے! البتہ اس بات پر تمام تاریخ دان متفق ہیں کہ چین میں سب سے پہلے شنگ یا مرہنگ خاندان نے حکومت

کا آغاز کیا تھا۔

اس خاندان نے 1766 سے 1530 قبل مسیح تک حکمرانی کی 1122 قبل مسیح میں ریاست چو کے حکمران دو نے نے اس خاندان کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کر لی جو پہلا حکمران خاندان ہے جس کے بارے میں تاریخ میں تفصیل سے معلومات ملتی ہیں۔

600 سے 300 قبل مسیح کے عرصے میں چین میں تین مشہور فلاسفر پیدا ہوئے جنہوں نے چینی زندگی کو بے حد متاثر کیا ان تین میں سے ایک لاذ زدوسرا کنفیوشس اور تیسرا ہلسان زد تھے ان میں سے کنفیوشس کے فلسفے نے چینیوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ان کی تعلیمات میں سے زیادہ اہم ہے کہ لیڈر صرف اچھی مثالیں قائم کر کے تعلیم کی مدد سے نرم رول اور انصاف اختیار کر کے لوگوں پر حکومت کر سکتے ہیں۔

چنانچہ اس کے اس خیال کو دنیا بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی سن 256 قبل مسیح میں چاؤ خاندان کی حکومت جب چین میں ختم ہوئی تو دو سو انچاس قبل مسیح میں چی ان خاندان اقتدار میں آ گیا 141 قبل مسیح میں دوتی حکمران کے عہد میں چین اس قدر مضبوط تھا کہ اس کی قدیم سرحدیں وسیع کرنے کا کام آسانی سے ہونے لگا۔

اس کے بعد ین یہاں حکمران رہے ان کے دور میں چین معاشی لحاظ سے خوشحال ہو گیا سن 80ء میں حکومت کے ایک عہدے دار وانگ پن نے حکومت پر قبضہ کر لیا کچھ عرصہ بعد ین خاندان نے حکومت واپس لے لی سن 230ء میں آخری ین حکمران کا انتقال ہو گیا اس کے بعد 375 تک چھ مختلف خاندان چین پر حکومت کرتے رہے آخری 960ء میں سنگ خاندان نے چین میں اپنی حکومت کی ابتداء کی تھی۔

بدقسمتی کہ ان دنوں شمال کی طرف سے وحشی قبائل نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا یہ لوگ پہلے خانہ بدوش زندگی بسر کرتے تھے برف سے ڈھکے ہوئے صحرا کے اندر رہتے تھے آخر انہوں نے دہشت کی حدود سے باہر نکلنا سیکھ لیا سب سے پہلے ہن قبائل نمودار ہوئے جن کو چینی ہو ینگ نو کہتے تھے۔

ان کے سردار کا خان کہلاتے تھے ان کا وطن شمال کے برفانی علاقوں کی جھیل بیکال کے قریب کوہستانوں کے شمالی دروازے کے اس پار تھا یہاں سے وہ دشت کے جنوب مشرقی دروازے سے خروج کرنے لگے تھے۔

اس کے بعد ترک اور تاتاری بھی نمودار ہوئے جو ان ہی ہن قبائل کے عزیز و اقارب تھے اور ان ہی کے قرب و جوار میں رہنے والے تھے۔

ان کے حملوں سے بچنے کے لئے چینی شہنشاہوں نے پہاڑیوں کے آر پار عظیم دیوار بنائی یہ دیوار جو اب سے کئی ہزار سال پہلے بنائی گئی تھی کچھ عرصہ تک وحشیوں کو روکتی رہی شمال سے نکلنے والے وحشی جب اس دیوار کو عبور کر کے چین پر حملہ آور نہ ہو سکتے تو انہوں نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا یہ دوسرا راستہ شمال کے جنگلوں کے بالکل نیچے کی گھاس کے میدانوں سے ہوتا ہوا منگولیا کی سطح مرتفع کو قطعہ کرتا ہوا کوہستان القائی کے دروں سے گزر کر وسط ایسیا کے دریاؤں کے ساتھ ساتھ دشت کرغیز کی عظیم الشان بلندیوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ کوہستان یورال کی ہلکی ہلکی ڈھلانوں کے بیچ در بیچ راستوں سے گزرتا ہوا جنوبی روس کے گھاس کے میدانوں پر ختم ہوتا تھا یہاں سے یہ راستہ سیدھا ہنگری کے میدانوں میں نکل جاتا تھا۔

یہ کوئی بنائی ہوئی شاہراہ نہ تھی یہ چراہ گاہوں کے درمیان ایک قدرتی راستہ تھا جو دشت و بیابان میں چار ہزار میل کی مسافت رکھتا تھا اور اسی علاقے میں چینیوں کے شمال سے نکلنے والے وحشی قبائل نے سفر کرتے ہوئے مختلف علاقوں کا رخ کرنا شروع کیا تھا۔

دیوار چین ایک عرصہ تک تو وحشیوں کو حملہ آور ہونے سے روکتی رہی آخر یہ دیوار عظیم روک تھام میں ناکام ہو گئی شروع میں یہ دیوار دراصل ہن قبائل کے حملوں سے بچنے کے لئے تعمیر کی گئی تھی لیکن چینی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حکمرانوں نے اس دیوار کی نگہبانی سے غفلت برتی جس کے نتیجے میں وحشی قبائل نے اس حصے سے دیوار کو توڑنا سیکھ لیا جس کی حفاظت نہیں کی جارہی تھی۔

اب چین کی اس عظیم دیوار کی حیثیت محض ایک جغرافیائی نشان سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ مانچوریہ سے نکلنے والے وحشی قبائل اب اس دیوار کا رخ کررہے تھے۔ آخر کار شمال کے ان وحشی قبائل کا ایک لشکر نمودار ہوا اور اس نے دیوار چین کو عبور کرلیا انہوں نے شمالی چین کے علاقے پر قبضہ کرلیا اور وہاں انہوں نے اناج اور کھیتوں کے درمیان اقامت اختیار کرلی تھی یہ لوگ ختائی کہلاتے تھے اور اپنی فتح کے بعد تاختائی یعنی عظیم ختائی کہلانے لگے۔

ان حملہ آور ختایوں کی تعداد چینیوں کی تعداد کی عشیر عشیر بھی نہ تھی جن پر اس زمانے میں سنگ خاندان کی حکومت تھی یہ سنگ خاندان کی ضعیفی اور انحاط کا زمانہ تھا نہ وہ اس قابل رہے تھے کہ سڑکوں اور نہروں کی حفاظت کرسکیں نہ اس قابل کہ زرد مٹی کے علاقے میں اپنی لاتعداد خلقت کو قحط اور خشک سالی سے بچاسکیں ان میں اتنی طاقت ہی نہ رہی تھی کہ وحشی قبائل کو نکال باہر کرسکیں۔

جب شمال کے وحشی ختائی ان پر حملہ آور ہوئے اور ان کی سرزمین پر قبضہ کرنا شروع کردیا تو اس موقع پر سنگ خاندان کے حکمرانوں سے ایک غلطی ہوئی انہوں نے شمال کے ایک اور وحشی قبیلے سے رابطہ قائم کیا وحشی قبیلے کا نام تنکس تھا اس تنکس قبیلے کے لوگ شکاری تھے برف زاروں میں رہتے تھے اور برف کے سوراخوں میں شمست لگا کر مچھلیاں پکڑ کر گزربسر کرتے تھے یہ لوگ اس خاندان کے معیث اعلیٰ بھی ہوئے جو بعد میں مانچو کے نام سے چین میں تخت نشین ہوا۔ یہ لمبی لمبی زلفیں بڑھاتے تھے اور چوٹی گوندھتے تھے انہیں بھی کسی وجہ سے دیوار چین کے جنوب میں لوگوں کے اندر چوٹیاں گوندھنے کا رواج ہوا جب ان میں سے کوئی مرجاتا تو اس کے ساتھ ایک کتے کی لاش جلائی جاتی تاکہ کتا مرنے کی روح کو آسمان کی طرف لے جائے۔

بہر حال یہی تنکس قبیلہ اپنے برف زاروں سے نکلا اور وہ چین پر حملہ آور ہونے والے وحشی قبائل ختا پر حملہ آور ہوئے۔ دونوں میں خوفناک ٹکراؤ ہوا جس میں تنکس کامیاب رہے جس کے نتیجے میں وحشی ختایوں میں سے کچھ تو چین کے اندر ہی آباد ہوگئے اور تنکس قبائل کی اطاعت اختیار کرلی کچھ ختائی جو قراختائی کہلانے لگے تھے وہ چین سے نکل کر تبت کی ڈھلانوں کی طرف بڑھے یہاں پہلے سے ان کے کچھ رشتہ دار قبیلے آباد تھے جو قزاقی کرکے گزربسر کرتے تھے چین سے نکلنے والے یہ ختائی انہی کے پاس جاکر آباد ہوگئے اور وہاں اپنی حکومت قائم کرلی جب تنکس قبیلے نے چین پر قبضہ کرلیا تو انہوں نے چینیوں کو بھی پیچھے ہٹانا شروع کردیا جنہوں نے اپنی مدد کے لئے انہیں مدعو کیا تھا وہ جانوروں کی طرح خونخوار تھے انہوں نے سنگ حکومت کو شمالی چین سے ختم کرکے جنوب کی طرف دھکیل دیا اب ان کا سردار شمالی چین کا حکمران بن گیا تھا جو اس دور میں ختا کا علاقہ کہلاتا تھا یہ تنکس چمکتے ہوئے سونے سے بڑھ کر کسی اور چیز کے قائل نہ تھے وہ سونے کو کیونکہ بے حد پسند کرتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے خاندان کا نام چن یعنی زریں رکھا اور اپنے آپ کو ان کا حکمران زرین اعظم کہلوانے لگا اس کے تخت پر اژدھوں کے سر بنے ہوئے اور اس کا دارالحکومت ین کنگ ایک مضبوط فصیل کے اندر واقع تھا شمالی چین میں جس وقت اس تنکس قبیلے کی حکمرانی تھی ان ہی دنوں منگول چنگیز خان کی سرکردگی میں خروج کرگئے تھے۔

ان تنکیس پر جواب زریں کہلاتے تھے سب سے پہلے چنگیز خان حملہ آور ہوا اور شمالی چین پر ایک طرح سے دور دور تک اپنی فتوحات کا سلسلہ پھیلاتے ہوئے اس نے تنکس کے علاقوں کو فتح کرلیا تھا چین کی سرزمین میں چنگیز خان کی سرکردگی میں منگولوں کا یہ پہلا حملہ تھا۔

اس کے بعد چنگیز خان کے سب سے چھوٹے

بیٹے یعنی قبلائی کے باپ تولائی خان نے ایک لشکر کے ساتھ جنوبی چین پر حملے شروع کئے تھے کیونکہ شمالی چین پر تو منگول قبضہ کرچکے تھے وہ جنوبی چین کو بھی اپنی گرفت میں لینا چاہتے تھے جہاں اب شمال سے نکل کر سنگ خاندان نے حکومت قائم کرلی تھی۔

قبلائی کا باپ شاید جنوبی چین کو فتح کرلیتا لیکن ان ہی مہمات کے درمیان موت نے اسے آلیا لہٰذا یہ مہم ادھوری رہ گئی اب اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کے لئے منگو خان نے اپنے بھائی قبلائی کا انتخاب کیا تھا۔

چین پر حملہ آور ہونے کے لئے منگو خان نے جہاں قبلائی خان کو ایک بہت بڑا لشکر مہیا کیا وہاں اسے بہترین سالار بھی فراہم کئے سب سے پہلے اس نے ایک منگول سالار اوریا نگ کو اس کے ساتھ کیا جو چنگیز خان کے نامور سپہ سالار سویدائی کا بیٹا تھا اسی سویدائی کے پوتے آچھو کو بھی اس لشکر میں شامل کیا گیا قبلائی خان اپنے لشکر کو لے کر اپنے آبائی مسکن سے روانہ ہوا طویل کوہستانی سلسلوں سے گزرتے ہوئے اس نے جنوبی چین کا رخ کیا تھا۔ طول طویل پہاڑوں کے سفر کو طے کرتے ہوئے ان کوہستانی سلسلے کے قریب جا پہنچے جسے کالے آدمیوں کا پہاڑ بھی کہا جاتا تھا یہاں ایک وحشی پہاڑی قوم آباد تھی جو نسلاً چینی تھی اور جس پر اس سے پہلے کسی نے حملہ نہ کیا تھا۔

ان وحشی قبائل نے قبلائی خان اور اس کے لشکریوں سے کوئی مزاحمت نہ کی آخر قبلائی خان اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا جنوبی چین کے صوبے ہونان میں جا داخل ہوا۔

جنوبی چین میں اس وقت سنگ خاندان کی حکومت تھی یہ لوگ شمالی چین پر وحشیوں کے حملے کی وجہ سے جنوب کی طرف چلے آئے تھے اور جن دنوں قبلائی خان ان علاقوں پر حملہ آور ہوا تھا اس وقت ایک نابالغ لڑکا جنوبی چین پر حکمرانی کررہا تھا حکمرانی کے کاموں میں اس کی ماں اور وزیر اس کی مدد کرتے تھے۔

قبلائی خان اپنے لشکر کے ساتھ ہونان کے صوبے میں دور تک گھستا چلا گیا تھا اس نے کافی علاقے فتح کرلئے تھے آخر پہلی بار قبلائی کے لشکریوں کو جنوبی چین کے لشکر کا بری طرح سامنا کرنا پڑا قبلائی کے لشکریوں کو پہلی ہی بار اس جنگ میں ہاتھیوں کا سامنا کرنا پڑا سنگ خاندان کے سپہ سالار ہاتھیوں کو اپنے لشکر کے آگے رکھتے ہوئے آئے تھے جن سے منگولوں کے گھوڑے بدک اٹھے تھے۔

ہاتھیوں کو دیکھتے ہوئے منگولوں نے اپنے لشکریوں کو اور اپنے گھوڑوں کو محفوظ کرنے کے لئے ہاتھیوں پر آتشی تیروں کی بارش شروع کردی تھی جلتے ہوئے تیروں کی آگ جب ہاتھیوں کو زخمی کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں جلانے بھی لگی تب ہاتھی ایک طرح سے پاگل ہوگئے اور اپنے لشکریوں کو روندتے کچلتے بھاگ کھڑے ہوئے اس طرح جنوبی چین کے لشکر کے مقابلے میں قبلائی خان کے لشکر کو فتح نصیب ہوئی تھی۔

قبلائی خان نرم طبیعت کا مالک تھا اور صلح جو بھی تھا ہونان کے صوبے کو فتح کرنے کے بعد اس نے اپنے نئے صوبے کے حالات کو درست کرنے کا حکم دیا تھا۔

اس نے دیکھا کہ گزرے ہوئے برسوں میں زراعت کی حالت بڑی ابتر ہوگئی تھی اس نے شمالی چین سے بھرتی کئے ہوئے اپنے نئے لشکریوں کو اجازت دے دی کہ وہ وہاں جاکر اپنے کھیتوں میں کھیتی باڑی کریں بلکہ انہیں بیج اور اوزار بھی مہیا کئے۔

پھر اس نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے مفتوحہ علاقوں کے اندر ایک نیا شہر آباد کرے جہاں وہ اپنے لشکر کے ساتھ قیام کرکے ان علاقوں میں حکومت کرسکے اس مقصد کے لئے جستجو شروع ہوئی آخر فتح کئے جانے والے علاقوں میں دریا کے کنارے زرخیز زمینوں کے اندر اس نے ایک نیا شہر بسانا شروع کیا اور نئے بسائے جانے والے اس شہر کا نام اس نے خان بالیغ رکھا تھا۔

قبلائی خان نے ہونان کے صوبے کو فتح کرکے وہاں اپنے لئے شہر بسانا شروع کردیا تھا اور صوبے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظم ونسق کو درست کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے وہاں زراعت کو ترقی دینا شروع کردی تھی جبکہ قبلائی کو رخصت کرتے وقت منگو خان نے جو احکامات جاری کئے تھے وہ اس سے مختلف تھے۔

منگو خان نے قبلائی خان کو جنوب کی سنگ سلطنت کے خلاف پیش قدمی کا حکم دیا جو دریائے یانگ تسی کے اس پار غیر مفتوح جنوبی چین میں واقع تھی جسے ان کے باپ تولائی نے فتح کرتے کرتے ادھورا چھوڑ دیا تھا قبلائی خان کو منگو خان نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ میں تمہیں ایک لاکھ کا لشکر مہیا کررہا ہوں اس لشکر کے ساتھ وہ منگولوں کے وطن سے چل کر تبت کی برفانی سطح مرتفع کے کنارے کنارے بڑھتا ہوا ہونان کے صوبے میں جا نکلے اسے فتح کرتے ہوئے وہ شمال کی طرف پیش قدمی کرنا شروع کردے جبکہ ہونان کو فتح کرنے کے بعد قبلائی نے وہاں قیام کرلیا تھا زراعت کو ترقی دینے لگا تھا ساتھ ہی ساتھ وہ چین کے لوگوں کے ساتھ بہترین تعلقات استوار کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔

چینیوں کے ساتھ یہ تعلقات منگولوں کو پسند نہ آئے لہٰذا چنگیز خان کے مسکن قراقرم میں منگو خان کے پاس قبلائی خان کی شکایتیں پہنچنا شروع ہوگئیں اور کہا جانے لگا کہ قبلائی خان چینیوں کی اس قدر ناز برداری کررہا ہے کہ انہیں سر چڑھانا شروع کردیا ہے منگو کو یہ شکایت بھی بھیجی گئی کہ قبلائی نے سنگ سلطنت کے قبائل شمال کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کی بجائے اس کے کہ وہ ہونان کے صوبے کو فتح کرکے وہاں ایک شہر کی تعمیر کے کام میں مصروف ہوگیا ہے جہاں منگو کو قبلائی کے خلاف شکایات مل رہی تھیں وہاں چینی رعایا قبلائی خان سے خوش تھی چینی رعایا جس کی فصلیں قبلائی خان کے آنے سے ہری بھری ہوگئی تھیں اور جنگ کی سختیوں سے ایک حد تک محفوظ ہوکر وہ آرام سے زندگی بسر کرنے لگے تھے وہ درپردہ قبلائی کے نام کی عزت کرتے تھے لیکن قبلائی خان کے یہ حالات سن کر منگو خان کو غصہ آگیا ان حالات میں ایک منگول سردار چند مسلح دستوں کے ساتھ ہونان صوبے میں قبلائی خان کے پاس پہنچا آنے والے اس منگول سردار کا نام علمدار تھا وہ منگول شہنشاہ منگو خان کی طرف سے ایک حکم لے کر آیا تھا منگو خان نے قبلائی خان کو حکم دیا تھا کہ چین میں جس قدر علاقے اب تک تم نے فتح کئے ہیں ان کی حکومت عملدار کے سپرد کرکے تم خود قراقرم منگو کے پاس پہنچ جاؤ۔

☆.....☆.....☆

آنے والے نئے منگول سردار نے نام جس کا عملدار تھا آتے ہی بہت سے چینی سرداروں کو قتل کروادیا جن کی وجہ سے قبلائی خان نے وہاں مستقل قیام کرلیا تھا اور نظم ونسق کے سارے حساب کتاب کی جانچ پڑتال شروع کردی تھی قبلائی خان کو اس کی یہ حرکت بڑی ناگوار گزری اور اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے قبلائی خان نے اپنے سارے سالاروں اور امراء کو اپنے خیمے میں طلب کرلیا وہ چاہتا تھا کہ اپنے بھائی کے حکم کی مزاحمت کرے۔

اس موقع پر منگو خان نے جو ایک چینی بزرگ اس کی رہنمائی کے لئے اس کے ساتھ بھیجا تھا اور جس کا نام یاؤ چاؤ تھا وہ قبلائی خان کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

”تم خاقان کی رعایا میں بلند ترین مرتبہ رکھتے ہو ایسی کوئی بات نہ کرنا کہ دوسروں کو تمہاری ریس کرنے کا موقع ملے تم ایسا کرو پہلے اپنی بیوی بچوں کو منگو خاقان کے پاس روانہ کردو پھر خود اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ تمہارے سارے مال ومتاع اور جان تک کا وہی مالک ہے۔“

دراصل بوڑھا چینی یاؤ چاؤ جس کا پورا نام فریس یاؤ چاؤ تھا وہ جان گیا تھا کہ اگر قبلائی خان نے منگو خان کے خلاف بغاوت کردی تو اس کا نتیجہ چینیوں کے لئے بڑا بھیانک اور ہولناک نکلے گا اس کا خیال تھا کہ اگر قبلائی نے اپنے بھائی کی حکم عدولی کی تو منگو خان ایک لشکر لے کر چینی علاقوں پر چڑھ دوڑے گا اور چینی علاقوں میں تباہی اور بربادی کا ایک نیا کھیل شروع ہوجائے گا لہٰذا اس نے یہ مشورہ دیا تھا اور اس کے اسی

مشورے کی وجہ سے چینی تمدن مزید تباہی سے بچ گیا تھا اس لئے کہ قبلائی خان نے اپنے مشیر فریس یاؤ چاؤ کی بات مان لی اور پہلے اس نے اپنے اہل خانہ کو منگو کے دربار میں روانہ کیا اس کے بعد خود بھی روانہ ہوگیا۔

منگو خان کو کیونکہ لوگوں نے قبلائی خان کے خلاف بھڑکایا ہوا تھا لہٰذا منگو خان کے علاوہ دوسرے منگول سردار بھی یہ امید قائم کئے ہوئے تھے کہ قبلائی خان منگو خان کا حکم پاکر اپنے لشکر سے نکل کر منگو خان کے پاس نہیں آئے گا لیکن قبلائی تن تنہا اپنے بھائی کے سامنے حاضر ہوا تو منگو خان کے سارے شبہے زائل ہوگئے منگو بہت منصف مزاج تھا اور اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے سالاروں اور سرداروں نے اسے بھڑکانے کی کوشش کی ہے اور یہ کہ قبلائی خان سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی بڑے خوش کن انداز میں دونوں بھائی ایک دوسرے سے بغلگیر ہوکر ملے کچھ دن تک دونوں بھائی اکٹھے رہے اس کے بعد منگو خان نے فیصلہ کیا کہ وہ سنگ خاندان پر حملہ آور ہوکر ان کی سلطنت کو نیست ونابود کرنے کے لئے اور وہاں منگولوں کی حکومت قائم کرنے کی خاطر مزید لشکر لے کر خود قبلائی خان کے ساتھ روانہ ہوگا۔

اس موقع پر بہت سے بوڑھے منگول سرداروں اور امراء نے منگو خان کو مشورہ دیا کہ اس کے بہت سے بھائی ہیں بے شمار سالار ہیں انہیں وہ مختلف سلطنتوں کی فتوحات پر مقرر کردے اور خود اپنے مرکزی شہر قراقرم ہی میں قیام کئے رہے لیکن منگو خان نے ان کا فیصلہ ماننے سے انکار کردیا اور اپنے بھائی قبلائی خان کے ساتھ اس نے جنوبی چین کی طرف جانے کا فیصلہ کرلیا۔

روانہ ہونے سے قبل منگو خان نے شہنشاہیت کی مہر اپنے چھوٹے بھائی اریق بوغا کے حوالے کی اسے اپنی آبائی چراگاہوں کا محافظ مقرر کیا ساتھ ہی ڈھول تاشے دفیں بجاتا ہوا اپنے سالاروں کے ساتھ پہلے چنگیز خان کی قبر پر حاضر ہوا تاکہ وہاں پر چم چڑھائے۔ ایسا کرنے کے بعد اس نے اپنے مرکزی شہر قراقرم میں اپنے سارے امراء اور سالاروں کو رخصتی دعوت دی پھر اپنے بھائی قبلائی خان کے ساتھ ایک اور لشکر لے کر جنوبی چین کے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا تھا۔

دونوں بھائی بہت بڑے لشکر اور کافی بڑے خیمہ وخرگاہ کے ساتھ جنوبی چین کے دریائے یانگ تسی کی جانب روانہ ہوئے تھے جو ان کے راستے میں تھا لیکن منگو خان نے جنوبی چین میں کوئی زیادہ مہموں میں حصہ نہیں لیا وہ حالات ہی کا جائزہ لیتا رہا جبکہ اپنے بھائی قبلائی خان پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اس کے لشکر کی طرف روانہ کردیا نئے منگول سالار عملدار کو واپس بلالیا اور قبلائی خان پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے اسے اجازت دے دی تھی کہ اپنے لشکر کے ساتھ وہ جس طرح چاہے جنوبی چین میں حرکت میں آتے ہوئے اپنی فتوحات کا دامن پھیلاتا رہے۔

اس طرح دونوں بھائی علیحدہ اور جدا ہوئے منگو خان نے واپسی کا سفر شروع کیا لیکن اسے اپنے مسکن قراقرم پہنچنا نصیب نہ ہوا راستے میں وہ پیچش کے عارضے میں مبتلا ہوگیا اور مرگیا۔

اس کی لاش کو چنگیز خان کے مسکن میں لایا گیا اور اسے چنگیز خان کے پہلو میں دفن کردیا گیا جہاں کوہستان برفان کا لدون پر صنوبر کے بڑے اور گھنے درختوں کے تلے چنگیز خان کی قبر تھی جس چمکڑے پر لاد کر منگول منگو خان کی لاش اس کو ہستانی سلسلے کے پاس لائے تھے اس چھکڑے کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ساری لکڑی جلادی اس کی موت کی رسومات میں صرف اس کے چھوٹے بھائی اریق بوغا نے شرکت کی اس لئے کہ منگو خان کی موجودگی میں وہی آبائی مسکن کا نگران مقرر کیا گیا تھا قبلائی خان اپنے صوبے ہونان پہنچ چکا تھا جو وہاں سے کافی دور تھا جبکہ دوسرا بھائی ہلاکو خان دور دراز کی مسلمان سرزمینوں میں اپنی فتوحات کا دامن پھیلانے کی کوشش کررہا تھا۔

چنگیز خان کی طرح منگو خان کی موت کی وجہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بھی منگولوں کی جنگی سرگرمی کچھ دنوں کے لئے تھم گئی اس کی موت خلاف توقع بہت جلد واقع ہوگئی تھی جبکہ اس وقت منگولوں کے مختلف لشکر مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

منگو خان کی موت کی وجہ سے منگولوں کے اندر ضعف پیدا ہونا شروع ہوگیا تھا اس لئے منگو خان ان کے درمیان رابطہ قائم کئے ہوئے تھا اور وہ اپنے دادا کی طرح دھن کا پکا تھا اور کہا کرتا تھا کہ خانہ بدوش کی سخت زندگی متمدن دنیا کی آرام طلب زندگی سے زیادہ افضل ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ منگو خان اپنے دادا چنگیز خان سے بھی زیادہ ذہین تھا اور مشیروں کی رائے کے حسن اور خامیوں پر غور کرنے کی اسے زیادہ تمیز تھی اس کی نظر چراہ گاہوں سے پرے پہنچی تھی اور وہ تمدنوں کی عقل فراست سے بھی اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

جس وقت منگو مرگیا اس وقت قبلائی ابھی دریائے یانگ تسی کے کناروں پر تھا کہ منگولوں کے آبائی مسکن قراقرم سے کچھ قاصد قبلائی خان کی خدمت میں آئے اور انہوں نے لشکر کے کچھ حصوں کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن وہ کوئی وجہ نہ بتا سکے کہ لشکر کے یہ حصے کیوں واپس بلائے جارہے ہیں دوسری طرف قبلائی خان بھی بڑا محتاط تھا اس نے اس وقت تک اپنے کسی پرچم بردار دستے کو اپنے آپ سے جدا ہونے کی اجازت نہ دی جب تک وہ خود یہ معلوم نہ کرلے کہ آخر اس کے لشکر میں سے ایک حصہ کیوں واپس آبائی دشت کی طرف منگایا جارہا ہے۔

آخر کچھ اور قاصد قراقرم سے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے یہ اطلاع دی کہ منگو خان بیمار ہے لہٰذا وہ اپنے لشکر کے کچھ دستے اپنے آبائی مسکن کی طرف روانہ کرے۔

قبلائی خان اب شک شبہات میں پڑ گیا تھا نئے آنے والے قاصدوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

میں جھوٹی افواہوں کی طرف دھیان نہیں دیتا

اس کے بعد اسے یہ خبر ملی گئی کہ آبائی مسکن میں اس کا بھائی منگو خان مر چکا ہے لہٰذا اس نے بھائی کی موت کا سوگ منانا شروع کردیا۔

اریق بوغا چونکہ تولائی خان کے باقی تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا سب سے بڑا منگو خان پھر ہلاکو خان پھر قبلائی خان اور پھر اریق بوغا اس کے علاوہ منگو خان نے اسے آبائی مسکن میں نا صرف سلطنت کی مہر اس کے حوالے کی تھی بلکہ چنگیز خان کی لکھی ہوئی مقدس کتاب جسے یاسا کہتے تھے وہ بھی اس کے حوالے حفاظت کی خاطر کی تھی اور یہ کتاب برنجی تختیوں پر لکھی ہوئی تھی جن میں چنگیز خان کے احکامات منقش تھے اب مسکن میں ایک طرح سے چھوٹا بھائی اریق بوغا خاقان بن گیا تھا۔

ایسا ہونا منگولوں کی روایات کے خلاف بھی تھا اس لئے کہ منگولوں میں یہ روایت تھی کہ جب بھی بھی ان کا خاقان مرتا تو سارے رشتہ دار اور اکابر سالار اور امراء ایک مجلس کی صورت میں جمع ہوتے اس مجلس کو وہ قرولتائی کا نام دیتے اور اسی قرولتائی میں نئے خان کا انتخاب ہوا کرتا تھا اب منگو خان کے بعد نہ کوئی مجلس منعقد ہوئی نہ قرولتائی کا اہتمام کیا گیا لہٰذا کچھ سالاروں اور امراء کے مشورے پر اریق بوغا نے اپنے خاقان ہونے کا دعویٰ کردیا تھا۔

منگو کے مرنے کے بعد جب قرولتائی منعقد نہ کی گئی اور اریق بوغا خاقان بن گیا تب منگولوں کی سلطنت آپ سے آپ چار حصوں میں تقسیم ہوگئی اور پہلے جب منگولوں میں ایک خاقان ہوا کرتا تھا تو اب چار خاقان بن گئے تھے اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

چنگیز خان کے بیٹوں میں سے جوچی خان سب سے بڑا تھا خوارزم کے علاوہ دشت قپچاق کو فتح کرنے کے بعد جوچی خان نے وہیں سکونت اختیار کرلی تھی جوچی خان کے ساتھ چنگیز خان کے باقی بیٹوں کو محبت اور انسیت نہ تھی اور وہ باقی بھائیوں سے الگ الگ ہی

رہتا تھا اسی مناسبت سے اس کا ملک بھی الگ اور ایک طرف ہی رہا جوچی خان کی اولاد میں سے جو لوگ ہوئے ان میں سے اکثر ازبک نام سے پکارے گئے جوچی خان چنگیز خان کے سامنے ہی فوت ہوگیا تھا لہٰذا چنگیز خان نے جوچی کا ملک اس کے بیٹے باتو خان کو دے دیا تھا باتو خان کے بعد اس کا چھوٹا بھائی برقائی خان ان علاقوں کا حاکم مقرر ہوا اس نے اسلام قبول کرلیا اس طرح اس نے اپنے ماتحت کام کرنے والے منگولوں کے درمیان اسلام پھیلانے کا کام سرانجام دیا یہی برقائی خان اب ایک خودمختار خاقان تھا۔

دوسرا خودمختار خاقان چنگیز خان کے سب سے چھوٹے بیٹے تولائی خان کا بیٹا ہلاکو خان ثابت ہوا یہ مسلمانوں کے علاقوں پر حملہ آور ہوا تھا اس نے مراغہ شہر کو اپنا مرکز بنالیا تھا اور یہاں ایک طرح سے اس نے اپنی حکومت قائم کرلی تھی اس نے بھی اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا تھا اس لحاظ سے یہ بھی ایک مطلق العنان خاقان تھا اس کے بعد اس کا بیٹا اباقا خان ان علاقوں کا حکمران ہوا اباقا خان کے بعد اس کا بھائی تلودار ان علاقوں کا حاکم مقرر ہوا اس نے اسلام قبول کرلیا تھا اور تاریخ کے اوراق میں یہ احمد تلودار کے نام سے مشہور ہوا اس نے بھی منگولوں کے ادوار اسلام پھیلانا شروع کیا تھا۔

باتو خان اور ہلاکو خان کے بعد منگولوں کی تیسری خودمختار حکومت ترکستان خراسان بلخ غزنی اور دریائے سندھ تک کے علاقے میں قائم ہوئی دراصل چنگیز خان نے اپنے سب سے بڑے بیٹے چغتائی خان کو ان علاقوں کا حاکم مقرر کردیا تھا۔ چغتائی کہتے ہیں بہت متقی اور بہادر انسان تھا اس کی وفات کے بعد ان علاقوں میں اس کی اولاد بھی ایک خودمختار اور مطلق العنان خاندان کی حیثیت سے حکومت کرتی رہی اور ان کا اپنا ایک طرح سے اپنا علیحدہ خاقان ہوا کرتا تھا۔

چوتھا خاقان اب چین میں قبلائی خان تھا جس نے نا صرف چین کے وسیع علاقے فتح کرلئے تھے بلکہ اس نے روایتی منگولوں کے خلاف چینیوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے ہوئے انہیں تلوار کی نوک پر رکھنے کے بجائے ان کے دل جیتنے شروع کردیئے تھے یہ قبلائی خان مسلمانوں سے بھی بڑا متاثر تھا۔ اس بناء پر اس نے اپنی مملکت کے بہت سے صوبوں کے حاکم مسلمان مقرر کئے اس کا وزیر مالیات بھی مسلمان تھا اور جس کا نام احمد تھا اور اس کے لشکر میں کچھ سالار بھی مسلمان تھے اس طرح چین میں قبلائی خان چوتھا خودمختار خاقان تھا جبکہ اس کے بعد اس کا بیٹا تیمور چین میں منگولوں کا خاقان بنا۔

پانچواں خاقان اب چنگیز خان کے مسکن میں تولائی خان کا سب سے چھوٹا بیٹا اور منگو خان ہلاکو خان اور قبلائی خان کا سب سے چھوٹا بھائی اریق بوغا تھا۔ چنگیز خان کے وقت کی مہر اس کے پاس تھی چنگیز خان نے منگولوں کے لئے جو قوانین مرتب کئے تھے اور جو برنجی تختیوں پر منقش تھے وہ بھی اس کے پاس تھے ان دو چیزوں کی ملکیت رکھتے ہوئے وہ ایک طرح سے اپنے آپ کو منگولوں کا اصل خاقان خیال کرتا تھا۔

اس طرح اب منگولوں کی پانچ مملکتیں قائم ہوگئی تھیں۔ ایک برقائی خان کی دوسری اباقا خان کی تیسری چغتائی کے بیٹوں کی چوتھی قبلائی خان کی اور پانچویں اریق بوغا کی۔

ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے چغتائی کی اولاد نے اپنے آبائی مسکن کی خاقانی حاصل کرنے کی کوشش کی ان لوگوں کی حکومت ترکستان خراسان بلخ غزنی اور دریائے سندھ تک کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی لہٰذا یہ خیال کرتے تھے کہ چنگیز خان کے اصل جانشین وہ ہیں انہوں نے کئی بار اریق بوغا پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس سے اپنا آبائی مسکن چھیننا چاہا لیکن انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

دوسری طرف قبلائی خان بھی اپنے آبائی مسکن پر قبضہ کرکے سارے منگولوں کا خاقان بننا چاہتا تھا۔

باتو خان اور اس کا بھائی برقائی خان تو روس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرزمینوں میں دور تھے وہ ایک طرح سے اپنے آبائی وطن کو فراموش کر چکے تھے ہلاکو خان اور اس کی اولاد بھی مسلمانوں کے اندر تھے وہ بھی دور افتادہ علاقوں میں تھے لہٰذا وہ بھی چنگیز خان کے وطن کو بھول بیٹھے تھے اب تین قوتیں ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں چغتائی کی اولاد اور قبلائی خان اور اس کا چھوٹا بھائی اریق بوغا۔

جب چغتائی کی اولاد اپنے دادا چنگیز خان کا مسکن حاصل کرنے میں ناکام ہوئی تب قبلائی خان نے فیصلہ کرلیا کہ وہ سارے منگولوں کا خاقان بنے گا مورخ لکھتے ہیں کہ منگو خان کی موت کے بعد یہی وہ مقام اور لمحہ تھا جہاں منگولوں کے اندر انتشار اور بے اتفاقی کا طوفان اٹھا۔ مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ چنگیز خان کے قانون کے مطابق منگو کے مرنے کے بعد سارے عزیزوں کی مجلس منعقد ہونی چاہئے تھی جس میں چنگیز خان کے خاندان کے سارے اراکین شریک ہوتے لیکن ایسا نہیں ہوا دور مغرب میں روس کی سرزمینوں تک چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوچی کی حکومت تھی جوچی مر چکا تھا جوچی کے بعد اس کا بڑا بیٹا باتو بھی فوت ہو چکا تھا اب وہاں برقائی حکومت کرتا تھا جو مسلمان ہو چکا تھا اور برقائی کے آنے کی کوئی توقع نہ تھی ہلاکو بھی نہ آسکا اس لئے کہ ان دنوں اس کا پالا مصر کے سلطان رکن الدین بیبرس سے پڑا ہوا تھا اور وہ بڑی تیزی سے منگولوں پر حملہ آور ہوتے ہوئے ان کا خاتمہ کرتا چلا جارہا تھا۔

تیسری سمت چنگیز خان کے بیٹے چغتائی خان کی تھی اس وقت ان کی رہنمائی اوغدائی کی نسل سے قائدو کررہا تھا وہ اپنی وسط ایشیا کی چراہ گاہوں میں الگ تھلگ ٹھہرا رہا اور منگو خان کی موت پر وہ اپنی آبائی سرزمینوں کی طرف نہ آیا۔

اس طرح ان قوتوں کے نہ آنے کی وجہ سے خاقان کے لئے جھگڑا اور تصفیہ قبلائی خان اور اریق بوغا کے درمیان رہ گیا تھا۔

اب جن حالات میں قبلائی خان اور اریق بوغا گھرے ہوئے تھے ان کی وجہ سے دونوں میں باہم مخاصمت پیدا ہوگئی تھی اریق بوغا کے اطراف بوڑھے منگول تھے جو سموری خیموں کے اصل باسی تھے جبکہ قبلائی خان کے ساتھ صرف اس کی طاقتور چنگی قوت تھی جس کی کمانداری اس کے چینی عہدے دار کررہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اریق بوغا کی جگہ قبلائی خان دشت کا خاقان بنے۔

اس کے علاوہ منگول اب چنگیز خان کے دور جیسے نہ رہے تھے ان کی پشتوں میں اب تبدیلی پیدا ہوچکی تھی دشت کے رہنے والوں نے اپنے لئے چھوٹے چھوٹے مٹی کے محل بنالئے تھے جہاں وہ وسیع فتوحات کے ثمرات سے لذت اندوز ہورہے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اب تک بھی وحشی کے وحشی تھے لیکن کم از کم زندگی ان کے لئے آرام دہ ہوگئی تھی اور اب وہ دشت کے قحط اور بھوک سے ہی نجات پا چکے تھے اس کے علاوہ اریق بوغا اور قبلائی خان کے خیالات میں بھی بڑا فرق تھا اریق بوغا اپنے آبائی دشت میں تھا وہ قدیم منگولوں کی روایات پر عمل پیرا تھا جبکہ قبلائی کے ساتھ جو منگول تھے انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ وسطی چین میں بسر کیا تھا وہ نظم ونسق میں مصروف تھے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے نفع اور آرام کا سامان کرتے رہیں وہ جنوبی چین کے مرکزی شہر ینگ چنگ کے اندر وہاں کی شان و شوکت کے مزے اٹھا چکے تھے اور ان کے اندر اب قراقرم کی خیمہ گاہوں کی طرف جانے کی کوئی خواہش نہ تھی اس کے علاوہ چینی تمدن سے سابقہ پڑنے کی وجہ سے قبلائی خان اور اس کے ساتھی نرم پڑ گئے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اب بھی فاتح اور آہنی مزاج سمجھتے تھے وہ چین میں فتوحات بھی حاصل کررہے تھے اور ان فتوحات کے نتیجے میں جو مال غنیمت اب تک ان کے حصے میں آرہا تھا وہ اپنے آبائی دشت میں منگو کی طرف بھی روانہ کرتے رہے تھے لیکن منگو کے بعد انہوں نے یہ کہنا شروع کردیا تھا۔

کیا وہ چنگیز خان کے احکامات کی تعمیل نہیں

کرتے رہے تھے اور گوبی کے باشندے تو مانگے کی فتح کی لوٹ سے موٹے ہوتے جارہے تھے۔

بہرحال اپنے بھائی منگو کے مرنے کے بعد اریق بوغا جو اپنے آبائی مسکن میں تھا اس نے چاروں طرف اپنے عزیز و اقارب رشتہ داروں اور امراء اور سالاروں کو منگو خان کے مرنے کی اطلاع کردی تھی اور انہیں اپنے آبائی مسکن کی طرف آنے کی دعوت بھی دی تھی انہیں ایک طرح سے اریق بوغا نے منگو خان کی قبر پر حاضر ہونے کے لئے طلب کیا تھا اس موقع پر چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوچی کا بیٹا برقائی خان تو نہ آیا ہلاکو بھی نہ گیا چغتائی کی نسل سے قاعدو بھی نہ گیا۔ لیکن ان کے علاوہ اور بہت سے سردار جوادھر ادھر آباد ہوگئے تھے وہ اپنے آبائی مسکن کی طرف گئے جب یہ سب لوگ وہاں جمع ہوئے تو ان میں سے اکثر نے اریق بوغا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی آبائی سلطنت ہرگز قبلائی خان کے حوالے نہ کرے اس لئے کہ وہ مرتد ہے وہ دشت خورد نہیں رہا۔

ابھی یہ قدیم منگول اریق بوغا کو یہی مشورہ دے رہے تھے کہ اریق بوغا کی خوش قسمتی کہ برقائی کے علاوہ وسط ایشیا سے اوغدائی خان کی نسل سے قاعدو کے قاصد آئے اور انہوں نے بھی قبلائی خان کے مقابلے میں اریق بوغا کے خاقان بنائے جانے کی حمایت کردی۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوگئی منگول خان کے مرنے کے بعد منگو خان کے تین بیٹے تھے ان تینوں بیٹوں نے بھی اریق بوغا کے حق میں حلف وفاداری اٹھایا اس کے علاوہ چنگیز خان کے بیٹے اوغدائی کی نسل کے بہت سے لوگ جنہیں ہلاکو قبلائی اور اریق بوغا کے باپ تولائی خان سے ایک طرح سے نفرت تھی وہ بھی اپنی اپنی چراہ گاہوں اور اپنے اپنے مسکنوں سے سفر کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے قبلائی خان کے مقابلے میں اریق بوغا کی حمایت کا اعلان کردیا۔

قبلائی خان کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو اس وقت وہ جنوبی چین کی سرزمین میں قیام کئے ہوئے تھا اس نے ہچکچائے بغیر ایک بہت بڑا قدم اٹھایا جو یقیناً منگولوں کی روایات کے خلاف تھا اس نے دریائے یانگ تسی کے اس پار جنوبی چین کے سنگ خاندان سے صلح کرلی ساتھ ہی جو اس نے نیا شہر آباد کرنا شروع کیا تھا وہاں اس نے ایک مجلس اپنے سارے سالاروں اور امراء کی طلب کی اور ان کے سامنے اس نے منگولوں کا خاقان ہونے کا اعلان کردیا۔

اریق بوغا کا بحیثیت خاقان انتخاب اس کے آبائی وطن میں ہو چکا تھا جبکہ قبلائی خان کا انتخاب چین کے ایک شہر میں ہوا تھا مورخین لکھتے ہیں کہ قبلائی خان کا یہ انتخاب ایک طرح سے چنگیز خان کے قانون کی صریح خلاف ورزی تھی اس لئے کہ چنگیز خان کا حکم تھا کہ جب کوئی نیا خاقان مقرر ہوگا تو اس کے لئے مجلس آبائی دشت میں ہوا کرے گی جب قبلائی خان کی اس حرکت کی اطلاع منگولوں کے وطن میں پہنچی تو اریق بوغا اور اس کے حامیوں نے دریائے کیرولین کے کنارے ایک باقاعدہ قرولتائی منعقد کی جسے مجلس کہتے تھے اور وہاں سب نئے اور پرانے منگول سرداروں نے جمع ہوکر اریق بوغا کو اس کے بھائی منگو خان کا جانشین اور خاقان منتخب کرلیا۔

دھرے انتخاب کی خبریں منگولوں کے اندر مغرب اور جنوب مغرب کی طرف پہنچیں دشت روس میں برقائی خان جو مسلمان ہو چکا تھا اور اس کے اردگرد سمرقند اور بخارا کے مسلمان جمع ہو چکے تھے وہ اپنی جگہ مطمئن تھا اسے یقین ہوگیا تھا کہ منگولیا میں خانہ جنگی ہوئی تو آنے والے دور میں کوئی خاقان بھی اس پر گرفت نہیں کرسکے گا لہٰذا اس نے ایک طرح سے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا تھا اسے کیونکہ ہلاکو سے متعلق بھی خبریں پہنچ رہی تھیں کہ ہلاکو مسلمانوں کے علاقوں پر حملہ آور ہوکر تباہی و بربادی کا کھیل کھیل رہا ہے لہٰذا اس نے خاقان کے لئے لڑی جانے والی خانہ جنگی کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک اور کام کی طرف توجہ دی اپنے لشکر کو اس نے جمع کیا اور اس نے ہلاکو خان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلاف جنگ کی ابتداء کرتے ہوئے اس پر حملہ آور ہونا شروع کردیا تھا اس طرح برقائی خان ہلاکو خان سے مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا انتقام لینے پر تل گیا تھا۔

خاقان ہونے کا اعلان کرنے کے بعد قبلائی خان نے جنگ کی پہل کرتے ہوئے جنوبی چین سے نکل کر اپنے آبائی دشت کا رخ کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جنوبی چین سے نکل کر قبلائی خان اپنے لشکر کے ساتھ اپنے آبائی مسکن کی طرف روانہ ہوا تاکہ اپنے چھوٹے بھائی اریق بوغا پر حملہ آور ہو کر اس سے آبائی دشت کی حکومت چھین لے تو اس موقع پر مورخین دو طرح کا اظہار کرتے ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ اریق بوغا نے قبلائی خان کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے سرکشی اختیار کی تھی دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے چونکہ اریق بوغا کو پرانے اور قدیم منگولوں نے دشت کے اندر خاقان مقرر کرلیا تھا اور قبلائی خان اس پر حملہ آور ہونے کے لئے آرہا تھا لہٰذا ان مورخین کا گروہ کہتا ہے کہ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرح سے قبلائی خان نے اریق بوغا کے خلاف بغاوت اور سرکشی کی تھی۔

بہرحال قبلائی خان اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا پہلے اس نے شین سی کے علاقے میں ان منگول دستوں پر حملہ کیا جو عموماً منگو خان کے تحت جنگ کیا کرتے تھے ان دستوں کو کاٹنے اور انہیں مار بھگانے کے بعد قبلائی خان نے پھر پیش قدمی شروع کی اب وہ اپنے آبائی دشت قراقرم کے جنوب میں جا پہنچا دوسری طرف اس کے چھوٹے بھائی اریق بوغا نے اپنے آبائی وطن میں جو فوج جمع کی تھی اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ قبلائی خان کا مقابلہ کرسکتی تاہم اریق بوغا نے حملہ آور قبلائی خان کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

دونوں بھائیوں کے لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے اریق بوغا کی بدقسمتی کہ اسے شکست ہوئی اور وہ ختا کے علاقے کی طرف بھاگ گیا۔

ختا کے علاقے میں کراقت ترک آباد تھے اریق بوغا ان ہی کی طرف گیا اس لئے کہ کراقت ترک اریق بوغا قبلائی خان منگو خان اور ہلاکو خان کے رشتہ دار تھے چاروں کی ماں کا تعلق ترکوں کے اسی کراقت قبیلے سے تھا اور وہ ایک سردار کی بیٹی تھی۔

اپنی ماں کے قبائل میں پہنچ کر اس نے پھر لشکر جمع کیا یہ لشکر جمع کرنے کے بعد اریق بوغا کو ایک بار پھر امید ہوئی کہ شاید وہ اپنے بھائی قبلائی خان کو شکست دے کر اپنا خاندانی مسکن حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے لہٰذا لشکر لے کر اپنے آبائی مسکن کی طرف گیا دونوں بھائیوں میں ایک بار پھر ٹکراؤ ہوا۔

قبلائی خان کی خوش قسمتی کہ اسے فتح نصیب ہوئی اریق بوغا کی بدقسمتی کہ اسے دوسری بار شکست کا سامنا کرنا پڑا اس بار شکست اٹھا کر اریق بوغا کاشغر کی طرف بھاگ گیا۔

وہاں بھی منگول قبائل آباد تھے کچھ عرصہ قیام کرکے اس نے پھر ایک لشکر تیار کیا اسے لے کر پھر اپنے بھائی قبلائی خان پر چڑھ دوڑا دونوں بھائیوں میں تیسری جنگ ہوئی لیکن اس بار بھی قسمت نے اریق بوغا کا ساتھ نہ دیا اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

تیسری بار شکست اٹھانے کے بعد جب اریق بوغا نے بھاگنا چاہا تو وہ صحرائے گوبی کے کنارے اپنے کچھ سالاروں سمیت گرفتار کرلیا گیا۔ اریق بوغا کو گرفتار کرکے قبلائی خان کے خیمے کی طرف لایا گیا جن لوگوں نے اسے گرفتار کیا تھا ان کے کہنے پر اریق بوغا کو قبلائی خان کے خیمے کی چوکھٹ پر دوزانوں ہونا پڑا پردے کی چک اس موقع پر اس کے سر پر آگری تھی پھر منگول سرداروں نے اسے قبلائی خان کے سامنے کھڑا کردیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس موقع پر قبلائی خان بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے چھوٹے بھائی اریق بوغا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا اب بتا میرے بھائی کون غلطی پر تھا میں یا تم۔

کہتے ہیں اریق بوغا نے بڑی جرأت مندی کا

اظہار کیا اور قبلائی خان کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"شروع میں آپ کی غلطی تھی اب میری غلطی ہے۔"

قبلائی خان نے اریق بوغا کی جان بخشی کردی اسے آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی شکست کھانے کے بعد اریق بوغا خطرناک نہ رہا تھا لیکن اریق بوغا کے ساتھ جو اس کے بہترین سالار اور مشیر گرفتار ہوئے تھے انہیں قبلائی خان نے قتل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس موقع پر اریق بوغا نے اپنے ان ساٹھ سالاروں کی جان بخشی کے لئے قبلائی خان سے التجا کی لیکن قبلائی خان نے معاف کرنے سے انکار کردیا اس موقع پر مورخین لکھتے ہیں کہ قبلائی خان ان ساٹھ سرداروں کو منگول قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر سزا دینا چاہتا تھا لیکن قبلائی خان اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا تھا اس لئے کہ اس نے خود بھی منگول قانون کی خلاف ورزی کی تھی جتنی ان ساٹھ سالاروں نے جن کو وہ خطاکار قرار دے رہا تھا اس لئے کہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھا اور ان پر غالب آچکا تھا۔ لہٰذا ان کا خاتمہ چاہتا تھا۔

جب ان ساٹھ منگول سالاروں کا مسئلہ قبلائی خان کے سامنے پیش کیا گیا تب ان ساٹھ میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

ساتھیوں ہم نے اریق بوغا کو تخت پر بٹھایا تھا تو عہد کیا تھا کہ وقت پڑا تو ہم اس کے لئے اپنی جانیں قربان کردیں گے اب جانیں قربان کرنے کا وقت آگیا ہے۔

قبلائی خان کے حکم پر ان ساٹھ منگول سالاروں کو زدوکوب کرکے مار ڈالا گیا اور کچھ کے گلے گھونٹ دیئے گئے اس طرح قبلائی خان نے اپنے خاقان ہونے کا لوہا منوالیا۔ قبلائی خان دشت کا مالک تو بن گیا تھا لیکن اپنے لشکر کے افسروں اور چینیوں کے علاوہ وہ چنگیز خان کے خاندان میں کسی اور کو اپنے لئے قابل اعتماد خیال نہ کرتا تھا دشت کے بہت سے سالاروں اور قدیم منگولوں نے آگے آکر سر جھکایا اس موقع پر ارض شام سے ہلاکو نے پیغام بھجوایا کہ وہ قبلائی خان کو خاقان تسلیم کرتا ہے وقتی طور پر برقائی خان نے بھی قبلائی خان کو خاقان بننے پر مبارکباد بھیج دی تھی تحفے روانہ کردیئے تھے۔

قبلائی خان جو بوڑھے منگولوں کے مقابل کہیں زیادہ فرزانہ تھا سمجھ گیا تھا کہ جس مقصد کے لئے چنگیز خان نے دشت کا شہر بسایا تھا وہ اب پرانا ہوچکا ہے یہ شہر محض چنگیز خان کے منگولوں کو اکٹھا ہونے کا مرکز قرار دیا گیا تھا بلند چراہ گاہوں کے درمیان یہ مٹی کی فصیل دشت خوردوں کا گودام تھی جس میں دنیا بھر کا مال غنیمت جمع ہوچکا تھا اب چنگیز خان کے خاندان میں پھوٹ پڑچکی تھی بحیثیت خاقان قبلائی خان کی آمدنی کا سارا دارومدار چین کے محاصل پر تھا اور چین کے تمدن میں رہتے ہوئے اس میں کافی تبدیلی آچکی تھی اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ اس کا اصل مسکن چین ہے اور اپنے آبائی وطن میں بیٹھ کر وہ چین کا نظم ونسق نہیں چلاسکتا اس لئے اس نے اپنا پایہ تخت اپنے آبائی مسکن سے دیوار چین سے اس پار جنوبی چین کے شہر ینگ کنگ میں منتقل کردینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

آخر اپنے آبائی دشت کو مضبوط ہاتھوں میں دینے کے بعد قبلائی خان اپنے لشکر کے ساتھ چین کی طرف چلا گیا تھا چنگیز خان کا تخت وتاج اور مہر اور چنگیز خان کے بنائے ہوئے قوانین وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اب ایک طرح سے منگولوں کا مرکزی شہر ہی تبدیل ہوگیا تھا اس تبدیلی کی وجہ سے منگولوں اور اس کے وطن کے درمیان جو رشتہ تھا وہ ٹوٹ گیا تھا اس کے بعد وہ روحانی طور پر بھی خانہ بدوش نہ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

اپنے بھائی اریق بوغا کو شکست دینے کے بعد قبلائی خان اپنے آبائی دشت کا خاقان تو بن گیا تھا ہلاکو خان کے بیٹے اباقا خان اور چنگیز خان کے دوسرے پوتے برقائی خان جو مسلمان ہوچکا تھا اس منصب پر قبلائی خان کو مبارکباد بھی دے دی تھی یہ اس بات کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نشاندہی تھی کہ وہ سب منگو خان کی طرح اب قبلائی خان کو اپنا خاقان خیال کرتے ہیں لیکن ایک قوت ایسی ابھر کر سامنے آئی جس نے قبلائی خان کو نا صرف خاقان ماننے سے انکار کردیا بلکہ اس نے قبلائی خان سے ٹکرانے کا عزم کرلیا تھا۔

جس شخص نے قبلائی خان سے ٹکرانے کا عزم کیا وہ اس کا ایک طرح سے بھتیجا تھا نام اس کا قاعدو تھا دراصل چنگیز خان کے بیٹے اوغدائی خان کے بعد اس کے خاندان کا قتل عام ہوا اور اس کو آبائی دشت سے نکال دیا گیا تھا جن کو دشت سے نکالا گیا تھا وہ چنگیز خان کے دوسرے بیٹے چغتائی کی اولاد سے جا ملے تھے جو مسلمانوں کی متمدن دنیا میں دور اور الگ تھلگ آبائی طرز کی زندگی بسر کررہے تھے اوغدائی اور چغتائی نسل کے ان منگولوں کو اپنی سرداری کے لئے یہی قاعدو مل گیا جس نے یورپ پر منگولوں کے حملے کے دوران کارہائے نمایاں سرانجام دیئے تھے اس کے ساتھ قاعدو بھی جنگ کا ایسا ماہر تھا جیسا اس کا چچا قبلائی خان اس کے علاوہ تولائی کے خاندان سے اس قاعدو کا خون کا بھی جھگڑا تھا پرانے اور بوڑھے منگول اس قاعدو کی قدر اور عزت بھی کرتے تھے اس لئے کہ وہ شکل وصورت میں چنگیز خان سے ملتا جلتا تھا اس کے علاوہ وہ سخت کوش اور سخت جان تھا دشت کے باسیوں کو لڑائی میں لے جانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا تھا جب قبلائی خان نے اسے پیغام بھیجا کہ ہلاکو خان کے بیٹے ابا قاخان اور برقائی خان نے مجھے خاقان بننے پر مبارکباد دی ہے اور مجھے خاقان سمجھا ہے تو تر کیوں میری خدمت میں حاضر نہیں ہوئے اور کیوں مجھے خاقان بننے پر مبارکباد نہیں دی۔

قبلائی خان کے اس پیغام کے جواب میں قاعدو نے روکھا سوکھا جواب دیا اس نے کہلا بھیجا۔

"میرے گھوڑے بیمار ہیں۔"

قاعدو کا یہ جواب سن کر قبلائی خاموش کیوں تھا لیکن قبلائی خان کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ قاعدو بہت جلد طاقت اور قوت پکڑ کر اس کے مقابل آجائے گا شروع شروع میں قاعدو کے ساتھ تھوڑے ہی لوگ تھے مگر وہ بڑا چالاک اور بڑا چلتا پرزہ تھا اس نے آہستہ آہستہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے منگولوں کو اپنے پاس اکٹھا کرنا شروع کردیا اور ایک لشکر تیار کرلیا۔

اب قاعدو کے پاس وہ سارے علاقے تھے جو چنگیز خان کے بیٹے اوغدائی اور چغتائی دونوں کے حصے میں آئے تھے اور وہ اب التائی کے درختوں سے ڈھکے ہوئے کوہساروں سے افغانستان کے پہاڑوں تک ہر جگہ اپنے لشکر کے ساتھ منڈلاتا پھرتا تھا ان علاقوں میں جو بڑے بڑے شہر تھے ان سے اس نے خراج وصول کیا جگہ جگہ اس نے اپنے حاکم مقرر کرلئے۔

قبلائی اس وقت تک اپنے لشکر کے ساتھ چین جاچکا تھا قاعدو نے اس دوران طاقت اور قوت پکڑلی جب اس نے دیکھا کہ اس کے لشکر کی تعداد بھی کافی ہوگئی ہے اس کے پاس گھوڑے بھی بے شمار ہیں تب اس نے منگولوں کے طریقے کے مطابق قبلائی خان کے خلاف جنگوں کا سلسلہ شروع کردیا تھا وہ اچانک اپنے لشکر کے ساتھ نمودار ہوتا چھاپہ مارتا ہوا ایک سرے سے دوسرے سرے تک نکل جاتا اور قبلائی خان اس کے ان حملوں سے تنگ آکر مجبوراً اسے مدافعت کا پہلو اختیار کرنا پڑتا اب قاعدو کے مقابلے میں قبلائی خان کی حالت ایسی تھی جیسے چینی شہنشاہوں کی حالت حملہ آور خانہ بدوشوں کی وجہ سے مدافعانہ ہوئی تھی۔

قبلائی خان چونکہ خاقان تھا لہٰذا چین کی سرزمینوں کے ساتھ ساتھ اسے اب صحرائے گوبی اور آبائی وطن کی حفاظت بھی کرنا پڑتی تھی اور اس آبائی وطن پر گاہے بگاہے قاعدو حملہ آور ہوتا رہتا تھا قاعدو کے حملوں سے بچنے کے لئے قبلائی خان نے اپنے علاقوں اور قاعدو کے علاقوں کے درمیان جو سرحد تھی وہاں تیز رفتار سواروں کے پرے کے پرے پھیلا دیئے تھے۔

لیکن یہ لشکر قاعدو کا کچھ نہ بگاڑ سکے گوبی کے کنارے کنارے اور شمالی چراگاہوں کے درمیانی علاقوں میں جب قاعدو کے حملوں سے یہ پرے ٹوٹ

جاتے تو قاعدو قبلائی خان کے ان دستوں کو پسپا کرتا ہوا آبائی مسکن پر حملہ آور ہوتا اور وہاں سے اپنے لئے فوائد حاصل کرنے کے بعد لوٹ جاتا۔

اب قبلائی خان کے لئے مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی تھی نا تو وہ ان باغیوں کا تعاقب کرتے ہوئے گوبی کے ریگزاروں کے پرے تک جاسکتا تھا اس لئے کہ ایسی صورت میں چین میں اس کے لئے حالات مخدوش ہوسکتے تھے اس کے علاوہ قاعدو اپنی جگہ کارروائیاں کوہستانی سلسلے کے اندر کرتا تھا جہاں اس کا تعاقب کرنا اس پر حملہ آور ہونا مشکل ہوتا تھا جبکہ وہ خود اچانک نمودار ہوکر قبلائی کے لشکریوں کو موت کے گھاٹ اتارتا اور اپنے لئے فوائد حاصل کرتے ہوئے کوہستانی سلسلے میں روپوش ہوجاتا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ قبلائی کی طرح قاعدو کو وہ ہنر آتا تھا کہ لوگ اس سے وفاداری کا دم بھریں اس کے حامی بڑے بڑے قبیلوں کے نام لیوا تھے اور اب آہستہ آہستہ اسی قاعدو کے ہمنوا اور سالار مسلمان بھی ہوتے جارہے تھے۔ مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کے علاوہ قاعدو کی بیٹی جو قاعدو سے بے پناہ محبت کرتی تھی وہ بھی جنگوں میں قبلائی خان کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی اور اس نے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا اپنے باپ کی طرح وہ بھی زیادہ وقت شہ سواری میں گزارتی کہتے ہیں وہ جنگ کی ایسی ماہر تھی کہ قاعدو کے خانہ بدوش سپاہی اس کی بہادری اور جرأت مندی کا لوہا مانتے تھے۔

مارکو پولو جیسا شخص جو ہمت کرکے قاعدو کے علاقوں سے گزرتا تھا قاعدو کی لڑکی کے متعلق لکھتا ہے۔

اس کا نام آئی یاروق تھا جس کے معنی ہیں ماہ تاباں یہ لڑکی بڑی خوبصورت تھی اور داؤ گھات میں بڑی ہوشیار تھی ہمیشہ اپنے باپ کے ہم رکاب میدان جنگ کو جاتی تھی وہ بھی اسے بخوشی اپنے ساتھ رکھتا تھا کبھی کبھی وہ اپنے باپ سے ہٹ کر دشمن پر اس طرح جھپٹتی جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

یہ مارکو پولو کے الفاظ تھے مشہور مورخ رشید الدین اس لڑکی کے متعلق لکھتا ہے۔

وہ لڑکی نوجوانوں کے بھیس میں لشکر کے ساتھ ساتھ جاتی اس کا باپ اس کی بڑی عزت کرتا تھا حالانکہ اس کے بھائی اس کی شکایت کرتے اور کہتے تمہارا کام گھر میں سینا پرونا ہے لشکر میں تمہارا کیا کام ہے اور وہ یہ الفاظ سن کر خفا ہوتی تھی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ماہ تاباں اپنے باپ قاعدو کے معاملات کو اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی۔

بہرحال ایسی قاعدو اور قبلائی خان کے درمیان نہ ختم ہونے والی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔

قبلائی خان اور قاعدو کے درمیان ان جنگوں کی وجہ سے وہ شاہراہ مخدوش اور بند ہوگئی تھی جس کے ذریعے مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت ہوتی تھی اور جسے شاہراہ ریشم کہہ کر پکارا جاتا تھا یہ شاہراہ چین کے علاقے تون ہوانگ سے شروع ہوتی تھی جہاں چین کی زرخیز زمین ختم ہوتی تھی قافلوں کے لئے یہ راستہ جو صحرائے گوبی سے ہوکر گزرتا تھا آپ سے آپ بن گیا تھا اس کے اطراف میں املی کے آسیب نما درخت خود بخود اگ آئے تھے مختلف درختوں سے ہوتا ہوا طوفانی ہواؤں سے گزرتا یہ راستہ خشک مٹی سے بھی گزرتا جہاں پانی کا کہیں نام ونشان نہ ہوتا اور زیرزمین پانی حاصل کرنا پڑتا تھا۔

اس راستے کو اونٹوں کی قطاروں نے اپنے نقش قدم سے بنادیا تھا اور کسی نے اسے خود نہیں بنایا تھا باربرداری کے اونٹ جن کی مہار اگلے سوار کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو گرد وخاک میں راستہ ڈھونڈتے کہ ریگستان کے اس پار مغربی پہاڑیوں میں کہیں سبزے کا نشان نظر آجائے یہ راستہ طوفانوں کے خیابانوں سے ہوکر گزرتا کاشغر کی پہاڑیوں کے سلسلے سے ہوتا ہوا ان باغوں کے پاس سے گزرتا جنہیں خاک سے محفوظ کرنے کے لئے ان کے اطراف میں بلند دیواریں کھڑی کردی گئی تھیں۔

پھر یہی راستہ جسے شاہراہ ریشم کہتے تھے چکر کاٹتا ہوا برفانی پہاڑی سلسلوں سے ہوتا ہوا آگے بڑھتا یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک کہ مغرب کی طرف آتے ہوئے یہ مرو شہر کے گنبدوں سے ہوتا ہوا گزرتا جہاں جنگلی پرندے اپنی پیاس بجھانے کے لئے دریائے آمد کے پاس آتے پھر گھاس میں سے ہوتا ہوا یہ راستہ ایران کے خشک میدانوں تک پہنچتا جہاں اونٹ سیدھے مغرب کی طرف قدم دھرتے چلے جاتے اور افق پر پہاڑوں کی نیلی قطاریں نظر آتی تھیں جو ناقریب آتی تھیں نہ نظروں سے اوجھل ہوتی تھیں اس راستے میں جگہ جگہ کیونکہ پانی کے نالے تھے لہٰذا اونٹوں کی قطاریں نالوں کے پانی کو اچھالتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی تھیں۔

یہی ریشم کی شاہراہ تھی یہ ریشم کی تجارت کی قدیم شاہراہ تھی اس راستے سے مشرق کا ریشم راستہ کبرائی اور دوسرے ممالک کی طرف جاتا تھا پھر سب سے پہلے چین کا یہ ریشم قدیم کنعانی قوم کے شہر میدون جاتا تھا جہاں کنعانی اس ریشم کو فرفری رنگ میں رنگتے اور پھر یہی ریشم جس کے ساتھ ہاتھی دانت بھی آتا تھا یورپ کے ملکوں کے علاوہ پالمیرہ کے تاجروں کے ہاتھ فروخت ہوتا تھا۔

شاہراہ ریشم کا ایک ذیلی راستہ برفانی دروں سے ہوتا ہوا بائیں جانب گھوم کر کشمیر کی سرد اور برف لگی وادیوں میں داخل ہوتا تھا یہ شاہراہ لشکریوں کے نقل و حرکت کے لئے دشوار گزار سمجھی جاتی تھی لیکن تجارت اور زیارت کے لئے بڑی اچھی گزرگاہ بن گئی تھی اسی شاہراہ ریشم کے ذریعے سے ہی بدھ مت کے نارنجی مجسمے مختلف علاقوں کی طرف گئے چین کے عقیدت مند اسی راستے سے کشمیر پہنچے تاکہ اور آگے ہندوستان میں مہاتما بدھ کے وطن اور اقامت گاہوں کی زیارت کو آئیں قاعدو کا علاقہ چونکہ کاروانوں کی اس شاہراہ کے درمیان واقع تھا اس لئے مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا پرانا ریشم والا راستہ خاص طور پر ان دونوں کے ٹکرانے کی وجہ سے خطرناک بنتا جارہا تھا اور چونکہ منگولوں کا رابطہ برقائی خان اور ہلاکو خان کے بیٹے ابا قاخان سے اس شاہراہ ریشم کے ذریعے ہوتا تھا لہٰذا قبلائی خان کا واسطہ اور تعلق قاعدو کے حملوں کی وجہ سے اپنے بھائی ہلاکو خان کے بیٹے ابا قاخان اور اپنے چچازاد بھائی برقائی خان سے قریب قریب منقطع ہوگیا تھا اس شاہراہ کے منقطع ہوجانے کی وجہ سے جہاں ابا قاخان کو منگولوں کے نئے خاقان قبلائی خان کی کوئی پرواہ نہ رہی تھی وہاں ایک خاقان کی حیثیت سے برقائی خان نے بھی اپنی آزاد سلطنت قائم کرلی تھی۔

☆.....☆.....☆

قبلائی خان نے قاعدو اور اس کے لشکریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے لشکر کا ایک حصہ مختص کردیا تھا جو گاہے بگاہے قاعدو سے ٹکراتے ہوئے آبائی دشت کی حفاظت کرتا رہتا تھا جبکہ قبلائی خان نے خود اپنے لشکر کے دیگر حصوں کے ساتھ جنوبی چین کے حکمرانوں کے سب سے بڑے اور ایک طرح سے مرکزی شہر لنگان کا رخ کیا تھا۔

جنوبی چین پر ابھی تک چین کے قدیم سنگ خاندان کی حکومت تھی شمالی چین میں جب ان کی حکومت ہوا کرتی تھی تب کئی مرتبہ وحشی قومیں مختلف سمتوں سے نکل کر ان پر حملہ آور ہوتی رہی تھیں لیکن جنوبی چین پر ابھی تک کسی نے حملہ نہ کیا تھا اس خطے نے اپنے آپ کو ہجرت اور عالمگیر جنگوں سے محفوظ رکھا تھا۔

اس بناء پر چین کے ان جنوبی حصوں میں ایک طرح سے جمود طاری تھا اور لوگ جنگوں کو فراموش کرچکے تھے جنوبی چین میں لوگ سنگ کے اٹھارہ شاہی خاندانوں کو دیکھ چکے تھے ان سرزمینوں میں سنگ خاندان کا معاشرہ لگ بھگ تین صدیوں پر محیط تھا اور اب اس سارے معاشرے کا مرکز لنگان شہر ہی تھا۔

باقی دنیا سے اتنے عرصے تک الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے سنگ کے لوگ ایک طرح سے کمزور اور ناتواں ہوکر رہ گئے تھے کیونکہ کسی بیرونی قوت نے ان پر حملہ نہیں کیا تھا لہٰذا سنگ حکمرانوں نے جنوبی چین میں ایک ایسی پرامن معیشت کی تکمیل کی تھی جس کی بدولت ملک کی زراعت سے شہری زندگی کے عظیم مرکزوں کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں ساتھ ہی شہروں کی تجارت کی

وجہ سے کھیتوں کے مزارعین کو بڑی مدد ملتی تھی اس کے باوجود مورخین لکھتے ہیں کہ اس دور میں رائج نظام معیشت کی وجہ سے امیر بہت امیر ہوگئے تھے اور مفلس بے حد مفلس ہوچکے تھے۔

لنگان شہر جس پر حملہ آور ہونے کے لئے قبلائی خان اپنے لشکر کے ساتھ کوچ کررہا تھا یہ شہر سنگ خاندان کی قوت کا مرکز خیال کیا جاتا تھا یہ فصیل بند شہر تھا کہتے ہیں اس دور میں بھی اس شہر کے اندر چھ لاکھ خاندان آباد تھے اس کے علاوہ شہر کے بارہ صدر بازار تھے۔

مورخین کا کہنا ہے کہ شہر کے اندر چونسٹھ عام میدان اور سات سو مندر تھے جن کی دیواریں قلعوں کی دیواروں کی طرح مضبوط تھیں اس کے درمیان جو دریا بہتا تھا اس سے نہریں نکالی گئی تھیں جس پر لگ بھگ تین سو ساٹھ پل تھے ان میں سے بعض پل پتھر کے تھے اور اتنے اونچے تھے کہ سمندر کی طرف سے آنے والی بڑی بڑی کشتیاں بھی ان کے نیچے سے گزر سکتی تھیں۔

سنگ خاندان کے اس شہر مضبوطی اس کی معیشت اور اس کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ اس کی شاہراہوں پر اینٹوں یا پتھروں کا فرش ہوا کرتا تھا اور ان کا پانی نہروں میں جاگرتا تھا ہر سڑک پر مینار نما عمارتیں تعمیر کی جاتی تھیں جن میں آگ نہیں لگ سکتی تھی اور ان میں آنے والے وقتوں کے لئے غلہ محفوظ کردیا جاتا تھا ہر گھر کے دروازے پر گھر کے مکینوں کی فہرست چسپاں ہوتی تھی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جنوبی چین کے لوگوں نے لنگان شہر کی تعمیر ہی زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے کی تھی شہر کے بیچ میں ایک بہت بڑا باغ تھا اس کی جھیل کے اطراف شاہی محل اور بے شمار مندر تھے جھیل کے اندر ڈونگوں اور آرام دہ کشتیوں کے ذریعے آمدورفت ہوتی تھی۔

بہرحال قبلائی خان بڑی برق رفتاری کے ساتھ اپنے لشکر کے ساتھ لنگان شہر کی طرف بڑھ رہا تھا قبلائی خان نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ جنوبی چین کے اس عظیم شہر کو بغیر خون ریزی کے فتح کرے گا اس نے اپنے سارے بڑے بڑے سالاروں کو بھی سمجھالیا تھا کہ اس شہر پر حملہ آور ہوتے ہوئے خون ریزی نہیں کی جائے گی کسی کو ناجائز قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔

قبلائی خان لنگان شہر کے ہر فرد سے اچھا سلوک کرنا چاہتا تھا صرف وہ جنوبی چین کے وزیر کو سبق سکھانا چاہتا تھا اس لئے کہ جس وقت چین سے نکل کر قبلائی خان اپنے لشکر کے ساتھ اپنے آبائی دشت کی طرف گیا تھا تاکہ اپنے چھوٹے بھائی سے برسرپیکار ہو تو اس کی غیر موجودگی میں جنوبی چین کے حکمران طبقے کے وزیر نے قبلائی خان کے مفادات کو سخت نقصان پہنچایا تھا اور بہت سے منگولوں کو اس نے موت کے گھاٹ بھی اتارا تھا اس بناء پر قبلائی خان اور اس کے سالار سنگ حکمرانوں کے اس وزیر سے سخت نالاں تھے۔

سنگ خاندان کی بدقسمتی کہ اس وقت ان کا حکمران ایک سات سالہ نابالغ لڑکا تھا اس کی ماں یعنی ملکہ کمزور اور ایک نازک خاتون تھی جبکہ وزیر شرارتی اور سازشی تھا۔

شہر کے نزدیک پہنچ کر سب سے پہلے قبلائی خان نے اپنے کچھ سفیر شہر کی طرف روانہ کئے اس نے احتجاج کیا کہ اس کی غیر موجودگی میں سنگ خاندان کے وزیر نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے مفادات کو نقصان پہنچایا تھا۔

جب یہ سفیر لنگان شہر پہنچے تو شہر میں کرتا دھرتا وزیر بھی تھا ملکہ کمزور اور ناتواں تھی اور بادشاہ نابالغ لہٰذا سنگ وزیر نے قبلائی خان کے ان سفیروں کو قتل کروادیا اور ان سفیروں کے ساتھ کچھ منگول سردار بھی گئے تھے انہیں اس نے زندان میں ڈال دیا۔

ساتھ ہی وزیر نے یہ کام کیا کہ لنگان شہر کے لوگوں حتیٰ کہ ملکہ اور بادشاہ تک کو خبر نہ ہونے دی کہ اس نے قبلائی خان کی غیر موجودگی میں منگولوں کے مفادات کو نقصان پہنچایا اور کئی منگولوں کو قتل کیا تھا اس نے اس بات کو بھی راز ہی رکھا کہ قبلائی خان نے جو قاعدو اس کے پاس بھجواتے تھے انہیں اس نے قتل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کروادیا ہے اور کچھ منگول سالاروں کو اس نے زندان میں ڈال دیا ہے۔

اس وزیر نے عیاری سے کام لیتے ہوئے اس سے پہلے لنگان کے لوگوں ملکہ اور نابالغ بادشاہ کو یہ باور کروادیا تھا کہ وہ منگولوں پر حملہ آور ہوا تھا اور انہیں شکست دے کر اس نے مار بھگایا ہے قبلائی خان کیونکہ واپس اپنے آبائی دشت چلا گیا تھا اس بنا پر شہر کے لوگ ملکہ اور بادشاہ یہی خیال کرنے لگے کہ شاید وزیر واقعی منگولوں کے خلاف حرکت میں آیا تھا اور انہیں شکست دے کر انہیں مار بھگایا ہوگا۔

لیکن سفیروں کو قتل کرنے اور سفیروں کے ساتھ جو منگول سالار آئے تھے انہیں زندان میں ڈالے جانے کو وزیر زیادہ عرصہ تک راز میں نہ رکھ سکا لوگوں کو خبر ہونا شروع ہوگئی تھی کہ جو کچھ وزیر کہتا رہا ہے یہ سب جھوٹ ہے جب یہ خبریں شہر میں پھیلنا شروع ہوئیں تو شہر کے اندر وزیر کی غداری کی خبریں گشت کرنے لگیں اور سنگ خاندان کے بہت سے قابل سالار منافع اور تیر انداز لنگان شہر سے نکل کر اپنے تحفظ اور سلامتی کی خاطر قبلائی خان کے لشکر میں پہنچ گئے تھے۔

شہر کے قریب پہنچ کر قبلائی نے لشکر کے ایک حصے کے ساتھ ایک جگہ پڑاؤ کرلیا اور اپنے سالاروں کو لشکر کے دیگر حصے کے ساتھ اس نے لنگان شہر پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا تھا۔

اس موقع پر سنگ خاندان کے وزیر نے پھر عیاری سے کام لیا اس نے قبلائی خان کے سالاروں کی طرف پیغام بھجوایا کہ تم ایسے ملک پر حملہ آور ہورہے ہو جس کا بادشاہ ابھی نابالغ ہے اور اس کی ماں بیوہ ہے۔

جواب قبلائی خان کے سالاروں نے اسے جواب دیا۔

تم کہتے ہو کہ تمہارا بادشاہ نابالغ ہے مگر تم بھول گئے کہ چین کی ان سرزمینوں میں پہلے چاؤ خاندان حکمرانی کرتا تھا جب سنگ خاندان نے ان سے یہ علاقہ چھین کر اس پر حکومت قائم کی اس وقت بھی چاؤ خاندان کا نابالغ بادشاہ حکومت کرتا تھا ہم تمہارے ساتھ وہی سلوک کررہے ہیں جو اس سے پہلے سنگ خاندان نے کیا تھا لہٰذا تمہیں اس کا برا نہیں ماننا چاہئے۔

منگول سالاروں کی اس حاضر جوابی سے سنگ خاندان کے سفیر اپنا سامنہ لے کر رہ گئے تھے سنگ خاندان کے سالاروں کو یہ بھی امید تھی کہ حملہ آور منگول ان کے شہر لنگان کو فتح نہ کرپائیں گے اس لئے کہ شہر کی فصیل کافی بلند اور مضبوط تھی اور انہوں نے قبلائی خان سے متعلق سن رکھا تھا کہ قبلائی خان کے پاس فصیلیں اور قلعوں کی دیواریں گرانے کے لئے سنگ باری کا کوئی سامان نہیں لیکن لنگان کے باشندوں اور حکمران طبقے کی بدقسمتی کہ قبلائی خان نے اپنے بھتیجے ہلاکو خان کے بیٹے ابا قا خان سے کچھ منجنیقوں کے ساتھ ساتھ منجنیقیں تیار کرنے والے صناع بھی منگوالئے تھے اس بناء پر اب قلعوں کو گرانے کے لئے قبلائی خان کے پاس پورا سامان موجود تھا۔

جنوبی چین کی ملکہ اور اس کا شہنشاہ بیٹا ابھی تک اپنے وزیر کی غلط کارروائیوں سے مکمل طور پر بے خبر تھے وزیر نے انہیں یہ تک اطلاع نہ دی تھی کہ اس کے رویے کی وجہ سے بہت سے چینی سالار امراء اور صناع ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے قبلائی خان کے لشکر میں جا چکے ہیں اسی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے جنوبی چین کے سات سالہ شہنشاہ کی ماں نے سنگ کی سرزمینوں میں امراء کو خطوط اور پیغام بھیجے اردگرد جو سالار بکھرے ہوئے تھے انہیں بھی دارالسلطنت لنگان کے تحفظ کے لئے طلب کرلیا تھا۔

دوسری طرف قبلائی خان کے سالاروں نے بی جوابی اقدام کیا اور انہوں نے اپنے کئی دستے مختص کئے ان دستوں کے سالار مقرر کئے ان کے حوالے رقوم کی تھیلیاں کیں یہ تھیلیاں لنگان کے گردونواح میں جو خستہ حال لوگ تھے ان میں تقسیم کرنا شروع کردی تھیں اس طرح چنگیز خان کی روایات کے برخلاف قبلائی خان اور اس کے سالاروں نے چین کے لوگوں کا دل جیتنے کی کوشش شروع کردی تھی۔

منگولوں کا لشکر جب لنگان شہر کی فصیل کے قریب پہنچا تو قبلائی کی طرف سے لشکریوں کو بڑی سختی کے ساتھ احکامات جاری کئے گئے کہ خبردار کوئی چیز نہ چرانا نہ ہی زبردستی کسی سے غلہ وصول کرنا اب منگولوں کا لشکر لنگان شہر کے نواح میں دریا کے کناروں کے ساتھ ساتھ اور فصیل کے اطراف میں دور تک پھیل چکا تھا جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے چونکہ منگولوں نے لنگان کا محاصرہ کرلیا تھا لہٰذا سنگ خاندان کے نابالغ بادشاہ اور اس کی ماں نے جب فصیل پر چڑھ کر منگولوں کے لشکر کا جائزہ لیا تو شہنشاہ کی ماں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ حملہ آور منگولوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے لہٰذا اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد منگولوں کی طرف پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے کسی سالار کو بھیجیں وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتی ہے۔

اس پر منگولوں کی طرف سے ان کا سالار بایان ملکہ سے گفتگو کرنے کے لئے گیا ملکہ نے صلح کی گفتگو کی اور ساتھ ہی وزیر نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے لئے اس نے قبلائی خان کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی مانگنے کی درخواست بھی کی۔

ملکہ کی یہ درخواست منظور کرلی گئی اس طرح سنگ خاندان کی وہ آخری ملکہ اپنے نابالغ شہنشاہ بیٹے کے ساتھ لنگان شہر سے نکل کر منگولوں کے لشکر میں گئی اور انہیں قبلائی خان کے سامنے پیش کیا گیا جس وقت دونوں ماں بیٹا قبلائی کے سامنے گئے تب ملکہ نے اپنے نابالغ بیٹے کو مخاطب کرکے کہا۔

دوزانوں ہوکر نو مرتبہ سجدہ کرو کہ فرزند آسمان قبلائی خان تمہاری جان بخشی کررہا ہے اس کا شکریہ ادا کرنا ہم پر لازم ہے۔

ملکہ اور اس کے شہنشاہ بیٹے کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ایک طرح سے منگولوں کے سامنے جنوبی چین کا مرکزی شہر لنگان فتح ہوچکا تھا اس کے بعد منگول شہر میں داخل ہوئے سب سے پہلے تمام کتب خانوں دفتروں نقشوں تصویروں تاریخی دستاویزات اور عدالتی فیصلوں کو سربمہر اور مقفل کردیا گیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس کے بعد جب جنوبی چین کے دارالسلطنت کے خزانوں کے نمونے قبلائی خان کے حضور پیش کرنے کے لئے سجائے گئے تو اس نے اپنی بیوی جاموئی خاتون کو بھی اپنے ساتھ لیا قبلائی خان کی بیوی جاموئی نے چینی ظروف کشیدہ کاری اور ہاتھی دانت اور سلیپ کا کام کئے ہوئے سامان کو بے حد پسند کیا اس کے علاوہ جاموئی خاتون نے سنگ خاندان کی بیوہ ملکہ اور اس کے نابالغ بیٹے کا شاندار انداز میں خیر مقدم کیا جب جنوبی چین کے خزانے قبلائی خان کے سامنے پیش کئے گئے تب کہتے ہیں قبلائی خان نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ایک دن منگول سلطنت کا بھی اسی طرح خاتمہ ہوگا۔

گو قبلائی اور اس کے لشکر نے جنوبی چین کے مرکزی شہر لنگان پر قبضہ کرلیا تھا ابھی جنوب میں بہت سے ایسے مقامات تھے جہاں لوگوں کو خبر تک نہ ہونے پائی تھی کہ منگولوں نے ان کے مرکزی شہر پر قبضہ کرلیا ہے اور وہاں ابھی مسلح چینی موجود تھے جو کسی بھی وقت اٹھ کر منگولوں کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے تھے ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے قبلائی خان نے جنوب کی چینی قوتوں پر ضرب لگانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

لنگان سے نکلتے وقت قبلائی خان نے دو احکامات جاری کئے پہلا یہ کہ اس نے اپنے لشکر کے ایک سالار آچو کو بحری بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا یہ آچو چنگیز خان کے دور کا مشہور و معروف سالار سوبدائی کا پوتا تھا دوسرا حکم اس نے اپنے لشکر کو کوچ کا دیا تھا اب قبلائی خان نے اپنے لشکر کے ساتھ جنوب کے ایک بڑے شہر اور بندرگاہ کا رخ کیا تھا۔

یہ شہر لین ٹان تھا بہرحال قبلائی خان اپنے لشکر کے ساتھ لین ٹان پر حملہ آور ہوا اسے بھی فتح کرلیا لین ٹان کے اندر اس وقت جو مسلح چینی تھے جب انہیں شکست ہوئی اور انہوں نے پسپائی اختیار کی تو شہر سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکل کر وہ اپنی کشتیوں میں منتقل ہو گئے اب انہوں نے اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر منگولوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر حملہ آور ہو کر انہیں نقصان پہنچا کر اپنی کشتیوں میں چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

لین ٹان کی بندرگاہ کی فتح کے بعد یورپ سے پولو خاندان کے دو افراد قبلائی خان کی خدمت میں حاضر ہوئے قبلائی خان نے ان سے ملاقات کی اور انہیں واپس یورپ بھیج دیا اور ان سے کہا کہ وہ رومتہ کبریٰ سے مبلغوں اور حکیموں کو اپنے ساتھ لے کر آئیں یہ دونوں افراد قبلائی خان کے حکم کے مطابق واپس تو چلے گئے لیکن دوبارہ جب واپس آئے تو اپنے ساتھ نہ کسی مبلغ کو لائے نہ کسی حکیم کو بلکہ دنیا کے مشہور سیاح اور تاجر مارکو پولو کو ساتھ لے آئے تھے جو وینس کا رہنے والا تھا۔

قبلائی خان جب پہلی بار چین میں داخل ہوا تھا تو اس نے ایک نیا شہر آباد کرنا شروع کیا تھا اور اسے اپنے بھائی سے نمٹنے کے لئے واپس جانا پڑا تھا اس لئے وہ شہر تعمیر نہ ہوسکا اب اس نے دوبارہ اس شہر کی تعمیر کا کام کیا تھا جہاں اس نے نیا شہر آباد کرنا شروع کیا تھا وہاں پہلے سے ٹائی ٹو نام کا ایک شہر تھا جو اس کے باپ کے حملوں کے دوران برباد کر دیا گیا تھا اسی پرانے شہر کی بنیادوں پر نئی فصیل قائم کی گئی اور نیا شہر تعمیر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

جو نیا شہر اس نے تعمیر کیا اس کے گرد وسیع چوکور دیواریں تھیں جو ہر طرف سے ایک ایک میل لمبی تھی احاطے کے اندر شہنشاہ کا عظیم الشان محل بنایا گیا جس کے اطراف زینہ بزینہ روشیں تھیں جن سے لوگ آتے جاتے تھے اس کی دیواروں پر سونے چاندی کے پتھر جڑے ہوئے تھے اور اژدھوں جانوروں اور پرندوں کی تصویریں نقش کی گئی تھیں بلند چھتوں پر سونے چاندی اور تصویروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا باہر قرمزی روغن کرایا گیا تھا اور آئینے کی طرح چمکتا تھا۔

دربار منعقد کرنے کے لئے قبلائی خان نے ایک ہال تعمیر کیا ہوا تھا جو اس قدر وسیع تھا کہ اس میں اتنی بڑی میز رکھی کہ اس پر چھ ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے قبلائی خان کے کھانے کی میز کے قریب ایک اور میز تیار کی گئی جس کا طول اور عرض تین تین قدم رکھا گیا تھا اس پر جانوروں کی سنہری تصویریں کندہ کی گئی تھیں اور اس پر خالص سونے کا ایک ساغر بنایا گیا تھا جس میں مصالحوں میں بسی ہوئی شراب رکھی رہتی تھی۔

محل سے متعلق مشہور مورخ مارکو پولو لکھتا ہے جب بادشاہ نے یہ محل تعمیر کیا تو بڑے بڑے امراء بادشاہ کی ساقی گری کی خدمت انجام دیتے تھے اور اپنے منہ اور نتھنوں کو ریشم کے زریں رومال سے ڈھانپ لیتے تھے تاکہ ان کی سانس سے بادشاہ کو پیش کی جانے والی شراب خراب نہ ہو جب قبلائی پینے لگتا تو موسیقی کے ساز بجنے لگتے اور جب وہ اپنا جام اٹھاتا تو تمام امراء اور حاضرین اس کے سامنے دوزانوں جھک جایا کرتے تھے۔

مارکو پولو مزید لکھتا ہے کہ قبلائی خان نے جو محل بنایا تھا اس کے شمال میں ایک تیر کی مسافت پر ایک مصنوعی پہاڑی بھی بنوا رکھی تھی جو سو قدم اونچی تھی اور جس کا قطر میل بھر تھا پہاڑی ایسے درختوں سے ہمیشہ ہری بھری رہتی تھی جس کے پتے پت جھڑ میں بھی نہ گرتے تھے قبلائی خان کو جب بھی کسی اچھے درخت کا پتا چلتا وہ تو اسے جڑ اور مٹی سمیت منگواتا اور اس پہاڑی کے اوپر لگا دیتا اور اس پہاڑی پر اس نے ہری نیلی دھات بھی جابجا منڈھوادی تھی اس طرح درخت ہی نہیں اس پہاڑی کی زمین کو بھی سبز کر دیا گیا تھا اور اس کا نام ہی سبز پہاڑی پڑ گیا تھا اس چوٹی پر اپنے روحانی سکون کے لئے قبلائی خان نے ایک مکان تعمیر کروایا تھا جو اندر باہر سے سارا ہرا ہی ہرا تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قبلائی خان نے اپنے آبائی دشت یعنی چنگیز خان کی سرزمین سے وہاں اگنے والی گھاس منگوائی تھی اور اپنے محل کے ایک کافی بڑے حصے میں اس نے یہ گھاس لگا دی تھی کبھی کبھی قبلائی خان اپنے اہل خانہ کے ساتھ اپنے محل کے اس گوشے میں جاتا جہاں اس نے وہ گھاس لگوائی تھی وہاں وہ بیٹھتا اور اپنے

بیوی بچوں اور بیٹیوں کو مخاطب کر کے اکثر کہا کرتا تھا۔

یہ تمہاری اصل میراث ہے یہ تمہارا وطن ہے جس سے تم آئے ہو۔

قبلائی خان کی سواری جب اس نئے محل سے نکلتی تو اس کی سواری چار ہاتھیوں کی پیٹھ پر ایک لکڑی کے حجرے میں نکلتی تھی جس کے اندر سونے کے پتھر چڑھے ہوتے تھے اور ببر شیر کے چمڑے کا استر لگایا گیا تھا جب وہ اسی محل سے شکار کے لئے ہاتھی پر بیٹھ کر نکلتا تو اپنے ساتھ ایک درجن باز رکھتا اس کے بہت سے امراء ہاتھیوں کے ساتھ چلتے رہتے اور کبھی کبھی قبلائی خان ان کے ساتھ مل کر شکار میں حصہ بھی لیتا تھا۔

قبلائی خان کی چار بیویاں تھیں جن کو وہ قانونی ازواج کی طرح رکھتا تھا اس کے علاوہ قبلائی خان کی صحت مند طبیعت کو حسین اور متناسب لڑکیاں اس قدر پسند تھیں جتنی اس کے چچا کو اپنی جوانی کے زمانے کی بیویوں سے محبت تھی اس نے اپنی ہر بیوی کے لئے بڑے محل کے اندر چھوٹے چھوٹے محل بنا رکھے تھے جہاں ان کی خدمت کے لئے ان گنت خادمائیں موجود تھیں اس کے علاوہ اپنے ذاتی محل کے لئے ہر سال وہ خوبصورت لڑکیوں کا انتخاب بھی کرتا تھا۔

جن لڑکیوں کو شاہی محل کی خدمات کے لئے چنا جاتا تھا ان کا چناؤ بھی عجیب و غریب تھا ان منگولوں کے اندر ایک تاتاری قبیلہ تھا جس کو الگرات کہتے تھے قبلائی خان کی بیوی جاموئی کا تعلق اسی قبیلے سے تھا یہ قبیلہ لڑکیوں کے حسن و جمال کی وجہ سے مشہور تھا ہر سال اس قبیلے کی دلفریب لڑکیاں قبلائی کے دربار میں بھیجی جاتی تھیں اور بعض نا تجربہ کار بوڑھیوں کو ان کی تربیت پر مامور کیا جاتا تھا۔

وہ بوڑھیاں ان لڑکیوں کو اپنے پاس یہ دیکھنے کے لئے سلاتی تھیں کہ ان کے منہ سے باس تو نہیں آتی وہ خراٹے تو نہیں لیتی اور ان کے اعضا مدور اور متناسب ہے کہ نہیں پھر ان میں سے چند کو چنا جاتا جو باری باری سے شہنشاہ کی خدمت پر تعینات کی جاتی تھیں ان میں چھ حسین ترین لڑکیوں کا فرض ہوتا تھا کہ وہ تین دن اور تین راتیں شہنشاہ کی خدمت میں رہیں جب قبلائی خان سوتا تو وہ پہرہ دیتیں اور وہ جو حکم دیتا اس کی تعمیل کرتیں اس کے بعد اگلے تین دن ان کی جگہ اور چھ لڑکیوں کا تقرر کیا جاتا تھا اس طرح سال بھر بدل بدل کر چھ لڑکیوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔

نیا شہر آباد کرنے اور جنوبی چین کے وسیع علاقوں کو فتح کرنے کے بعد قبلائی خان نے جنوبی چین میں کاغذ کے نوٹ جاری کرنے کا فیصلہ کیا اسے بتایا گیا کہ اس سے پہلے چین میں کاغذ کے نوٹ چلتے رہے تھے اس سلسلے میں اس نے احمد ناصر کے ایک مسلمان سے مشورہ کیا جو مالیات کا ماہر تھا قبلائی خان اور اس کی بیوی جاموئی اور احمد پر بڑا اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے لہٰذا کاغذوں کے ان نوٹوں کے متعلق قبلائی خان کو تجویز دیتے ہوئے احمد نے کہا تھا۔

ایسے کاغذی نوٹ جاری کیے جائیں جو چاندی میں ان کی نصف قیمت ادا کی جائے اور یہ نوٹ جو چھاپے جائیں قیمتی کاغذ بھی کہلائیں۔

اس کے علاوہ احمد کے مشورے پر ان کاغذی نوٹوں کی قیمت قانوناً مقرر کی گئی رعایا کے لئے یہ لازم قرار دیا گیا کہ اسی قیمت پر وہ کیسے قبول کئے جائیں جو ان پر چھپی ہوئی ہو اس طرح حکومت کو اپنا موصول ریشم فصلوں محصوروں اور جانوروں کی شکل میں وصول کرتی لیکن اپنے اخراجات کاغذ کی شکل میں ادا کرتی۔

مورخین ان کاغذ کے نوٹوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ چین میں شہتوت کے درخت بہت ہوا کرتے تھے اس شہتوت کی نرم چھال اتاری جاتی تھی یہ وہی شہتوت تھا جس میں ریشم کے کیڑے پالے جاتے تھے اس سے ایک طرح سے کاغذ کے تختے تیار کئے جاتے تھے یہ کالے کالے تختے چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں کاٹے جاتے تھے بڑے ٹکڑوں کی قیمت وینس کے دس سکوں کے برابر ہوتے تھے ان سب ٹکڑوں پر اس قدر احتیاط سے چھپائی کی جاتی تھی گویا یہ حقیقت میں سونے چاندی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکھائی دیتے تھے ہر سکے پر قبلائی خان کا مقرر کیا ہوا عہدیدار خاص سرخ سرکاری مہر لگاتا تھا تب کہیں جاکر یہ کاغذی نوٹ قانونی سکہ بنتے تھے جب قبلائی نے یہ نوٹ جاری کئے تو ساتھ میں یہ حکم بھی جاری کیا گیا اگر کوئی جعلی نوٹ چھاپے گا تو اسے موت کی سزا دی جائے۔

یہ ٹکڑے اس کی سلطنت کے گوشے گوشے میں سکوں کی صورت میں رائج ہوئے اور انہی کے ذریعے سے تمام اخراجات ادا کئے جاتے تھے کوئی کتنا ہی بلند مرتبہ رکھتا ہو ان سکوں کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا تھا بلکہ لوگ ان کو بڑی خوشی سے قبول کرتے تھے کیونکہ ان نوٹوں سے بھی سامان کی خرید و فروخت آسانی سے ہوتی تھی جتنی سونے چاندی کے سکوں سے ہوا کرتی تھی۔

دوسرے ممالک سے جو تاجر مال کا لین دین کرنے کے لئے آتے تھے انہیں بھی یہ سکے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا مورخین کہتے ہیں کہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں سے جو تاجر آتے وہ اپنے ساتھ سونا چاندی جواہرات اور موتی لاتے اور ان سے سارے تاجروں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ قبلائی خان کے خزانچی کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ سونا چاندی جواہرات اور موتی فروخت کریں اپنے خزانے کے قبلائی خان نے بارہ محاسب مقرر کئے تھے جو آنے والے تاجروں سے سونا چاندی جواہرات موتی خریدے تھے اس کے بدلے قیمت کے طور پر کاغذ کے نوٹ انہیں دیتے تھے وہ تاجر یہ نوٹ بخوشی قبول کر لیتے تھے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اتنی زیادہ قیمت انہیں کہیں اور سے نہیں ملتی۔

تاجروں کی وجہ سے قبلائی خان کے پاس بڑی مقدار میں سونا چاندی جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ قبلائی خان کے کہنے پر اس کے نمائندے سال بھر میں کئی بار مختلف شہروں میں منادی کراتے تھے کہ اگر کوئی سونا چاندی جواہرات یا ہیرے موتی بیچنا چاہے تو خزانے میں آجائے جہاں سے خاطر خواہ قیمت اسے ملے گی۔ سونے جواہرات کا مالک بڑی خوشی سے یہ سودے کرتے سونا چاندی دیتے اور بدلے میں وہ کاغذ کے نوٹ لے جاتے لیکن اگر کوئی سونا چاندی نہ بیچنا چاہتا تھا تو اس پر سختی نہیں کی جاتی تھی اس طرح قبلائی خان کے خزانے میں سونے چاندی جواہرات اور موتی کے ڈھیر لگنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

اس کے علاوہ قبلائی خان کے دور اور اس کے بعد میں بارود اور چھاپے خانے کو بھی بڑی ترقی ہوئی۔ چینی کافی عرصے سے بارود بنانا جانتے تھے اور بارود اڑانا اور بارود پھیلانا دونوں طرح کے ہنر سے واقف تھے انہوں نے اس کو فوجی ہتھیار کے طور پر استعمال تو کیا مگر بے تو جہی سے وہ بھدے سے بم بھی بنا لیتے تھے جن سے شعلہ اور دھواں نکلتا تھا اور حملہ آور ان سے ڈر جاتے تھے۔

جس وقت منگول شمالی چین پر حملہ آور ہوئے تھے تو اسی قسم کے بم چین کے لوگ شہر کی فصیلوں سے لٹکا دیتے تھے جو پھٹتے آگ اور دھواں دیتے جن سے منگول خوفزدہ ہو جاتے تھے چنگیز خان کے سالاروں اور دوسرے منگول امیروں نے اپنے مقصد کے لئے ان بارود کے آتشی پٹاخوں کا اچھی طرح مطالعہ کیا بارود ان کا راز جاننے کے بعد چنگیز خان کے سالار جب یورپ پر حملہ آور ہوئے تو انہی منگولوں نے چین سے بارود کا فن سیکھنے کے بعد ہنگری والوں کے خلاف بارود کے وہی پٹاخے استعمال کئے تھے اس کے علاوہ یورپ میں لڑی جانے والی جنگوں کے درمیان منگولوں نے اس بارود سے ایک اور فائدہ اٹھانا شروع کیا وہ لگاتار دشمن کے سامنے کئی بم پھینک دیتے جس کی وجہ سے فضاؤں کے اندر دھواں پھیل جاتا اور اس دھویں کی آڑ میں وہ دشمن پر حملہ آور ہو کر انہیں نیست و نابود کر کے رکھ دیتے۔

اس طرح مغلوں نے اپنے دشمنوں پر شعلے پھینکنے والے گولے چلانے کا فن چینیوں ہی سے سیکھا تھا پھر اتفاق ایسا ہوا کہ جس دور میں منگولوں کی فتوحات اور قبلائی خان کے چین پر قبضہ کرنے کی وجہ سے یورپ کے راہب اور دوسرے مذہبی گروہ چین اور منگولیا کی طرف آنا شروع ہو گئے اسی زمانے میں مشرقی یورپ کے اس حصے میں

بارود کی ایجاد کا دعویٰ کیا گیا ہے جس حصے میں یورپ کیج اندر بارود کی ایجاد کا دعویٰ کیا گیا تھا اس حصے میں پہلے ہی منگول فوجیں پہنچ کر بارود کو استعمال کر چکی تھیں۔

گو یورپ والوں کا خیال ہے کہ بارود کا موجد راجر بیکن ہے لیکن یہ راجر بیکن خود اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے بارود سے متعلق پہلی بار گفتگو ایک راہب سے کی تھی جو منگولوں کے پاس سے آیا تھا اور منگولوں کے بارود بنانے کے ہنر سے واقف تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ راجر بیکن نے بارود کے بھڑکنے کا مسئلہ چینیوں ہی سے سیکھا ہو پھر بھی حقیقت ہے کہ راجر بیکن کے بارود بنانے کا دعویٰ کرنے سے پہلے منگول چینیوں کی وجہ سے بارود کو باقاعدہ استعمال کر رہے تھے۔

منگولوں نے بہرحال بارود سے چلنے والی کوئی توپ تو نہ ایجاد کی گو قبلائی خان کے حملوں میں محاصرے کی مشینیں استعمال کی جاتی تھیں جن کی ساخت میکانکی قسم کی ہوتی تھیں اور جن سے پتھر پھینکے جاتے تھے جبکہ قبلائی خان کے دور میں چین میں بارود استعمال کیا جاتا تھا اس کے باوجود مورخین یہ کہتے ہیں کہ بارود کے تباہ کن ہتھیار بنانے کا سہرا اہل یورپ کے سر ہے اور یہ انہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے بنی نوح انسان کی ہلاکت کے لئے پہلی بار بارود سے کام لیا۔

مارکو پولو کی وجہ سے مصوری کا فن بھی یورپ پہنچا مارکو پولو قبلائی خان کے پاس رہ چکا تھا اس کی وجہ سے تصویروں کی حرکیت اور حقیقت نگاری کا اثر یورپ تک پہنچا اسی اثر کے تحت بعد میں یورپ میں چھاپے خانے بھی بننے لگے۔

جبکہ اس سے بہت پہلے قبلائی خان کے تحت چینی لوگ اپنی کلاسکی ادب کو لکڑی کے چھاپوں سے چھاپا کرتے تھے قبلائی کے زمانے میں بدھ کی مذہبی کتابیں اسی طرح شائع کی گئیں اس کے وزیروں کے فرامین اور کاغذ کے نوٹ جن سے مارکو پولو بڑی دلچسپی ظاہر کرتا تھا چھاپے خانے کی مشینوں ہی میں چھاپے جاتے تھے یہ قبلائی خان کے چینیوں ہی کا کمال تھا کہ ان چینیوں نے سب سے پہلے دھات کی چھاپے کی متحرک مشینیں بنائیں چھاپے خانے کی ان متحرک مشینوں کا فن قبلائی خان کے ہاں سے اٹھ کر اس کے بھتیجے اباقا خان اور بھائیوں کے پاس ایران پہنچا یہاں ثمر قندی ریشم سے اچھے قسم کا کاغذ تیار کیا جاتا تھا اس پر طباعت کا کام ہونے لگا۔

منگولوں کی فتوحات سے جب یورپ کے لوگ قبلائی خان تک جانے لگے تو چینی چھپے ہوئے کاغذ مغرب تک پہنچنے لگے بعد میں جب جائزہ لیا گیا تو پتا چلا کہ یورپ کے اولین چھپے ہوئے کاغذ چینی نمونوں سے بہت مشابہ تھے اور چین کی طرح یہاں بھی چھپائی ورق کے صرف ایک جانب ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ بھی ایک اور اہم چیز کے لئے دنیا چین ہی کی ممنون ہے اور وہ یہ کہ عرب ملاحوں نے اہل یورپ کو ایک عجیب اختراع دکھائی جس کے ذریعے دھند اور کالی راتوں میں وہ آسانی سے جہاز رانی کر سکتے تھے یہ قطب نما تھا جو باغیوں کے ایک صندوق میں بہتے پانی میں رکھ دیا جاتا تھا یہ اختراع بھی اصل میں چین سے آتی تھی وہاں یہ جنوب دکھانے والی سلوتی کہلاتی تھی اور محض ایک عجوبہ نہ تھی اس کے ذریعے سے گوبی کے صحرا کے قافلے اپنا راستہ تلاش کرتے تھے کیونکہ صحرائے گوبی میں تیز آندھیاں چلتی تھیں تو ٹیلے بنتے اور بگڑتے رہتے تھے اور راستے معدوم ہو جاتے تھے لہٰذا اس جنوب دکھانے والی سوئی کے ذریعے صحرائے گوبی کے اندر سے تجارتی قافلے با آسانی سے گزرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

یہ جہاز رانی کے ابتدائی آلات تھے ان کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کاریگری کے فیصلے ظروف اور چینی کے کارخانوں کے بنے ہوئے نازک برغبی برتن بھی چین سے یورپ پہنچے ان دریافتوں سے مغربی دماغوں کی قومیت اختراع کو مقابلے کی دعوت ملی اور یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ یورپ میں ایجادات کی ابتداء کا دور وہی ہے جبکہ یورپی سیاح قبلائی خان کے دربار میں پہنچے اور پھر واپس آکر وہاں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیزوں کو اہل یورپ میں متعارف کرانا شروع کیا۔

چین کو فتح کرنے کے بعد قبلائی خان کے لشکر میں ہر طرح کے لوگ جمع ہو گئے تھے ان میں منگول بھی تھے ترک مسلمان بھی تھے ایرانی اور تاتاری بھی تھے اس کے علاوہ ترکوں کے اور بہت سے قبائل کے علاوہ چینی بھی شامل تھے قبلائی خان نے اپنی سلطنت کا نظم و نسق ایک طرح سے مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا اس بناء پر چینی محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے علاقوں میں آخر سلطنت کا سارا کاروبار ایک مسلمان کے حوالے کیسے کر دیا گیا سلطنت کا سارا کاروبار اور مالیات کا سلسلہ قبلائی خان نے جس مسلمان کے حوالے کیا تھا اس کا نام احمد تھا اور وہ ایرانی تھا اور پھر قبلائی خان ایک بہت بڑی رسد گاہ بنا رہا تھا اور اس رسد گاہ کا ناظم بھی وہ کسی مسلمان کو مقرر کرنا چاہتا تھا۔ اس بناء پر مقامی لوگ احمد کے خلاف ہو گئے تھے یورپ سے آنے والے مارکو پولو بھی اس موقع پر مسلمانوں سے تعصب اور دشمنی کا ثبوت دے رہا تھا قبلائی خان آنکھیں بند کر کے احمد پر اعتبار کرتا تھا اسے اپنا وزیر مال بنا رکھا تھا اسے اس قدر وقعت دیتا تھا کہ وہ جو چاہتا کرتا اس احمد کو اس قدر اختیار تھا کہ حکومت کے عہدوں پر جس کا چاہے تقرر کرے اور مجرموں کو سزا دے جب کسی منصب سے کسی شخص کو ہٹانا ہو تو قبلائی خان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور کہتا۔

"اس شخص نے حضور والا کے حکم سے سرتابی کی ہے۔"

جواب میں قبلائی خان کہتا اس سے جیسا مناسب سمجھو سلوک کرو اور احمد اس شخص کو ہٹا دیتا اور بڑا جرم ہوتا تو قتل کرا دیتا۔

مقامی لوگ احمد سے اس لئے بھی جلتے تھے کہ وزیر مالیات ہونے کے ساتھ ساتھ سلطنت کے سارے کاروبار کی گرفت اس کے ہاتھ میں تھی وہ ایک طرح سے قبلائی خان کے بعد جو چاہتا کر سکتا تھا انہیں یہ بھی شبہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے لئے بہت سی دولت جمع کر رکھی ہے اور بہت سی بیویاں رکھی ہیں مارکو پولو الزام لگاتا ہے کہ اس کے پچیس بیٹے تھے۔

کہتے ہیں کہ چینی اس مسلمان وزیر سے تنگ آ گئے تھے آخر انہوں نے مل کر طے کیا کہ وہ ہر صورت میں اس کا خاتمہ کر کے رہیں گے اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب اور جس وقت قبلائی خان شہر سے نکل کر اپنی شکارگاہ کی طرف جائے گا تو اس کی غیر موجودگی میں احمد کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

قبلائی خان نے اپنے نئے بسائے جانے والے شہر میں قیام کیا ہوا تھا وزیر احمد کا بھی قیام وہیں تھا دیگر مسلمان وہیں قیام کئے ہوئے تھے۔

قبلائی خان ایک بار تیتر کے شکار کے لئے اپنی خود کی بنائی ہوئی شکارگاہ کی طرف چلا گیا تب ایک شخص چنگ پی نے احمد کے خلاف سازش تیار کی اس چنگ پی نے ایک چینی سالار کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جس کا نام وانگ چو تھا ان دونوں نے ایک چینی جادوگر کو بھی اس سازش میں شامل کر لیا اور اس سازش کا مقصد یہ تھا کہ شہر کے اندر ہنگامہ کھڑا کر دیا جائے شہر کے اندر جس قدر چینی آباد ہیں انہیں اشارہ دیا جائے گا کہ وہ ایک دم شہر سے باہر سڑکوں پر نکل آئیں اشارہ یہ مقرر کیا گیا تھا کہ جب جلتی ہوئی ایک مشعل بلند جگہ دکھائی جائے گی اس کے اشارے پر سب چینی لوگ سڑکوں پر نکل آئیں گے حالانکہ رات کو سڑکوں پر اس طرح نکلنا منع تھا۔

ان تین سازشیوں نے یہ طے کیا کہ سارے چینی سڑکوں پر نکل آئیں اور جو بھی داڑھی والا شخص نظر آئے اسے قتل کرتے جائیں اس لئے کہ مسلمانوں کے علاوہ منگول بھی داڑھی رکھتے تھے اس کے علاوہ دیگر ترک اور تاتاری بھی اکثر داڑھی رکھتے تھے ان چینیوں کا خیال تھا کہ جب سارے داڑھی والوں کا قتل عام کر دیا جائے گا تو منگولوں سے جنوبی چین کی جان چھوٹ جائے گی اور جنوبی چین کے گورنر منگولوں سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ایک بار پھر سنگ خاندان کی حکومت قائم کر دیں گے۔

یہ ساری سازش تیار کرنے کے بعد وانگ چو اور

چنگ پی اپنے ساتھی جادوگر کے ساتھ رات کے وقت محل میں داخل ہوئے اس لئے کہ یہ دونوں چینی بھی بڑے اہم سالار اور ان کا شمار قبلائی خان کے ہر دل عزیز امراء میں ہوتا تھا محل اس وقت خالی تھا اس لئے کہ قبلائی خان اپنے سارے اہل خانہ کے ساتھ شکارگاہ کی طرف چلا گیا تھا وانگ چو قصر کے بڑے کمرے میں بیٹھ گیا اور اس نے بہت سی قندیلیں روشن کرنے کا حکم دیا پھر اس نے احمد کے پاس پیغام بھیجا کہ قبلائی خان کا بیٹا چنگم اچانک واپس آ گیا ہے اور اس نے فی الفور احمد کو طلب کیا ہے یہ پیغام اس لئے بھیجا گیا تھا کہ چنگم اور احمد ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے ڈرتے تھے اور ایک دوسرے کا کہا بھی مانتے تھے۔

یہ پیغام جب احمد تک پہنچا تو احمد اس پیغام کے جواب میں گھر سے نکل کر قصر کی طرف روانہ ہوا جب وہ راستے میں ایک پھاٹک پر پہنچا تو وہاں قبلائی خان کے لشکر کے ایک حصے کا سالار کوغنائی اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اس نے احمد کو مخاطب کر کے پوچھا۔

اتنی رات گئے آپ کہاں جا رہے ہیں چنگم کی خدمت میں جو ابھی یابھی آیا ہے احمد نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

کوغنائی نام کے اس سالار نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے علم کے بغیر وہ خفیہ طور پر کیسے محل میں داخل ہو سکتا ہے۔

کوغنائی کو شک پڑ گیا کہ شہر کے اندر کوئی سازش تیار کی جا رہی ہے لہٰذا ذرا فاصلہ رکھ کر وہ بھی احمد کے پیچھے پیچھے محل کی طرف روانہ ہوا اور اپنے ساتھ کچھ مسلح دستوں کو بھی لے لیا۔

جیسے ہی احمد محل میں داخل ہوا اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں اس لئے کہ اس وقت محل کے اندر ان گنت قندیلیں روشن کر دی گئی تھیں اس وقت قصر کے بڑے کمرے میں وانگ چو بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد اس قدر روشنی تھی کہ وہ وانگ چو کو پہچان نہ سکا اور یہی سمجھا کہ قبلائی خان کا بیٹا چنگم بیٹھا ہوا ہے جونہی وہ اس کے سامنے تعظیم کے لئے جھکا وانگ چو کا ساتھی اور دوسرا سازشی چنگ پی حرکت میں آیا تلوار بلند کر کے اس نے احمد کا سر کاٹ دیا۔

عین اسی لمحہ کوغنائی نام کا وہ سالار اس بڑے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا تھا اس وقت احمد کا سر کاٹا جا چکا تھا اس صورت حال کو دیکھتے ہی کوغنائی زور زور سے چلانے لگا۔

غداری! غداری!

پھر اس نے اپنی کمان سے تیر نکالا اور وانگ چو کو مارا اور اس کا تیر وانگ چو کے جسم سے پار ہو گیا پھر اس نے اپنے ساتھ آنے والے لشکریوں کو حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے کوغنائی کے تیر سے وانگ چو مرا نہیں تھا زخمی ہوا تھا اس طرح وانگ چو اور چنگ پی دونوں کو گرفتار کر لیا گیا اس کے بعد کوغنائی نے شہر بھر میں منادی کرا دی کہ جو شخص بھی سڑکوں پر آئے گا اسے پوچھے بغیر قتل کر دیا جائے گا۔

اس طرح کوغنائی کی ذہانت اس کی جانثاری اور خلوص کی وجہ سے منگولوں مسلمانوں تاتاریوں اور دیگر ترکوں کے خلاف چینیوں کی سازش ناکام ہوئی اس واقعے کی اطلاع قبلائی خان کو کر دی گئی یہ واقعہ بڑا اہم تھا اس لئے کہ اس کا وزیر احمد مارا گیا تھا لہٰذا وہ واپس آیا معاملے کی تحقیق کی اور جتنے بھی اس سازش میں شریک تھے سب کا اس نے خاتمہ کرا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

قبلائی خان نرم مزاج انسان تھا اور ساری اقوام اور سارے قبائل کو اپنے ساتھ لے کر ترقی کی منازل کی طرف بڑھنا چاہتا تھا اسی بناء پر اس کی سلطنت میں نا صرف وزیر مسلمان تھے بلکہ اس کے بہت سے صوبوں کے حکمران بھی مسلمان تھے قبلائی خان اب ایک طرح سے شمالی اور جنوبی حصوں کا حکمران تھا بلکہ وہ پورے چین کا اس وقت شہنشاہ تھا اس نے جہاں مسلمانوں اور عیسائیوں کو اپنے لشکر کے علاوہ اپنے مختلف صوبوں کے حاکم کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیثیت سے اہمیت دی وہاں اس نے منگولوں تاتاریوں اور دیگر ترک قبائل کو بھی اسی طرح اہمیت دی۔

کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید منگول اور تاتاری ایک ہی ہیں کچھ لکھنے والوں نے بھی پڑھنے والوں کے ذہن میں ابہام سا ڈال دیا ہے اسی بناء پر پڑھنے والے منگول تاتار، ترکمان، قراتار وغیرہ قوموں میں امتیاز نہیں کر سکتے کبھی تاریخ پڑھنے والا پڑھتا ہے کہ سلجوقی مثلاً الپ ارسلان طغرل بیگ ترک تھے پھر وہ چنگیز خان کی نسبت پڑھتے ہیں کہ وہ منگول تھا۔ دوسری جگہ اس کی نسبت پڑھا جاتا ہے کہ وہ ترک تھا پھر چنگیز خان کے فتنے کو فتنہ تاتار کے نام سے موسوم کر دیا جاتا ہے اس طرح منگول ترک اور تاتار ایک ہی نام کے تحت لکھ دیئے جاتے ہیں لیکن آگے چل کر منگولوں اور ترکوں کی مخالفت اور لڑائیوں کا حال بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔

حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ حضرت نوح کے تین بیٹے تھے جن کے نام حام، سام اور یافت تھے یافت کی اولاد بلاد شرقیہ خصوصیت سے چین اور اس کے اطراف میں آباد ہوئی یافت کی اولاد میں ایک شخص ترک نامی ہوا اس کی اولاد چین اور ترکستان میں پھیل گئی اور وہ سب ترک کہلانے لگے۔

ترک بن یافت کی اولاد چین اور ترکستان اور ختن وغیرہ میں جب خوب پھیل گئی تو انہوں نے امن امان اور نظام کے قائم رکھنے کے لئے ایک شخص کو اپنا سردار تجویز کرنا ضروری سمجھا رفتہ رفتہ ان میں بہت سے قبیلے اور گروہ پیدا ہو گئے ہر قبیلے اور گروہ نے اپنا ایک سردار بنایا اور یہ تمام سردار ایک سب سے بڑے سردار کے تحت سمجھے جاتے تھے لہٰذا ترک بن یافت کی اولاد کے ہر قبیلے پر ترک کا لفظ بولا جا سکتا ہے اور ترکستان، ختن اور چین تک کے سب باشندے ترک ہی کہلائے جاتے ہیں۔

انہی ترک قبائل میں سے بعض نے دریائے آمو کو عبور کر کے مسلمانوں کے عہد میں خراسان وغیرہ کے اندر راہزنی اور ڈاکہ زنی شروع کی ان قبائل کو ترکنان غز کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ ترکنان غز یورپ، افریقہ اور مراکش تک بھی پہنچے۔

ترک بن یافت کی اولاد میں ترکوں کے قبیلے سلجوقا نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور انہیں طغرل الپ ارسلان بڑے بڑے عالی جاہ سلاطین ہوئے جن کی شہرت اور عظمت نے تمام دنیا کا احاطہ کیا سلجوقیوں کے مسلمان ہونے اور خراسان کی جانب خروج کرنے سے پہلے ترکوں کے درمیان دو اور نئے قبیلے دو حقیقی بھائیوں کے نام سے مشہور ہو چکے تھے ان کے نام منگول اور تاتار تھے سلجوقیوں کے مسلمان ہونے شہرت اور عظمت حاصل کرنے کے وقت یہ دونوں قبیلے ناقابل التعات اور بہت ہی بے حقیقت اور کم حیثیت تھے ترک بن یافت کی اولاد میں ایک شخص النجہ فان تھا جس کے دو بیٹے منگول خان اور تاتار خان پیدا ہوئے انہی دونوں بھائیوں کی اولاد منگول اور تاتاری قومیں بنیں۔ ان دونوں قوموں نے اپنے لئے الگ الگ مقام سکونت اختیار کئے منگول چین کے ہمسائے میں مغرب کی طرف آباد ہو گئے۔ ان کے نام سے ان کے علاقے کا نام منگولیا پڑ گیا تاتار نے دریائے جیحوں کے کنارے سکونت اختیار کی اور اس کے نام سے علیحدہ ملک تاتاریا ترکستان کہلایا ترکستان پر کیونکہ فریدون کے بیٹے طور نے بھی حکومت کی تھی اس لئے اس علاقے کو بعد میں توران کے نام سے بھی یاد کیا جانے لگا۔

منگول اور تاتاری دونوں قبائل ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے اور ایک دوسرے کے خلاف عداوت اور دشمنی نبھاتے رہے دونوں قبیلے ایک دوسرے سے جدا ہو کر جدا جدا ملکوں میں سکونت اختیار کر چکے تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے پر چڑھائی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے جب تک ایران میں کیانی خاندان حکمرانی کرتا رہا اس خاندان نے تاتاریوں کا ساتھ دیا اور منگول ہمیشہ تاتاریوں کے مقابلے میں مغلوب اور مقتول ہوتے رہے اور ان کو بھی تاتاریوں پر بالادستی یا چیرہ دستی کا موقع نہ ملا۔

ان لڑائیوں میں منگولوں کی اکثر عورتیں تاتاریوں کے قبضے میں چلی جاتی تھیں ان عورتوں سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اس اولاد کو تاتری باندی بچہ کہتے تھے اور اپنے ترکہ کا وارث نہیں بناتے تھے۔

رفتہ رفتہ اس قسم کے لوگوں کی کثرت ہوئی اور ان کی شادیاں اس قسم کے گھرانوں میں ہونے لگی اس طرح ایک الگ قوم تیار ہو گئی جس کو خراقا تار کا خطاب دیا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ انہی لوگوں کو ترکمان بھی کہا جاتا ہے یہ تاتاریوں کی منگولوں سے نفرت کا نتیجہ کہ انہوں نے منگول عورتوں کی اولاد کو اپنا ہمعصر نہ سمجھا ورنہ حقیقت میں منگول اور تاتار ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔

منگول تاتاری قپچاق، ایغور، خلج، قاچار، افشار، جلائر، ارنات، دوغلات، کنکرات، ارغون، کوچین، ترخانی، توغائی، سلجوق عثمانی، کرائت خراقا تار، غزان سب قبیلوں کو ترک کہا جا سکتا ہے لیکن ان سب کی اپنے اپنے قبیلوں کے سرداروں کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ شناخت بھی ہے۔

قبلائی خان کو اپنے آخری دور میں اسے ایک بہت بڑا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا وہ اس طرح کہ اس کا ایک بھتیجا جو چنگیز خان کے بیٹے اوغدائی کا پوتا تھا اور نام جس کا قاعدو تھا وہ اندر ہی اندر طاقت اور قوت پکڑتا جا رہا تھا اس کے تحت بلخ بخارا سمرقند جیسے بڑے بڑے عظیم شہر تھے اس کے علاقے افغانستان اور دریائے سندھ تک پھیلے ہوئے تھے انہی کے اندر سے لشکری بھرتی کرتے ہوئے اس نے اپنے لشکر کی تعداد بڑھا کر اپنی عسکری قوت کو خوب مستحکم کر لیا تھا۔

دراصل قاعدو اندر ہی اندر تیاری کرتے ہوئے پرانے چین پر قبضہ کرنے قبلائی خان کو اپنے سامنے بے بس کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جہاں اس نے اپنے لشکر کی تعداد بڑھائی اور عسکری قوت کو بڑا عروج دیا وہاں اس نے ایک اور بہت بڑا اقدام اٹھایا۔

دوسرا اقدام یہ تھا کہ چنگیز خان کے آبائی مسکن کے شمال میں مانچو نام کا ایک تاتاری قبیلہ آباد تھا یہ بڑے جنگجو بڑے وحشی تھے چونکہ ترک سب ہی آپس میں ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں اور جانتے بھی تھے کہ ان کے درمیان ایک رشتہ ہے لہٰذا قاعدو نے تاتاریوں کے اسی مانچو نام کے قبیلے سے سردار سے رابطہ قائم کر کے ساز باز کی اور یہ منصوبہ بنایا کہ قاعدو پہلے جنوب کی طرف سے شمال کی طرف پیش قدمی کرے گا او منگولوں کے آبائی وطن پر قبضہ کر کے چنگیز خان کی قبر تک کو اپنی گرفت میں کرے گا جب وہ ایسا کر چکے گا تو اپنی اس کامیابی کی اطلاع وہ مانچو قبائل کو دے گا جس کے جواب میں مانچو قبائل شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی کریں پھر قاعدو اپنے لشکر کے علاوہ وحشی مانچو کے ساتھ مل کر چین پر حملہ کر دے گا اور چین پر قبضہ کر کے قبلائی خان کو اپنے سامنے بے بس کر کے رکھ دے گا۔

قبلائی خان کے مخبر گو بڑی تیزی سے نقل و حرکت کرتے تھے اور آس پاس رونما ہونے والی تبدیلیوں سے اسے خبر بھی کرتے تھے لیکن انہیں قاعدو کے ان ارادوں سے آگاہی حاصل نہ ہو سکی جس کے نتیجے میں قاعدو آندھی اور طوفان کی طرح حملہ آور ہوا جنوب سے شمال کی طرف بڑھا صحرائے گوبی کے غربی کناروں کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ وہ منگولوں کے آبائی وطن میں گھسا چنگیز خان کے مسکن پر اس نے قبضہ کر لیا اور چنگیز خان کے مسکن میں اس وقت جس قدر منگول آباد تھے انہیں اس نے اپنا ہمنوا بنا لیا یہ قاعدو کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی یہ کارروائی قاعدو نے اس وقت کی جب قبلائی خان کا ایک لشکر شمالی چین میں کچھ قبائل کے ساتھ الجھا ہوا تھا اور کچھ دستے جنوبی چین میں خان بالغ شہر میں قبلائی خان کے پاس تھے قبلائی خان کو جب خبر ہوئی کہ اس کے بھتیجے قاعدو نے جنوب سے شمال کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے منگولوں کے آبائی وطن پر قبضہ کر لیا ہے تو اسے بے حد صدمہ اور دکھ ہوا اس لئے کہ قبلائی خان کو تو سارے منگولوں کا اپنے آپ کو خاقان سمجھتا ہے اب جبکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منگولوں کا آبائی خطہ بھی اس سے چھین لیا گیا تو منگولوں کے خاقان کی حیثیت سے یہ اس کی بڑی بے عزتی تھی کہ اس کے دادا چنگیز خان کا مسکن اس کے پاس نہ رہا۔

یہ صورت حال قبلائی خان کے لئے ناقابل برداشت تھی اس کا جو لشکر شمالی چین کے دور دراز علاقوں کی طرف گیا ہوا اس کی طرف اس نے پیغام بھجوایا کہ فوراً اپنے آبائی مسکن کی طرف پہنچیں اس لئے آبائی مسکن پر قاعدو نے قبضہ کرلیا ہے جو لشکر اس وقت اس کے پاس تھا اسے لے کر قبلائی بھی اپنے آبائی مسکن کی طرف روانہ ہوا تھا۔

اس وقت تک قاعدو چنگیز خان کے مسکن میں اپنی حالت بہتر بنا چکا تھا شمال کے وحشی تاتاری مانچو بھی اس سے آن ملے تھے سب سے پہلے قبلائی اپنے لشکر کے ساتھ اپنے آبائی وطن پہنچا اس کے لشکر کی تھوڑی سی تعداد دیکھتے ہوئے شمال کے وحشی مانچو تاتاریوں نے ان پر حملہ آور ہونا چاہا لیکن چین میں رہتے ہوئے قبلائی کے ہتھیار وہ نہ رہے تھے جو اس سے پہلے چنگیز خان اس کا بیٹے اور اس کے پوتے استعمال کرتے تھے چین میں رہتے ہوئے قبلائی خان نے چینیوں کی وجہ سے بارود کا استعمال سیکھ لیا تھا لہٰذا جب مانچو قبائل نے قبلائی خان کو گھیرنے کی کوشش کی تو بارود استعمال کئے ہوئے گولے ان پر پھینکے گئے جو جہاں گرتے آگ لگا دیتے دھوئیں کے بادل کھڑے کردیتے۔

یہ صورت حال شمال کے وحشی مانچو قبائل کے لئے نئی تھی اتنی دیر تک قبلائی خان کے وہ لشکر بھی اس کے پاس پہنچ گئے جو شمالی چین کی مہموں میں مصروف تھے اس طرح قبلائی خان کے پاس اپنی پوری طاقت جمع ہوگئی تھی اس کے بعد اس نے مانچو قبائل کے علاوہ قاعدو پر حملے شروع کردیئے تھے۔

چینیوں کی مدد سے قبلائی خان نے جو آگ کے گولے بنائے تھے ان کی وجہ سے قاعدو کے لشکر میں ہلچل مچ گئی مانچو خوفزدہ ہوگئے قبلائی خان کے حملے کو مانچو برداشت نہ کرسکے لہٰذا قاعدو کا ساتھ چھوڑ کر وہ شمال کے اپنے جنگلوں کی طرف بھاگ گئے تھے مانچو قبائل کے بھاگنے کے بعد قاعدو کو بھی قبلائی خان کے ہاتھوں بدترین شکست ہوئی اور وہ بچے کھچے لشکر کو لے کر مغرب کی طرف بھاگ گیا تھا۔

اس طرح قبلائی نے اپنا آبائی وطن قاعدو سے چھڑا لیا تھا حالانکہ اس وقت قبلائی بوڑھا ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ گنٹھیا کا مریض بھی ہوچکا تھا پھر بھی وہ ہاتھیوں کی پشت پر مہورے میں بیٹھ کر اپنے سالاروں کو ہدایت دیتا رہا قاعدو اور شمال کے وحشی تاتاری قبیلے مانچو کے خلاف اس نے شاندار فتح حاصل کی اس شاندار فتح کے بعد پھر نہ کبھی قاعدو کو جرأت ہوئی کہ وہ قبلائی خان سے اس کا آبائی وطن چھیننے کی کوشش کرے اور نہ ہی شمال کے وحشی تاتاری قبیلے مانچو کو کبھی جرأت ہوئی کہ وہ شمال کے اپنے برفانی جنگلوں سے نکل کر منگولوں کے آبائی مسکن پر حملہ آور ہوں۔

قاعدو کی طرف سے فراغت پانے کے بعد اب قبلائی خان نے دوسری سمت سے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا ارادہ کی اس نے لشکری تیار کئے جنوب کی طرف روانہ کئے قبلائی خان کے یہ لشکر کوریا اور برما تک پہنچ گئے اور کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا یہاں تک کہ قبلائی خان کے بحری بیڑے کے کچھ جہاز ملایا اور سماٹرا تک جا پہنچے۔ قبلائی خان کے ایک اور لشکر نے تبت کی سرزمینوں پر قبضہ کرتے ہوئے آگے پیش قدمی کرنا چاہی وہ چاہتے تھے کہ بلند کوہستانی سلسلوں کو عبور کرکے آگے جائیں لیکن انہیں ناکامی ہوئی اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو یقیناً وہ ہمالیہ کو عبور کرکے ہندوستان میں داخل ہوجاتے۔

برما اور کوریا پر ایک طرح سے قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے لوگوں کو قبلائی خان نے اپنے لشکر میں شامل کیا اس وقت تک اس کے بحری بیڑے کے ملاحوں نے اسے جاپان کے متعلق بہت سی خبریں پہنچادی تھیں جاپان سے متعلق خبریں ملنے کے بعد قبلائی خان نے کچھ جہازوں میں اپنے قاصد جاپان کی طرف روانہ کئے

ان قاصدوں نے جاپانیوں کو قبلائی خان کا یہ پیغام دیا۔

’’منگول سلطنت تم سے مہربانی کا سلوک کرنا چاہتی ہے وہ یہ نہیں چاہتی کہ تم اطاعت قبول کرو بلکہ وہ یہ چاہتی ہے کہ تم عظیم منگول سلطنت کا ایک حصہ اور جز بن جانا قبول کرلو۔‘‘

جاپان کے حکمران طبقے نے ان سفیروں سے ملاقات تک کرنا گوارہ نہ کی جب وہ قاصد واپس قبلائی خان کے پاس آئے تو قبلائی خان نے ایک چھوٹا سا بحری بیڑا جاپان پر حملہ آور ہونے اور اس پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔

قبلائی خان کا یہ بحری بیڑا جاپان کی طرف بڑھا لیکن اس دور میں جاپانی بھی منگولوں کی طرح انتہا درجے کے جنگجو تھے۔ قبلائی خان کا بحری بیڑا ابھی جاپان کے ایک بیرونی جزیرے تسوشیما کے پاس ہی پہنچا تھا کہ اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور یہ بحری بیڑا ناکام ہوگیا، اس ناکامی پر قبلائی خان کو بے حد غصہ آیا اس نے ایک اور بہت بڑا بحری بیڑا تیار کیا اس بحری بیڑے میں قبلائی خان نے لگ بھگ تیس ہزار منگولوں کو رکھا اور منگولوں سے دوگنی تعداد بحری بیڑے میں چینیوں اور کوریا والوں کی رکھی تھی یہ اتنا بحری بیڑا تھا کہ اس میں بہت سے گھوڑے بھی لشکر کے ساتھ کردیئے تھے۔

جس طرح ہسپانوی بیڑے نے انگلستان کے مقابل کوئی کامیابی حاصل نہ کی تھی اس طرح یہ منگول بیڑا بھی جاپان میں ناکام رہا زمین پر اتر کر انہوں نے اپنے پڑاؤ کے اطراف میں ابھی مورچے بنانے شروع کئے ہوئے تھے کہ جاپانی جنگجو دستے ان پر حملہ آور ہوگئے جاپانی منگولوں کے حملوں سے قطعاً خائف نہ تھے اور وہ خوفناک حملے کرتے ہوئے منگولوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کررہے تھے۔

☆......☆......☆

اسی دوران منگولوں کی بدقسمتی کہ ایک طوفان سمندر کے اندر آیا جس کی وجہ سے ان کی باربرداری کی کشتیاں منتشر ہوگئیں۔ ان کشتیوں کے اندر ان کے کھانے پینے اور خوراک کا سامان تھا جس کی وجہ سے منگولوں کے لئے ایک مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی اور اس طوفان کی وجہ سے ان کی کچھ کشتیاں ڈوب بھی گئیں۔

آخر جاپانیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ منگولوں نے نئی کشتیاں بنانے کی کوشش کی ساتھ ہی جاپان کی سرزمینوں سے اپنے لئے کھانے پینے کا سامان بھی حاصل کیا لیکن جاپانیوں نے اس جانفشانی سے مقابلہ کیا کہ انہیں آگے نہ بڑھنے دیا۔ یہاں تک کہ جاپانیوں کے مقابلے میں منگول چینی اور کوریائی عاجز آگئے انہیں شکست اٹھانا پڑی کچھ منگولوں نے ہتھیار ڈال دیئے جاپانیوں نے انہیں قتل کردیا بہت سے کوریا والوں کو بھی انہوں نے گرفتار کرلیا بہت کم کو اپنی جانیں بچا کر قبلائی خان کے پاس پہنچنا پھر نصیب ہوا۔

اس شکست سے قبلائی خان کو اور برہمی ہوئی اس کے غصے اور غضبناکی کی کوئی انتہا نہ تھی آخر اس نے ایک اور بہت بڑا بحری بیڑا تیار کیا اس نے چینی راہبوں کو پہلے جاسوس بنا کر ان جزیروں کی طرف بھیجا لیکن جن کشتیوں میں جن راہبوں کو بھیجا گیا تھا ان کشتیوں کے ملاح جاپانیوں کے وفادار تھے لہٰذا انہوں نے ان راہبوں کو راستے میں سمندر کے اندر ہی مار کر ختم کردیا۔

اس کے بعد قبلائی خان نے ایک اور بہت بڑا لشکر اور عربی بیڑا تیار کرتے ہوئے جاپان پر حملے کی تیاریاں شروع کیں۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے بحری بیڑے کو کوریا کی بندرگاہوں میں اس کے خلاف بغاوت شروع ہوگئی اس کے ملاح کشتیاں چھوڑ کر بھاگ گئے وہ جاپان پر حملہ آور نہیں ہونا چاہتے تھے جنگی کشتیوں کے ناظم سمندر میں نکل کر بحری قذاقی کرنے لگے اور ساحلوں کو لوٹ لوٹ کر دولت جمع کرنا شروع کردی تھی۔

قبلائی خان کے لشکر میں جو چینی عہدے دار تھے وہ بھی جاپان پر حملہ آور نہیں ہونا چاہتے تھے ان میں سے جن کے سپرد غلہ اور رسد فراہم کرنے کی ذمہ داری تھی وہ بھی ان چیزوں کی فراہمی میں کوتاہی کرنے لگے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے قبلائی خان کے سپہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سالاروں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر اس نے جاپان پر حملہ آور ہونے کے لئے بحری بیڑا روانہ کرنے کے لئے اصرار کیا تو کھلم کھلا بغاوت کا ڈر ہے بلآ خر خود قبلائی کو اس کا احساس ہوگیا کہ جاپانیوں کے خلاف ایک اور مہم بھیجنا بے کار ہے لہٰذا اس نے جو بحری بیڑا تیار کیا تھا اسے جاپان پر حملہ آور ہونے سے روک دیا۔

قبلائی خان اب بوڑھا ہو چکا تھا پھر وہ گنٹھیا کا مریض بھی تھا اس دوران اسے دو صدمے ایسے ملے جنہوں نے اسے اور بوڑھا کردیا پہلا یہ کہ اس کی بیوی جاموئی مرگئی اور دوسرا صدمہ جو اسے پہنچا وہ یہ کہ اس کا بیٹا چنگ کم بھی فوت ہوگیا چنگ کم کو قبلائی خان بڑا پسند کرتا تھا اس لئے کہ اس میں دشت نوردوں کی سی سختی پائی جاتی تھی۔

اپنی زندگی کے آخری دور میں قبلائی خان بڑا اداس اور افسردہ رہنے لگا تھا اس دور میں مارکو پولو اور اس کے ساتھ جو اہل مغرب کے کچھ لوگ تھے انہوں نے قبلائی خان سے گزارش کی کہ انہیں اپنے وطن کی طرف جانے کی اجازت دے دی جائے قبلائی نے انہیں جانے کی اجازت دے دی ان کے سپرد یہ خدمت کی کی کہ وہ اپنی نگرانی میں قبلائی خان کی بیٹی شہزادی کوکا چین کو حفاظت سے ایران پہنچادیں۔

قبلائی خان بیٹی کوکا چین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس کی عمر سترہ سال تھی وہ بڑی حسین اور جاذب نظر تھی۔

قبلائی خان اپنی اس بیٹی کو اس لئے ایران بھیج رہا تھا کہ وہاں ہلاکو خان کی نسل سے ایک شخص ارغون کی پہلی بیوی مرچکی تھی مرنے والی بیوی کا تعلق اسی قبیلے سے تھا جس قبیلے سے قبلائی خان کی بیوی جاموئی کا تعلق تھا لہٰذا ارغون کا یہ اصرار تھا کہ وہ اپنی مرنے والی بیوی کے قبیلے ہی سے شادی کرے گا۔ اس سلسلے میں ارغون کے جو سفیر قبلائی خان کے دربار میں تھے انہوں نے قبلائی خان کی بیٹی کوکا چین کو پسند کیا ارغون کے لئے رشتہ مانگا جس کے لئے قبلائی خان نے ہاں کہہ دی اور پھر ارغون نے یہ پیغام بھیجا کہ شہزادی کوکا چین کو پولو خاندان کی تحویل میں بھیجا جائے کیونکہ یہ لوگ جنوبی سمندروں سے بخوبی واقف تھے۔

ایسا اس بناء پر کیا جارہا تھا اور کوکا چین کو سمندر کے راستے اس لئے بھیجا جارہا تھا کیونکہ قبلائی خان کے بھتیجے قاعدو سے جنگ کی وجہ سے بری راستہ مخدوش ہوگیا تھا اس لئے قبلائی نے اپنی بیٹی کوکا چین کو سمندر کے راستے روانہ کیا مارکو پولو اور اس کے ساتھی سمندر میں سفر کرتے ہوئے ساٹرا اور پھر بحر ہند میں داخل ہوئے اور قبلائی خان کی بیٹی کو انہوں نے ہلاکو خان کی اولاد کے مرکزی شہر مراغہ میں جا پہنچایا تھا۔

1294ء کے پہلے مہینے میں آخر قبلائی خان فوت ہوگیا۔ اس نے اسی سال کی عمر پائی اور پینتیس سال حکومت کی اس خواہش کے مطابق اس کی لاش کو چین میں دفن نہیں کیا گیا بلکہ منگولوں کے روایتی چھکڑے میں لاد کر اس کی لاش کو اس کوہستانی سلسلے میں لایا گیا جس کوہستانی سلسلے کے اندر چنگیز خان قبلائی خان کے باپ قبلائی خان کے بھائی اور دوسرے عزیز و اقارب کی قبریں تھیں اور وہیں قبلائی خان کو دفن کردیا گیا تھا۔

قبلائی خان سے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ علماء کا دوست تھا جو دولت کو اپنے اور اپنی رعایا دونوں کے لئے عزیز رکھتا تھا اس کے متعلق چینیوں کی رائے تھی کہ وہ حد سے زیادہ اوہام پرست تھا اور عورتوں اور چاندی کا بڑا شوقین تھا اور اپنی ضعیف اعتقادی کے باعث مضحکہ خیز حد تک تبت کے لامادی کے زیر اثر تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قبلائی کی چین کی فتوحات سے پہلے ہی چین کا تمدن قبلائی کو فتح کرچکا تھا اصلیت اس سے بھی بڑھ کر ہے اس نے منگولوں کی جبلت سے چینیوں پر حکومت کرنا چاہی اپنی سرداری اور ذاتی جاہ و چشم پر اسے گھمنڈ تھا وہ ایسا ہی تھا جیسے خانہ بدوشوں کو عام طور پر ہوا کرتا تھا اپنی اس ذاتی آرزو کی تکمیل میں وہ چاہتا تھا کہ سچ مچ چینیوں کا آقا بن جائے اس نے پرانی قبائلی زندگی اور منگول رشتوں سے اپنا ربط توڑ دیا اور

چینیوں میں گھل مل گیا جب وہ مراتب چنگیز خان کے دشت میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔

اپنے بیٹے چنگ کم کے مرنے کے بعد قبلائی خان نے اپنے پوتے یعنی چنگ کم کے بیٹے کو اپنا جانشین بنادیا تھا قبلائی کا انتقال اس زمانے میں ہوا جب تیرہویں صدی کے آخری برسوں میں دنیا کے اندر بڑی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں منگول سلطنتیں اپنی حدود میں سمٹ گئی تھیں شمالی ایشیا سے ہجرتوں کے سلسلے کا خاتمہ ہوگیا دو ہزار سال سے اہل دشت جنوب اور مغرب کی طرف یلغار کرتے چلے آرہے تھے اب یہ انسانی مدو جزر بند ہوگیا تھا اور متمدن مرکزوں پر حملے کا دور اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا مغرب بعید میں سلجوقی ترک ایک بہت بڑی طاقت کی صورت میں کروٹ لیتے ہوئے اپنے سامنے آنے والے ہر دشمن کو شکست کے داغ لگا رہے تھے۔ عثمانی ترک ایک بہت بڑی طاقت بن کر یورپ کے دروازے پر دستک دینے والے تھے اور مشرق بعید میں مانچو قبیلے کے تاتاری جنگلوں سے نکل کر شمالی چین کی نراد زمین میں پیش قدمی کرتے ہوئے بہت سے علاقوں پر قبضہ کرنے کی ابتداء کرنے والے تھے۔

''چنگیز خان نے کبھی پیش گوئی کی تھی کہ اس کے جانشین لذیذ کھانے کھانے لگیں گے، ریشمی کپڑوں سے تن ڈھانکیں گے، حسین عورتوں کو سینے سے لگائیں گے اور بھول جائیں گے کہ کس کی بدولت انہیں یہ ساری نعمتیں میسر ہوئیں۔''

چین میں بھی یہی ہوا قبلائی کے بعد اس کا پوتا تیمور تخت نشین ہوا جس میں بعض ذاتی خوبیاں تھیں ہوائی میں وہ شرابی اور عیاش تھا لیکن جب قبلائی خان کے دیو نقش تخت پر مسند نشین ہوا تو سنبھل کے اعتدال کی زندگی بسر کرنے لگا اس نے حکم نافذ کیا کہ اس کے اپنے حکم کے بغیر ساری سلطنت میں کسی کو سزائے موت نہ دی جائے اس نے دوسرا حکم یہ جاری کیا کہ جو سالار اپنے سپاہیوں کو کسانوں کی فصلیں لوٹنے یا تباہ کرنے کی اجازت دیں گے انہیں سخت سزا دی جائے گی۔

قبلائی خان کا پوتا رحم دلی سے کام لے رہا تھا جبکہ رحم کی یہ صنعت خانہ بدوشوں کے پرانے نقشہ فتح سے ایک مختلف چیز تھی۔ دراصل قبلائی کے جانشین وہ کچھ کررہے تھے جو پرانے منگول اصول کے بالکل برعکس تھا تیمور نے اپنے دور میں لشکر کے سالار زیادہ تر ترک مقرر کئے لشکر میں اس نے صناع بھی ترک ہی بھرتی کئے تھے اسی بناء پر اس کے دور میں چینی کھل کر کہتے تھے کہ چین کے لوگ منگولوں کی تین خطاؤں کو کبھی نہیں معاف کریں گے پہلی تبت کے لاماؤں کی سرپرستی، دوسری اعلیٰ عہدوں پر اجنبیوں کا تقرر اور تیسری منگول معیشت کی زوال تھی۔

کاغذی سکوں کی وجہ سے بھی قبلائی خان کے بعد معیشت کی حالت بری ہوگئی کاغذی سکے کی قیمت کئی بار گری اور کم کردی گئی محصول بڑھادیا گیا اس سے عوام پھر نچوڑے جانے لگے کیونکہ عہدے دار اپنا بار ہلکا کرنے کے لئے عوام سے پیسہ نچوڑتے تھے اس کے علاوہ جنوب میں قحط کے آثار نمودار ہوئے۔ کفیسانیوں نے گھر ویران کرنے شروع کردیئے اور پھر مزید یہ کہ اردگرد سے بھترے سے وحشی قبائل نکل کر بڑی تعداد میں ٹڈی دل کی طرح چین کے مختلف حصوں میں آباد ہونا شروع ہوگئے تھے اور انہیں روکنا اب قبلائی خان کے جانشینوں کے بس کی بات نہ رہی تھی۔

تیمور کے جانشینوں میں قبلائی اور تیمور کی سی قوت عمل نہ تھی منگول لشکر سرحد کی چوکیوں پر منتشر تھے بیرونی دشت کے رہنے والے مخالف تھے اور منگولوں کی حکومت اب برائے نام ہی رہ گئی تھی۔

منگولوں کے اطراف میں بڑی بڑی تبدیلیاں اور انقلاب رونما ہورہے تھے وسط ایشیا سے دور آتشی اسلحہ کو ترقی دی جارہی تھی اور چھاپے کی مشین کی تکمیل کی جارہی تھی لیکن اس وقت تک دشت تک نہ توپ خانہ پہنچا تھا نہ کتابیں اور خانہ بدوشوں کی زندگی ان کے بغیر ہی مکمل تھی خانہ بدوش جو اپنی آزادی کی قدر کرتا تھا اپنے آپ کو شہری سے افضل سمجھتا تھا کام کاج سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جہاں تک ان کے کسانوں کا تعلق تھا تو وہ اپنے آپ کو بہت برتر سمجھنے لگے تھے جو اپنے کھیت چھوڑ کر کہیں نہ جاتے تھے اس کے باوجود اب بھی خانہ بدوشوں کو اپنے بال دار ٹٹو پر سوار ہو کر چراہ گاہ کی سیر کرنے اور ہاتھ میں شہباز لئے پھرنے کا شوق تھا تبدیلی کے باوجود ان وحشیوں کے نزدیک توڑے دار بندوق بھونڈی سی چیز تھی اور کتاب کا پڑھنا بڑا خشک سا کام تھا اور بالکل بے کار بھی۔

لیکن اس طرح سوچنے سے حالات تبدیل نہ ہو سکتے تھے ان کی نظروں سے اوجھل ایک تبدیلی رونما ہو رہی تھی تیر انداز شہہ سوار کی برتری کا خاتمہ ہو رہا تھا خانہ بدوشوں میں جسمانی سختیاں جھیلنے کی جو صلاحیت تھی وہ بندوق کے سامنے بے کار تھی خانہ بدوشوں کے تیز رہوار توپ خانے اور برق انداز حملوں کے آگے بے کار تھا اور اب صورت حال بڑی تیزی سے یہ پیدا ہوتی جا رہی تھی کہ طاقت کا عصا خانہ بدوشوں کے ہاتھ سے نکل کر متمدن دنیا کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگا تھا۔

بہر حال قبلائی خان کا خاتمہ ہوا جہاں وہ نرم دل تھا وہاں دوسرے مذاہب کی قدر کرنے والا بھی تھا ایک بار اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

چار پیغمبر ایسے ہیں جن کی لوگ اطاعت کرتے ہیں اور جن کی لوگ عزت کرتے ہیں۔

یہ چار حضرت یسوع مسیح، حضرت محمدؐ، حضرت موسیٰ اور ساقیہ منی مطلب مہاتما بدھ ہیں۔

اس نے مزید کہا کہ میں ان چاروں کے آگے سر جھکاتا ہوں جس نے انہیں عظمت بخشی اور جو جاودانی آسمان میں ہے میں اس سے امداد کی التجا کرتا ہوں کچھ مورخین کا بیان ہے کہ منگولوں کے دین اور مذاہب کا پتا نہیں چلتا لیکن دوسرے مورخین کہتے ہیں کہ وہ ایک خالق اور قادر ہستی کا تصور ضرور رکھتے تھے یعنی خدا تعالیٰ کے قائل تھے اس لئے کہ ایک بار چنگیز خان نے خود اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس کے پاس چند علماء کو لایا جائے تا کہ وہ ان سے گفتگو کرے اس پر چنگیز خان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قاضی اشرف اور ایک جید عالم اس کے سامنے پیش کئے گئے ان دونوں کا تعلق بخارا سے تھا جب یہ دونوں چنگیز خان کے سامنے پیش ہوئے تو چنگیز خان کے پوچھنے پر ان دونوں علماء نے سب سے پہلے توحید باری تعالیٰ کا عقیدہ چنگیز خان کے سامنے پیش کیا۔

"چنگیز خان نے کہا کہ میں اس عقیدے کو تسلیم کرتا ہوں۔"

اس کے بعد دونوں علماء نے رسالت کا عقیدہ پیش کیا۔ جواب میں چنگیز خان نے کہا کہ میں اس بات کو بھی قبول کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ بندوں کی ہدایت کے لئے دنیا میں اپنے ایلچی اور پیغمبر بھیجا کرتا ہے اس کے بعد انہوں نے نماز اور روزے کے لازمی ہونے کا حال بیان کیا جس پر چنگیز خان نے کہا۔

اوقات معینہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت بجالانا اور گیارہ مہینے کے بعد ایک مہینے کے روزے رکھنا بھی بڑی معقول بات ہے اس بناء پر مورخین اندازہ لگاتے ہیں کہ منگول اور وحشی قبائل میں خدا نے کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور مبعوث کیا ہوگا جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نامے لاتے ہوں گے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہالت کے سبب منگول اپنے پیغمبر اور آسمانی ہدایت ناموں کو فراموش کر بیٹھے ان میں حرام اور حلال کی بھی کوئی قید نہ رہی ہر ایک چیز کھا لیتے اور ہر ایک کام کر لیتے کچھ ان کے علاقوں کی آب و ہوا کچھ ان قبائل کی عداوتیں مل ملا کر اس کا باعث ہوئیں کہ وہ مذہب سے بالکل ہی بیگانہ ہو گئے جس کی بناء پر انہوں نے انسانی قتل کو اپنا مذہب بنا لیا اور ستارہ پرستی اور عناصر پرستی ان کے اندر گھس آئی بہر حال قبلائی خان مر گیا اس کے جانشین آہستہ آہستہ کمزور ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ چین میں دوسرے قبیلے طاقت اور قوت پکڑتے چلے گئے جنہوں نے بڑی تیزی سے چین میں منگولوں پر غلبہ پانا شروع کر دیا تھا۔

☆☆

کھڑکی

ڈاکٹر فرید اللہ صدیقی

کھلی کھڑکی بند کھڑکی پر تجسس ہوتا آنا جانا اور پھر زندہ لاش کا نکر کرنا، یہ سب ایک بہت ہی ڈرائونا شاخسانہ تھا، اس کی حقیقت کیا تھی، وہ تو اچھا ہوا کہ خوابی روش کی جگہ نوجوان لاش بن جاتا۔ مگر کیسے؟

شعور اور لاشعور کا آپس میں گہرا تعلق ہے اس موضوع پر ایک سبق آموز کہانی

گھروں کے کمروں میں کھڑکیاں ہوتی ہی اس لئے ہیں کہ ان کو وقت ضرورت کھولا یا بند کیا جا سکے۔ مگر میرے گھر کے سامنے والے گھر کی کھڑکی اس لئے پر اسرار اور پر تجسس ہو گئی تھی کہ وہ کل سے بند تھی۔ کھڑکی بند ہونا کوئی حیران کن بات نہیں ہو سکتی مگر یہ وہ کھڑکی تھی جس کو میں نے ہمیشہ سے کھلی پایا۔ پچھلے کئی سالوں سے جب سے میں اس مکان میں منتقل ہوا ہوں وہ کھڑکی مستقل کھلی رہتی تھی اور کوئی سایہ سا کھلی کھڑکی سے کمرے میں گھومتے پھرتے نظر آتا تھا۔ میں نے کبھی کسی کو اس کھڑکی کے قریب کھڑے یا باہر جھانکتے نہیں دیکھا تھا۔

سامنے والے گھر کی کھڑکی مجھے اپنی بالکونی میں آنے کے بعد دیکھائی دیتی تھی۔ میں عام حالات میں کبھی کبھی ہی بالکنی میں کھڑا ہوتا تھا۔ مجھے تانک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھانک سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر مجھے سامنے والی کھڑکی سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ایک مجبوری کے سبب ہوا۔

ہوا کچھ یوں کہ بدقسمتی سے سڑک کے ایک حادثے میں میرے بائیں ٹانگ کی ہڈی میں فریکچر ہوگیا۔ پلاسٹر چڑھا کر وہیل چیئر پر بیٹھا دیا گیا۔

گھر میں تقریباً ڈیڑھ دو سال کی قید۔ ڈاکٹر اس قید مجبوری کو مکمل آرام کا نام دیتے ہیں اس مجبوری کے عالم میں میری بالکنی میری قید تنہائی میں ساتھ دیتی تھی۔ دن میں بیشتر اوقات میں اپنے وہیل چیئر پر بالکونی میں بیٹھا رہتا تھا۔ باہر کا نظارہ سڑک کی چہل پہل ریل پیل میرے لئے بند کمرے میں پڑے رہنے سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔

موسم بدل رہا تھا۔ ہوا میں خنکی صبح شام بڑھ رہی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد میں اپنی پہیوں والی کرسی پر بالکونی میں آجاتا تھا اور دوپہر کو کھانے کے وقت تک بیٹھا رہتا تھا اخبار کی سرخیوں میں ایک نظر ڈال کر میں رکھ دیتا تھا۔ سیاسی قلابازیوں اور دہشت گردی کے واقعات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ مجھے ہمیشہ سے چونکا دینے والی کہانیاں پڑھنی پسند تھیں ایسی کہانیاں جو دلفریب، حیرت انگیز، پرتحیر راہ بر اندام اور جسم میں رونگٹے کھڑے کرتی ہوئی خوفناک دہشت ناک، وحشت ناک اور دل و دماغ کو مبہوت کرتی ہوئی ناقابل فراموش کہانیاں ہوں۔ خوش قسمتی سے میری ایسی پسندیدہ کہانیاں مجھے ہر ماہ ڈر ڈائجسٹ میں پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے حادثے سے پہلے دیگر مصروفیات کی وجہ سے ڈر کی کہانیاں پڑھ نہیں پایا تھا۔ اب کئی ماہ کے جمع شدہ مواد پڑھنے کا وقت ہی وقت تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میں خود اسی طرح کی ایک کہانی کا کردار بن جاؤنگا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میرے سامنے والی ہمیشہ سے کھلی کھڑکی دو دنوں سے بند تھی۔ بند ہے تو ہے میرا کیا جاتا ہے یہ سوچ کر میں آسانی سے اپنی تشویش کو سکون اور اطمینان میں بدل سکتا تھا۔ عام حالات میں شاید میں ایسا ہی سوچتا۔ مگر پچھلے دو دنوں سے صبح و شام بالکنی میں وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے میں نے ڈر ڈائجسٹ میں کہانی پر کہانی پڑھ کر ذہن اور طبیعت میں سراغ رسانی اور تجسس کا مادہ پیدا کر لیا تھا۔ عام واقعات اور حالات میں بھی پر اسراریت محسوس ہوتی تھی۔

کھڑکی جو ہمیشہ سے کھلی رہتی تھی اچانک لگاتار دو دن و رات بند رہنا ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔ ٹانگوں نے جواب نہ دیا ہوتا تو میں خود چل کر سامنے والے گھر میں جاتا اور کسی نہ کسی بہانے سے کھڑکی کے بند ہوجانے کا راز جاننے کی کوشش کرتا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اندر کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ موبائل فون ایک لنگڑے کے لئے کتنا ضروری ہے۔ وہیل چیئر کو موڑ کر پہیہ کو دھکا دے کر بالکنی سے کمرے کے اندر جانے میں کچھ وقت لگا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی تھی کہ بجے جا رہی تھی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف دیرینہ دوست یعقوب تھا۔ ایک عرصہ کے بعد اس نے فون کیا تھا۔ میں نے شکایت کی تو جواب معقول تھا کہ ”میں یہاں کہاں تھا کاروبار کے سلسلے میں کوریا گیا ہوا تھا۔ اب سب سے پہلے واپس آنے کے بعد تمہیں فون کیا ہے۔ ملنے آرہا ہوں۔ تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔“

”فوراً آجاؤ تحفے کے لالچ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ پرانا شوق یاد آجائے گا۔“

”کون سا شوق جلدی بتاؤ؟“ یعقوب نے بے چینی سے سوال کیا۔

”تمہارا یہ پرانا شوق ہی منع کرتا ہے کہ ٹیلی فون پر ساری باتیں نہیں کرنی چاہیے۔ درمیان میں کوئی اور کان بھی ہوسکتا ہے۔ مخبری ہو جائے گی۔“ یعقوب کی آواز سنتے ہی مجھے اس کی جاسوسی کا شوق یاد آگیا تھا۔

کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ کل اور آج میں کتنا وقت گزر چکا ہے مگر کالج کی باتیں اب جب یعقوب سے باتیں کرنے کے بعد یاد آئی ہیں تو اب لگا کہ ہم پھر اسی دور میں واپس پہنچ چکے ہیں۔ جاسوسی کا قصہ کچھ یوں کہ ان دنوں ابن صفی اور منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے انگریزی جاسوسی ناول بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے اور یعقوب تو انکا شیدائی تھا۔ اس کے اندر بھی جاسوسیت حلول کر گئی تھی۔ کالج کے ہر لڑکے کی وہ جاسوسی کر چکا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے جاسوسی تجربے کو بیان کرتا تھا مگر افسوس آج تک وہ کسی کے چونکہ دینے والے راز کوئی بچھو کو نہیں پکڑ پایا تھا۔ مگر اسے پھر بھی یقین ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے۔ جسے وہ ایک روز حل کرے گا۔ اب تنا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ ایک کامیاب معروف کاروباری شخص تھا۔ کالج کے دن شاید اسکو اس طرح یاد نہ ہوں جیسے مجھے اب اپنی مجبور کے عالم میں یاد آرہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں ابھی تک بالکنی میں بیٹھا سامنے والی کھڑکی پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ دروازے تک پہنچنے میں مجھے پھر کچھ وقت لگا اسی دوران یعقوب کی انگلی گھنٹی کے بٹن سے ہٹی تو میں نے دروازہ کھولا۔ یعقوب نے سلام دعا سے پہلے حسب عادت شکایت کی۔ ”تو کیا تم انتظار کر رہے تھے کہ گھنٹی بند ہو تو تم دروازہ کھولو۔“ پھر فوراً ہی جب اس کی نظر میری ٹانگ پر گئی اور مجھے وہیل چیئر پر پایا تو آئی ایم سوری کہہ کر مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پھر زوردار قہقہہ کے بعد ہم وہی یار بن گئے جیسے کالج کے زمانے میں تھے۔ ہنسی مذاق ابے تبے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس نے ڈبہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو تمہارا تحفہ“

”کیا ہے؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”کھول کر دیکھ لو۔“ اس نے شک کی آواز میں کہا۔

”بھئی کوریا سے آتے وقت کچھ سمجھ نہیں آرہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی کہ تمہارے لئے کیا لوں۔ بس یہ لے آیا۔'' میں نے ڈبہ کھولا تو اس میں سے ایک بہت طاقت ور دوربین نکلی۔ ''ارے واہ میری جان تمہیں کیسے خیال آیا کہ مجھے آجکل ایک دوربین کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔''

''شرلک ہومز کی طرح سوچنے کی عادت ابھی تمہاری گئی نہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''چلو مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں دوربین پسند آئی۔ مگر میں سمجھا نہیں، تمہیں آجکل اس حالت میں اس کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اچھا سمجھ گیا۔ باہر نکل نہیں پا رہے ہو تو پھر دوربین سے دور کے نظارے۔ مگر یار تم تو کبھی تانک جھانک کے عادی نہیں تھے۔ خیر آؤ چلو تمہاری بالکونی سے دیکھتے ہیں کیا کیا دیکھائی دیتا ہے۔''

ہم دونوں بالکنی میں آئے۔ اب شام ہو چلی تھی۔ یعقوب نے کچن میں جا کر دو مگ جھاگ دار کافی کے بنا لایا تھا۔ دل بھر کے پرانی باتیں یاد کرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اسے خوش کرنے کے لئے میں دوربین دیکھ کر خوش ہوا یا واقعی مجھے اس کی ضرورت تھی اور اگر تھی تو کیوں تھی؟ میں نے سامنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ کھڑکی دیکھ رہے ہو جو بند ہے۔ وہ بند کیوں ہے یہ راز جاننے کے لئے دوربین کی ضرورت ہے؟'' وہ بڑی زور سے ہنسا۔

''واہ میرے یار تمہارا بھی جواب نہیں۔ میرے بھائی دوربین سے دیکھنے کے بعد بھی وہ کھڑکی بند ملے گی۔ ہاں اگر کھڑکی کھلی ہوتی تو کوئی بات ہوتی کہ شاید تم کسی کو کمرے کے اندر دیکھنے کی کوشش میں ہو۔ ویسے بتاؤ تو سہی کون کافر حسینہ ہے اس بند کھڑکی کے پیچھے۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دیکھو یعقوب تمہاری شوقیہ جاسوسی کا شوق اب میرے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ اس سامنے والی کھڑکی کا راز یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کھلی رہتی تھی کئی سالوں سے دن و رات مگر اب کئی دنوں سے مسلسل بند ہے۔''

''تو اس میں راز کی کونسی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی نیا کرایہ دار یا مالک مکان آ گیا ہو جس نے اب کھڑکی بند کر دی۔ بس۔''

''نہیں میرے دوست مجھے کچھ بو آ رہی ہے دیکھ جب پہلے کھڑکی مسلسل کھلی رہتی تھی تو مجھے کمرے میں ایک سایہ گھومتا پھرتا دیکھائی دیتا تھا وہ سایہ کھڑکی کے قریب نہیں آتا تھا۔ مگر اب دو دن پہلے میں نے اس کھڑکی سے ایک جنبی چہرے کو کھڑکی سے باہر دائیں بائیں اور اوپر نیچے جھانکتے ہوئے دیکھا اور جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے فوراً کھڑکی بند کر دی۔ پھر جب سے اب تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا یہ کھڑکی نہیں کھلی۔''

یعقوب نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ''ارے تم بھی کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔''

یہ دوربین لو اور سامنے والی وہ دوسری بلڈنگ جو ابھی نئی تعمیر ہوئی ہے اور نئے کرایہ دار آ کر بسے ہیں ان کی نظر یاتی جاسوسی کرو۔ ہر ایک کے بارے میں اپنی رائے قائم کرو اور جب تم ماشاءاللہ چلنے کے قابل ہو جاؤ تو جا کر پتہ لگانا کے تمہاری قیاس کے ایاں کس حد تک درست تھیں۔''

''مشورہ تو تمہارا بہت اچھا ہے اور میں اس پر ضرور عمل کروں گا مگر پہلے مجھے سامنے والی کھڑکی کی تسلی کرا دو۔''

ایسا کرو میرے دوست کہ تم میرے خاطر سامنے گھر میں جاؤ۔ وہاں کے مکین سے ملاقات کرو اور حقیقت حال جاننے کی کوشش کرو تم تو خود اپنے وقت کے مشہور شوقیہ اسٹوڈنٹ جاسوس رہ چکے ہو۔ تمہاری پرانی یاد تازہ ہو جائے گی۔ مجھے اطمینان ہو جائے گا۔''

میرے اس طرح بضد ہونے پر یعقوب بیچارہ مجبوراً راضی ہو گیا۔

''اچھا تو پھر میں ابھی تمہاری تسلی کرائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ واقعی میرا دل رکھنے کو یا پھر اپنے شوق میں سامنے والے مکان کی جانب گیا۔ میں نے بالکنی

سے اسے سڑک کراس کرتے دیکھا۔ اس گھر کا دروازہ اندر جانے کے لئے سائڈ والی گلی میں تھا۔

میں نے یعقوب کو اس گلی کے اندر جاتے دیکھا۔ میں نے ابھی پہلی مرتبہ دوربین کو اپنی آنکھوں سے لگایا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ مجھے اس بند کھڑکی کے پیچھے پردہ سا ہلتا دیکھائی دیا۔ پھر وہی پر اسرار خاموشی۔ یعقوب کو گئے ہوئے اب کوئی پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ پھر دس منٹ اور ہو گئے اور یعقوب واپس نہیں لوٹا پھر آدھ گھنٹے کے بعد وہ مجھے گلی سے تیزی سے آتے دیکھائی دیا۔

''آخر اسے اتنی دیر کیوں لگ گئی؟ شاید مکین نے بٹھا لیا ہو۔'' میں اپنی قیاس آرائی کر رہا تھا کہ وہ واپس آ گیا۔ یعقوب کے چہرے سے ڈر و خوف اور دہشت برس رہی تھی۔ پہلے تو اس نے جگ سے دو گلاس پانی پیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ کہیں دور سے نہیں بلکہ صرف سڑک پار سے آیا تھا۔

پانی پینے اور سانس قابو میں آنے کے بعد وہ بولا تو اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

''لگتا ہے کہ تمہاری ٹانگ کے حادثے کی وجہ سے تمہاری چھٹی حس بہت بیدار ہو گئی ہے۔ یہاں اپنی بالکنی میں بیٹھے بیٹھے اتنی دور سے ایک بند کھڑکی کے پیچھے تم نے وہ خوفناک اور بھیانک نظارہ دیکھ لیا ہے جو میں ابھی اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اور مجھ پر ایک دہشت طاری ہے بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، بتاؤ تو سہی تم نے کیا دیکھا۔ کیسے دیکھا۔ کس سے ملاقات ہوئی ہوا کیا تفصیل سے بتاؤ۔ یعقوب کہنے لگا کہ میں سوچ کر آیا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گی۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ رہے گا۔ کہیں گھومنے جائیں گے رات کو کہیں پر فضا مقام پر ڈنر کریں گے۔ مگر مجھے تو خوف کی لہریں گھیرے ہوئے ہے۔ میں نے معافی مانگتے ہوئے یعقوب سے کہا کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یوں میری وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ ویسے بھی میری اس مجبوری کے تحت ہم باہر نہیں جا سکتے تھے۔ خیر میرے پیارے دوست بتاؤ تو سہی سامنے والے گھر میں کیا ہوا۔ یعقوب نے بھاری آواز میں کہا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔ پولیس کو رپورٹ کریں میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ کیا بات کیا ہے۔ دیکھو میرے دوست تمہارے کہنے پر میں اس کھڑکی والے گھر کے دروازے پر گیا۔ وہاں اندر کی گھنٹی کا سوئچ لگا ہوا تھا۔ میں نے کافی دیر تک گھنٹی بجائی۔ اندر سے گھنٹی کی آواز مجھے باہر آ رہی تھی۔ مگر متعدد بار گھنٹی بجانے پر بھی اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ پہلے میں نے سوچا کہ شاید گھر میں کوئی نہیں۔ باہر گئے ہوئے ہوں۔ مگر باہر کے دروازے میں پرانے زمانے کا کنڈا لگا ہوا تھا۔ جس پر باہر سے تالا لگایا جاتا ہے۔ مگر یہ کنڈا بند نہیں تھا اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ایک بار ہمت کر کے دروازے کو ہلکا سا دھکا بھی دیا۔ مگر وہ اندر سے مضبوطی سے بند تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس سے اندر سے جھانک کر یہ دیکھا جا سکتا تھا کہ باہر کون آیا ہے۔ مگر باہر والا اندر اس لئے نہیں جھانک سکتا کہ شیشے کے پیچھے پردہ پڑا تھا۔ مگر اتفاق سے اندر کا پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا۔ میں نے اس سے جھانکنے کی کوشش کی۔ کمرے میں کہیں سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔ کمرہ تقریباً خالی پڑا تھا۔ سامنے وہ کھڑکی تھی جو تم اپنے بالکونی سے دیکھتے ہو۔ اس پر اندر سے مہین جالی والا پردہ پڑا ہوا تھا۔ مگر جس شے نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے اور مجھ پر کپکپی طاری کر دی وہ ایک برہنہ انسانی جسم تھا جو کمرے کے درمیان سیمنٹ کے فرش پر چت پڑا ہوا تھا اب میں اسے لاش کہوں یا نہ کہوں یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ اس زندہ لاش کے پاس کوئی خون نہیں تھا۔ میں سکتے کے عالم میں کافی دیر اسے تکتا رہا۔ مگر وہ بے حس و حرکت چت پڑا رہا۔ جب میرے ہوش بجا ہوئے تو میں الٹے پاؤں واپس آ گیا ہوں۔

اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔ میں سوچتا ہوں پولیس کو اطلاع دے دینی چاہئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یعقوب کا بیان سن کر میں خود بھی حیران تھا اور ایک انجانی خوشی بھی کہ میں نے کیسے اندازہ لگایا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ بہت ہی گڑبڑ تھا۔ پولیس کو بتانے میں ایک قباحت یہ تھی کہ پولیس سب سے پہلے یہ پوچھے گی کہ آپ کو اس لاش کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ سچ بات بتانے پر بھی وہ اسے سچ نہیں مانے گی کہ کھڑکی سے بندیا کھلے ہونے سے آپ کو کیا مطلب یہ کسی کے پرائیویٹ معاملہ میں دخل اندازی ہے۔ پھر لاش کی تحقیقات کے سلسلہ میں عدالت میں گواہی کے چکر پولیس کسی نہ کسی طرح اس جرم میں ہمارے ہاتھ کو ثابت کرنے کی کوشش کرے گی اور خواہ مخواہ پھنسنے کا ڈر ہے لہذا خاموشی اختیار کرنا بہتر رہے گا۔ جب لاش سڑے گی اور بدبو پھیلے گی تو محلہ والے خود ہی تشویش کا اظہار کریں۔ دیکھتے ہیں تب کیا ہوتا ہے۔

اس روز یعقوب یہ وعدہ کر کے چلا گیا کہ وہ وقتاً فوقتاً آتا رہے گا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بات کہاں تک پہنچی۔

رات ہو چلی تھی۔ سردی بڑھ گئی تھی میں اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ پتا نہیں کب نیند آئی۔ آنکھ کھلی تو سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ ہر سو سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں وہیل چیئر کو ٹھیلتا ہوا باہر بالکنی میں آیا سامنے والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور کھڑکی کے قریب اس گھر میں رہنے والے پرانے دوست شاہد نے مسکرا کر مجھے سلام کیا اور ہاتھ ہلا کر میری خیریت معلوم کی۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ کل اس کھڑکی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ میں اپنے ہوش وحواس کو بجا کر رہا تھا کہ کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں کمرے میں واپس آیا۔ ٹیلی فون اٹھا کر ہیلو کیا تو دوسری طرف سے یعقوب کی آواز آئی۔ میں اس کی آواز سنتے ہی بولا۔

"یعقوب تم فوراً واپس آؤ۔ عجیب بات ہوئی ہے۔ دوسری طرف سے تشویش میں آواز آئی کیا عجیب بات ہوئی ہے تمہارے حادثے کی اطلاع تو مل گئی تھی۔ تم فکر نہ کرو میں انشاء اللہ اگلے ہفتے واپس کوریا سے کراچی پہنچ رہا ہوں۔ کہو تمہارے لئے کیا تحفہ لاؤں۔ یہاں میں نے تمہارے لئے ایک بہت خوبصورت مگر طاقت بانیا کلر یعنی دوربین خریدلی ہے۔ یاد ہے تمہیں کالج کے سامنے سے ہی دوربین لینے کا شوق تھا۔ اب میں لا رہا ہوں تم اس بالکنی سے ادھر ادھر کا نظارہ کرنا۔ میں ذہنی پریشانی کے عالم میں کہا۔

"یعقوب تم کیا بات کر رہے ہو۔ تم کل ہی تو میرے لئے دوربین لائے تھے۔" یعقوب نے پہلے کچھ ہنس کر پھر سنجیدگی سے کہا ہے۔

"لگتا ہے تم اپنے پاؤں کے درد کو دور کرنے والی اور نیند والی دوا کچھ زیادہ مقدار میں لے لی ہوگی۔ تمہاری آواز سے مجھے لگ رہا ہے کہ رات تمہاری گہری نیند میں نہیں گزری اچھا اب تم آرام کرو۔ فکر مت کرو۔ پلستر جلد اتر جائے گا۔ اللہ حافظ" کہہ کر یعقوب نے فون بند کر دیا۔ میں نے پورے کمرے کو چھان مارا کہیں کوئی دوربین نہیں تھی۔ یا اللہ یہ سب کچھ کل جو ہوا۔ کھلی کھڑکی۔ بند کھڑکی یعقوب کا آنا۔ دوربین لانا۔ پھر اس کا میری درخواست پر سامنے والے گھر پر جانا۔ وہاں سے واپس آ کر زندہ لاش کا ذکر۔ میرے خدایا کیا یہ سب ایک ڈراؤنا تصور تھا۔ میں نے فوراً درد دور کرنے اور نیند لانے کی دواؤں کی شیشی دیکھی۔ وہ خالی تھیں۔ میرے خدایہ کیا میں مارے درد کے ساری گولیاں ایک ساتھ پھانک گیا۔ زندگی تھی جو میں بچ گیا۔ ورنہ میں شاید اس خوابی لاش کی جگہ خود لاش بن چکا ہوتا۔

اب مجھے بے چینی سے یعقوب کا انتظار ہے کہ میں اسے بتاؤں کہ تم کیا جاسوس تھے۔ جو میں نے نیند میں جاسوسی کی ہے۔ اس کا ہے کوئی جواب۔ پھر اس کا جواب میں نے خود ہی سوچا۔ ذہن انسانی کی کھلی یا بند کھڑکی کیا کیا تماشے دیکھ سکتی ہے۔

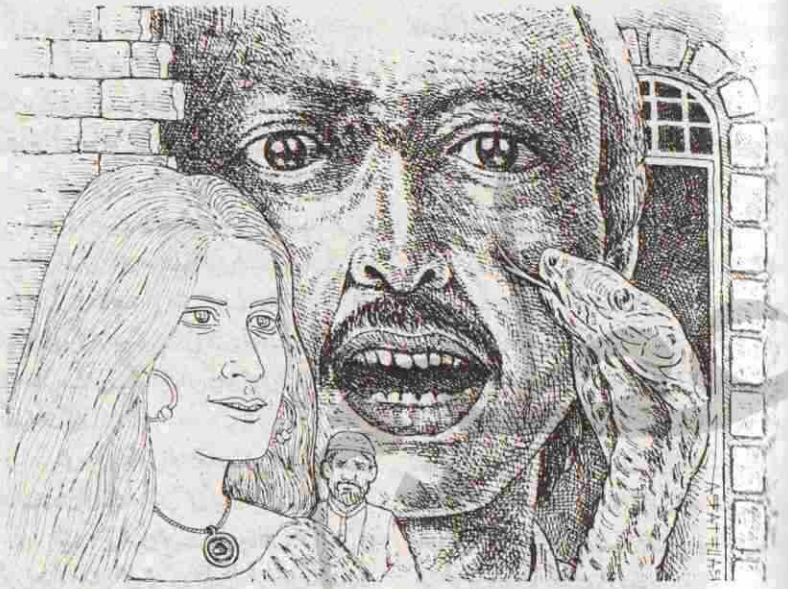

دشمن جاں

شرجیل تصور-لاہور

اس گھر میں اور گھر کے باہر ایک ہجوم کھڑا تھا، سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں، سب کے چہرے فق ہو رہے تھے، جسم پر سکتہ طاری تھا، رونگٹے کھڑے تھے زبان گنگ تھی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ اتنے میں ایک ناقابل یقین منظر رونما ہوا۔

خوف وہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک حیرت انگیز اور تحیر انگیز دل دہلاتی کہانی

میں جب یونیورسٹی جانے کے لئے صبح گھر سے نکلا تو اس وقت آسمان پر ہلکے ہلکے بادل کے ٹکڑے تھے مگر جب میں دوپہر کو یونیورسٹی سے واپس آیا تو اس وقت تک اچھی خاصی بارش ہو چکی تھی۔ گلی محلے پانی اور کیچڑ سے بھرے پڑے تھے۔ جو مین بازار ہمارے گھر کی طرف جاتا تھا وہ بھی بری طرح گندگی سے بھر گیا تھا، اس بازار میں کبھی تارکول ڈالا گیا تھا اور کبھی یہ پختہ بازار ہوا کرتا تھا بالکل صاف ستھرا خیر پختہ تو یہ ابھی بھی ہے مگر اب اس کا تارکول جگہ جگہ سے اکھڑ گیا ہے اور اس میں بے شمار گڑھے پڑ گئے ہیں، جب کبھی بارش ہوتی ہے تو گڑھے پانی سے بھر جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس بازار سے گزرنا اور محال ہو جاتا ہے۔

آج بھی ایسی ہی صورت حال تھی، مجھے سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، بہر حال جیسے تیسے میں اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلی تک پہنچ گیا۔

گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا جو ہمارے گھر کے پاس لگا تھا۔ اس بات سے مجھے تشویش ہوئی۔ ”خدا خیر کرے! جانے کیا مسئلہ ہے۔“

میں تیزی سے ہجوم کی طرف بڑھا قریب جانے پر پتا چلا کہ ہمارے ساتھ والے گھر میں سانپ گھس گیا ہے، اہل محلہ مل کر اس سانپ کو تلاش کرنے میں لگے تھے، یہ گھر روشن علی کا تھا، جس میں صرف وہ اور اس کی بیوی حمیدہ رہتی تھی، ان کا بچہ کوئی نہیں تھا، روشن علی کی عمر 45 سال کے قریب تھی جبکہ اس کی بیوی کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔

میں اپنی کتابوں کو سنبھالے اپنے گھر جانے کی بجائے روشن علی کے گھر میں گھس گیا۔

ایک بڑی عمر کی عورت ماسی پھاتاں جو نام ہی کی طرح ہر کام میں بھی تیز تھی چیخ چیخ کر لوگوں کو ہدایت کر رہی تھی، ”یہاں دیکھو! یہاں ہوگا سانپ..... یہاں نہیں اس طرف دیکھو!..... ارے بابا اب اس کے پیچھے گھس گیا ہوگا۔“ اس کا رعب داب اتنا تھا کہ ہر کوئی اس کا حکم بنا چوں چرا مان رہا تھا۔

میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور سارا تماشا دیکھنے لگا۔

روشن علی اور اس کی بیوی حمیدہ دونوں ہی نہایت بزدل انسان تھے۔ وہ سانپ کو ڈھونڈنے کی بجائے چارپائی پر چڑھے ہوئے تھے اور ڈھونڈنے کا کام اہل محلہ کر رہے تھے۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک دراز قامت بڑی مونچھوں والا شخص گھر میں وارد ہوا۔ جناب کا اصل نام تو جانے کیا تھا، مگر محلے میں سبھی جناب کو طرم خان کے نام سے پکارتے تھے، طرم خان اس وقت خاکستری شلوار قمیض میں تھے اوپر کالے کلر کی واسکٹ چڑھا رکھی تھی۔ ادھیڑ عمر طرم خان کی کراکری کی دکان تھی جہاں اس کا جواں سال بیٹا بیٹھتا تھا اور خود طرم خان سارا دن آوارہ گردی کرتے رہتے تھے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو زیادہ فارغ قسم کے انسان ہوتے ہیں وہ سماجی کاموں میں زیادہ سے زیادہ بلکہ بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے ہیں، طرم خان کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ جہاں کوئی چھوٹا بڑا مسئلہ نظر آتا جناب فوراً وہاں پہنچ جاتے۔ طرم خان کا گھر محلے کی دوسری نکڑ پر تھا مگر پھر بھی وہ یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں پہنچ جانا ہی اصل میں ان کی عادت کا حصہ تھا۔

وہ آتے ہی گرج دار آواز میں گویا ہوئے۔

”یہاں ہے سانپ.....؟ اس حرام کے تخم کو مرنے کے واسطے روشن ہی کا گھر ملا تھا کیا؟“

وہ آیا اور کر دکھایا کے مصداق۔ طرم خان نے آتے ہی پورے گھر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ انہوں نے ہر اس چیز کو الٹ دینا اپنا فرض اولین سمجھا جو قرینے سے کسی بھی جگہ پڑی تھی۔ طرم خان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے طرم خان کے انتظار ہی میں سانپ کہیں چھپ کر بیٹھا تھا کہ ”طرم آئے اور آ کر مجھے پکڑ لے۔“

ماسی پھاتاں، طرم خان کی دست اندازی دیکھ کر غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی جیسے اب اس کا یہاں کوئی کام نہ رہا ہو۔

ماسی پھاتاں کی جگہ اب طرم خان نے سنبھال لی۔ وہ بھی چیخ چیخ کر لوگوں کو ہدایت کرنے لگے کہ ”یہاں دیکھو!..... وہاں دیکھو!..... ادھر نہیں اس طرف.....“

طرم خان نے تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد روشن علی سے پوچھا۔ ”جب سانپ اندر آیا تھا تو تم نے اسے کس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا؟“

روشن علی اور اس کی بیوی ابھی بھی خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے، روشن علی نے لڑکھڑاتی آواز میں بتانا شروع کیا۔ ”وہ..... باہر کے دروازے سے..... آ کر .....اس طرف پیٹی کے نیچے گھس گیا تھا، پھر..... پھر..... مجھے پتا نہیں چلا.....“

”بس..... بس میں سمجھ گیا۔ طرم نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروا دیا۔

طرم خان کے قدم پیٹی کی طرف بڑھنے لگے۔ پیٹی جہازی سائز کی تھی، اس کے چاروں کونوں کے نیچے

ایک ایک اینٹ دے کر اسے زمین کی سطح سے اونچا رکھا گیا تھا۔

طرم خان پیٹی سے دو قدموں کے فاصلے پر رک کر زمین کے سینے پر گھٹنے ٹیک کر اور گردن جھکا کر پیٹی کے نیچے دیکھنے لگے۔

”یہاں تو پہلے ہی دیکھا جا چکا ہے جناب!“ کسی محلے دار نے پیچھے سے آواز لگائی۔

طرم نے گردن موڑی، غصہ اور دبدبہ اس کے چہرے اور مونچھوں پر نظر آ رہا تھا۔ ”تو میں کیا یہاں جھک مار رہا ہوں؟ میں بھی سانپ ہی کو تلاش کر رہا ہوں، اگر پہلے دیکھا جا چکا ہے تو پھر ملا کیوں نہیں.....“

وہ شخص اپنا سا منہ لے کر رہ گیا، طرم خان اپنی کارروائی کرنے لگے، طرم خان نے اپنی جیب سے ٹارچ والا سیل فون برآمد کیا اور اس کی روشنی پیٹی کے نیچے ڈال کر سانپ کو تلاش کرنے لگے، ساتھ ساتھ منہ سے ”ہش، ہش“ کی آوازیں بھی نکالیں، مگر نتیجہ ندارد رہا!!

طرم خان اٹھے اور گھر کے ایک کونے سے ایک موٹا ڈنڈا اٹھا لائے، ڈنڈے کو انہوں نے پیٹی کے نیچے گھسیڑ دیا اور ادھر ادھر پھیرنے لگے، اگر نیچے کچھ ہوتا تو ضرور ظاہر ہوتا مگر شاید نیچے کچھ تھا ہی نہیں۔

طرم خان نے کہا، ”پیٹی کی چاروں اینٹوں کو نیچے سے نکالنا پڑے گا اگر سانپ نیچے ہوا تو خود ہی دب کر مر جائے گا، اس کے بعد پیٹی کو سائیڈ پر کر کے دیکھ لیں گے۔“

دل تو میرا یہی چاہ رہا تھا کہ یہاں رکوں اور سانپ کا عبرت ناک انجام ہوتے دیکھوں مگر مسئلہ یہ تھا کہ امتحانات سر پر تھے اور مجھے ان کی تیاری کرنا تھی، ابھی تو مجھے اپنا کیچڑ سے اٹا یونیفارم بھی چینج کرنا تھا اس لئے میں اپنے گھر کو ہو لیا۔ سانپ کا جو بھی انجام ہوتا وہ تو مجھے بعد میں پتا چل ہی جاتا، جاتے جاتے میں روشن علی اور اس کی بیوی حمیدہ کے قریب گیا اور پوچھا، ”ویسے سانپ کون سا تھا روشن؟“

”کالے رنگ کا کوبرا تھا۔“ روشن نے بتایا۔

ہمارا گھر روشن علی کے گھر کے بائیں طرف تھا اور ہمارے دروازے تقریباً اکٹھے ہی تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر سانپ ہمارے گھر میں گھس جاتا تو جو ہنگامہ اس وقت روشن علی کے گھر میں برپا تھا وہ ہمارے گھر پر ہوتا۔

میں نے گھر جا کر یونیفارم چینج کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ نشاط آباد (فیصل آباد) سے ماموں آئے ہوئے تھے، میں نے ماں سے ان کی بابت پوچھا۔

امی نے بتایا کہ وہ ذرا کام سے باہر گئے ہیں۔

ماموں کا نام حکیم علی ہے، وہ ریلوے برج میں ملازم تھے اب ریٹائرڈ منٹ کے بعد فارغ زندگی گزار رہے تھے۔ ماموں سیلانی طبیعت کے مالک تھے، جس جس شہر میں کوئی رشتے دار یا کوئی واقف کار تھا ان شہروں میں گھومتے رہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی وہ اس وجہ سے آ جاتے تھے کہ انہیں پہاڑ بہت اچھے لگتے تھے، مگر افسوس! جس جگہ ہم رہتے ہیں یعنی شمال جنوبی سرگودھا میں..... وہاں پہاڑ بہت کم تھے اور جو تھے ان کو بھی روز بہ روز ڈائنامائٹ سے اڑا کر صاف کیا جا رہا تھا تاکہ وہاں کی زمین کو استعمال میں لایا جا سکے۔

میں کھانا کھا چکا تھا، امی نے بتایا کہ ”آج سائرہ کا فون آیا تھا، اس نے اپنی خیریت بتائی ہے اور ساتھ ہی تمہاری خیریت بھی پوچھ رہی تھی۔“

”تو پھر کیا بتایا آپ نے؟“ میں نے سوال کیا۔

امی ہنسنے لگیں۔ ”کہہ دیا کہ تم روز بہ روز ہٹے کٹے ہوتے جا رہے ہو کیونکہ تمہیں کوئی فکر فاقہ تو ہے نہیں۔“

میں بھی ہنس دیا۔ ”فکر ہے نا امی امتحان سر پر ہیں۔“

امی میرے سامنے سے کھانے کے برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔ سائرہ میری بڑی بہن کا نام ہے جو جڑانوالہ شہر میں بیاہی گئی ہے اس کی شادی کو 4 سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور وہ دو گول مٹول بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

میں اس وقت چھوٹا تھا جب ابا جی وفات پا گئے تھے ہماری کچھ اراضی تھیں جو ہم نے ٹھیکے پر دے رکھی تھی اس سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی سے ہمارا گزر بسر ہو رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھریلو ایک دو چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد میں کتابیں لے کر بیٹھ گیا۔ بجلی غائب تھی اور گھر کے اندر قدرتی روشنی زیادہ نہیں پڑ رہی تھی، آسمان پر ابھی بھی بادل تھے مگر اب بارش نہیں ہو رہی تھی۔ میں کتابیں لے کر اوپر چلا گیا کہ جب بارش ہوگی تو نیچے آجاؤں گا، مجھے مطالعہ کرتے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مجھے روشن علی کے گھر سے اس کی بیوی کی چیخ کی آواز سنائی دی، پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید حمیدہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے مگر پھر جب اس کا واویلا سنائی دینا شروع ہوا تو مجھے کچھ حوصلہ ہوا، وہ کسی بات پر روشن علی کو کوس رہی تھی، میں چشم تصور میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی چھاتی بھی پیٹ رہی ہے۔ میں نے بہتر جانا کہ جا کر دیکھوں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

میں ایک بار پھر روشن علی کے گھر چلا گیا، دیکھتا ہوں کہ حمیدہ کے ہاتھ میں کچھ خطوط تھے اور وہ کسی فرزانہ نام کی لڑکی کو چڑیل، بھوتنی اور کتیا جیسے القابات سے تشبیہہ دے رہی تھی۔

کچھ لوگ حمیدہ کو چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے مگر میں جانتا تھا کہ اب یہ چپ کرنے والی ہرگز نہیں۔ حمیدہ جب بھی لڑنے کے انداز میں بولتی تھی تو کسی بریک فیل گاڑی کی طرح آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی تھی، میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ روشن علی جیسا بھلے مانس شخص جانے کس طرح حمیدہ جیسی لڑاکا عورت سے گزارہ کر رہا ہے۔

پتا نہیں اب اصل ماجرا کیا تھا؟ اور ماجرے کا پتا یہاں رہ کر چل بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ حمیدہ بول رہی تھی، حمیدہ جب بولتی تھی تو پھر اس کے سامنے کوئی اور نہیں بول سکتا تھا اور حمیدہ جو بولتی تھی وہ گالیوں اور خرافات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

میری نظر جاوید نامی ایک نوعمر لڑکے پر پڑی وہ اس گلی میں رہتا تھا اور اس فلاحی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا اور یقیناً مذکورہ بالا واقعہ کا عینی شاہد بھی تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔

گلی میں لے جا کر میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”یہ کیا ماجرا ہے جاوید..... حمیدہ اتنا شور کیوں مچا رہی ہے؟“

اس نے پہلے تو بے وقوفوں کی طرح دانت نکال کر اپنی بے ہودہ ہنسی کا مظاہرہ کیا پھر سر کھجاتے ہوئے بتانے لگا۔ ”ہونا کیا ہے..... وہ اپنے طرم خان صاحب ہے نا!“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔

”جب سانپ کہیں سے بھی اور پیٹی کے نیچے سے بھی نہ ملا تو انہوں نے خیال پیش کیا کہ شاید سانپ پیٹی کے اندر گھس گیا ہے اس لئے پیٹی کو بھی کھول کر چیک کر لینا چاہئے۔“

میں جھلا اٹھا۔ ”ارے بھئی یہ کیا بکواس ہے، سانپ پیٹی کے اندر کیسے گھس سکتا ہے؟“

جاوید ایک بار پھر دانت نکال کر ہنسا۔ ”یہی تو وہ بات ہے جناب جس کی وجہ سے یہ سارا تنازعہ اٹھا ہے، ہوا یوں تھا کہ پیٹی کھولی گئی۔ پہلے اس کا اوپر کا سامان ہٹایا گیا پھر کسی نے خیال پیش کیا کہ سانپ پیٹی کی تہ تک چلا گیا ہے۔ پھر پیٹی کا سارا سامان نکالا گیا۔ سانپ تو نہ ملا البتہ پیٹی کی تہ سے کچھ خطوط مل گئے جو کسی فرزانہ نام کی لڑکی نے شادی سے قبل محترم روشن علی کے نام لکھے تھے۔ جیسے ہی خطوط حمیدہ کے ہاتھ تک پہنچے ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا جو تمہارے سامنے ہنوز جاری و ساری ہے۔“ جاوید نے ان الفاظوں کے ساتھ اپنا بیان ختم کیا۔

ایک سوال میرے ذہن میں چبھ رہا تھا میں نے وہ بھی فوراً جاوید سے کر ڈالا۔

”یہ بتاؤ کہ جب پیٹی کھولی جا رہی تھی تو روشن علی نے پیٹی کھولنے والوں کو روکنے یا اس عمل میں مزاحم ہونے کی کوشش نہیں کی تھی؟“

”کی تھی جناب! مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟“

جاوید نے اپنا بیان ازسرنو ختم کیا اور تیزی سے اندر چلا گیا تاکہ رہا سہا تماشا بھی دیکھ سکے۔

اب میرا یہاں رکنے کا کوئی مقصد نہیں تھا، سانپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملا نہیں تھا، خطوط مل گئے تھے، مجھے معلوم تھا کہ اب یہ تماشا رات گئے تک جاری و ساری رہے گا، میرے Exams قریب آنے والے تھے اور میں کسی بھی طرح اس Position میں نہیں تھا کہ وقت کا زیاں کر سکوں، سو میں واپس گھر چلا گیا، میں چشم تصور میں دیکھ رہا تھا کہ اب دیگر لوگ بھی دھیرے دھیرے وہاں سے کھسک رہے ہونگے۔ کیونکہ پاگل کر دینے والی حمیدہ کی بکواس کو زیادہ دیر سننا اور برداشت کرنا کسی کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔

میں نے کتابیں سنبھالیں اور مطالعہ میں محو ہو گیا۔ حمیدہ کے رونے اور چلانے کی آوازیں ابھی بھی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں گود میں کتاب رکھے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بار بار میرا دھیان بھٹک رہا تھا۔ مگر میں خاطر جمع سے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور کسی طرح اس کام میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا، آہستہ آہستہ آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ میں خاصی دیر Study کرتا رہا۔ لائٹ ابھی تک نہیں آئی تھی، کوئی فنی خرابی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ برسات میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے، شام کی سیاہی دن کے اجالے کے آڑے آنے لگی تھی اور دھیرے دھیرے اسے اپنے اندر نگل رہی تھی۔ فضا میں خنکی بھی بڑھ رہی تھی۔ میں نے کتابیں ایک طرف رکھیں اور موسم سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میں لب بام پر کھڑا ہو کر باہر گلی کا نظارہ کر رہا تھا۔ پہلے موسم خوش گوار تھا بارش کے بعد موسم میں خنکی در آئی تھی، مجھے جھر جھری سی محسوس ہونے لگی میں نے اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا لیے تا کہ سردی کے احساس کو کم کیا جا سکے۔

گلی میں اکا دکا لوگ تھے، لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اپنے گھروں میں دبک گئے تھے۔ میرا دھیان حمیدہ کی طرف گیا۔ اس کی آوازیں اب بالکل معدوم ہو گئی تھیں، تقریباً آٹھ سال سے روشن علی اور حمیدہ ہمارے ساتھ والے مکان میں رہ رہے تھے، ان کی شادی کو بارہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

سردی کے احساس کے ساتھ ساتھ اب اندھیرا بھی خاصا بڑھ چکا تھا۔ میں نے بہتر جانا کہ ایک نظر روشن کے گھر کی طرف ڈال لوں کے وہاں کیا صورت حال ہے......

ان کے کمروں کی چھت ہمارے گھر کی چھت سے ملی ہوئی تھی، جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے صرف صحن دیکھا جا سکتا تھا اور صحن اس وقت خالی تھا۔ سانپ کے سب متلاشی لوگ تلاش بسیار کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ حمیدہ اور روشن بھی صحن میں نہیں تھے۔ میں اپنے گھر کی چھت سے ان کی چھت پر چلا گیا، کنارے پر پہنچ کر میں جھکا اور روشن دان کے راستے سے اندر کی طرف جھانکا۔

روشن علی اور اس کی بیوی، دونوں چار پائی پر سوگوار انداز میں بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے دنیا جہاں میں دونوں ایک دوسرے کے سبب سے بڑے ہمدرد اور غم گسار ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ دونوں کبھی لڑے ہی نہیں یا حمیدہ کبھی روشن پر چلائی نہیں ان کی ایسی حالت زار دیکھ کر مجھے اچانک ایک شعر یاد آ گیا جو کچھ یوں تھا۔

اندر طرب بھی تھا کچھ کچھ پریشاں
کہ مشکل میں پڑا تھا حسن سوگواراں

ان دونوں ادھیڑ عمر میاں بیوی کا حسن کچھ برس قبل رخصت ہو چکا تھا، میں نے بہتر جانا کہ اب میں بھی رخصت ہو جاؤں، سو میں چھت سے نیچے اتر آیا۔

میں چھت پر رہ کر روشن علی یا اس کی بیوی کی مدد بھی کیا کرتا تھا بھلا...... کسی کے گھر میں سانپ گھس آئے تو گھر کے مکینوں کو یقیناً ماتم کناں ہونا ہی چاہیے۔ کیونکہ سانپ کسی بھی وقت اپنی پناہ گاہ سے باہر آ سکتا ہے اور پھر اس صورت میں وہ کسی پر بھی حملہ کر سکتا ہے، سانپ کے حملہ کرنے کا سیدھا اور صاف مطلب ہے موت!

ماں نے چراغوں میں تیل ڈال کر انہیں روشن کر دیا تھا، میں چراغوں کی مدھم روشنی میں مطالعہ کرنے لگا ماں اور ماموں دوسرے کمرے میں باتیں کر رہے تھے، میں نے کھانا کھا لیا۔ وقت خاصا گزر چکا تھا مگر ابھی تک لائٹ نہیں آئی تھی، اس وقت مجھے خاصی سردی محسوس

ہو رہی تھی شاید ہلکا سا بخار بھی ہونے لگا تھا۔ جی میں خیال آیا کہ جا کر ڈاکٹر سے دوائی لے آؤں مگر پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کہ بدن کو ہلکی سی حرارت ہی تو ہے، بہر حال سردی کے احساس کو کم کرنے کیلئے میں نے آتش دان میں لکڑیاں ڈال کر آگ جلا دی، ہمارا گھر پرانے طرز کا بنا تھا، دونوں کمروں میں آتش دان بنے تھے، دوسرے کمرے میں ماں اور ماموں نے بھی آتش دان روشن کر لیا تھا، جنوبی سرگودھا کے چک 46 میں جس جگہ ہم لوگ رہتے ہیں وہاں قدرتی گیس جیسی نعمت ناپید ہے، اس لئے ہمارے ہاں ایندھن کے طور پر درختوں کی لکڑیاں، کوئلہ، مٹی کا تیل، گیس اور بھینسوں کے گوبر کے اپلے استعمال ہوتے ہیں۔

آتش دان روشن ہوا تو ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی، لائٹ تو آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی میں نے سوچا اب سو جاتا ہوں صبح جلدی اٹھ کر اسٹڈی کر لوں گا۔

میں اٹھا اور جا کر چٹائی اٹھا لایا جسے میں نے آتش دان کے سامنے کچھ فاصلے پر بچھا دیا، میں نے چٹائی کے اوپر دو تین موٹی چادریں بچھا دیں اس کے بعد اپنے اوپر کمبل لپیٹ کر سونے کیلئے لیٹ گیا، آتش دان کی حدت مجھ تک پہنچ رہی تھی، بلندی کے باعث آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے اور میری کیفیت خواب ناک سی ہو رہی تھی، آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میں کب نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب کسی سرسراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا مگر جب آنکھوں کے سامنے سے دھند چھٹی تو مجھے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلنے والا جملہ صحیح طور پر سمجھ آنے لگا مگر یہاں جو صورت حال تھی وہ ذرا مختلف تھی، میرے پاؤں کے نیچے زمین نہیں تھی بلکہ میں پورے کا پورا زمین پر لیٹا تھا اور مجھے اپنا پورا وجود زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

میرے سینے پر ایک کالا زہریلا سانپ بیٹھا ہوا تھا وہ پیچھے سے اپنے جسم کو بل دیے ہوئے تھا، مگر اس کا پھن اٹھا ہوا تھا اور وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اس کے منہ سے پھنکاریں نکل رہی تھیں۔ غالباً میرے اٹھ جانے کی وجہ یہ پھنکاریں ہی تھیں، اس وقت کیلئے میرے بارے میں صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

سانپ کی ہر ہر پھنکار جیسے اجل کے گھنگروں کی جھنکار، اس کی آنکھیں جیسے نزع کی نزاکت ہے گداز و ملائم سے دو انڈے، جن کی قہرناک کسی پر ٹوٹ جائے تو اس کا مقدر پھوٹ جائے اور زندگی روٹھ جائے۔

یہ قہرناک یقیناً مجھ پر ٹوٹنے والی تھی اور میری زندگی مجھ سے روٹھنے والی تھی۔

میری چھاتی پر بیٹھا سانپ اسپیکٹیکل کوبرا (Spectacle cobra) تھا، اسپیکٹیکل کوبرا ایک طرح سے کنگ کوبرا سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے، ہر چند کہ کنگ کوبرا کا زہر اسپیکٹیکل کوبرا سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے مگر جب کنگ کوبرا کسی کو ڈستا ہے تو اپنے زہر کی مقدار زیادہ نہیں چھوڑتا اس کے برعکس سپیکٹیکل کوبرا جب کسی کو ڈستا ہے تو اپنے زہر کی مقدار کنگ کوبرا کے زہر کی مقدار سے دوگنا یا اس سے بھی زیادہ چھوڑتا ہے، تب کاٹے جانے والا جانور بہت زیادہ زہر کی مقدار کی وجہ سے جلد ہی موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔

سانپ نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں، سانپ کی آنکھوں پر ایک مستقل شفاف جھلی ہوتی ہے۔ جسے اسپیکٹیکل کہتے ہیں اور آنکھیں بہت کم خدمت کرتی ہیں، ان دو وجوہات کی بنا پر سانپ کی آنکھیں بہت خوفناک لگتی ہیں کیونکہ وہ آنکھیں نہیں جھپک سکتا بلکہ ایک طرح سے ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہتا ہے۔

ہمارے اور روشن کے گھر کی دیواروں کے بیچ چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ سانپ یقیناً انہیں سوراخوں میں سے کسی سے ہمارے گھر میں گھس آیا تھا اور اہل محلہ اسے روشن کے گھر میں تلاش کرتے رہے تھے۔

سانپ یقیناً سردی سے بچنے کیلئے اور آتش دان کی حدت حاصل کرنے کیلئے اپنی کمین گاہ سے نکل کر میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھاتی پر چڑھ آیا تھا، اگر اس نظریے سے دیکھا جائے تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نظر نہیں آتی تھی، سانپ جس طرح چڑھا تھا اس طرح اتر بھی سکتا تھا مگر اب سانپ کے تیور بدلنے لگے تھے، وہ بار بار اپنی دو دھاری زبان لپلپا رہا تھا۔ ایسا عموماً سانپ تب کرتے ہیں جب انہیں اپنے شکار یا ہدف کے بارے میں سن گن نہیں ہو، سانپ میں ناک کی سونگھنے کی جگہوں کے علاوہ منہ تالو (Palate) پر دو گڑھے ہوتے ہیں جنہیں جیکبسن آرگن (Jacobson Argan) کہتے ہیں۔ جن کے ذریعے یہ زبان سے وہ بو محسوس کر لیتے ہیں جو اس کی زبان سے باہر آ کر ہوا سے شکار کی موجودگی سے حاصل کرتی ہے، کچھ سانپوں میں آنکھوں اور نتھنوں کے درمیان گڑھے ہوتے ہیں۔ جنہیں پٹ آرگن (Pit Argan) کہتے ہیں۔ یہ شکار کی موجودگی اس کی گرمی سے محسوس کر لیتے ہیں۔ جیسے وائپر سانپ (Viper Snake)

سانپ کا بار بار اپنی زبان کو باہر نکالنا اور اندر لے جانا میرے لیے شدید خطرے کی علامت تھی، میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات سما رہی تھی کہ کسی بھی طریقے سے سانپ کو خود سے نیچے اتارا جائے مگر یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا۔ میری ذرا سی جنبش پر سانپ مجھے بری طرح ڈس سکتا تھا۔ میرے خیال میں میں تبھی تک محفوظ تھا جب تک میں کوئی حرکت نہ کروں، میری ذرا سی حرکت سانپ کو مشتعل کر سکتی تھی اور ایسا میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

سانپ کے ظاہر و باطن سے جو لگ رہا تھا وہ یہ تھا کہ موصوف کا ابھی میری چھاتی سے اترنے کا کوئی ارادہ نہیں، میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں سانپ کی ویسے ہی کھلی رہتی ہیں، ہم دونوں براہ راست ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے، میں نے اپنے پورے جسم کو ساکت و جامد کر رکھا تھا۔ اگر آپ پر ایسا وقت آن پڑے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایسے وقت میں انسان کا پورا جسم ماؤف ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسے کڑے وقت میں اپنے آپ کو سنبھالنا ہی کمال کی بات ہے اگر ہم ایسا نہ کر پائیں تو پھر موت یقیناً ہمارا مقدر ہوتی ہے۔

میں نے اپنے خیالات کی بھٹکتی ہوئی رو کو قابو میں لا کر اس نہج پر ڈال دیا جہاں کسی نتیجے پر پہنچ کر اس افتاد سے چھٹکارے کا کوئی حل تلاش کیا جا سکے، ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ میں اپنی گردن بھی نہیں گھما سکتا تھا اس سے بھی سانپ مشتعل ہو سکتا تھا، میں چاہتا تھا کہ ایک بار مجھے پورے کمرے کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے جس سے شاید کوئی ایسی چیز میری نظر میں آ جائے جس کو میں استعمال میں لا سکوں اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو اسے دیکھ کر کم از کم کوئی مناسب Idea ہی سوچ سکوں۔

گردن گھمانا ممکن نہیں تھا سو میں اپنے چشم تصور کو استعمال میں لے آیا۔

چشم تصور میں میں نے کمرے کی ایک ایک چیز پر نہایت باریک بینی سے نظر ڈالی، جب پورے کمرے کا جائزہ لے چکا تو ایک جگہ جا کر میری نظر ٹھہر گئی۔ وہ جگہ تھی آتش دان جو کہ میرے قریب ہی تھا، زیادہ اہمیت آتش دان کی نہیں بلکہ آتش دان کی راکھ کریدنے والی سلاخ کی تھی، تین فٹ لمبا لوہے کا وہ راڈ میرے اور آتش دان کے درمیان پڑا تھا جس تک آسانی سے میرا ہاتھ پہنچ سکتا تھا اور میں قسمت آزمائی کی یہ کوشش ہر حال میں کر لینا چاہتا تھا۔

اس وقت سانپ کے منہ سے ایک زبردست قسم کی پھنکار نکلی۔ مجھے لگا جیسے میری روح قفس عنصری سے پرواز کرتے کرتے رہ گئی ہو۔

مجھے جو بھی کرنا تھا وہ ایک دم ہی کرنا تھا اور اس میں ذرا سی بھی کسی غلطی کا استعمال بالکل نہیں تھا، ٹائمنگ اور تیزی میں ذرا سی بھی چوک مجھے موت کہ منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ میں نے گردن گھمائے بغیر اپنی آنکھوں کو گھمایا، میری نظریں لوہے کی سلاخ تک پہنچ رہی تھیں اور میرا ہاتھ بھی وہاں تک پہنچ سکتا تھا، گویا راڈ میری دسترس میں تھا۔

میں نے آخر بار خدا کو یاد کیا، اپنے سابقہ گناہوں کی معافی مانگی، آئندہ کے گناہوں سے تائب ہوا، کلمہ شہادت پڑھا اور تیزی سے اپنا دائیاں ہاتھ راڈ تک

پہنچا دیا، ہاتھ گھماتے ہوئے جب میں نے سانپ پر وار کیا تو تب میں نے دیکھا، سانپ کا پھن تیزی سے میرے بائیں شانے پر آ رہا تھا، مجھے اپنا وار خالی جاتا ہوا محسوس ہوا میں نے موت کے خوف سے آنکھیں بند کر لیں، تبھی کوئی چیز میرے شانے سے ٹکرائی اور اس میں ایک درد سا اٹھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خدا نے میری سن لی تھی میں واقعی بچ گیا تھا۔

میرے شانے سے ٹکرانے والا سانپ کا پھن نہیں بلکہ ماموں جان کا اعضاء تھا، ماموں رات کو حاجت کی غرض سے اٹھے تھے۔ انہوں نے میری خیریت دریافت کی غرض سے میرے کمرے میں جھانکا تو انہیں آتش دان کی مدھم روشنی میں سانپ والا منظر نظر آیا۔ وہ میری جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ طویل لمحے تک انتظار کرتے رہے، انہوں نے امی کو تو نہ جگایا البتہ خود لٹھ سنبھال کر دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے اور مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے۔ جب میں سلاخ سے سانپ پر وار کرنے لگا تو تب ماموں کو پوری طرح خطرے کا احساس ہو گیا اور وہ فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ اگر انہیں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ سانپ یقیناً اب تک مجھے ڈس چکا ہوتا۔

سانپ نے میرے بائیں شانے پر حملہ کیا تھا اور ماموں نے اسے روکنے کیلئے مدافعتی حملہ کیا تھا، جب میں نے آنکھیں بند کر لیں تھیں تب ماموں کا لٹھ میرے شانے پر لگا تھا جس سے میرے شانے میں درد اٹھا تھا۔

ماموں کے لٹھ کے پہلے ہی وار سے سانپ دور جا گرا تھا، ساتھ ہی ماموں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پیچھے گھسیٹ لیا تھا۔ حواس بحال ہوتے ہی میں فوراً سنبھل گیا۔ اس سے پہلے کہ سانپ بھی سنبھل جاتا ماموں نے فوراً ہی لٹھ سے دوسرا حملہ بھی کر دیا، اب کی بار لٹھ سانپ کے سر پر پڑا تھا۔ سانپ کا سر پھٹ گیا، اس کی آنکھیں اندر کو پچک گئیں۔ اور منہ بری طرح کھل گیا، اس کے ساتھ ہی سانپ زمین پر بری طرح پٹخنیاں کھانے لگا، ماموں نے اس پر بس نہیں کیا وہ سانپ پر پے در پے وار کرتے رہے جو سانپ کو پتا نہیں کہا کہاں لگتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں سانپ ہمارے سامنے کشتے کی صورت میں پڑا تھا۔

اگلے روز یہ بات پورے محلے میں پھیل گئی کہ جس سانپ کو روشن کے گھر میں تلاش کیا گیا تھا وہ حدت لینے کیلئے آدھا پونا گھنٹا میرے سینے پر سوار رہا تھا۔ یہ بات کئی لوگوں نے مجھے روک روک کر پوچھی کہ "کیا یہ واقعی سچ ہے؟"

یہ بات روشن اور حمیدہ نے بھی مجھ سے پوچھی۔

میں نے کہا۔ "ہاں یہ بات سچ ہے۔"

انہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس سانپ سے وہ اتنا ڈر رہے تھے وہ آدھا پونا گھنٹا میری چھاتی پر سوار رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "دراصل سانپ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اس لیے میں نے خود ہی اسے اٹھا کر اپنی چھاتی پر بٹھا لیا تھا تاکہ وہ حدت حاصل کر سکے۔"

دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ "تم نے ایسا کیوں کیا جمیل عالی.....؟"

میں ہنسنے لگا۔ "اس لئے کہ تم دونوں میں بھی ہمت پیدا ہو سکے، تم حالات کا سامنا کر سکو، اپنے آپ کو تماشا بننے سے روک سکو اور یہ کہ ایک دوسرے کا سہارا بن سکو!"

حمیدہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "جمیل تم نے یہ سب کچھ ہماری خاطر کیا؟"

"ہاں!" میں نے گرم لوہے پر چوٹ کی۔ "تم دونوں وعدہ کرو کہ آج کے بعد کبھی نہیں لڑو گے اور ایک دوسرے کی قدر کرو گے۔"

دونوں باقاعدہ رونے لگے۔ "آج کے بعد ہم دونوں کبھی نہیں لڑیں گے۔ ہم تم سے یہ وعدہ کرتے ہیں۔"

میں یہ جملہ سن کر انہیں دروازے میں کھڑے روتا چھوڑ کر بازار کی طرف چل پڑا، رات کو سانپ کے آدھا پونا گھنٹہ میری چھاتی پر بیٹھنے سے وہاں پر جو بوجھ پڑا تھا وہ اب سرکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، شاید کہ میری مذکورہ باتوں سے وہ دونوں آپس میں لڑنا چھوڑ دیں اور ایک دوسرے کی عزت کرنے لگیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:81

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

رولوکا اور مہیش باتیں کررہے تھے کہ ایک ملازم آیا اور بولا۔ ''مہیش بابو شرفو چاچا آئے ہیں، وہ بہت پریشان ہیں، اور آپ کا پوچھ رہے ہیں، یہ سن کر مہیش رولوکا کے ساتھ باہر آیا تو حویلی کے دروازے پر ایک عمر رسیدہ بزرگ کھڑے تھے جن کا نام شرف الدین تھا۔ وہ مہیش کو دیکھتے ہی بولے مہیش بابو! کل رات سے سعیدن کی طبیعت بہت خراب ہے وہ اول فول بک رہی ہے، آپ ذرا دلی والے حکیم صاحب کا پتا بتلادیں، میں دلی جاتا ہوں، یہ سن کر مہیش رولوکا کی طرف دیکھا تو رولوکا نے آنکھ کا اشارہ کیا تو مہیش بولا۔ ''چاچا وہ حکیم صاحب آپ کے سامنے کھڑے ہیں، یہ سنتے ہی شرفو رولوکا کا ہاتھ پکڑ کر گڑگڑانے لگے تو رولوکا اور مہیش ان کے ہمراہ ان کے گھر گئے، ان کی بچی پر ایک ضدی جن سوار ہوگیا تھا۔ جب وہ گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی چند منٹ پہلے رسیاں توڑ کر سعیدن باہر کو نکلی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہوگئی۔ رولوکا نے معلوم کرلیا کہ وہ ضدی جن سعیدن کو اپنے قبیلہ میں لے گیا ہے۔ بہرحال رولوکا جنات کے اس قبیلہ تک چند لوگوں کے ہمراہ پہنچ گیا اور جنات کے سردار سے اس کی باتیں ہوئیں۔ سردار نے بہت معذرت کی اور سب کے سامنے اس نے اس شرکش جن کو جلا کر خاکستر کردیا اور اس نے باعزت طور پر سعیدن کو واپس کردیا۔ شرف الدین نے رولوکا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ رولوکا مہیش کے ساتھ مطب کے لئے روانہ ہوگیا تو راستے میں ایک جگہ چند آتماؤں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ جنہیں رولوکا نے راستے سے ہٹایا۔ دوسرے دن حسب وعدہ رولوکا مہیش کی حویلی میں پہنچ گیا کیونکہ حویلی والوں کے ساتھ رولوکا نے آتما حویلی جانا تھا۔ اس نے شنکر داس کی آتما سے وعدہ کیا تھا۔ رولوکا سب کے ساتھ آتما حویلی پہنچا اور حویلی میں داخل ہوگیا۔ حویلی میں موجود تمام آتماؤں نے بہت اودھم مچایا، ہر طرح کا ڈر و خوف پیدا کیا مگر رولوکا کے آگے ان کی ایک نہ چلی، رولوکا نے شنکر داس کی آتما اور سب کو اپنے تئیں بہت سمجھایا کہ وہ ضد چھوڑ دیں مگر وہ سب اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ مجبوراً رولوکا نے پوری حویلی کو مسمار کردیا، پوری حویلی جل کر خاکستر ہوگئی اور ساتھ تمام آتمائیں بھی جل کر بھسم ہوگئیں۔ رولوکا سب کے ساتھ واپس مہیش کی حویلی میں آگیا اور بولا۔ ''اب سنیل کی طبیعت بالکل ٹھیک رہے گی، اب گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تمام آتماؤں کا خاتمہ ہوگیا ہے اور پھر رولوکا نے ان سب سے مصافحہ کرکے دلی حکیم وقار کے مطب میں آگیا۔

(اب آگے پڑھیں)

حکیم وقار کے مطب میں جمعہ کے دن آؤٹ ڈور یعنی باہر سے آنے والے مریضوں کے لئے چھٹی ہوتی تھی۔ چونکہ مطب میں دور دراز سے آنے والے مریض دو تین دن کے لئے اگر ان کی بیماری زیادہ پیچیدہ ہوتی تو انہیں ٹھہرا لیا جاتا تھا۔ آج جمعہ کا دن تھا اور وقت ساڑھے دس بجے کا تھا رولوکا اور حکیم وقار بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔

رولوکا۔ حکیم وقار سے بولا۔ ''حکیم صاحب اکثر آپ ذکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات ہیں اور یہ کتنی ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

میں آپ کی باتوں پر اکثر غور کرتا ہوں کہ دنیا بنانے والے نے انسان کو تمام مخلوقات پر برتر بنایا ہے یعنی انسان کا درجہ بہت زیادہ اونچا ہے۔ لیکن اکثر نظر آتا ہے کہ انسان مفاد پرستی میں اس قدر پستی میں گر جاتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی، کیا انسان کو زیب دیتا ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے فائدے کے لئے نا تلافی نقصان پہنچائے؟"

حکیم وقار بولے۔ "آپ کی باتیں بالکل سو فیصد درست ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی تمام مخلوقات پر اشرف بنایا ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بعد انسان کو ہی افضل قرار دیا ہے، انسان کو جو مقام دیا ہے اس کی برتری کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اللہ تعالیٰ نے جب سے دنیا بنائی ہے اس وقت سے اپنے نبی اور پیغمبروں کے ذریعہ یہی پیغام دیا کہ "انسان اپنے رب کی عبادت کرو، احکام خداوندی پر چلو، اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، کسی کا دل نہ توڑو، کسی کمزور پر اپنی طاقت و بہادری کا دھونس نہ جماؤ، کیونکہ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں، لیکن کسی کی بڑائی اس کے عمل میں ہے۔ کیونکہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی، یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے اور نہ ناری ہے۔"

آپ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا اندازہ نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں سب کی سب انسان کے لئے ہیں، تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ انسان کے تصرف میں دے دیا ہے۔ زمین میں طرح طرح کے خزانے اور ضروریات زندگی کے لئے دیگر چیزیں چھپادی ہیں اور فرمایا ہے کہ انسان اپنی عقل کے مطابق اور ضرورت کے مطابق ان چیزوں سے فائدہ اٹھائے۔

انسان ناحق کسی کا خون نہ بہائے، زبردستی کسی کے مال پر قبضہ نہ جمائے، اپنے شرعی حدود میں رہے، ہر انسان کو دنیا میں خوشی سے وقت گزارنے کا حق ہے۔

کوئی انسان اپنے عمل یا اپنی سوچ سے کسی کو تکلیف پہنچا کر خود خوش و خرم نہیں رہ سکتا ہے۔ انسان کی اپنی خوشی، بھلائی اسی صورت میں ہے کہ وہ اپنی ذات سے دوسروں کو خوشی پہنچائے۔

اب اس کو لے لیجئے کہ ایک ملک نے اپنے دشمن ملک پر ایٹم بم گرایا جس سے لاکھوں انسان لقمۂ اجل بن گئے، مرنے والے سارے انسان خراب عمل کے نہیں تھے، سب کے سب معصوم اور بے گناہ تھے، ایک ملک میں صرف چند لوگ خراب ہوتے ہیں جو کہ دوسرے ممالک کو اپنا دشمن گردانتے ہیں کسی بھی ملک کے سارے عوام غلط سوچ کے حامل نہیں ہوتے۔ اور پھر جو ملک ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا ہے اس ملک کے بھی سارے لوگ اس کے حق میں نہیں ہوتے کہ دوسرے ملک کے لوگوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

مہلک ہتھیاروں کا یہ ابتدائی دور ہے اور ہمارے خیال میں ایسا بھی دور آئے گا کہ مہلک ہتھیاروں کے دوڑ میں ایک ملک دوسرے ملک سے آگے نکلنے کے لئے عجیب عجیب مہلک ہتھیار بنائے گا۔ تاکہ وہ ہتھیار اور بم وغیرہ کمزور ممالک پر گرائے جائیں اور اس طرح جہاں کہ ایسے بم یا ہتھیار استعمال ہوں گے وہاں کے بے گناہ اور معصوم لوگ اذیت ناک موت سے ہمکنار ہوں گے۔ تو کیا ایسا کرنے والے لوگ جو کہ اپنی طاقت و بہادری سے دوسروں کو موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں، وہ قدرت کی کرم نوازی کے حقدار ہوں گے۔ کیا دوسروں کو موت سے ہمکنار کرنے والے دنیا میں یا پھر دنیا سے جانے کے بعد خوش رہ سکتے ہیں؟

جبکہ دنیا تو چند روز ہے اور مرنے کے بعد جہاں ہمیشہ رہنا ہے تو کیا وہاں دوسروں پر ظلم کرنے والا آرام و سکون سے رہ سکے گا۔ جب ایک ملک کوئی بھی مہلک بم یا ہتھیار بناتا ہے تو یہ سوچ کر اور حتمی فیصلہ کر کے بناتا ہے کہ یہ ہتھیار اور یہ بم دشمن ممالک پر استعمال ہوں گے اور جب یہ استعمال ہوں گے تو ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان موت سے ہمکنار ہو جائیں گے۔

تو کیا ایسا سوچ کر عملی قدم اٹھانے والے دین و دنیا میں فلاح پا سکتے ہیں؟ کیا ایسے لوگوں کو مرنے کے بعد یا پھر زندہ رہتے ہوئے دوسرے لوگ اچھے الفاظ سے یاد کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں، برا کرنے والوں کو لوگ برے نام سے یاد کرتے ہیں اور جو لوگ دنیا میں اچھائی

کا پرچار کرتے ہیں اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، اپنے عمل سے دوسروں کو خوش کرتے ہیں، ان لوگوں کو لوگ اچھے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

اچھے لوگوں کو دنیا سے گذرے ہوئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال بیت گئے ہیں مگر آج بھی لوگ ان کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ ان کے نام پر دھن و دولت لٹاتے ہیں، ان کی یاد میں روتے ہیں خوش ہوتے ہیں، اپنے اپنے مذہب کے طور طریقے سے ان کے حق میں دعائیں کرتے ہیں اور یہ سلسلہ رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گا۔

لہٰذا برا سوچنے اور برا کرنے والوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ ہم کیوں اپنی چند روپوں کے لئے دین و دنیا والوں کو خراب کریں، انسان اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے جاتا۔ صرف اچھے اعمال اس کے ساتھ جاتے ہیں یا پھر وہ دعائیں جو کہ اس کے مرنے کے بعد چند لوگ ایک جگہ بیٹھ کر اپنے اپنے مذہب کے طریقے سے کرتے ہیں۔" حکیم وقار یہاں تک بول کر خاموش ہو گئے۔

رولو کا بولا۔ "آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انسان اگر اپنے حدود میں رہے اور قناعت پر قائم رہے تو خوش و خرم زندگی گزار سکتا ہے۔ اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہی انسان کے لئے پریشانی کا باعث ہے، انسان اپنے مالک کے بنائے ہوئے قانون پر کاربند نہیں رہتا اور پھر اسی لئے انسان آئے دن کسی نہ کسی پریشانی سے دوچار رہتا ہے۔ دنیا بنانے والے نے انسان کو تمام مخلوقات میں برتر بنایا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ انسان سے بے پناہ انسیت رکھتا ہے اگر ایسا نہیں ہوتا تو انسان کو برتر نہیں بناتا۔

دنیا میں جتنے بھی جاندار ہیں سب کے لئے دنیا بنانے والے نے ایک مستحکم حدود متعین کر دیا ہے اور انسان کے علاوہ تمام جاندار اپنے مالک کے بنائے گئے قانون کے حدود میں ہیں مگر صرف انسان ہی ایسا ہے کہ اپنے مالک و خالق کے بنائے ہوئے قانونی حدود سے باہر نکلتا ہے اور پھر اذیت ناک دکھ میں گھر جاتا ہے۔

مالک نے انسان کو عقل و شعور سے نوازا ہے اور پھر یہی وجہ ہے کہ دنیا ختم ہونے کے بعد جب انصاف کا دن آئے گا تو انسان سے ہی حساب کتاب لیا جائے گا کہ اے انسان تو نے دنیا میں اپنے عمل سے کیا کیا کام کیا، تیرے لئے میں نے جو حدود شرعی متعین کیا تھا اس حدود سے تو نے تجاوز کیا اور میرے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میرے پیدا کرتا مخلوق کو نقصان پہنچایا بلکہ یہاں تک کیا کہ میری دی ہوئی طاقت و عہدہ سے تو نے بے شمار لوگوں کو اذیت سے ہمکنار کر دیا۔

اے انسان میں نے تجھے بڑائی دی، عزت دی، دولت دی، شہرت دی مگر تو نے میرا حکم نہیں مانا بلکہ....."

اور بات ادھوری رہ گئی کیونکہ

ایک ملازم آیا اور حکیم وقار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "حکیم صاحب ایک صاحب آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ "تم نے انہیں بتایا نہیں کہ آج مطب کی چھٹی ہے۔"

ملازم بولا۔ "حکیم صاحب میں نے انہیں بتایا کہ آج مطب کی چھٹی ہے کیونکہ آج جمعہ ہے اور جمعہ کے دن چھٹی ہوتی ہے۔ مگر وہ بہت عاجزی و انکساری سے بلکہ گڑگڑاتے ہوئے بولا کہ۔ "مجھے پتا تو نہیں کہ جمعہ کے دن مطب کی چھٹی ہوتی ہے، میں کافی دور سے آیا ہوں اور بڑی امید و آس سے آیا ہوں، اب اتنی دور جانا اور پھر دوبارہ آنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ آپ حکیم صاحب تک میرا پیغام پہنچا دیں کہ ان کی بہت مہربانی ہوگی اور مجھ پر احسان بھی ہوگا، میں بہت پریشان ہوں، مجھ پر نظر کرم کریں اور میری بات سن لیں۔"

یہ سن کر رولو کا بولا۔ "حکیم صاحب آپ ان سے مل لیں، لگتا ہے بے چارے بہت زیادہ پریشان ہیں اور ویسے بھی انہیں معلوم نہیں کہ جمعہ کے روز مطب بند رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ بھی بول رہے ہیں تو انہیں بلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیتے ہیں، پتہ نہیں کیا پریشانی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب ایک آدمی دکھ مصیبت اور پریشانی سے دوچار ہو جاتا ہے تو وہ بہت بے چین رہتا ہے، چلئے اگر ہماری تھوڑی سی نگہداشت مدد یا تعاون سے کسی کی پریشانی دور ہو جاتی ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔" حکیم وقار بولے ملازم سے۔ "اچھا میاں انہیں بلا کر لے آؤ۔"

یہ سنتے ہی ملازم چلا گیا اور پھر چند منٹ میں واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک باریش بزرگ تھے۔

بزرگ نے آتے ہی سلام کیا اور اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے رولوکا اور حکیم وقار کی طرف بڑھا دیا۔ مصافحہ کے بعد حکیم وقار کی اجازت سے وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو حکیم وقار بولے۔ "اب آپ حکم کریں کیسے تشریف لائے اور کیا مسئلہ ہے؟"

بزرگ نے جواب دیا۔ "حکیم صاحب میرا نام شرافت علی ہے اور میں اپنے بیٹے سلامت کو لایا ہوں، میرا یہ اکلوتا بیٹا ہے، جوان ہے صحت مند ہے بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ پورے گاؤں میں اس کی قد کاٹھ اور اٹھان میں کوئی اور نوجوان نہیں۔

میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں کہ آج میں چھٹی والے دن آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ مجھے دراصل معلوم نہیں تھا کہ جمعہ کے دن مطب کی چھٹی ہوتی ہے۔ اور یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ میری بات سن رہے ہیں، میں تو کسی لائق نہیں مگر اس کا اجر آپ کو اللہ ضرور دے گا، کسی مجبور پریشان اور مصیبت زدہ کی بات سننا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا بھی میری نظر میں بڑا کارِ ثواب ہے۔"

آپ بے فکر ہو کر اپنا مدعا بیان کریں، میری کوشش ہوگی کہ میں آپ کی تکلیف دور کروں۔" حکیم وقار خوشدلی سے بولے۔

حکیم وقار کی بات سن کر بزرگ نے کہا۔ "جناب میں کہہ رہا تھا کہ ایک باپ ہونے کہ ناطے میں محسوس کر رہا ہوں کہ، سلامت دن بدن اپنی صحت سے محروم ہو رہا ہے۔ اب تو اس کا رنگ بھی زردی مائل ہو رہا ہے، اس کی صحت ایسی تھی کہ اگر زمین پر پاؤں مارے تو زمین سے پانی نکل آئے، میری کچھ زمینیں ہیں کھیتی باڑی ہمارا آبائی پیشہ ہے۔ کھیت کھلیان کی ساری ذمہ داری اس نے سنبھال رکھی ہے، فصلیں کٹنے کے بعد آئے دن یہ کھلیان میں غلے کی حفاظت کے لئے پڑا رہتا تھا۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ اب تو ہر وقت جیسے خلاؤں میں گھورتا رہتا ہے، اپنے دوست یاروں سے بھی زیادہ تر کٹا کٹا رہتا ہے۔ تنہائی پسند ہو گیا ہے۔ میں بے شمار حکیموں کے پاس لے کر جا چکا ہوں مگر اس کی صحت سنبھلنے کے بجائے دن بدن مزید گرتی جا رہی ہے۔ صحت مندی کے پیشِ نظر میں نے اسے رات کے وقت کھلیان میں رکنے سے بھی منع کر دیا۔ اس کے دوست یار بھی بہت پریشان ہیں کہ اچانک سلامت آدم بے زار کیوں ہو گیا ہے؟ ہر روز میرے کہنے پر گرم پانی سے غسل کرتا ہے، رات کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں سو جاتا ہے مگر جب صبح کے وقت یہ اپنے کمرے سے نکلتا ہے تو اس کی حالت بہت غیر ہوتی ہے، تھکا تھکا نڈھال قدموں سے چلتا ہوا نظر آتا ہے، اس کے جسم سے صبح کے وقت عجیب قسم کی بساند کی بو بھی آتی ہے۔

اسے دیکھ دیکھ کر سارا گھر پریشان ہے، اس کی دو چھوٹی بہنیں ہیں، والدہ کا سکون ختم ہو گیا ہے، اور پھر میری تو کمر ٹوٹتی ہوئی نظر آ رہی ہے، جوان اولاد کی تکلیف والدین کے لئے ویسے بھی جان لیوا ہوتی ہے۔

میں بہت امید و آس لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ کے پاس سے لاعلاج مریض بھی صحت یاب ہو کر جا چکے ہیں اور پھر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کے پاس روحانی علاج بھی ہوتا ہے، آپ کو اللہ کا واسطہ برائے مہربانی میرے بڑھاپے پر رحم کھاتے ہوئے میرے بچے کو بچا لیں۔ میں تا زندگی آپ کے لئے دعا گو رہوں گا۔" یہ بول کر بزرگ حسرت بھری نظروں سے حکیم وقار اور رولوکا کی طرف دیکھنے لگے۔

"جناب آپ مطمئن رہیں، فکر نہ کریں، آپ

کے بچے کو میں دیکھتا ہوں، مریض کو بغیر دیکھے کسی بھی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں، مجھے امید ہے کہ آپ کا بچہ انشاء اللہ صحت یاب ہو گا، میں آپ کے بچے کو یہیں بلاتا ہوں اور اس کی نبض چیک کرتا ہوں۔" حکیم وقار بولے۔

حکیم وقار نے ملازم کو آواز دی تو ملازم فوراً حاضر ہو گیا اور بولا۔ "جی فرمائیے۔" تو حکیم وقار بولے۔ "باہر جو نوجوان بیٹھا ہوا ہے اسے بلا لاؤ۔" ملازم واپسی کے لئے فوراً پلٹ گیا اور چند منٹ میں جب حاضر ہوا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔

نوجوان نے آتے ہی رولوکا اور حکیم وقار کو سلام کیا اور ہاتھ آگے بڑھا کر دونوں سے مصافحہ کیا۔ حکیم وقار بولے۔ "اس کرسی پر تشریف رکھیں۔" کرسی حکیم وقار کے بہت قریب پڑی تھی۔ نوجوان جب کرسی پر بیٹھ گیا تو حکیم وقار بولے۔ "آپ اپنا دایاں ہاتھ میز پر رکھیں۔" نوجوان نے اپنا دایاں ہاتھ میز پر رکھ دیا تو حکیم وقار نے نوجوان کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔ نوجوان کی کلائی پر نبض کی جگہ انگلیاں رکھ کر حکیم وقار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر یکسوئی سے نوجوان کی نبض کی رفتار چیک کرنے لگے۔ اس دوران رولوکا کی بھرپور نظریں نوجوان پر مرکوز تھیں۔ چند منٹ تک حکیم وقار نوجوان کی نبض چیک کرتے رہے پھر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنا سر اوپر اٹھایا اور پھر انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

حکیم وقار بولے۔ "جسمانی کمزوری بہت بڑھ گئی ہے اور جسم میں خون کا دوران بھی بہت سست ہے، اور میرے اندازے کے مطابق جسم کی چربی بھی تیزی سے کم ہو رہی ہے، اور اس کے لئے علاج جم کرانا ہو گا اور پھر ساتھ ہی ساتھ علاج کے دوران پرہیز بھی لازمی کرنا ہو گا۔ میں تین دن کی دوا دے دیتا ہوں پابندی سے کھائیں اور وقت مقررہ پر ضرور تشریف لائیں۔" پھر حکیم وقار بولے۔

"یہ حکیم کامل ہیں، روحانی علاج یہی کرتے ہیں، آپ گھبرائیں نہیں، یہ بھی اپنے تئیں دیکھ لیں گے کہ کوئی ایسا ویسا مسئلہ تو نہیں تاکہ آپ کا شک اس معاملے میں دور ہو جائے۔"

یہ سن کر رولوکا بولا۔ "حکیم صاحب بچے کو آپ پرسوں بلا لیں، تاکہ میں اپنے تجربے کے بنا پر بچے کو دیکھ لوں، میرا دماغ اب کچھ اور بھی سوچ رہا ہے، بہر حال بزرگوار! آپ فکر نہ کریں آپ کا بچہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ بول کر رولوکا خاموش ہو گیا۔

حکیم وقار نے دوا دی تو شرافت علی نے ممنون نگاہوں سے حکیم وقار اور رولوکا کی طرف دیکھا اور ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ان کے پاس اپنی گھوڑا گاڑی تھی۔

دونوں باپ بیٹوں کے جانے کے بعد رولوکا حکیم وقار سے بولا۔ "حکیم صاحب! میں نے اپنے تئیں کچھ سوچا ہے کہ اس نوجوان کے ساتھ کچھ اور چکر بھی لگتا ہے، خیر آج رات، میں معلوم کروں گا۔"

☆.....☆.....☆

چاول کی فصل کٹ چکی تھی۔ کھلیان میں دھان کے پودے کا ڈھیر لگ چکا تھا۔ ایک بہت بڑا میدان جس میں گاؤں بھر کے لوگ اپنے اپنے کٹے ہوئے فصل کی ڈھیر لگا چکے تھے۔ کھلیان میں رات کے وقت ہر آدمی اپنے اپنے غلہ کی نگہبانی کے لئے رکتا تھا۔ کہ کہیں ہمارا غلہ کوئی اور نہ اٹھا لے۔

سلامت بھی اسی غرض کے تحت رات دن اپنے غلہ کی نگرانی کے لئے کھلیان میں موجود ہوتا تھا۔ گاؤں میں فصل کٹنے کے بعد کھلیان میں کسان اپنی فصل کی ڈھیر لگا دیتے ہیں، اس طرح ایک ہفتہ تک وہ کٹی ہوئی فصل دھوپ میں پڑی رہتی ہے اور پھر جب وہ سوکھ کر تیار ہو جاتی ہے تو کسان اپنے طریقے پر پودے سے دانہ الگ کر لیتے ہیں۔

رات کا ایک دن نہ جانے کونسا پہر تھا کہ ایک نرم و نازک ہاتھ سوتے میں سلامت کو اپنے چہرے پر محسوس ہوا۔ "کون!" اس آواز کے نکلتے ہی وہ نرم و نازک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا اور پھر فوراً ہی ایک نسوانی آواز اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے کان کے قریب "سرگوشی" میں گونجی۔ "خاموش رہو کوئی آواز سن لے گا۔"

نسوانی آواز سن کر سلامت اچنبھے میں پڑ گیا کہ اس وقت رات کے سمے یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے جو کہ اس کے قریب ہے۔

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا، ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ان دنوں ویسے بھی اندھیرا کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ اماوس کی تاریخیں چل رہی تھیں جس کی وجہ سے چاند آسمان سے غائب تھا، اور جب اماوس کی راتیں شروع ہوتی ہیں تو چاند کا وجود آسمان پر نظر نہیں آتا، چاند کی بالکل آخری تاریخیں ستائیس اٹھائیس اور انتیسویں کی ہوتی ہیں۔ جب آسمان پر چاند تارے ہوتے ہیں تو ہلکی یا تیز روشنی یعنی چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی نظر آتی ہے،

وہ نسوانی آواز اتنا بولنے کے بعد کہ "آواز کوئی سن لے گا" پھر اس کے بعد وہ نسوانی وجود سلامت کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سلامت نے محسوس کیا کہ یہ کوئی نوجوان لڑکی ہے جو اس کے پاس آئی ہے۔

پھر اس لڑکی نے اپنا سر سلامت کی چھاتی پر رکھ دیا اور پھر کھسک کر وہ سلامت کے اور قریب ہو گئی اس نے اپنا چہرہ سلامت کے چہرے کے مزید قریب کر لیا، ابھی تک سلامت کچھ زیادہ ہی ہلکان و اچنبھے میں تھا کہ رات کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نہ جانے یہ کون آ گئی ہے؟

اس لڑکی کی سرگوشی سنائی دی۔ "تم گھبراؤ نہیں، میرا نام مدھو ہے، میں تمہاری چاہت میں بے قرار ہو کر آج آ ہی گئی۔ تم بڑے کٹھور ہو، میں اکثر تمہیں آتے جاتے دیکھتی تھی مگر تم نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھنے تک کا گوارہ نہیں کیا۔

تم گھبرا کیوں رہے ہو، ارے مجھے دیکھو کہ میں لڑکی ہو کر رات کے اس اندھیرے میں تمہاری محبت میں بے چین ہو کر تمہارے پاس اور وہ بھی کھلیان میں آ گئی۔ تم بالکل بھی گھبراؤ نہیں، کسی نے مجھے تمہارے پاس آتے ہوئے دیکھا نہیں اور نہ ہی مجھے تمہارے پاس آتے ہوئے کوئی دیکھ سکتا ہے۔ ارے کیا تم اس طرح لیٹے ہی رہو گے چلو اٹھ کر بیٹھو تو۔"

"تمہارا گھر کس طرف ہے، اور تم کس کی بیٹی ہو، اگر کسی نے دیکھ لیا تو نہ جانے کیا طوفان آ جائے۔ ایسا کرو تم جلدی سے چلی جاؤ، کھلیان میں اور بھی لوگ موجود ہیں کوئی اس طرف آ گیا تو؟" اور سلامت کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ لڑکی نے اپنی انگلی اس کے منہ پر رکھ دی تھی۔

"تم فکر کیوں کر رہے ہو؟ میں نے بول دیا ناں کہ اس طرف کوئی بھی نہیں آ سکتا اور نہ ہی میری بات یا پھر تمہاری بات کوئی سن سکتا ہے، ہم دونوں کیا چیخ رہے ہیں کہ کوئی ہماری بات سن لے گا۔ رات کا آخری پہر ہے ہر کوئی گہری نیند میں پڑا ہے۔ چلو اٹھ کر بیٹھو۔" لڑکی بولی۔

سلامت اٹھ کر بیٹھ گیا تو وہ لڑکی مزید آگے کی طرف کھسک کر سلامت کے اور بہت قریب ہو گئی اور پھر وہ سلامت کی آغوش میں جیسے سما گئی۔ اب تو لڑکی کی سانسیں سلامت کے چہرے سے ٹکرانے لگیں، گرم گرم سانسیں اب سلامت کے چہرے پر متواتر پڑ رہی تھیں۔ سلامت نوجوان صحت مند یعنی اٹھتی ہوئی جوانی، اس قدر قریب کسی لڑکی کو موجود پا کر اس کی اندرونی کیفیت بہت غیر ہونے لگی۔ اس کا پورا جسم ہلکی سردی کے باوجود گرم محسوس ہونے لگا۔

لڑکی نے اپنی بانہیں سلامت کے گلے میں حمائل کر دیں اور پھر سلامت کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ اور پھر اپنے تپتے ہوئے ہونٹ سلامت کے ہونٹوں پر رکھ دیئے تو سلامت کی حالت ناقابل برداشت ہونے لگی کہ اچانک لڑکی نے سلامت کو چھوڑ دیا۔ اور پھر سلامت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "بھئی تم تو عجیب مرد ہو، جو ڈر رہے ہو، مرد تو بہادر ہوتے ہیں اور تم....." اور اس کی بات درمیان میں ہی رک گئی۔ کیونکہ سلامت بول پڑا۔

"بات دراصل مرد یا جوانی کی نہیں بلکہ بات

عزت کی ہے، دیکھو عزت سے بڑھ کر انسان کی زندگی میں کچھ نہیں، اور پھر میرے ابا کی گاؤں میں کتنی عزت ہے، اگر کسی نے شکایت کر دی تو وہ مجھے زندہ درگور کر دیں گے، اب تم جلدی سے چلی جاؤ یہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔"

"یہ تم نے تم تم" کیا لگا رکھی ہے، میرا نام مدھو ہے اور تم مجھے میرا نام مدھو لیا کرو۔ ٹھیک ہے تمہاری بات میں مان لیتی ہوں اور واپس جا رہی ہوں، بس میں تمہاری چاہت و محبت میں پاگل ہو گئی ہوں، جب مجھے چین نہیں آیا تو مجبور ہو کر تمہارے پاس آ گئی۔

ایک بات میری کان کھول کر سن لو، اگر تم نے مجھے اپنے سے الگ کیا تو میں تمہارے لئے اپنی جان دے دوں گی، ارے تم میری محبت اور میرا حوصلہ دیکھو کہ میں رات کے اس پہر اس گھور اندھیرے میں بھاگتی ہوئی تمہارے پاس آ گئی۔ یہ میں تمہیں پکا یقین کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ کوئی بھی مجھے تمہارے پاس آتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ خیر اب میں تمہاری بات مانتے ہوئے جا رہی ہوں۔ تم آرام سکون سے سو جاؤ۔" اس لڑکی نے سلامت کے گال پر ایک چٹکی بھری اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

سلامت اپنی جگہ بیٹھا ہوا گہری سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ مدھو! میں نے آج سے پہلے تو یہ نام سنا نہیں اور نہ ہی کسی اور کے منہ سے ہی یہ نام سنا جبکہ اس گاؤں میں بھی پلا بڑھا ہوں۔" پھر اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ ہو سکتا ہے یہ کسی کے گھر کافی دنوں سے مہمان آئی ہو؟" وہ جتنا اس لڑکی کے متعلق سوچتا رہا اتنا ہی اس کا ذہن الجھتا رہا۔ اور جب اس کا ذہن یہ سوچتے سوچتے تھک گیا تو وہ اپنی جگہ پر لیٹ گیا، اور یہ سوچ کر اپنے ذہن کو جھٹکا کہ "خیر جو بھی ہو، چلی تو گئی اور میں کل یا اپنے دوستوں سے معلوم کروں گا کہ یہ مدھو کون ہے" وہ کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ اپنے ذہن کو جتنا جھٹکتا اس سے کہیں زیادہ اس لڑکی کا خیال اس کے دماغ میں جڑ پکڑ لیتا۔

اور پھر اس ادھیڑ پن میں مسجد سے آتی ہوئی اذان کی آواز سنائی دی۔ تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنی جگہ پر وہ بیٹھا آنکھیں بند کئے اس لڑکی کے ہی بارے میں سوچتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور گھڑے میں پڑا ہوا پانی نکال کر اپنے منہ پر چھینٹے مارے اور مسجد کی طرف چل پڑا۔ مسجد میں جا کر اس نے مسواک کیا، وضو بنایا اور پھر ایک کونے میں بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگا۔ وقت مقررہ پر نماز کے لئے صف بندی شروع ہو گئی تو وہ اٹھا اور نماز کے لئے صف میں کھڑا ہو گیا۔ اور پھر فجر کی نماز اس نے ادا کی، نماز سے فارغ ہو کر وہ اپنے گھر آ گیا۔ مسجد میں سلامت کے والد صاحب بھی موجود تھے۔ مسجد سے واپس آ کر گھر میں سلامت نے ناشتہ کیا۔ اتنی دیر میں اس کے والد صاحب بھی گھر میں آ گئے اور پھر انہوں نے سلامت سے کھیت کھلیان کی باتیں کیں۔ انہوں نے بتایا کہ "فصل کٹے ابھی دو دن ہوئے ہیں ابھی ہمارے پاس تقریباً ایک ہفتہ ہے، اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پرسوں دوسرے کھیت کی فصل کٹائی کر لی جائے، میں نے چند لوگوں کو بتا دیا ہے وہ پرسوں سیدھے کھیت میں پہنچ جائیں گے، بس تم اس کا خاص خیال رکھنا کہ ٹھیک طور پر سارا کام مکمل ہو جائے۔

اب تم ایسا کرو کہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں لیٹ جاؤ تا کہ نیند آ جائے کیونکہ اصل نیند اپنے بستر پر ہی آتی ہے، کھلیان میں اتنا آرام تو نہیں مل سکتا جتنا کہ اپنے گھر میں ملتا ہے، میں اب کھلیان جا رہا ہوں، تم گھر پر ہی رہو یا پھر اپنے دوستوں سے ملاقات کر لو تھوڑی دیر گھوم پھر آنے کے بعد اپنے بستر پر پڑ کر سو جاؤ تا کہ نیند پوری ہو اور جسم تھکاوٹ سے محفوظ رہے۔ بیٹا یہی زندگی کا مقصد ہے کہ اپنے کام کو وقت پر انجام دو، اخلاق اور شرافت کا دامن کبھی نہ چھوڑو، احکام خداوندی پر چلو گے تو دین و دنیا میں فلاح پاؤ گے، اچھا اب میں کھلیان میں جا رہا ہوں، میرا کھانا لے کر نہیں آنا، میں خود ہی تھوڑی دیر کے لئے آ جاؤں گا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور سلیم سے بولوں گا کہ تھوڑی دیر وہ دیکھ بھال کرتا رہے۔" یہ بول کر سلامت کے والد خدا حافظ کہتے ہوئے کھلیان کے لئے گھر سے نکل پڑے۔

سلامت اپنے دوست یاروں سے ملنے کے لئے باہر چلا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ واپس آیا، نہایا دھویا اور پھر اپنے کمرے میں بستر پر جا کر لیٹ گیا، بستر پر لیٹتے ہی پھر اس کے دماغ میں رات کا مدھو والا واقعہ گھومنے لگا۔ مدھو کے جسم ہاتھ سے اور پھر اس کی من موہنی آواز سے تو اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ بہت خوبصورت بھی ہے، وہ بستر پر لیٹے لیٹے اس کے متعلق سوچتا رہا اور کروٹ پر کروٹ بھی بدلتا رہا اور پھر ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

دوپہر میں اس کے والد گھر آئے اور اس کا پوچھا تو چھوٹی بہن نے بتایا کہ۔ "بھائی سو رہے ہیں۔" یہ سن کر اس کے والد مطمئن ہوگئے اور پھر ظہر کی نماز کے لئے مسجد چلے گئے۔ نماز کے بعد وہ گھر آئے کھانا کھایا اور پھر دوبارہ کھلیان چلے گئے۔

دن کے ڈھائی بجے سلامت کو اس کی والدہ نے نیند سے اٹھایا اور بولیں۔ "بیٹا ڈھائی بج رہے ہیں اٹھو اور منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھالو۔" ماں کی بات سن کر وہ اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ کھانا کھاتے کھاتے اس نے پوچھا۔ "بابا آئے تھے، کھانا کھالیا؟" تو والدہ نے بتایا کہ "ہاں آئے تھے، نماز کے بعد کھانا کھا کر کھلیان چلے گئے ہیں۔"

گھنٹہ گھنٹہ کر کے دن گزر گیا، شام کی آمد ہوئی، اس نے والدہ سے کہا۔ "امی روٹیاں اور سالن دے دیں، کھلیان ہی میں رات کا کھانا کھالوں گا، مجھے جلدی جانا ہے کیونکہ بابا آج صبح سے کھلیان میں ہیں، میں جلدی جا کر انہیں بھیج دوں گا۔"

ویسے بھی گاؤں دیہات میں سرِ شام ہی ہر سو سناٹا چھا جاتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں یا پھر چند لوگ ایک جگہ مل بیٹھتے ہیں وہ بھی ڈیڑھ دو گھنٹہ کے لئے ایک دوسرے سے ہنس بول کر وقت پاس کر کے اٹھ جاتے ہیں اور پھر گھروں میں جا کر بستر کے ہو جاتے ہیں۔ دراصل گاؤں والے دن کا اجالا پھیلتے ہی کام کاج کے لئے گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ لیکن شہر میں زندگی اس سے مختلف زیادہ تر شہری لوگ دن کے آٹھ نو بجے تک سوتے رہتے ہیں اور رات کے بارہ بجے تک گھومنا پھرنا، گپ شپ لگانا یا پھر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اپنا وقت پاس کرتے ہیں۔

دن ڈھل گیا اور سلامت کھلیان پہنچ گیا، کھانا اپنے ساتھ لے گیا تھا، گاؤں میں چونکہ تیل گھی اصلی ہو ہے جس کی وجہ سے سالن جمتا نہیں اور پھر آٹا بھی ایسا ہوتا ہے کہ روٹی سوکھ کر سخت نہیں ہوتی۔ کھلیان میں جا کر سلامت نے اپنے والد کو گھر کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی دیر تک کھلیان میں موجود چند دوست ایک جگہ بیٹھ کر گپ شپ کرتے رہے کہ اچانک سلامت کو یا آ گیا تو اس نے پوچھا۔ "یار ہمارے گاؤں میں کوئی مدھو نام کی بھی لڑکی رہتی ہے؟"

"ارے بھئی یہ تجھے اچانک مدھو کا خیال کیسے آ گیا، کیا کوئی چکر و کر تو نہیں۔" ایک دوست بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں، بس میرے دماغ میں آج صبح سے یہ نام جیسے گردش کر رہا ہے۔" سلامت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایک اور دوست بولا۔ "بچوا اگر کوئی معاملہ ہے بتا دے تاکہ ہم سب مل کر تیرے من کی شانتی کے لئے کوئی اپائے کریں۔"

ایک اور بول پڑا۔ "واہ جی واہ! سلامت تیرے منہ سے ہم آج پہلی مرتبہ کسی لڑکی کا نام سن رہے ہیں تو پورے گاؤں میں ایسا ہے کہ تو جانتا ہی نہیں کہ مرد کے علاوہ ایک دوسرا وجود بھی ہے جس کا نام "عورت یا لڑ ہے یا پھر ایسا تو نہیں کہ کسی لڑکی نے تیرے خواب میں آ کر اپنا مکھڑا دکھلا دیا ہے۔ اور وہ بھی کسی ہندو لڑکی۔ کیونکہ مدھو نام تو غالباً ہندو میں ہی ہوتا یا پھر میں نے بھی سنا ہے کہ مدھو نام بنگال میں بھی رکھے جاتے ہیں مسلمان گھرانوں میں۔"

"تو کیا تو آج کل روٹی سالن کے بجائے بادام کھانے لگا ہے کہ تیرا دماغ زیادہ کام کر رہا ہے، تو نے بادام پر فلسفہ جھاڑنا شروع کر دیا۔" سلامت بولا۔

"بھئی بات تو ہے فکر اور سوچنے کی کیونکہ اتنی عمر ہونے کے بعد تیرے منہ سے پہلی مرتبہ کسی لڑکی کا نام سنا گیا ہے۔" ایک اور دوست بولا۔

"چل خواہ مخواہ کی لنترانی تو کر رہا ہے، میرے دماغ میں ایسا کچھ بھی نہیں۔ اب اس مسئلے کو چھوڑ اور اپنا اپنا کھانا لے آؤ تاکہ آج ساتھ بیٹھ کر کھائیں ویسے بھی ابھی تک آگ اپنا جوبن دکھلا رہی ہے۔ جسے ہم نے جلائی تھی۔" سلامت بولا۔

سب کے سب اپنا اپنا کھانا لے آئے اور جلتی آگ کے قریب بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک دیگچی میں اصلی دودھ کی چائے بنائی اور مزے مزے سے چائے پینے لگے۔ اکثر کھلیان میں موجود جو کہ اپنے فصل اور غلے کی رکھوالی کیا کرتے تھے وہ سب مل کر ساتھ کھانا کھاتے اور پھر چائے بنا کر چائے پیتے تھے۔

چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد سب کے سب جلتی آگ بجھائی اور اپنی اپنی جگہ پر آ کر سونے کے لئے لیٹ گئے۔ بستر پر لیٹتے ہی اچانک سلامت کو مدھو والا واقعہ یاد آ گیا اور اس نے سوچا۔ "عجیب نڈر اور ہمت والی لڑکی ہے جو کہ کھلیان میں اندھیری رات اور کسی کے دیکھ لئے جانے سے بے خوف ہو کر آ گئی، اپنے ارادے کی تو وہ واقعی بہت ہی پکی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ اگر تم نہ ملے تو میں تمہارے نام پر اپنی جان دے دوں گی۔"

وہ یہ سوچتے ہوئے کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا، مدھو کے خیالوں نے اسے نیند سے بہت دور کر دیا تھا وہ اس اچنبھے میں زیادہ تھا کہ نہ آج سے پہلے اس نے اس لڑکی کو گاؤں میں دیکھا اور نہ ہی اس نے کبھی اس کا نام سنا تھا۔ اس کے دماغ میں بار بار یہی آ رہا تھا کہ آخر یہ لڑکی ہے کون؟" کافی دیر تک یہی سوچتے سوچتے وہ گہری نیند میں سو گیا۔

آج پھر رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا کہ اس کی آنکھ اچانک کھل گئی کیونکہ کسی نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تھا۔ اس نے جب آنکھ کھولی تو سوائے اندھیرے کے اسے کچھ نظر نہیں آیا، تو اس نے خود اپنے ہاتھ کو اپنے چہرے پر پھیرا تو اس کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ اس کے بعد کسی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"گھبراؤ نہیں میں ہوں مدھو۔" یہ سننا تھا کہ وہ گھبرا کر اپنی جگہ اٹھ بیٹھا۔ پھر سرگوشی سنائی دی۔ "کتنے مزے سے نیند کے مزے لے رہے تھے اور ایک میں، میرا من کتنا پاگل اور بے چین ہو رہا تھا تمہارے بغیر تم مرد ہوتے ہی ہو سخت دل کے۔"

سلامت فوراً بولا۔ "مدھو تمہارے آنے سے میرا دل بہت دھڑک رہا ہے یہ سوچ کر کہ اگر کسی نے تمہیں آتے اور پھر میرے پاس دیکھ لیا تو میرا انجام اتنا بھیانک ہوگا کہ میں یہ سوچ کر دہل رہا ہوں۔ تم رات کے وقت اس طرح یہاں نہیں آیا کرو، جس گھر میں بھی تم رہتی ہو اور پھر اس قدر فاصلہ طے کر کے آنا، یہ ٹھیک نہیں ہے، ہوسکتا ہے کھلیان میں سوتا ہوا کوئی اٹھ جائے اور پھر اس کی نظر تم پر پڑ جائے تو تم خود ہی سوچو کہ اس وقت کیا ہوگا۔ میں تو یہی سب سوچ کر ہلکان ہو رہا ہوں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں، لگتا ہے تم تو پاگل ہوگئی ہو، تم انجام کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہو۔"

"تم کیوں فکر مند ہو رہے ہو، جب میں نے یہ کہہ دیا کہ مجھ پر کسی کی بھی نظر نہیں پڑ سکتی اور پھر نہ ہی کوئی میری یا تمہاری آواز سن سکتا ہے کیونکہ رات کے اس سمے ہر کوئی گہری نیند میں پڑا ہوتا ہے۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہی میری باتوں پر یقین کرو، اور یہ ڈرنا دہلنا چھوڑ دو ہمت والے بنو، حوصلہ رکھو میرے ہوتے ہوئے تم پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا، اگر کسی نے تمہیں میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھ نکال دوں گی، اگر کسی نے تمہیں نقصان پہنچایا تو میں اس کا ناطہ اس دنیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے توڑ دوں گی، اگر کسی نے تم پر ہاتھ اٹھایا تو میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عبرت کا نشان بنا کر رکھ دوں گی، یہ میری گیدڑ بھبکی نہیں بلکہ میں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں، کسی دن یہ تم دیکھ لینا کہ اگر کسی نے تمہارے خلاف غلط سوچا بھی تو اس کی خیر نہیں۔

میں نے تمہیں چاہا ہے، میں نے تم سے پیار کیا ہے، میرے من میں صرف اور صرف تمہاری صورت بس گئی ہے۔ میں نے اٹل فیصلہ کرلیا ہے کہ میں اپنا تن من تم پر نچھاور کردوں گی، یہ مدھو کا تم سے وعدہ ہے۔ تم نڈر ہو کر مجھ سے ملو، میری اور تمہاری ملاقات صرف رات میں ہی ہوسکتی ہے بلکہ ہوتی رہے گی۔"

سلامت بولا۔ "تم نے مجھے سوچ کے سمندر میں غرق کردیا ہے، میں یہ سوچ سوچ کر بے چین ہوں کہ تم ہو کون؟ اور اس طرح بے باکی سے رات کے وقت آنا، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کوئی تمہیں دیکھ نہ سکے، ایسا ممکن ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم دونوں کا ملنا کسی کو معلوم نہ ہو اور یہ کھلیان میں اپنا تھوڑے دنوں کی بات ہے جب کھلیان کا کام ختم ہوجائے گا تو پھر تم رات کے وقت مجھ سے کس طرح مل سکتی ہو، رات میں گھر کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، گھر میں سارے افراد موجود ہوتے ہیں۔"

"بھئی جب تک تم کھلیان میں موجود ہو، اس وقت تک تو میں تم سے مل سکتی ہوں۔ کھلیان سے جب تمہارا کام ختم ہوجائے گا تو پھر اس کے متعلق سوچوں گی، یہ سوچنا تمہارا کام نہیں۔ تم میرے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ میرا دل تمہارے لئے کس قدر زور زور سے دھڑک رہا ہے۔" اور پھر مدھو نے سلامت کا سیدھا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ لیا۔

سلامت نے محسوس کیا کہ مدھو کا دل واقعی دھونکنی کی طرح ہو رہا تھا۔ آج مدھو بہت ہی چھوٹا گھاگرا اور پھر چولی بہت ہی چھوٹی پہن رکھی تھی۔ کیونکہ جب سلامت نے اپنے ہاتھ اس کے جسم پر پھیرے تو اسے اس کا اندازہ ہوا۔

"مدھو کسی دن مروا نہیں دینا، بس میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے، مدھو نے سلامت کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھ لئے، اور پھر وہ جیسے سلامت کی آغوش میں سما گئی۔ سلامت صحت و تندرستی میں پورے گاؤں میں یکتا تھا، کوئی اور اس جیسا خوبرو، جیہہ، طاقتور، گٹھیلا جسم والا اور بانکا نہیں تھا۔ گاؤں میں موجود زیادہ تر لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ سلامت ہمارا داماد بن جائے۔

اندھیری رات، بے خوف و خطر کی تنہائی، "جوان جسم ایک جگہ ہوں تو کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ اس وقت انسان کی ذہنی جسمانی اور اندرونی کیفیت کیا ہوسکتی ہے۔

مدھو نے اور قریب ہو کر اپنے ہونٹ سلامت کے ہونٹ پر رکھ دیئے اور پھر سلامت اپنے جذبات سے بے قابو ہو کر مدھو کو بھینچ لیا اور پھر بپھرا ہوا طوفان نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سلامت تمہارا بہت بہت دھنے واد، تم نے میرے بیاکل من کو شانت کردیا، اب میں چلتی ہوں، بھور ہونے والی ہے۔" اور مدھو جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تو سلامت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "کل ضرور آنا، میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

اذان فجر سنائی دی مگر سلامت اپنی جگہ گہری نیند ہی پڑا رہا، وہ جس طرح اذان فجر کے وقت اٹھ جاتا تھا اور پھر مسجد کی راہ لیتا۔ صبح ہوئی تو کھلیان میں موجود اس کے کئی دوستوں نے پوچھا "سلامت آج تو مسجد نہیں گیا" تو سلامت بولا۔ "آج پتہ نہیں کیا ہوا، میری آنکھ نہیں کھلی، میں سوتا رہ گیا۔" سلامت جب گھر کے لئے کھلیان سے روانہ ہوا تو وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ نڈھال محسوس کررہا تھا اور یہی نہیں بلکہ اس کے جسم اور کپڑوں سے عجیب قسم کی بو بھی محسوس ہورہی تھی۔ اس کے والد مسجد سے نماز پڑھ کر آچکے تھے انہوں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "بیٹا آج تم مسجد میں نظر نہیں آئے؟"

"جی بابا! پتہ نہیں آج میری آنکھ کیوں نہیں کھلی، میں خود بھی حیران ہوں۔"

یہ سن کر سلامت کی والدہ نے کہا۔ "تم زیادہ تھک گئے ہوگے اور تھکن کی وجہ سے تمہاری آنکھ نہیں کھلی، خیر چھوڑو، آئندہ کوشش کرنا کہ اذان فجر پر تمہاری آنکھ کھل جائے۔ اچھا بیٹھو میں ناشتہ پکا کر دسترخوان پر لگاتی ہوں۔"

"نہیں امی ابھی دل نہیں کررہا ناشتہ کے لئے، کل رات میں ہم نے ایک جگہ کھانا کھایا تھا اور اس طرح میں نے کھانا کچھ زیادہ ہی کھالیا تھا۔ میرے کپڑے آپ نکال دیں، میں کنوئیں پر جا کر پہلے نہاؤں گا، پھر ناشتہ کروں گا۔" یہ سن کر اس کی امی نے آواز دی۔ "ارے نگہت ذرا سلامت کے کپڑے نکال دو، میں ناشتہ بنا رہی ہوں۔" نگہت سلامت کی چھوٹی بہن تھی۔ نگہت جھٹ اٹھی اور دوسرے کمرے سے سلامت کے کپڑے لا کر سلامت کو دے دیئے۔ سلامت نے کپڑے پکڑے اور نہانے کے لئے باہر کنوئیں پر چلا گیا۔ گاؤں دیہات میں لوگ عموماً کنوئیں پر یا پھر تالاب میں غسل کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد سلامت نہا کر آ گیا اور اپنے اتارے ہوئے کپڑے نگہت کو آواز دے کر پکڑا دیا۔ کپڑے پکڑتے ہی نگہت بولی۔ "بھیا آپ کے کپڑوں سے صندل کی خوشبو آرہی ہے، آپ کے کپڑوں میں صندل کیسے لگ گیا؟"

"ارے بھئی ایک دوست عطر لایا تھا، اس نے کپڑوں پر عطر والا ہاتھ پھیر دیا تھا۔" یہ بول کر سلامت ناشتہ کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس کی والدہ نے اس کے سامنے اصلی گھی میں بنے ہوئے دو پراٹھے، سرسوں کا ساگ اور ایک گلاس لسی کا بھر کر اس میں مکھن ڈال دیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "امی میں کھلیان جارہا ہوں۔" یہ سن کر اس کے والد بولے۔ "بیٹا کھلیان میں جارہا ہوں، تم گھر پر آرام کرو، دوپہر میں تمہارا کھانا نہیں لانا، میں خود آ کر کھالوں گا اور نماز بھی تو پڑھنی ہے۔" یہ بول کر اس کے والد کھلیان چلے گئے۔ سلامت کی امی نے کہا۔ "بیٹا اب تم آرام کرو، اور کوشش کرنا کہ جلدی سے نیند آجائے۔"

والدہ کی بات سن کر وہ بولا۔ "ٹھیک ہے امی، میں اپنے کمرے میں جا کر سو رہا ہوں۔" اور وہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹ کر وہ رات والے واقعے میں کھو گیا، وہ مدھو کے متعلق سوچنے لگا۔ "عورت ذات ہو کر کس قدر نڈر اور بہادر ہے، میں تو مر کر دوبارہ پیدا بھی ہوجاؤں تو شاید اتنا ہمت والا نہیں بن سکوں، اندھیری رات، سنسان راستے اور گھر سے چل کر اتنی دور کھلیان میں آنا۔" یہ باتیں سوچتے ہوئے اس کا دماغ جھنجھنانے لگا تو اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا اور نیند کے سمندر میں ڈوب گیا۔

دوپہر میں اس کی بہن نے اسے اٹھایا کھانا کھانے کے لئے، وہ اٹھا کھانا کھایا اور پھر باہر اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد واپس آیا اور پھر دوبارہ اپنے بستر پر پڑ کر سو گیا۔

دن ڈھلا شام ہوئی اور سلامت اپنا رات کا کھانا لے کر کھلیان میں پہنچ گیا اور کھلیان میں موجود اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں لگ گیا۔ سب نے اس جگہ پھر آگ جلا دی جہاں روزانہ آگ جلایا کرتے تھے۔ اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد دودھ پتی کی چائے بنی اور سب چائے پینے کے بعد تھوڑی دیر بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔

ان میں سے ایک بولا۔ "سلامت، تم نے کل رات کسی مدھو کے بارے میں پوچھا تھا، تو کیا اس کا کوئی سراغ ملا۔"

دوسرا بولا۔ "ارے ہاں یاد آیا، سلامت کیا بنا تمہاری مدھو کا، پتہ چلا جو کہ تمہارے دماغ پر چھا گئی ہے۔"

یہ سن کر سلامت بولا۔ "تم لوگ خواہ مخواہ پوچھ پاچھ کررہے ہو، مدھو ودھو کوئی نہیں میں نے تو بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا، کیونکہ یہ نام اچانک میرے دماغ میں آ گیا تھا۔"

ایک اور بولا۔ "تو مان یا نہ مان میں نے آج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دن بھر ئی لوگوں سے معلوم کیا ہے کہ کیا اس نام کی کوئی لڑکی ہمارے گاؤں میں ہے، ویسے تو ہم گاؤں کے سارے لوگوں کے متعلق تو جانتے ہیں، میرے دماغ میں یہ بات بھی آئی تھی کہ ہوسکتا ہے اس نام کی کوئی لڑکی کسی کے گھر کسی اور جگہ سے مہمان آئی ہو، مجھے تو لگتا ہے کہ یہ......'' اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

آدھا گھنٹہ تک وہ سب آگ کے گرد بیٹھے گپ شپ کرتے رہے اور پھر سونے کے لئے اس جگہ سے اٹھ گئے۔ سلامت اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گیا، بستر پر جیسے ہی لیٹا تو رات میں بیتے ہوئے مدھو کے خیالات نے اسے آن گھیرا، وہ ابھی تک اچنبھے میں تھا کہ ''آخر یہ لڑکی ہے کون، کہاں سے آتی ہے، کس کے گھر میں موجود ہے؟''

بہر حال آج اسے مدھو بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ کہاں تو وہ پہلے روز خوف کی شدت سے ڈر رہا تھا، ڈر اس پر اس قدر سوار تھا کہ جیسے وہ کپکپا رہا تھا اور اسے جلدی تھی کہ مدھو جلدی سے چلی جائے مگر آج وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

رات کے تقریباً ڈیڑھ کا وقت تھا اور ابھی تک اسے نیند نہیں آئی تھی کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کی جگہ موجود ہے، اس نے آہستہ سے بولا۔ ''کون؟''

''تمہاری جان!'' یہ آواز سنتے ہی سلامت اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''آج تم نے آنے میں اتنی دیر کردی میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج تم آؤ نہیں اور یہ سوچ سوچ کر میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔''

وہ سلامت کے قریب بیٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔

''میں تو تم سے کہیں زیادہ بے چین تھی آنے کے لئے، اگر میرا بس چلے تو میں تمہیں چھوڑ کر جاؤں نہیں، میں تو سوچتی ہوں کہ دن رات تمہارے پاس ہوں مگر افسوس کہ میں ایسا نہیں کرسکتی، میں بے بس ہوں، کاش! میں ہر پل تمہارے قریب رہوں۔ کاش! دن کے اجالے میں بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب رہیں مگر کبھی کبھی انسان کی مجبوریاں انسان کو اذیت سے دوچار کردیتی ہیں۔ کاش! کہ دنیا کے سامنے ہم دونوں کا ملن ہو جائے، خیر تم گھبراؤ نہیں، میں تمہیں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی، اور اگر تم نے بے وفائی کی تو میں تمہارے سامنے اپنی جان دے دوں گی۔''

''ایسی بات مت کرو مدھو، اگر میری جان کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں، اب تو میں بھی تمہاری جدائی برداشت نہیں کرسکتا، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت میرے قریب رہو، اب تو تمہارے بغیر میرا دل کہیں اور نہیں لگتا اور میں بڑی شدت سے انتظار کرتا ہوں کہ جلدی سے رات آ جائے، میں تو یہ بھی سوچنے لگا ہوں کہ دن کا اجالا نہیں پھیلے بلکہ ہر وقت رات ہی رات رہے۔'' اور یہ بول کر سلامت نے مدھو کو خود سے لپٹا لیا۔

دونوں کے درمیان میل ملاپ کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر ان دونوں نے حدود کی ساری حدیں پھلانگ ڈالیں۔ دونوں صحت مند تھے جوان تھے۔ دونوں کی خوشیاں اور امنگیں دیکھنے کے قابل تھیں۔ کھلیان میں موجود سارے لوگ خواب خرگوش میں پڑے تھے اور یہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں مست تھے۔

سلامت کو تو کچھ ہوش ہی نہیں تھا کہ مدھو بولی۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں، میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

یہ سنتے ہی جیسے سلامت مچل گیا اور بولا۔ ''بھئی اتنی جلدی جانے کی بات نہ کرو، ابھی تمہیں آئے وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ یہ تم نہیں کہا کرو کہ ''میں جا رہی ہوں۔''

''تمہیں نہیں معلوم! میں زیادہ بہتر جانتی ہوں کہ مجھے کتنا وقت رکنا ہے، اگر میں زیادہ دیر تک رک گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے دن آنے میں میرے سامنے کوئی رکاوٹ یا پریشانی کھڑی ہو جائے۔ لہذا میری تمہاری خوشی اس میں ہے کہ میں وقت پر آؤں اور وقت پر جاؤں، یہ جدائی تمہیں برداشت کرنی پڑے گی

ابھی سے کل رات ڈیڑھ دو بجے تک، اب تم آرام سے سو جاؤ، اور میں چلتی ہوں۔'' یہ بول کر وہ اس جگہ سے باہر نکل گئی۔

سلامت کے دل میں ابھی بھی یہ ڈر تھا کہ کہیں کوئی اسے آتے یا جاتے وقت دیکھ نہ لے، مگر وہ بھی کیا کرسکتا تھا۔ خیر اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو مطمئن کرلیا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اور مدھو کا خیال [illegible] ہوا اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔

کب فجر کی اذان ہوئی، کب صبح ہوئی اسے پتہ نہ چلا۔ صبح کے ساڑھے سات بجے اس کا ایک دوست جو کہ وہ بھی کھلیان میں اپنے غلے کی پہریداری کرتا تھا اس نے اسے سوتے سے اٹھایا تو سلامت اٹھ گیا۔ دوست جس کا نام رمضان تھا بولا۔ ''ارے بھئی آج کیا بات ہے تو اٹھا نہیں، تو تو سب سے پہلے فجر کے وقت اٹھ جاتا ہے، تو دوسروں کو اٹھاتا ہے اور آج......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

سلامت فوراً بولا۔ ''ابے کیا بتاؤں، رات میں نیند نہیں آئی اور کافی رات گئے آنکھ لگی، آج بابا بھی باز پرس کریں گے۔''

''چل فکر نہ کر بول دینا بس آنکھ نہ کھلی، تیرے بابا کونسا ظلم کریں گے، تیرے بابا کو پتہ ہے جوانی کی نیند کیسی ہوتی ہے، اگر تجھے ڈر لگ رہا ہے تو میں چلوں تیرے ساتھ، بابا سے تیری سفارش کردوں گا۔''

''ارے رمضان ایسی بات نہیں، میرے بابا بہت اچھے ہیں، اچھا اب میں چلتا ہوں۔ ذرا دیکھ بھال رکھنا، تھوڑی دیر میں میں خود آ جاؤں گا۔'' یہ بول کر سلامت اپنے گھر آ گیا۔

سلامت جب گھر آیا تو اس کی والدہ راہ تک رہی تھیں، اس کی بہنیں اور بابا بھی بے چین تھے کہ آج سلامت نے کیوں اتنی دیر کردی۔ سلامت کو دیکھتے ہی اس کی والدہ بولیں۔ ''بیٹا! خیریت تو ہے ناں آج اتنی دیر!''

''امی پتہ نہیں آج بھی میری آنکھ نہ کھلی، مجھے اتنی دیر سوتا دیکھ کر رمضان بھی اچنبھے میں تھا۔''

''چلو کوئی بات نہیں کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ رات میں جلدی سویا کرو، لگتا ہے تمہارے سر میں خشکی ہوگئی ہے، جب دماغ میں خشکی بڑھ جاتی ہے تو ایسا ہوتا ہے، چلو میں تمہارے سر میں روغن بادام کی مالش کردیتی ہوں، چند دن ایسا کرنے سے یہ خشکی دور ہو جائیگی، اور پھر وقت پر نیند آئے گی اور وقت پر ہی نیند

بڑی رحمت......!

انسان کی دیرینہ خواہشات میں سے ایک خواہش یہ بھی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے مستقبل میں جھانک کر دیکھے اور یہ معلوم کرسکے کہ آنے والا کل کیسا ہوگا؟ اس کی عمر کتنی لمبی ہوگی؟ وہ آگے چل کر غم دیکھے گا یا خوشیاں؟ حادثے اور سانحے کب اور کہاں پیش آئیں گے اور شادمانی کے اسباب کیا کیا میسر ہوں گے؟

مگر یہ تو سوچئے کہ اگر خالق کائنات انسان کو یہ سب کچھ پیشگی بتا دیتا تو زندگی اس کے لئے موت سے بدتر ہو جاتی۔ آنے والے غموں کے تصور میں اس کی موجودہ خوشیاں بھی زہر کا پیالہ بن جاتیں۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ زندگی کے کس مرحلے میں اس کے کون کون سے پیارے داغ مفارقت دینے والے ہیں تو ایک اسی غم کے باعث دنیا سے اس کا دل چاٹ ہو جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ قدرت نے مستقبل پر غیب کے پردے ڈال رکھے ہیں اور دیکھا جائے تو یہ بھی اللہ کی رحمتوں میں سے ایک بہت بڑی رحمت ہے۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اٹھ جاؤ گے۔"

"ارے امی آپ پریشان نہ ہوں، خواہ مخواہ آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"بیٹا! تمہاری امی ٹھیک کہہ رہی ہیں، روغن بادام سے مالش کے بعد تمہارے سر میں تازگی آجائے گی۔" سلامت کے والد نے کہا۔ تو سلامت نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

"نگہت میرے کپڑے نکال دو، میں ذرا غسل کرلوں۔" سلامت نے کہا۔

یہ سن کر اس کی والدہ نے نگہت سے کہا "بیٹا بھائی کے کپڑے نکال دو، یہ جلدی سے نہا کر آجائے تو میں ناشتہ دوں۔"

نگہت نے اس کے کپڑے نکال دیئے، اس نے کپڑے لئے اور نہانے کے لئے باہر کنوئیں پر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ نہا کر آ گیا۔ تو اس کی والدہ نے ناشتہ لگا دیا، اس نے ناشتہ کیا اور بولا۔ "امی رات میں تیل کی مالش کر دیجیے گا، میں ابھی کھلیان جا رہا ہوں، میں نے رمضان سے بولا تھا، ذرا تو خیال رکھنا میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"بیٹا میں چلا جاتا ہوں۔" اس کے والد بولے۔

"نہیں بابا میں جا رہا ہوں۔ آپ جا کر کھیت کو دیکھ لیں، اور خاص طور سے اس نالی کو دیکھ لیجئے گا۔ جس سے کھیت میں پانی جاتا ہے، یہ کام بھی کل ہو جائے تو اچھا ہے، کل صبح کے وقت کھیت میں پانی لگا دیں گے۔" سلامت نے کہا تو اس کے بابا بولے۔ "ٹھیک ہے تم چلے جاؤ اور میں کھیت کی طرف جا رہا ہوں، اور دوپہر میں تمہارا کھانا لے کر آجاؤں گا۔"

"آپ تکلیف مت کیجئے گا، میں خود ہی آ کر کھانا کھا لوں گا، چند منٹ کی تو بات ہے۔ آپ کھیت سے واپسی پر آرام کر لیجئے گا۔" اور یہ بول کر سلامت کھلیان کے لئے نکلتا چلا گیا۔

سلامت کے جانے کے بعد اس کے بابا کھیت کی طرف چلے گئے اور اس کی والدہ دوپہر کا کھانا پکانے میں مصروف ہو گئیں۔ سلامت جب کھلیان میں پہنچا تو رمضان بولا۔ "ارے بھئی اتنی جلدی کیوں آ گیا، میں تو دیکھ بھال کر ہی رہا تھا، گھر میں آرام کر لیتا۔"

"ارے آرام کیسا، بابا کھیت کی طرف گئے ہیں، کل صبح کھیت میں پانی لگانا ہے، اور میں یہاں چلا آیا۔" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اس جگہ جمال آ گیا، اسے لوگ جمالا، جمالا کہہ کر پکارتے تھے۔ سلامت کی بات سن کر جمالا بولا۔ "کل تو ہماری باری ہے کھیت میں پانی لگانے کی۔"

سلامت بولا۔ "میں نے ایک ہفتہ پہلے کل کے لئے بول دیا تھا، جس پر تو بھی راضی تھا، ارے بھئی کنواں ایک ہے اور پھر جب بھی پانی لگایا جاتا ہے سب ایک دوسرے سے اتفاق کرتے ہیں تو، ایک دوسرے کا کام چلتا ہے۔ کئی لوگوں کے سامنے یہ بات ہوئی تھی، اور اس جگہ رمضان بھی موجود تھا، کیوں رمضان! تیرے سامنے بھی یہ بات ہوئی تھی، کل کا دن ہمارا ہے پانی لگانے کا۔"

"ہاں! یہ بات تو میرے سامنے ہوئی تھی، جمالا تو بھی راضی تھا۔ اگر تو کہہ دیتا تو، کل تو پانی لگا لیتا، سلامت ایک دن بعد اپنے کھیت میں پانی لگا دیتا۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا! کل پانی میں ہی لگاؤں گا، سلامت تو ایک دن بعد یعنی پرسوں پانی لگا لینا۔" جمالا بولا۔

"دیکھ بھئی جمالا! میرا پانی تو کل ہی لگے گا، کئی لوگوں کے سامنے تیری رضامندی سے میں نے اپنے لئے کل کا دن مقرر کیا تھا۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے، کام کرنے والوں کو میں نے ایڈوانس پیسے بھی دے دیئے ہیں۔" اتنے میں اس جگہ چند لوگ اور بھی جمع ہو گئے تھے، جب انہوں نے سنا کہ جمالا ہٹ دھرمی کر رہا ہے تو سب نے یہی بولا کہ "جمالا یہ فیصلہ ایک ہفتہ پہلے ہو گیا تھا، اور تو بھی راضی تھا مگر آج اچانک تو کیوں پنگے بازی کر رہا ہے۔" یہ سنتے ہی جمالا مشتعل ہو گیا اور سلامت کا اس نے جھٹ گریبان پکڑ لیا۔ اور

بولا۔ "میں دیکھوں گا کہ مجھے کون روکے گا کل پانی لگانے سے۔ اور اگر تجھ میں ہمت ہو تو کل صبح آ جانا کنویں پر۔"

یہ دیکھ کر اس جگہ موجود چند لوگوں نے جمالا سے سلامت کا گریبان چھڑایا اور بولے۔ "جمالا یہ تیری زیادتی ہے، سلامت چونکہ شریف ہے اس لئے تو دھونس جما رہا ہے۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں یہی ہوگا، کل پانی میں لگاؤں گا، اگر کسی میں ہمت ہے تو روک لے۔"

یہ سن کر چند لوگ بولے۔ "ٹھیک ہے پھر تیرے والد کے پاس چلتے ہیں، انہیں بھی یہ بات معلوم ہے کہ پرسوں تمہاری باری ہے۔"

جمالا آپے سے باہر ہو گیا اور بولا۔ "کسی کو میرے بابا کے پاس جانے کی ضرورت نہیں، جو میں نے بول دیا وہی ہوگا اور میں اپنے فیصلے سے کسی صورت پیچھے نہیں ہٹوں گا، اب جس کا جو دل چاہے کرے۔" اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس جگہ موجود سب نے کہا۔ "سلامت تو فکر نہ کر پانی لگانے کی باری کل تیری ہے اور تو ہی پانی لگائے گا، جب یہ فیصلہ ایک ہفتہ پہلے ہو چکا ہے تو یہ ٹل نہیں سکتا، ہم جمالا کے والد کے پاس جا رہے ہیں تو فکر نہ کر۔"

سلامت بولا۔ "رمضان چھوڑ دے اس بات کو، لڑائی جھگڑا ٹھیک نہیں، تم لوگ تو جانتے ہی ہو کہ جمالا کس قماش کا آدمی ہے، میں اپنے بابا کو بول دوں گا، وہ میری بات مان لیں گے، ایک دن کی تو بات ہے کل نہ سہی پرسوں سہی۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا، یہ تیرا مسئلہ نہیں پورے گاؤں کا مسئلہ ہے، اگر جمالا زیادہ ہیکڑی دکھاتا ہے تو ہم اس کی ہیکڑی نکالنا بھی جانتے ہیں، تو یہاں رک جا اور دیکھ بھال رکھنا ہم تھوڑی دیر میں واپس آتے ہیں، ہم جانتے ہیں چاچا جمن اچھے آدمی ہیں، جو اصل بات ہے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ کل پانی تیرا ہی لگے گا۔" یہ بول کر وہ لوگ جمالا کے والد کی طرف چلے گئے۔

سب لوگ جمالا کے والد کے پاس گئے اور ساری روداد سنائی اور یہ بھی بتایا کہ جمالا نے خواہ مخواہ سلامت کے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہے تو جمال کے والد جمالا پر بہت برہم ہوئے اور بولے۔ "جمالا جب ایک ہفتہ پہلے یہ بات طے ہو گئی تھی کہ کل پانی کی باری ان کی ہے تو تو کیوں بیچ میں ٹانگ اڑا رہا ہے۔ کل پانی انکا ہی لگے گا، تو کل اپنا پانی لگا لینا۔"

یہ سن کر جمالا طیش میں آ گیا اور بولا۔ "بابا جو میں نے بول دیا ہے، وہ ہوگا، کل میں پانی لگاؤں گا۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو روک کر دکھائے۔"

"دیکھ میری بات مان لے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا، یہ تیرا مسئلہ نہیں، یہ میرا مسئلہ ہے، بلکہ یہ پورے گاؤں کا مسئلہ ہے، میں تیری بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا، ارے گاؤں میں میری بھی عزت ہے، جب سب کے سامنے ایک بات طے ہو گئی تو بس ہو گئی، اگر ایسی بات تھی تو، تو اس روز آج کے لئے راضی ہو جاتا، تیری رضامندی سے یہ بات سب کے سامنے طے ہو گئی تھی، اور جو بات ہو گئی وہی ہوگا۔ یہ میرا ابھی فیصلہ ہے کہ تو پرسوں پانی لگائے گا۔"

یہ سن کر وہ مزید طیش میں آ گیا اور بولا۔ "بابا یہ آپ کا مسئلہ نہیں، جو بھی مجھے پانی لگانے سے روکے گا اسے میں دیکھ لوں گا، اور ہوگا وہی جو میں نے کہہ دیا۔" اور پھر وہ غصے سے باہر نکل گیا۔ اس کی باتیں سن کر سب کے سب بالکل خاموش تھے کہ اس کے والد بولے۔ "بیٹے آپ لوگ جائیں، ہم پرسوں پانی لگا لیں گے، کل سلامت ہی پانی لگائے گا، میں خود جمالے کو دیکھ لوں گا، اور آج رات میں خود کھلیان میں آؤں گا، میں دیکھتا ہوں کہ وہ کیسے نہیں مانے گا۔" یہ باتیں سن کر سب کے سب واپس آ گئے۔ اور کھلیان میں آ کر جمالے کے والد کا فیصلہ سلامت کو سنا دیا۔

دوپہر میں سلامت کھانا کھانے کے لئے گھر آیا، اور پھر اس نے جمالے کی ساری باتیں اور اس کے والد کے فیصلے سے اپنے بابا کو آگاہ کیا، تو اس کے والد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولے۔ ”سلامت بیٹے، کیا فرق پڑتا ہے، ایک دن آگے یا پیچھے، چلو کوئی بات نہیں، ہم پرسوں پانی لگالیں گے، میں جا کر جمن کو سمجھادوں گا کہ وہ جمالے پر سختی نہ کریں۔ چلو تم کھانا کھاؤ۔“

شام ہوئی، مغرب کی نماز کے بعد سلامت کے والد سلامت کا کھانا لے کر کھلیان گئے، سلامت کو کھانا دیا اور سمجھایا۔ ”بیٹا جمالے سے زیادہ بات نہیں کرنا، میں نے جمن کو بھی سمجھا دیا ہے کہ کوئی بات نہیں ہم پرسوں پانی لگالیں گے، ایک دن میں کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ ”نہیں جو بات ایک بار طے ہوگئی وہی ہوگا، انہوں نے کہا ہے کہ میں جمالے کو سمجھالوں گا۔“

سلامت بولا ”ٹھیک ہے بابا، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جائیں۔“ سلامت کے والد کھلیان سے واپس گھر آگئے۔

رات کے تقریباً آٹھ بجے جمالے کے والد کھلیان پہنچے، جمالا کھلیان میں ہی موجود تھا، اپنی جگہ پر جہاں اس کا غلہ پڑا تھا۔ اس کے والد کو دیکھتے ہی چند بندے ان کے قریب آگئے تو وہ بولے۔ ”میں نے سختی سے جمالے کو سمجھا دیا ہے کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے، ویسے سلامت کے بابا آئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ لوگ کل پانی لگالیں، ہم پرسوں پانی لگالیں گے۔ تو میں نے جواب دیا کہ یہ آپ کی شرافت ہے، لیکن کل ہی آپ پانی لگائیں گے، میں پرسوں پانی لگالوں گا، اور جمالے کی میرے آگے نہیں چل سکتی، ابھی میں زندہ ہوں، جو بات پنچ کے سامنے ہوجائے وہی اٹل ہے۔“

”چاچا آپ چھوڑیں، دراصل جمالا بہت ضدی ہے، ہم بھی اسے سمجھادیں گے، اب اس کی مرضی جو چاہے کرے، آپ درمیان میں نہیں بولئے گا، سلامت بھی اس میں خوش ہے کہ لڑائی جھگڑا نہ ہو، ایک دن میں بھلا کیا فرق پڑ جائے گا۔ آپ یہیں بیٹھ جائیں، آگ بھی جل رہی ہے، اور آج تو ہمارے ہاتھ کی چائے پینی پڑے گی، ہم نے چائے کا انتظام کر رکھا ہے۔“ رمضان بولا۔

رمضان کی باتیں سن کر جمالا کے والد اس جگہ بیٹھ گئے، جہاں آگ جل رہی تھی، اس جگہ اور بھی کئی لڑکے موجود تھے جن میں سلامت بھی موجود تھا۔ رمضان دوڑا ہوا گیا اور دیگچی دودھ اور چائے کی پتی لے آیا تاکہ دودھ پتی کی چائے بنائی جائے۔

تھوڑی دیر میں چائے تیار ہوگئی اور وہ سب چائے پینے لگے۔ چاچا جمن بولے۔ ”رمضان تم نے تو بڑے مزے کی چائے بنائی ہے، ایسی مزیدار چائے ہے کہ بس بندہ پیتا ہی رہے، اب دل چاہ رہا ہے کہ میں روزانہ چائے پینے کے لئے آجایا کروں، بھئی ایسی مزیدار چائے تو گھر میں بھی نہیں ملتی۔ اس چائے کا ذکر میں گھر میں بھی کروں گا۔“

رمضان بولا۔ ”چاچا آپ ہمت والے بنو، آپ روزانہ آجایا کریں، آپ کے لئے حاضر ملے گی چائے، ویسے ہم ہر روز اپنے لئے چائے بناتے ہیں، جمالا بھی روزانہ چائے پیتا ہے سب کے ساتھ ہنس بول کر رہتا ہے مگر پتہ نہیں آج اس کی کھوپڑی پر بھوت کیوں سوار ہوگیا۔“

اچانک دل کو ہلاتی فلک شگا چیخیں سنائی دیں۔ چیخیں جمالے کی تھیں۔ بچاؤ...... بچاؤ...... ارے مجھے بچالو...... یہ بولتا ہوا وہ جھونپڑی سے نکل کر باہر کو بھاگا۔ چائے پیتے پیتے سارے لوگ ہڑ بڑا کر اٹھے اور اس طرح بھاگے جس طرف سے جمالے کی چیخیں سنائی دی تھیں۔ جب سب لوگ اس جگہ پہنچے تو دیکھا کہ جمالا ادھر ادھر بھاگ رہا ہے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی نادیدہ طاقت اس پر کوڑے برسا رہی ہو۔

”بچاؤ...... بچاؤ ......کی آواز نکالتا ہوا وہ چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں دوڑ رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ کبھی آگے تو کبھی پیچھے اور کبھی سر پر یا پھر کبھی بازوؤں پر بھی مارتا جاتا تھا کہ پھر اچانک اس کا وجود نیچے سے اوپر کو ہوا میں اچھلا جیسے کسی نے اسے نیچے سے اوپر کو اچھال دیا ہو۔“

اس کی فلک شگاف اذیت ناک اور دلدوز چیخیں

بدستور جاری تھیں، وہاں پر موجود ہر کوئی جیسے سکتے میں تھا۔ اس کے والد بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے جمالے کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک وہ دھڑام سے اوپر سے نیچے زمین پر گرا، پھر وہ فوراً ہیلیچے سے اوپر کو اچھلا اور دیکھتے ہی دیکھتے دوبارہ دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ اور پھر ایسا متواتر ایسا ہونے لگا، وہ نیچے سے اوپر کو اچھلتا اور پھر دھڑام سے نیچے گر پڑتا۔

یقیناً کوئی نادیدہ قوت تھی جو کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کر رہی تھی، اب اس کی فلک شگاف چیخیں دم توڑ گئی تھیں، پھر وہ اوپر سے نیچے دھڑام سے گرا۔ وہ بے سدھ ہو کر زمین پر پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ اوپر کو نہیں اچھلا، نیچے پڑا دیکھ کر اس کے والا دوڑتے ہوئے اس کے قریب گئے اور اس سے لپٹ گئے اور ان کی زوردار آواز سنائی دی۔ ”جمالے۔“

اب وہ جمالے سے لپٹ کر دھاڑیں مارتے ہوئے رو رہے تھے۔ ”جمالا بیٹا...... جمالا بیٹا......“ وہ مسلسل جمالے کو پکارے جا رہے تھے۔ مگر جمالے کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہاں پر موجود سارے لوگ جمالے کے قریب گئے۔ رمضان دوڑ کر لالٹین اپنی جھونپڑی سے اٹھا لایا۔ لالٹیں کی روشنی میں سب نے دیکھا۔ جمالے کے منہ اور ناک سے گاڑھا گاڑھا خون نکل رہا تھا۔ وہ بے سدھ پڑا تھا، اس کی آنکھیں خوف سے جیسے پھٹی ہوئی تھیں۔ اسے ہلایا گیا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔ جمالا کے والد رو رہے تھے۔ ”جمالا...... بیٹا اٹھ، ...... تجھے کیا ہوگیا...... بیٹا آنکھیں کھول...... بیٹا کل تو ہی پانی لگالینا...... ارے آنکھیں کھول...... ارے مجھے کیوں جیتے جی مار گیا...... ارے میں تیرا غم کیسے سہاروں گا...... تیری شادی کا کیا ہوگا...... سسرال والوں کو میں کیا جواب دوں گا...... ارے اگلے ماہ ہی تو تیرا سہرا بندھنا تھا...... بیٹا تجھے کیا ہوگیا۔“

جمالے کے گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور صد افسوس کہ جمالا مر گیا تھا۔

جمالا کے والد اس سے لپٹے ہوئے رو رہے تھے۔ دو لڑکوں نے مل کر انہیں جمالا کے جسم سے الگ کیا...... ان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ہر کوئی سکتے کے عالم میں تھا۔ کسی کے دماغ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ اچانک جمالے کو کیا ہوگیا۔ بہرحال اب کیا ہوسکتا تھا۔

دو لڑکوں نے جمالے کے والد کو سنبھالا اور پھر ایک نے جمالے کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور گھر میں لے آئے، گھر میں آتے ہی ایک کہرام مچ گیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی جمن چاچا غش کھا کر گر پڑے۔ جمالے کی ماں بہنیں اور بھائی بچھاڑے کھانے لگے۔ رونے اور بین کرنے کی آواز سے پاس پڑوس کے سارے لوگ اپنے گھروں سے باہر آگئے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ سارا گاؤں سکتے کے عالم میں تھا، کسی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک کیسے ہوگیا۔

اچھا بھلا تو جمالا تھا اور پھر اس کی موت کا جو طریقے کار سامنے آیا تھا اس نے پورے گاؤں والوں کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ جمالے کے والد چند منٹ کے لئے ہوش میں آتے اور پھر غش کھا کر گر پڑتے۔ کیونکہ جمالے کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ ان کے سامنے ہوا تھا۔ اور یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ جمالے پر جو کچھ بیتی وہ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ ورنہ کوئی بھی شک شبہ کرسکتا تھا۔

ماں بہنوں کا رونا اور بین کرنا لوگوں کا دل مسوس رہا تھا، ان لوگوں کے آنسو اور تکلیف دہ حالت لوگوں سے دیکھی نہیں جاتی تھی، پورے گاؤں والوں کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ اور پھر پورے گاؤں والوں کی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

صبح ہوئی اور پھر کفن کا انتظام کیا گیا، ظہر کی نماز کے بعد جمالے کو قبر میں ڈال کر مٹی ڈال دی گئی۔ گاؤں والوں نے دلاسے دیئے، آنسو پونچھے اور ایک ایک کرکے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

کھیت میں پانی والی بات کو یاد کرکے جمالے کے والد، دھاڑیں مار کر رونے لگتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ لیکن کھلیان میں موجود جتنے بھی افراد تھے وہ اب تک خوف و ہراس میں تھے، ان کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا کہ جو کچھ بھی جمالے کے ساتھ ہوا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ ہر کسی کے دماغ میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ ”یہ سب کچھ کیوں ہوا، اور کیسے ہوا؟“

کھلیان میں موجود تمام لوگوں سے گاؤں والے جب اصل حقیقت سنتے تو جیسے کانپ کر رہ جاتے تھے، گاؤں کے سارے افراد چاہے ہندو یا مسلمان سب ہی جمن چاچا کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ پورے گاؤں پر ماتم بچھ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ کھلیان میں جاتے ہوئے گھبرانے لگے تھے، کئی دن تو ایسا ہوا کہ صبح سے شام تک لوگ کھلیان میں رہتے اور شام ہوتے ہی کھلیان سے واپس اپنے گھر آجاتے۔ مگر ایسا سدا تو نہیں ہوسکتا تھا۔ چند روز گزرنے اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے کھلیان میں کام دوبارہ شروع کردیا۔ رات میں اپنے غلے کی رکھوالی کرنے لگے تھے۔

چوتھے روز حسب معمول سلامت کھلیان کی اپنی جھونپڑی میں سویا پڑا تھا۔ جمالے کے حالات کے پیش نظر وہ مدھو کو یکسر بھول چکا تھا۔ آج بھی جب وہ جھونپڑی میں سویا تو مدھو کا خیال اس کے ذہن سے کوسوں دور تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ گہری نیند میں جا پہنچا۔ رات کے ٹھیک دو بجے اسے اٹھا دیا گیا۔ اسے اٹھانے والی مدھو تھی۔

مدھو کی سرگوشی سنائی دی۔ ”تم کتنے کٹھور ہو، تین چار دنوں میں تم نے بھولے سے بھی مجھے یاد نہیں کیا، اور میرا یہ حال رہا جیسے کہ ”جل بنا مچھلی“ ویسے دیکھا گیا ہے کہ مرد ہوتے ہی ہیں سخت دل، آج تمہیں یہاں دیکھ کر میرے من کو شانتی ملی۔ رات میں میں نے بہت چاہا کہ تمہارے پاس آؤں مگر میں اپنی جگہ مجبور تھی۔ سوائے تڑپنے اور بے چین ہونے کے۔ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ مرنے والا بہت ضدی تھا، اس نے تمہارا گریبان پکڑا تھا اور تمہیں دھمکی بھی دی تھی، یہ دیکھ کر میرا تو خون کھول اٹھا، کوئی تمہیں تکلیف پہنچائے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتا، بدذات کہیں کا، اس نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا اور اپنے بھیانک انجام کو پہنچا، جس نے بھی تمہارے ساتھ بدتمیزی کی یا پھر تمہیں نقصان پہنچایا تو میں اس کے لئے قہر بن جاؤں گی، چاہے جو بھی ہو تمہیں تکلیف پہنچا کر بچ نہیں سکتا۔“ وہ روانی میں بولتی جارہی تھی۔

سلامت کو جیسے ہوش آ گیا تھا، اس نے مدھو کی باتوں پر غور کیا اور بولا۔ ”تم تو ایسے بول رہی ہو جیسے کہ تم نے اسے مارا ہے۔ تم یہ تو سوچو کہ تم بول کیا رہی ہو۔“

”میں تو تمہارے پیار میں جیسے پاگل ہو رہی ہوں، جب میں نے دیکھا، ارے نہیں جب سنا تو میں آپے سے باہر ہوگئی لیکن.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”خیر چھوڑو جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا، جمالے کی موت پر مجھے بھی بہت دکھ ہے، بے چارے کے ساتھ نہ جانے ایسا کیوں ہوا، ہر کوئی ابھی تک حیران ہے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر کوئی زندہ وجود ایسا کرتا تو میں اس کا گلا دبا دیتا۔“ سلامت بولا۔

”تو میرا گلا دبا دو۔“ مدھو بولی۔

”کیا مقصد، تم کہنا کیا چاہ رہی ہو، لگتا ہے واقعی تمہارا دماغ اپنی جگہ نہیں۔“ سلامت بولا۔

”بس تم اس سے اندازہ کرسکتے ہو کہ میں تمہیں کتنا چاہنے لگی ہوں، میرے منہ سے کیسے کیسے عجیب طرح کے الفاظ نکل رہے ہیں، بس مجھے غصہ ہے کہ اس نے تمہیں برا کہا اور تمہارے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور یہی مجھے بہت برا لگا ہے۔“ مدھو بولی۔

”اچھا اب غصہ تھوک دو، گذری ہوئی باتوں میں الجھنے سے فائدہ کیا۔ یعنی سانپ گذر گیا اور ہم بیٹھے لکیر کو پیٹتے رہے، اس سے کوئی فائدہ ہے۔“ سلامت بولا۔

”کیا تم بھی مجھے اتنا ہی چاہنے لگے ہو جتنا میں تمہیں چاہنے لگی ہوں، میرا تو تمہارے بغیر ایک پل بھی گزارنا بہت مشکل ہے۔“ مدھو بولی۔

”دل تو میرا بھی چاہنے لگا ہے کہ تم ایک پل کے لئے بھی مجھ سے دور نہ جاؤ، لیکن چاہنے سے کیا ہوسکتا ہے، ہوگا تو وہی جو وقت چاہے گا، ہم رسم و رواج اور دیا دی نیم کے پابند ہیں، بس تم میرے لئے ہر روز آجایا کرو، یہ تین دن بھی میں نے تمہارے بغیر بہت کٹھن طریقے سے گذارا ہے، اب تو شام ہوتے ہی تمہارا انتظار شروع ہوجاتا ہے، کل سے تم جلدی آجایا کرو۔“ سلامت روانی میں بولتے چلا گیا۔

”میں چاہ کر بھی جلدی نہیں آسکتی، بس تم یہ سمجھ لو کہ میرا ایک وقت مقرر ہے آنے کا اور جانے کا، اس سے جلدی آنا میرے بس میں نہیں اور پھر دیر سے تمہارے پاس سے جانا ممکن نہیں۔“ مدھو بولی۔

”تم یہ کیسی باتیں کررہی ہو کہ جلدی آ نہیں سکتی، چلو میں مانتا ہوں کے دیر سے جانا ٹھیک نہیں کیونکہ کچھ لوگ صبح ہونے سے پہلے بھی اٹھ جاتے ہیں۔“ سلامت بولا۔

”دیکھو میرا جو آنے کا وقت ہے وہ بالکل صحیح ہے کیونکہ یہ ایسا وقت ہے کہ کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا اور نہ ہی جاتے وقت مجھے کوئی دیکھ سکتا ہے۔“ مدھو بولی۔

”ارے اب چھوڑو بھی یہ آنے جانے کا چرچا، جو میں کررہی ہوں ٹھیک کررہا ہوں، بس مجھے صرف یہ پتہ ہے کہ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں، میرا بس چلے تو میں تمہیں ابھی اپنے ساتھ لے جاؤں، لیکن یہ ممکن نہیں، تم کچھ کرو یا نہ کرو لیکن میری کوشش ہوگی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لے کر چلی جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ چلو گے ناں۔“

”مدھو آج تم یہ کیسی بہکی باتیں کررہی ہو، لگتا ہے تمہارا دماغ کچھ زیادہ تھک گیا ہے یا پھر الجھ گیا ہے، دماغ پر زیادہ زور نہیں ڈالا کرو، اور پھر ایسا نہ ہو کہ اوروں کے سامنے بھی تمہاری زبان کچھ زیادہ ہی حقیقت اگل دے اور تمہارا یہ راز یعنی مجھ سے روزانہ ملنے والی بات تم کسی اور کے سامنے کہہ دو، اس لئے میرا مشورہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو، ویسے بھی سنا گیا ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کا دل دماغ کمزور ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت اپنے سینے میں زیادہ راز چھپا کر نہیں رکھ سکتی، لہٰذا کم بولا کرو، دوسروں کے سامنے ذرا احتیاط کرنا، کم بولنے میں ہی میری اور تمہاری بہتری ہے۔“ سلامت بولا۔

”تم بے فکر رہو، میں کسی ایسے ویسے کے قریب جاتی ہی نہیں کہ میری زبان پھسلے، میری خوشی ہے کہ تم خوش رہا کرو، تمہاری خوشی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔“ مدھو نے کہا۔

بہر حال سلامت اور مدھو کافی دیر تک ایک دوسرے کی قربت میں مست رہے، اور پھر مدھو نے خود کو سنبھالا اور بولی۔ ”اب میرے جانے کا وقت ہوگیا، اب میں چلتی ہوں، تم اپنا خیال رکھنا، کل تک کے لئے میں جدا ہو رہی ہوں، کل پھر ہماری ملاقات ہوگی، تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو، خیر اب مجھے اجازت دو۔“ مدھو نے کہا۔

”اگر میرے دل کی بات مانو تو میں کس دل سے اجازت دوں، میرا دل نہیں چاہتا کہ تم جاؤ مگر مجبوری بھی ہے، کل زیادہ انتظار نہیں کرانا اور جلدی آجانا۔“ سلامت بولا۔

ان حالات کے تحت سلامت کی صبح جلدی اٹھنے کی روٹین خراب ہوگئی تھی، جب ایک آدمی رات کے چار بجے تک روزانہ جاگتا رہے تو بھلا وہ صبح پانچ بجے کیسے اٹھ سکتا ہے۔ اور یہی حال سلامت کا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ یعنی میری آنکھ نہیں کھلتی کا کہہ کر پوچھنے والوں کو ٹال دیا کرتا۔ گھر والے بھی ایسی باتیں سن کر مطمئن ہوجاتے، گھر والوں کے دماغ میں یہ بات تھی کہ جو آرام سکون اپنے گھر اور اپنے بستر پر ملتا ہے ویسا آرام کھلیان میں کہاں مل سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سلامت کی آنکھ نہیں کھلتی۔

لیکن اپنی اولاد کو باپ ماں زیادہ جانتے ہیں، سلامت کے والد کی جہاندیدہ نظریں سلامت کے رکھ رکھاؤ، کھانے پینے اور پھر صحت مندی کے معاملے میں کچھ اور بھی دیکھ رہی تھیں، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ گھر والوں کے پاس بیٹھا بیٹھا ذہنی طور پر کہیں کھو جاتا۔

بہر حال وقت بہت تیزی سے گذر رہا تھا۔

گاؤں دیہات میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب فصل کٹتی ہے تو اسے کھلیان میں کچھ دنوں کے لئے رکھا جاتا ہے اور پھر جب دانے نکل جاتے ہیں تو ان دانوں کو بوریوں میں بھر دیا جاتا ہے، ضرورت کے مطابق غلے کو گھر میں محفوظ کرلیا جاتا ہے اور ضرورت سے زیادہ غلہ منڈی میں فروخت کردیا جاتا ہے جس سے اچھی خاصی رقم مل جاتی ہے یہاں بھی یہی کیا گیا، دانہ نکلے کے بعد انہیں بوریوں میں بھرا جانے لگا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی میں غلہ لوٹنے والے لٹیرے زور بازو اور اسلحہ کے زور پر غلہ اٹھا کر لے جاتے ہیں اور سال بھر محنت کرنے والا کسان بے چارہ منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ایک دن ایسا ہی ہوا، پورے کھلیان میں غلہ کی بے شمار بوریاں پڑی ہوئی تھیں اور پروگرام یہ تھا کہ کل ان بوریوں کو کھلیان سے ہٹا کر کچھ گھر میں رکھ لیں گے اور باقی منڈی میں فروخت کردیں گے کہ اس رات غلہ کے لٹیرے آگئے، ان کے ساتھ کئی بیل گاڑیاں تھیں جن پر وہ غلہ بھر کر لے جاتے۔

مدھو کے ساتھ سلامت اپنی جھونپڑی میں موجود نفسانی خواہشات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک پتہ لگ گیا کہ کھلیان میں لٹیرے آگئے ہیں۔ سب کے سب اپنی اپنی جھونپڑی میں محوِ خواب تھے۔" مدھو لگتا ہے لٹیرے آگئے ہیں، اور غلہ اٹھا کر لے جائیں گے۔ یہ تو بہت برا ہے، ہماری سال بھر کی محنت اور جمع پونجی آج ختم ہو جائے گی، اگر شور مچایا تو ہوسکتا ہے کہ یہ لٹیرے ہم نہتے لوگوں پر بندوقیں چلادیں، اب کیا ہوسکتا ہے؟"

"تم فکر نہ کرو، اب میں چلتی ہوں، تم آرام سے اس جگہ لیٹے رہو، باہر نہ نکلنا کیونکہ ہوسکتا ہے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔ تمہیں میری قسم تم باہر نہ نکلنا اور بالکل خاموش رہو، تم میری فکر نہ کرنا، میں اپنے آپ کو ظاہر نہیں ہونے دوں گی، اور کوئی میرا بال تک بے کا نہیں کرسکتا، بس تم تماشہ دیکھتے رہنا۔" مدھو نے یہ بولا اور جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

مدھو کے باہر نکلنے کے چند منٹ بعد سلامت کو ایسا محسوس ہوا کہ چند لوگ کسی تکلیف کی وجہ سے کراہ رہے ہیں اور پھر ان کی کراہیں فلک شگاف چیخ میں بدل گئیں۔ وہ چیخیں ان لٹیروں کی تھیں جو کہ غلہ لوٹنے آئے تھے۔

چیخیں سن کر جھونپڑی میں موجود سارے لوگ باہر نکل آئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ کل چھ افراد تھے جو کہ نیچے زمین سے اوپر فضا میں اچھلتے اور دھڑام سے نیچے زمین پر گر پڑتے، اور یہ سلسلہ مسلسل ہو رہا تھا، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھ کے چھ افراد اپنے ہاتھ پیر ٹوٹ کر بے سدھ زمین پر پڑ گئے۔ "بچاؤ ..... بچاؤ" کی آوازیں ان کے منہ سے نکلتی رہیں ایسا لگتا تھا کہ "جیسا جمالے کیساتھ ہوا تھا وہی سین ان لٹیروں کے ساتھ بھی ہوا تھا۔" ان لٹیروں میں سے ایک کی بھی جسمانی ہڈی سلامت نہیں بچی تھی۔ وہ سب کے سب حرکت کرنے سے بھی قاصر تھے۔

ان میں سے ایک نے پوچھنے پر بولا۔ "ہم غلہ لوٹنے آئے تھے، اور ہمارے ساتھ کسی ہوائی مخلوق نے ایسا کیا ہے۔" پاس ہی ان کی چار بیل گاڑیاں بھی موجود تھیں، اور بیل مردہ حالت میں پڑے تھے۔ ان لٹیروں کی حالت بہت خستہ تھی۔ وہ چلنے پھرنے بلکہ بولنے اور حرکت کرنے سے بھی مجبور تھے۔ یہ سب کیسے ہوا، اور کیوں ہوا؟ اس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

کھلیان میں موجود سب لوگ اب جان گئے تھے کہ "یقیناً یہ کام کسی انسان کا نہیں بلکہ یہ کام کسی ہوائی مخلوق کا ہے۔ اور وہ ہوائی مخلوق کسی کی زیادتی برداشت نہیں کرسکتی، وہ ہوائی مخلوق ہم کھلیان والوں پر مہربان ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس دن جمالے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور آج ان لٹیروں کو بھی اپنے بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔"

صبح ہوئی اور یہ خبر پورے گاؤں میں آناً فاناً

پھیل گئی۔ دو بندے گئے اور تھانیدار کو بلا لائے۔ پولیس آئی اور اس کے پوچھنے پر ان لٹیروں نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا، اور ساتھ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بھی من وعن بتلا دیا۔ پولیس ان لٹیروں کو بیل گاڑیوں میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئی، مردہ بیلوں کو لوگوں نے اٹھا کر کھلیان سے کچھ فاصلے پر گڑھے کھود کر مٹی میں دبا دیا۔

پورے گاؤں میں اچنبھے کی حالت تھی، ہر کوئی شکتے میں تھا۔ اور یہ راز جاننے سے قاصر تھا۔

دن ڈھل گیا اور رات آگئی۔ وقت مقررہ پر سلامت کی جھونپڑی میں مدھو آگئی۔ اب اماوس کی دو بارہ راتیں شروع ہوچکی تھیں، یعنی ایک ماہ کا عرصہ ہونے والا تھا۔ مدھو اور سلامت کو ملتے ہوئے مہینہ ہوچلا تھا۔

سلامت بولا۔ "کل رات میں اچھا ہوا کہ تم بحفاظت نکل گئی تھیں اگر تم پر کسی کی نظر پڑ جاتی تو بہت برا ہوتا، ان لٹیروں کے ساتھ بھی ایسا ہوا جیسا اس دن جمالے کے ساتھ ہوا۔ وہ کل چھ لٹیرے تھے، وہ ہوا میں اوپر کو اچھلتے اور دھڑام سے زمین پر گر پڑتے، کافی دیر تک ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا، لگتا تھا کہ ان کے جسم کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ اس حالت میں بھی نہیں تھے کہ اپنا ہاتھ پاؤں ہلا سکیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ کوئی ہوائی چیز نے ان کے ساتھ ایسا کیا۔ اور میرے دماغ میں بھی یہی بات آرہی ہے کہ کوئی انسان ایسا نہیں کرسکتا، جسم ہوا میں اچھلنا اور پھر دھڑام سے نیچے گرنا یہ بالکل کسی نادیدہ ہوائی مخلوق کا کیا دھرا ہے، تمہارا دماغ کیا کہتا ہے؟" سلامت نے مدھو سے پوچھا۔

"میرا دماغ تو کہہ رہا ہے کہ تمہاری بات درست ہے، اور میں بھی وثوق سے کہہ رہی ہوں کہ یہ کیا دھرا کس ہوائی چیز کا ہے۔ تمہیں جو بھی نقصان پہنچائے گا اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔" مدھو بولی۔

"ارے مجھ میں کیا تعل لگ گیا ہے، کہ یہ سب میرے لئے ہو رہا ہے، تم بھلا وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟ مجھے تو لگ رہا ہے کہ ایسی کوئی چیز ہم پورے کھلیان والوں پر مہربان ہوگئی ہے کہ جو بھی کھلیان والوں کے ساتھ برا کرنا چاہتا ہے تو اس کے ساتھ برا ہو رہا ہے۔" سلامت نے کہا۔

"خیر چھوڑو جو ہو رہا ہے ہونے دو، ہم کیوں اپنا دماغ سوچ سوچ کر خراب کریں۔ زیادہ نہ سوچا کرو، زیادہ سوچنے سے سر میں درد ہونے لگتا ہے، کھاؤ پیو خوش رہو، بس تم صرف اور صرف میرے لئے سوچا کرو۔ ہم تم خوش تو سارا سنسار خوش۔" اور یہ بول کر مدھو سلامت سے لپٹ گئی۔ پھر طوفان آیا اور گذر گیا۔

اپنے وقت پر مدھو چلی گئی، کل پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے۔ مدھو کے جانے کے بعد سلامت تھوڑی دیر تک جاگتا رہا اور مدھو کی بے سروپا باتوں پر سنجیدگی سے غور کرتا رہا۔ اور جب سوچتے سوچتے دماغ تھک گیا تو اسے نیند آگئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اب کھلیان میں کام بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا، لوگ اپنی اپنی چیزیں سنبھال رہے تھے۔ تمام لوگوں کا سارا غلہ اٹھ چکا تھا۔ لیکن سلامت کا دماغ زیادہ الجھ گیا تھا اس لئے کہ چند دن میں اسے کھلیان چھوڑنا پڑے گا یعنی اسے گھر میں رات کے وقت رہنا پڑے گا اور اس حالت میں وہ مدھو سے مل نہیں سکتا، مدھو کے گھر بار کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے کس کی بیٹی ہے یا پھر کس کے گھر مہمان آئی ہوئی ہے؟

وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ وہ مدھو سے دور ہو جائے، بلکہ وہ تو مدھو سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جس دل بستگی سے مدھو نے اسے روشناس کرایا تھا، اب بھلا وہ مدھو سے الگ کیسے ہوسکتا تھا۔ اس سوچ نے اسے گھائل کر کے رکھ دیا تھا۔ "بغیر کام کے تو وہ کھلیان میں نہیں رہ سکتا تھا۔" یہی کچھ سوچ سوچ کر سلامت ہلکان ہونے لگا۔ "جب میں اپنے گھر میں مسلسل رہنے لگوں گا تو مدھو کسی صورت بھی میرے پاس نہیں آسکتی اور یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اسے دن میں کہیں دیکھ سکوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دن ڈھل گیا اور پھر رات آ گئی۔ کھلیان میں سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا، ایک ساتھ چائے پی اور پھر تھوڑی دیر تک گپ شپ کرنے کے بعد اپنی اپنی جھونپڑی میں سونے کے لئے چلے گئے۔ سلامت اپنی جھونپڑی میں اپنے بستر پر لیٹ کر مدھو کی یاد میں کروٹیں بدلنے لگا۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ نیند آ جائے مگر آج اس سے نیند کوسوں دور تھی۔

وقت دھیرے دھیرے آگے کھسکتا رہا اور پھر وقت مقررہ پر مدھو کی آواز سنائی دی۔ ”جانو آج تو تم ابھی تک جاگ رہے ہو، میں نے تو ہر حال میں آنا ہی تھا، تم سو جاتے، میں آ کر تمہیں جگا لیتی، میں تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم بے سکون رہو۔“

”مدھو! کھلیان میں چند دن کا کام رہ گیا ہے، جب یہاں کا کام ختم ہو جائے گا تو یقیناً کھلیان میں مجھ سمیت کوئی بھی نہیں رہے گا، پھر مجھے اپنے گھر میں رہنا پڑے گا۔ اس صورت میں ہم دونوں کا ملنا بالکل ختم ہو جائے گا، اور میں اب تو تمہاری جدائی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا، تمہیں نہیں پتہ کہ تمہارے بغیر میں دن اور پھر رات کا اتنا وقت کیسے کاٹتا ہوں، جب تک تم نہیں آتی اس وقت تک میں ماہی بے آب رہتا ہوں۔“ سلامت بولا۔

”تمہارے بغیر یہی حال تو میرا بھی ہوتا ہے۔ خیر تم فکر مند اور پریشان نہ ہو، وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا، میں کوئی نہ کوئی اپائے نکال لوں گی، جب تم سے دل لگا لیا ہے تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا، تم پر جب میں اپنا جیون نچھاور کر سکتی ہوں تو یہ کون سا مشکل ہے کہ میں تم سے نہ مل سکوں، میں تم سے ملنے کے لئے میں ہر جگہ جا سکتی ہوں، تم دنیا کے چاہے کسی کونے میں بھی چلے جاؤ، میں اس جگہ حاضر ہو جایا کروں گی۔“ مدھو نے کہا۔

”مدھو تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں کہ تم بھلا مجھ سے ملنے میرے گھر میں کیسے آؤ گی؟ گھر والے اندر سے دروازے میں کنڈی لگا لیتے ہیں اور پھر یہی نہیں میرے بابا دروازے کے قریب والے کمرے میں سوتے ہیں اور میرا کمرہ بالکل آخر میں ہے تو ایسی صورت میں تمہارا میرے پاس آنا.....“ اور سلامت نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کیونکہ مدھو نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی تھی۔ ”اب تم خاموش ہو جاؤ، یہ سوچنا تمہارا کام نہیں بلکہ تمہارے پاس آنا میرا کام ہے۔ تم زیادہ نہ سوچو، نہیں تو تمہارا دماغ کچھ زیادہ ہی الجھ جائے گا، اب اس معاملے میں سوچنا بند کر دو، جب میں تمہارے پاس رات سے آؤں گی تو پھر دیکھنا۔“ یہ بول کر وہ سلامت سے لپٹ گئی۔

پھر دونوں کے من میں طوفانی سرکش لہروں نے سر ابھارا اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، دونوں ان بپھری ہوئی لہروں کے تھپیڑے میں غوطہ زن ہو گئے۔ کافی دیر تک دونوں اپنے ہوش سے بیگانہ رہے اور پھر بپھری ہوئی طوفانی لہروں میں ٹھہراؤ آ گیا۔ دونوں بپھری ہوئی لہروں کے درمیان سے کنارے لگ چکے تھے۔ سلامت تو بالکل بے حس و حرکت پڑ گیا تھا۔

مدھو کی مدہوش کن گنگناتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اچھا اب میں چلتی ہوں، اپنے آپ کو سنبھالو۔“

یہ سننا تھا کہ جیسے سلامت کو کرنٹ سا لگا اور وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم نہ جاؤ، میرا دل تمہیں جانے دینے پر تیار نہیں، آج تم نہ جاؤ..... میری بات مان لو..... تمہاری جدائی اب مجھ سے ناقابل برداشت ہے۔“

”میرا تمہارے پاس رکنا ناممکن ہے، دن کا اجالا میرے وجود کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا، دن کی روشنی مجھے فنا کر دے گی، ہم دونوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدائی ہو جائے گی، ہم تم چاہ کر بھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے، لہٰذا اگر اس طرح ہم روزانہ ملتے رہنے پر قائم رہیں تو میرا جانا ضروری ہے، روز ملنے کے لئے یہ تھوڑا سا وقت جدائی کا تمہیں برداشت کرنا پڑے گا، اب تم آرام کرو میں چلتی ہوں۔“ اور یہ بول کر وہ جھونپڑی سے نکلی اور اچانک

اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

کھلیان میں رہتے ہوئے غلے کی رکھوالی کے لئے سلامت کو ایک ماہ کا عرصہ ہونے والا تھا۔ اور اب کھلیان میں ہر طرح کا کام ختم ہو چکا تھا۔

صبح کے وقت وہ گھر آیا تو آج اس کی طبیعت بہت نڈھال ہو رہی تھی، آج تو اسے چکر بھی کچھ زیادہ ہی آ رہے تھے، اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ اس کی والدہ نے کہا۔ ”سلامت کیا بات ہے؟ تم تو بہت زیادہ تھکے تھکے لگ رہے ہو، اور پھر تمہارا رنگ بھی زرد ہو رہا ہے، بیٹا ایسا تو نہیں کہ.....“ اور انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”امی ایسی تو کوئی بات نہیں، بس پتہ نہیں میں اپنے اندر کمزوری محسوس کر رہا ہوں اور چلنے پر مجھے چکر آ رہے ہیں۔ آپ میرے لئے ایک گلاس دودھ گرم کر دیں، دودھ پیوں گا تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“

اس کی امی نے فوراً ایک گلاس گرم دودھ دیا اس میں اصلی شہد ملا کر، اس نے گلاس کا پورا دودھ پی لیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی طبیعت بحال ہو گئی تو وہ اٹھا اور نہانے کے لئے کپڑے لیکر کنوئیں پر چلا گیا۔ جب وہ نہا کر آیا تو اس کی طبیعت بحال ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر میں اس کے بابا کھیتوں کی دیکھ بھال کر کے آ گئے تو اس کی امی نے بتایا کہ ”سلامت بول رہا تھا کہ میں اپنے اندر کچھ کمزوری محسوس کر رہا ہوں اور چلنے پر چکر بھی آ رہے ہیں، میں نے گرم دودھ میں شہد ڈال کر پلا دیا ہے، اور ابھی تھوڑی دیر پہلے نہا کر آ گیا ہے اور اپنے کمرے میں آرام کر رہا ہے۔ میں نے ناشتہ کا کہا تو جواب دیا کہ ”تھوڑی دیر میں کروں گا۔“

یہ سن کر اس کے والد بولے۔ ”بھئی کھلیان میں رہنا کوئی معمولی بات نہیں، خیر اب وہاں کا کام ختم ہو گیا ہے۔ اس سے کہنا کہ آج سے کھلیان میں نہ جائے، آج وہ گھر میں سوئے گا، اور میں جا کر حکیم صاحب سے دوا لے آؤں گا، اگر انسان کو مکمل آرام نہ ملے تو اچھے اچھے کمزوری محسوس کرنے لگتے ہیں، اور یہ بات تو میں خود کئی دن سے محسوس کر رہا ہوں۔“

انہوں نے تو بیوی کو سمجھا دیا تھا مگر ان کی جہاندیدہ نظریں بہت دور دیکھ رہی تھیں، ان کے دل میں ایک پھانس چبھ گئی تھی۔ ”جوان اولاد ہے، اور جوانی منہ زور ہوتی ہے، جوانی پر مکمل کنٹرول رکھنا بہت دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ ہو نہ ہو اس کی اندرونی کیفیت متزلزل ہے، خیر میں حکیم صاحب سے بات کروں گا۔“

سلامت کے والد ایک گھنٹہ بعد گاؤں میں موجود حکیم صاحب کے پاس پہنچ گئے اور حکیم صاحب سے اپنے دماغ کے مطابق سلامت کی کمزوری کے بارے میں بتایا۔

ان کی باتیں سن کر حکیم صاحب بولے۔ ”ارے شرافت بھائی، جوان اولاد ہے، من سے محنت کرتا ہے، کھلیان میں رہنا اور وہ بھی ایک ماہ تک، بہت مشکل کام ہوتا ہے، آرام نہیں سکون نہیں وقت پر نیند نہیں، اور کھلیان میں یقیناً یہ سب دوست یار ایک جگہ بیٹھ کر گپ شپ بھی کرتے ہوں گے کافی رات گئے تک اور پھر صبح اذان کے وقت اٹھ جانا، ان حالات کے پیش نظر جوان بہت زیادہ بے آرامی کا اثر اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں، میں دوا دے رہا ہوں چند روز استعمال سے طبیعت بالکل بحال ہو جائے گی، اور ہاں ذرا کھانے پینے پر خیال رکھئے گا، طاقت والی چیزیں کھلائیں بہت جلد چنگا بھلا ہو جائے گا۔ کسی وقت اسے بھیج دیجئے گا، میں اس کی نبض چیک کر لوں گا۔“

حکیم صاحب نے دوا دی اور سلامت کے بابا دوا لے کر گھر آ گئے، بیوی کو دوا دی اور تاکید کر دی کے اس کے کھانے پینے پر خاص خیال رکھا جائے۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ ”چند دن دوا کے استعمال سے صحیح ہو جائے گا۔“

دن ڈھل گیا اور شام کے بعد پھر رات ہو گئی۔ سلامت نے گھر والوں کے ساتھ رات کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا، اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والدہ نے کہا ”بیٹا ابھی دروازہ بند نہ کرنا، تھوڑی دیر میں، میں تمہارے لئے گرم گرم دودھ اور دوا لے کر آ رہی ہوں، تمہارے بابا حکیم صاحب سے تمہارے لئے دوا لے آئے تھے۔

”ٹھیک ہے امی۔“ کہہ کر سلامت اپنے بستر پر بغیر دروازہ بند کئے لیٹ گیا۔

اسی دوران پڑوسن خالہ گھر میں آ گئیں اور اس کی امی کے پاس بیٹھ کر اپنی بیٹی کی منگنی کی باتیں کرنے لگیں کہ ”آنے والے مہینہ میں فلاں تاریخ کو سکینہ کی منگنی کرنی ہے۔“ ان باتوں میں وقت گذرنے لگا اور رات کے نو بج گئے۔ کہ اتنے میں سلامت کی والدہ کو خیال آیا کہ میں نے سلامت کو دوا کے ساتھ دودھ بھی دینا ہے۔ انہوں نے پڑوسن سے اس کا ذکر کیا تو وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

سلامت کی والدہ نے سلامت کو گرم گرم دودھ دیا اور دوا پلا دی، اس کے بعد وہ اس کے کمرے سے باہر آ گئیں اور پھر اٹھ کر سلامت نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا لی۔

آج وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھا اس کے دماغ میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ ”مدھو سے اب ملاقات ناممکن ہے۔ کاش کہ کھلیان میں کام ختم نہ ہوتا اور وہ مجھ سے ملتی رہتی۔“

وہ بستر پر لیٹے ہوئے کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا، کسی پل اسے چین نہیں مل رہا تھا، جب وہ کروٹ بدل بدل کر تھک جاتا تو اٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتا اور پھر جب اس سے بھی تھک جاتا تو بستر سے نیچے اتر کر کمرے میں ہی ٹہلنے لگتا، ٹہلتے ٹہلتے وہ اپنے ہاتھ کی دونوں مٹھیاں بھینچ لیتا اور پھر اس کے بعد دونوں ہاتھ سے اپنے سر کو پکڑ لیتا۔ بستر پر بیٹھ جاتا اور پھر لیٹ جاتا، مسلسل چھت کو گھورتے رہنے سے آنکھوں میں درد اٹھنے لگتا تو وہ اپنی آنکھیں زور سے موند لیتا اور اس کے منہ سے آواز نکلتی ”اوہ! مدھو..... کدھر ہو؟“ اور پھر وقت نے بارہ بجائے۔

دروازے کے باہر موجود دونوں کتے گلا پھاڑ کر بھونکنے لگے، آج جس انداز میں کتے بھونک رہے تھے اس سے پہلے انہوں نے کبھی اس طرح نہ بھونکا تھا۔ اندھیری رات اور پوری طاقت لگا کر کتوں کا بھونکنا .....اور پھر تھوڑی دیر بعد جیسے وہ رونے کی آواز نکالتے پھر اچانک فلک شگاف آواز میں بھونکنے لگتے۔ کتوں کی آواز سے قرب و جوار کے لوگوں کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں، ہر کوئی اپنے گھر میں بے چینی محسوس کرنے لگا۔

ویسے بھی گاؤں دیہات میں سر شام ہی سب کے گھروں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنے بستروں میں دبک جاتے ہیں، رات کے بارہ بجے تک گاؤں والے کافی نیند کے مزے لوٹ چکے ہوتے ہیں۔ لیکن آج اچانک کتوں کی فلک شگاف بھونکنے کی آواز سے ان کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔

اور پھر رات کے ساڑھے بارہ بجتے ہی لوگوں نے ایسا محسوس کیا کہ ان کتوں کے گلے میں کسی زور آور نے پھندا ڈال دیا ہو، کتوں کی آوازیں ایسے ہو گئیں کہ جیسے ان کا گلا دبایا جا رہا ہو، تاکہ وہ بھونکیں نہیں۔ ان کی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اب بہت زیادہ اذیت میں ہوں، پھر بھونکنے کی آوازیں اچانک کیں .....کیں.....میں بدل گئیں .....اس کے بعد ان کی آوازیں غراہٹ آمیز ہو گئیں۔

دونوں کتوں میں سے پہلے ایک کی آواز کرب و اذیت کے انداز میں دب گئی، پھر چند سکنڈ بعد دوسرے کی بھی آواز آنا بند ہو گئی۔

دونوں کتوں کی آوازوں کے ختم ہوتے ہی پھر تو ایسا لگا کہ گاؤں بھر کے سارے کتے سلامت کے گھر کے باہر دروازے پر جمع ہو کر نا قابل برداشت حد تک بھونکنا شروع کر دیا۔ کتوں کی آوازوں سے اب تو پورا گاؤں دہل اٹھا۔ اور پھر ان بھونکتے کتوں کی آوازیں اذیت میں ڈوبتی چلی گئیں۔

(جاری ہے)

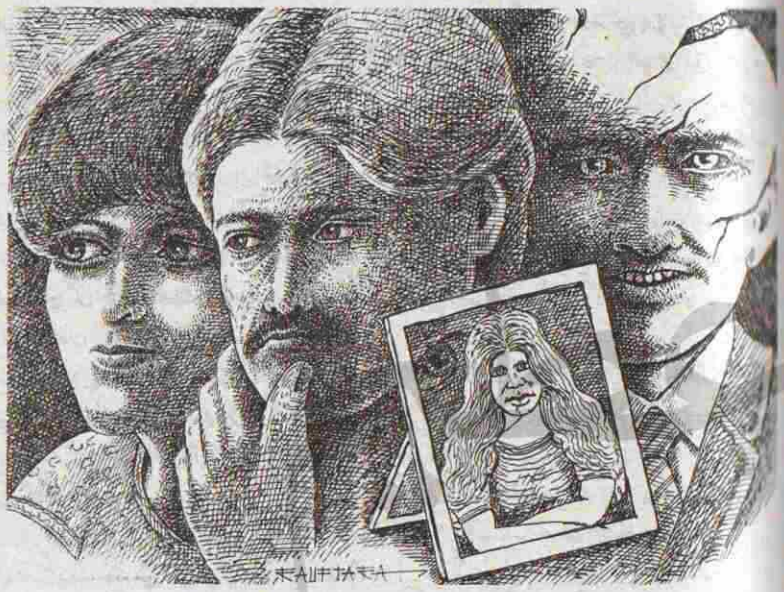

بھوت کی تلاش

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

مقفل کمرے میں موجود عورت کی بھیانک حالت میں لاش صبح کے وقت ہوٹل سے کافی دور ویرانے میں ملی۔ جسے دیکھ کر ہر آدمی ششدر تھا، ماہر اور تجربہ کار پولیس آفیسرز بھی اچنبھے میں تھے۔

حقیقت کو جھٹلانے والے اکثر اپنی زندگی درگور کر لیتے ہیں، بھوت کہانی میں موجود ہے

ڈینیل نے پارکنگ لاٹ میں کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو ایک دم پیچھے گھوم کر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ پرانی طرز کی وہ گھڑی شام کے چھ بجا رہی تھی۔ سورج پہاڑوں کے عقب میں چھپ چکا تھا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا تاکہ پارکنگ لاٹ کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ وہاں سے ایک عورت اپنی کالے رنگ کی کار کے قریب کھڑی نظر آئی۔ کاروں کے متعلق اس کا علم زیادہ وسیع نہیں تھا لہٰذا وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کار کا نام اور کمپنی کون سی ہے مگر اسے اس کی پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ کون سا کار خریدنے جا رہا تھا۔

کار کے قریب کھڑی مضبوط اور بھرے بھرے جسم والی وہ عورت سگریٹ پی رہی تھی اور کسی جلدی میں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے کندھوں تک کٹے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنہرے بال ہوا کی وجہ سے نہایت دلفریب انداز میں ہلتے ہوئے اس کے چہرے پر رقص کر رہے تھے جس کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف طور پر ردیکھنا ممکن نہیں تھا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ وہ دلفریب نقوش کی مالک ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا کہ اگر اس نے لیدر کی جیکٹ اور پتلون پہنی ہوتی تو کسی گھٹیا درجے کی ایکشن فلموں کی ہیروئن ہی نظر آتی، ایک ایسی فلم جس میں ہیروئن سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے کو اپنی انگلیوں میں گھما کر ایک طرف اچھالتی اور پھر ایک جھٹکے سے اپنی بغلی ہولسٹر سے پستول نکالتے ہوئے اپنے شکار پر شیرنی کی طرف ٹوٹ پڑتی۔ مگر اس حسین عورت نے تو دھاری دار سویٹر اور نیلی جینز کی پتلون پہن رکھی تھی۔

سگریٹ ختم کر کے وہ عورت اپنی کار کے اندر جھکی اور سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے کو کار کے اندر رکھے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ڈینیل کو ایسے نفیس لوگ بہت پسند تھے اور وہ انکی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں برسوں سے اس سرائے میں ملازمت کر رہا تھا جس میں ہوٹل کی طرح کمرے نہیں تھے بلکہ ایک کھلی جگہ پر مختلف کمرے بنے ہوئے تھے جو مسافروں کو کرائے پر دیے جاتے تھے۔ اس کا واسطہ ہر روز کئی لوگوں سے پڑتا مگر کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کی وہ دل سے عزت کر سکتا۔

وہ عورت اس کی نظروں کے دائرے سے ہٹ گئی تو ڈینیل بھی سیدھا ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا یقیناً وہ عورت اندر آ رہی تھی۔ جب وہ عورت دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی تو اسے اپنی کرسی سے اٹھنا پڑا۔ وہ عورت سردی سے کپکپا رہی تھی اور اپنے ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ باہر درجہ حرارت کم ہو رہا تھا۔ وہ عورت دفتر کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھی مگر ڈینیل اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں اور کانوں میں دلکش آویزے جھول رہے تھے۔ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نگاہ جونہی کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ڈینیل پر پڑی تو وہ ایک دم جھینپ گئی اور اسی کے تراشیدہ لبوں پر ہلکی مسکراہٹ تیرنے لگی۔

"بروک شائر سرائے میں خوش آمدید....." ڈینیل چہکا۔

"ہائے.....! میں نے ایک کمرے کی بکنگ کے لیے آپ کو فون کیا تھا۔" وہ بولی تو ڈینیل کو پتہ چلا کہ اس کی آواز میں بھی ایک حسین ترنم تھا۔

"اوہ.....! ہاں..... مس....." ڈینیل جملہ ادھورا چھوڑ کر گاہکوں کی لسٹ کا جائزہ لینے لگا۔ حالانکہ وہ صرف پڑھنے کا بہانہ کر رہا تھا کیونکہ اس کے پاس فارغ وقت میں اس کے سوا اور کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ گاہکوں کے ناموں والی لسٹ کو پڑھتا رہے اسی وجہ سے اس کو اس وقت تک سارے نام حفظ ہو چکے تھے۔

"..... ولیمز..... ٹھیک کہا نا میں نے....." وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا.....

"آپ کا کمرہ سب سے آخری والا ہے۔ یقیناً پسند آئے گا۔"

"ہاں..... شاید....." مس ولیمز نے بس اتنا ہی جواب دیا' وہ اپنے بازو سینے پر باندھے کاؤنٹر پر جھکی کھڑی تھی۔ وہ باتونی نہیں تھی یا پھر کم از کم اجنبیوں سے زیادہ بات چیت پسند نہیں کرتی تھی۔

ڈینیل مڑا اور اپنے عقب میں لگے بورڈ پر لٹکی ایک چابی اتار لی۔ چابی کے ساتھ ایک چھوٹا سا براؤن ٹیگ لگا ہوا تھا جس پر 110 نمبر درج تھا' چابی پر بھی گرد کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔

"آپ کا کمرہ نمبر 110 ہے جو سب سے آخر میں چٹانوں کے پاس ہے۔ اس کمرے کے عقب میں ایک بالکونی بھی ہے جہاں سے قریبی دریا کا بہت اچھا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کمرے کے باتھ روم میں ایک جہازی سائز کا باتھ ٹب بھی موجود ہے، کچن، آتش دان اور DVD کی سہولت بھی صبح 10 بجے تک آپ کے لیے موجود ہے۔"

سنہری بالوں والی اس حسینہ نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کیا یہ سب سہولیات باقی کمروں میں بھی موجود ہیں....."

ڈینیل گڑبڑا گیا اور کچھ نہ بول پایا۔

"میں نے کمرہ بک کروانے کے لیے فون پر جس آدمی سے بات کی تھی اس نے بتایا تھا کہ یہ کمرہ کرایہ دار کے لحاظ سے سب سے زیادہ سستا ہے..... کیا اس میں کوئی مسئلہ ہے؟" وہ مشکوک لہجے میں پوچھنے لگی۔

ڈینیل کو امید نہیں تھی کہ وہ یہ سوال کرے گی مگر اب جواب دیے بغیر بھی چارہ نہیں تھا۔

"ہاں..... یہاں..... اس کمرے میں کچھ عجیب واقعات ہوتے ہیں....." وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"کیا عجیب.....؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"اس کمرے میں..... آدھی رات کو خود بخود روشنیاں جلنے بجھنے لگتی ہیں، چیزیں ادھر ادھر حرکت کرنے لگتی ہیں بس ایسا ہی کچھ....." وہ گھبراتے ہوئے بولا۔

"یعنی..... آسیب زدہ ہے....." وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"یہی سمجھ لیں....." ڈینیل کی آواز دھیمی تھی۔

ڈینیل کی پریشان شکل دیکھ کر اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "کیا تم سیریس ہو.....؟"

ڈینیل نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"..... یہی وجہ ہے کہ اس موسم میں صرف یہی کمرہ اس سرائے میں خالی ہے..... کیونکہ اس کمرے میں بھوت رہتے ہیں....." وہ ڈینیل کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں..... ٹھیک کہا..... کیونکہ وہاں چیزیں خود بخود حرکت کرتی ہیں..... مگر میں نے کبھی ایسا کچھ نہیں دیکھا وہاں....." ڈینیل وضاحت کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے..... میں خود دیکھ لوں گی ان کو..... میں تلاش کر لوں گی ان بھوتوں کو....." اس نے چابی پکڑی اور اپنی پتلون کی عقبی جیب سے اپنا کریڈٹ کارڈ نکالا اور ادائیگی کے لیے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

جب وہ دروازے سے باہر نکل رہی تھی تو ڈینیل چپ چاپ اپنی نشست پر بیٹھا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اپنے سیل فون پر کسی سے ہنستے ہوئے بات کر رہی تھی۔ ڈینیل سخت پریشان تھا کیونکہ مس ولیمز اس ساری صورتحال کو مذاق سمجھ رہی تھی۔ مگر ڈینیل کو یہ بھی یقین تھا کہ اس کمرے میں ٹھہرنے والے دوسرے تمام لوگوں کی طرح وہ بھی آدھی رات سے پہلے ہی اس کمرے کو چھوڑ کر بھاگے گی۔

☆.....☆.....☆

اسٹیفنی ولیمز نے گاڑی اپنے کمرے کے سامنے مخصوص پارکنگ میں روکی۔ باہر سے تو یہ کمرہ بڑا اچھا اور نیا لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حال ہی میں اس کی تزئین و آرائش کی گئی ہے۔ جونہی وہ گاڑی سے باہر نکلی پہاڑی علاقے کی مخصوص ٹھنڈی ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ چہرے پر پڑنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کے سنہری بال بکھرا دیے اور بری طرح کپکپاتے ہوئے اس نے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے اپنا چھوٹا بیگ اٹھا لیا۔ اس کا یہ سفر قدرے غیر متوقع تھا لہٰذا اس کا سامان بھی مختصر ہی تھا۔ اس نے کمرے کی چابی اپنی جیب سے نکالی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے غیر ارادی طور پر سیٹی بجانے لگی۔

دروازے کا تالا کھول کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ اندر ٹھنڈک اور صنوبر کی لکڑی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ گیس کا بٹن تلاش کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اس دوران اس کو اندازہ ہو گیا کہ عقبی سمت کھلنے والی کھڑکیوں میں سے ایک کھلی ہوئی تھی اور اسی کی وجہ سے کمرے میں ٹھنڈی ہوا داخل ہو رہی تھی۔ اس نے کھڑکی مضبوطی سے بند کی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کمرہ زیادہ استعمال نہیں ہوا تھا اور بالکل نیا نظر آ رہا تھا۔ بیڈ کے سرہانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں طرف نئے لیمپ پڑے تھے۔ کچن میں لگے نل بھی نئے اور اسی کمپنی کے تھے جس کا اشتہار آج کل ٹی وی پر دکھایا جارہا تھا۔ سنگ مرمر کے شیلف اور فرش پر لگی ٹائیلیں، باتھ روم کا جہازی سائز کا باتھ ٹب سب پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی تھی' ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے ان کو کبھی استعمال ہی نہ کیا گیا ہو۔

باتھ ٹب کو دیکھ کر اس کے دل میں عجیب سی خوشی کا تاثر ابھرا، سارے دن کی لمبی ڈرائیونگ کے بعد وہ بری طرح تھک چکی تھی اور اس ٹب کو دیکھ کر اس کے دل میں غسل کی خواہش شدت سے سر ابھارنے لگی۔

اسٹیفنی اس وقت دوسرے کاموں میں مشغول تھی جب اسے اچانک دفتر کی طرف سے اس لمبے سفر پر روانہ ہونے کا حکم ملا لہٰذا اسے تیاری کا کچھ زیادہ وقت نہیں مل سکا تھا اور نہ ہی وہ اپنی سب مطلوبہ چیزیں اپنے ساتھ لے سکی تھی اس لیے اب وہ اپنی کار لے کر قصبے کی طرف چلی گئی اور جب لوٹی تو اس کے ہاتھ میں اشیاء خورد و نوش کا سامان اور بیئر کے ڈبے تھے۔ وہ سیٹی پر ایک بے معنی سی دھن بجا رہی تھی، جیب سے بیرونی قفل کی چابی نکال کر اس کو تالے میں گھمایا مگر پھر ایک دم رہ گئی، اسے یوں محسوس ہوا کہ اندر سے کچھ آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

وہ کچھ دیر رکی رہی اور سننے کی کوشش کرتی رہی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ واپس سرائے کے دفتر میں جائے اور ڈیٹیل کو وہاں سے بلا کر یہاں لے آئے تاکہ وہ اس کے لیے کسی اور کمرے کا بندوبست کر سکے مگر پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ اس طرح تو وہ سمجھے گا کہ وہ بھوتوں سے ڈر گئی ہے حالانکہ یہ سچ نہیں تھا۔ پھر ایک فیصلہ کر کے اس نے دروازے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔

اسے امید تھی کہ فرنیچر اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہٹا ہوا ہوگا، کچھ چیزیں چھت سے چپکی ہوں گی، کچھ الٹی پڑی ہوں گی۔ جیسے اس نے اس ہارر فلم میں دیکھا تھا جس کا نام اب اسے یاد نہیں رہا تھا۔ مگر یہ حقیقی دنیا تھی یہاں ایسا کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے خدا کا شکر یہ ادا کیا کہ ہر چیز اپنی جگہ اسی طرح موجود تھی جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

اس نے فوراً ہی سارے کمرے کی تلاشی لی، کھڑکیاں کھول کر دیکھیں، باتھ روم کا جائزہ لیا اور پھر تقریباً مطمئن ہوگئی۔ مگر اسی وقت اسے خوف کی ایک ٹھنڈی لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی محسوس ہوئی اور اس کی گردن کے روئیں کھڑے ہوگئے جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے عقبی کھڑکی کھلی نظر آئی حالانکہ وہ اسے اچھی طرح بند کر کے گئی تھی۔

خوف اس کے مساموں سے پھوٹ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف لپکی، اس نے ایک دفعہ سنا تھا کہ "پرانے گھروں میں اس طرح کے واقعات ہوتے ہیں۔" اس نے کھڑکی بند کی اور پھر کھولی، پھر بند کر دی وہ بالکل ٹھیک کھل اور بند ہو رہی تھی۔ اس میں کسی قسم کا نقص نہیں تھا جب اس نے کھڑکی بند کی تو شیشے میں سے باہر دھیمی روشنی میں اس کو کچھ حرکت نظر آئی، اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

بھورے رنگ کی اس عجیب سی چیز نے ایک لمحہ رک کر اپنی سیاہ گول گول آنکھوں سے پیچھے اس کی طرف دیکھا پھر وہ خرسک نام کا جانور جھاڑیوں کے اندر گم ہوگیا۔ اسٹیفنی نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور بے ساختہ ہنسنے لگی۔ اسے اپنے ڈر اور خوف پر ہنسی آرہی تھی۔ اسے اب بیئر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے صدر دروازے کو اندر سے مقفل کیا۔ حفاظتی زنجیر چڑھا کر کھڑکیوں کو ایک دفعہ پھر چیک کیا، سب بند تھیں۔ بیئر کا ایک ڈبہ اٹھایا اور چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ آدھا کین معدے میں انڈیلنے کے بعد اس نے کچھ پنیر اور خشک میوے ان لفافوں میں سے نکالے جو وہ ابھی قصبے سے خرید کر لائی تھی اور بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔ نیچے بہتا دریا کا پانی اسے بمشکل نظر آرہا تھا مگر وہ اس کی آواز با آسانی سن سکتی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے باقی بیئر بھی ختم کر دی۔ باہر موسم خنک تھا اور زیادہ دیر وہاں کھڑے رہنا مشکل تھا اس لیے وہ واپس اندر آگئی اور فریج میں سے بیئر کا ایک اور کین نکال لیا اور اسے ختم کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب اسے نہا لینا چاہیے۔ اس کا جسم تھکاوٹ سے ٹوٹ رہا تھا۔

اسٹیفنی ولیمز نے اپنا سیل فون چیک کیا اور اپنے ایک دوست کی طرف سے آنے والے ٹیکسٹ میسج کا جواب دیا پھر اسے کچن کے کاؤنٹر پر رکھا اور کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی اور اس میں سے سفید سوتی لبادہ نکالا، اس کی جیبوں کو چیک کیا اور مطمئن ہوئی کہ وہ خالی تھیں اس کے بعد اس نے اپنا سویٹر کھینچ کر اتارا مگر اپنی قمیض کے بٹن کھول رہی تھی تو کسی انجانے خطرے کے پیش نظر رک گئی اس کی نسوانی حس پوری طرح بیدار تھی۔ اسے نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ محتاط نظروں سے اس نے چاروں طرف انجانے خطرے کے پیش نظر رک گئی اس کی نسوانی حس پوری طرح بیدار تھی۔ دروازہ بند تھا، کھڑکیوں پر پڑے پردے بالکل برابر تھے، کوئی درز نظر نہیں آرہی تھی۔ مطمئن ہو کر اس نے اپنی قمیض اتاری اور پھر جوتے اتار کر ایک کونے میں اچھال دیے۔ پھر اپنی جینز بھی اتار دی۔ لبادہ پہنتے ہوئے اسے جھرجھری آگئی وہ جسم پر کافی باہر رہا تھا۔ جی چاہا کہ اسے اتار پھینکے مگر مکمل برہنہ ہونا اسے پسند نہیں تھا خصوصاً ایسی جگہ جو اس کے لیے مکمل اجنبی تھی۔

باتھ ٹب کو بھرنے میں کئی منٹ لگ گئے اور یہ وقت اس نے ٹی وی کے سامنے گزارا۔ ایک کے بعد دوسرا چینل بدلتی گئی پھر ایک جگہ رک گئی اس چینل پر اس کی ہزارویں دفعہ کی دیکھی ڈراؤنی فلم چل رہی تھی۔ اسے ہمیشہ اس فلم کا ایک سین دیکھ کر بہت ہنسی آتی تھی۔ جب ہیروئن کو کپڑوں کی الماری تک پہنچنے میں تیس سیکنڈ لگ جاتے تھے پھر وہ خوف سے چیختی مگر قاتل اسے پیچھے سے دبوچ لیتا اور ایک لمبا سا خنجر دستے تک پورا اس کے سینے میں اتار دیتا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ ہمیشہ لطف اندوز ہوتی۔ مگر اس وقت ٹی وی اسکرین پر پولیس جنگل کے

قوت و طاقت

قوم عاد کو شیطان نے قوت و طاقت کے نشے میں مبتلا کر کے صراط مستقیم سے ہٹا دیا یہ قوم قوت و طاقت سے ہی ہونے کے یقین میں ایسی مبتلا ہوگئی کہ ان کا یہ نعرہ تھا ہم سے بڑھ کر اور کون طاقت وقوت میں زیادہ ہے؟ یا ہم سے بڑھ کر سپر پاور کون ہے؟ اسی قوت و طاقت میں ہی کامیابی وعزت کا ایسا یقین کر بیٹھے کہ حضرت ہودؑ کے سمجھانے پر بھی باز نہ آئے۔ بالآخر اللہ رب العزت نے ہوا کے عذاب سے ان کے نشے کے باطل بت سمیت ان کا صفایا کر دیا۔

(محمد علی۔ پشاور)

بچوں بیچ لڑکی کی قبر کھود کر اس کی لاش کو برآمد کر رہے تھے جب اس کو ٹب کے بھرنے کا خیال آیا۔ یہ خیال بر وقت تھا کیونکہ ٹب لبالب بھر چکا تھا اور اب چھلکنے کے قریب تھا۔ پورے باتھ روم میں گرم پانی کے بخارات کی دھند پھیل چکی تھی اور عین اس وقت جب وہ اپنا لبادہ اتار کر ٹب میں اترنے ہی والی تھی کہ اس کی نظر سامنے لگے آئینے پر پڑی جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی خوف کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑنے لگی۔ وہ غور سے آئینے کو دیکھنے لگی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے....." آئینے پر لکھے لفظ بالکل واضح اور نمایاں تھے۔

سانس سینے کے اندر رکنے لگا، وہ حیران اور پریشان ہوگئی اور سوچنے لگی کہ یہ الفاظ اتنے واضح ہونے کے باوجود اس کو پہلے نظر کیوں نہیں آئے تھے۔ وہ ہمت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر کے ان الفاظ کو قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھی ہی تھی کہ کچن میں پڑا اس کا سیل فون بجنے لگا۔

اس نے جا کر فون اٹھایا تو دوسری طرف ڈینیل بول رہا تھا۔ اس نے یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ دفتر بند ہو رہا ہے اور اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بتا دے۔

اسٹیفنی نے ڈینیل کا شکریہ ادا کیا اور فون بند کر دیا۔ یقیناً یہ اسی بیوقوف کا کام ہے۔ اسٹیفنی نے سوچا پھر اس نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر باتھ روم میں واپس جا کر آئینے پر سے بھاپ صاف کی، لفظ مٹائے اور آئینے پر خود اپنی انگلی سے لکھ دیا۔

''لعنت ہو تم پر.....'' جلد ہی گرم بھاپ ان الفاظ کو مزید نمایاں کر دے گی اور کل صبح جب کوئی یا ڈینیل خود اس کمرے میں آئے گا صفائی کرنے کے لیے تو اسے یہ پیغام مل جائے گا۔

ٹب کا گرم پانی اس کے جسم کو فرحت بخش رہا تھا اس نے ٹیئر کا ایک اور کین کھول لیا، یخ ٹھنڈی ٹیئر اندر سے اور باہر سے گرم پانی جسم کو ایک عجیب سا احساس دے رہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب ہی لٹکا ایک چھوٹا تولیہ کھینچا اور اسے ٹب کے پانی میں ڈبو دیا۔ گیلا ہو جانے پر اسے اپنی پیشانی اور منہ پر پھیرنے لگی، آنکھیں بند کر لیں گرم پانی اس کے اعصاب کو سکون دے رہا تھا اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ رہے تھے۔

پھر اسے زیادہ ہوش نہ رہا، نجانے کتنی دیر وہ سوتی رہی۔ جب جاگی تو ٹب کا پانی قدرے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا اب سو جانا چاہیے۔ ٹب سے باہر نکل کر ایک بڑا سا تولیہ اپنے گیلے جسم کے گرد لپیٹا اور پھر لبادہ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس جگہ پر نہیں ہے جہاں اس نے اسے ٹب میں اترنے سے پہلے رکھا تھا۔ پریشان ہو کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ نہ تو وہ کسی دیوار یا دروازے کی کھونٹی پر لٹکا ہوا تھا اور نہ ہی فرش پر پڑا تھا، وہ کہیں نہ تھا۔

تلاش کے دوران میں اس کو معلوم ہوا کہ کچرے کے ڈبے کے اوپر ٹیئر کے پانچ خالی کین موجود تھے جب کہ ایک باتھ روم میں تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا جب اس نے اتنی زیادہ پی لی تھی اور نہ ہی اس نے نشے کے دوران میں پہلی مرتبہ کوئی چیز کھوئی تھی۔

سوتے وقت ساری روشنیاں گل کر دینا اس کو بالکل پسند نہیں تھا کیونکہ بہادری کے لاکھ دعووں کے باوجود اس کو اندھیرے سے خوف آتا تھا، وہ بھوتوں سے تو نہیں مگر اندھیرے سے ضرور ڈرتی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے اپنے سیل فون پر موصول ہوئے ٹیکسٹ میسج چیک کرنے کے لیے فون اٹھانا چاہا تو اس کو اندازہ ہوا کہ اس نے اپنا سیل فون جہاں رکھا تھا وہاں نہیں ہے۔ اسے تلاش کرنے میں اسے چند منٹ اور لگ گئے۔ وہ کمرے کے فرش پر گرا پڑا تھا اور گرنے کی وجہ سے اس کا اوپری حصہ علیحدہ ہو چکا تھا اور اس کی بیٹری باہر گری پڑی تھی۔ فون بند ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً دوبارہ بیٹری فٹ کی مگر فون چلا نہیں، اس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

''بے وقوف.....'' اسٹیفنی بے بسی سے چلا اٹھی۔

اس سرائے کے خبطی منیجر کے بیان کردہ اور شاید خود ساختہ بھوت کا خوف اب کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ تناؤ اور نشہ ایک ساتھ اس پر قابو پا رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ می گرین کا درد اس کی دائیں آنکھ کے پیچھے شروع ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی اتری ہوئی جینز کو گھسیٹ کر اپنے قریب کیا اور اس کی جیب سے سردرد کی ایک گولی نکال لی۔

وہ گولیوں کو کافی عرصہ سے استعمال کر رہی تھی۔ ان گولیوں کو کھانے کے لیے اسے پانی چاہیے تھا۔ پانی پینے کے لیے استعمال کے قابل گلاس تلاش کرنے میں اسے ایک آدھ منٹ اور لگ گیا جو اسے کچن کی الماری کی تلاشی کے بعد ملا۔ اس گلاس کو پانی سے بھرنے کے بعد اس نے گولی نکالی اور پانی کے گھونٹ بھرنے لگی وہ

تین گلاس پانی پی گئی۔ وہ واپس کمرے کی طرف آئی اور بیڈ پر بیٹھ گئی کچھ سوچتے ہوئے اس نے لحاف کھینچا اور اس کے اندر دبک گئی۔ اس کے جسم پر صرف ایک تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ وہ جتنی جلدی نیند کی وادیوں میں اترتی اتنی ہی جلدی اسے می گرین کے درد سے چھٹکارا مل سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسے کسی کی موجودگی محسوس ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے کسی اور نے اس کے لحاف کے اندر گھسنے کی کوشش کی ہو۔ لحاف کے اندر اس کی آنکھیں یکدم کھل گئیں۔ دل نہایت تیزی سے دھڑک رہا تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور پھر ٹھٹھک گئی کمرے کی تمام روشنیاں گل تھیں اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ سوئی تھی تو کئی روشنیاں جل رہی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، کمرے میں ستاروں کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھیمی روشنی میں ایک سایہ لپکتا محسوس ہوا۔ اس کا سینہ دھونکنی بن گیا، نبض کی رفتار بہت تیز ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تولیہ دوبارہ اپنے جسم پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دایاں ہاتھ رینگتا ہوا لحاف سے باہر نکلا اور بیڈ کے سرہانے پڑے لیمپ کی طرف بڑھا اور اس کا بٹن دبا دیا..... مگر روشنی ہوئی نہیں۔ وہ اچھل کر بستر سے نکلی، سانس سینے میں رک رہا تھا۔ بجلی کے سوئچ کو اندھیرے میں تلاش کر کے اس کو فوراً دبا دیا۔ روشنی جل اٹھی۔

اس نے دیکھا کہ اس کے کپڑے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے اپنی پتلون کو سنبھالا اور اسے فوراً پہن لیا۔ اس کی قمیض بھی اس کو جلد ہی مل گئی موزے تلاش کرتے ہی وہ بیرونی کمرے کی طرف بڑھی تاکہ چابی تلاش کر سکے۔

کچن کی تمام الماریاں کھلی پڑی تھیں حالانکہ اسے یاد تھا کہ پانی کا گلاس تلاش کرنے کے بعد اس نے ان تمام کو اچھی طرح بند کیا تھا۔ اس کے سر کا درد لوٹ آیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی دیوار سے اپنا سر ٹکرا دے۔

بمشکل تمام اس نے اپنے جوتے پہنے اور اپنا سامان سمیٹنے کے لیے وہ واپس بیڈ روم کی طرف بھاگی مگر یہ دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کہ کمرے کا دروازہ بند تھا جب کہ باہر نکلتے ہوئے وہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی۔

دروازے پر رک کر اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اس کے سر کا درد شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کی ایک لہر کمرے میں در آئی تھی اور وہ کھڑکی کے ہلنے کی آواز سن رہی تھی۔

''کون ہے یہاں.....؟'' وہ چیخ اٹھی اور اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے اس نے تمام روشنیاں آن کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد اس نے کچن کی تمام الماریاں بند کیں۔ اس کے ذہن پر ابھی تک نشہ چھایا ہوا تھا۔

''میں ڈر نہیں سکتی..... کیونکہ بھوتوں کا کوئی وجود نہیں ہے.....'' وہ بلند آواز سے خود کلامی کر رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے بیڈ روم کا دروازہ دوبارہ کھولا اور اندر جھانکا، اسے اپنی تنہائی اور بے یار و مددگاری پر غصہ آ رہا تھا۔

اسے ایک بار پھر احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے، اسے چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے نتھنوں سے ایک نامانوس اور عجیب سی بو ٹکرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ سارے جسم کا خون نچوڑ کر چہرے پر اکٹھا ہو رہا تھا۔ اب وہ یہاں سے جلد نکل جانا چاہتی تھی کوئی اسے چھو نہیں سکتا تھا، اسے ہلا نہیں سکتا تھا وہ اسمارٹ اور ذہین تھی اور عقلمندی کا تقاضہ یہی تھا کہ اس غیر فطری خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں سے نکل جائے۔ ممکن ہے وہ سب اس کا وہم ہو مگر اب گیلے پتوں اور گیلی مٹی کی اس عجیب سی بو سے اس کا سانس رکنے لگا تھا۔

بھوت ایک مختلف چیز ہے اور متعفن کمرہ ایک علیحدہ..... وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی اور اپنی چیزیں اکٹھا کرنا شروع کر دیں۔ کمرے میں پھیلی بو اب شدید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگئی تھی اور اسے سگریٹ کی طلب بھی محسوس ہو رہی تھی۔

جب وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی تو اس کا سگریٹ کا پیکٹ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا اور اچھل کر بیڈ کے نیچے چلا گیا۔ پیکٹ نکالنے کے لیے اس نے چادر کا کنارہ ہٹا کر نیچے دیکھا مگر سگریٹ کا پیکٹ بیڈ کے نیچے دور چلا گیا تھا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور بیڈ کے نیچے ہاتھ پھیرا۔

کسی نے ایک دم اس کی کلائی کو تھام لیا اور بیڈ کے نیچے اپنی طرف کھینچا، اس کا چہرہ بری طرح بیڈ کے ساتھ ٹکرایا، اسے یوں لگا جیسے اس کے دانت ٹوٹ جائیں گے۔ یہ سب اتنا تیزی سے ہوا کہ وہ چلا بھی نہ سکی۔ وہ اپنے پہلو کے بل فرش پر گر گئی اور وہ اسے سینے کے بل بیڈ کے نیچے لیٹا ہوا نظر آ گیا۔ اس نے نرسوں والا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور سانسوں میں باسی مچھلی کی بو۔

''عورت.....؟ تمہیں بیڈ کے نیچے جھانکنا نہیں چاہیے تھا.....'' خرخراتی ہوئی آواز سرگوشی نما تھی جس میں دنیا جہاں کا خوف سمایا ہوا تھا۔ اس کے الفاظ سے دہشت ٹپک رہی تھی۔ اس کا لہجہ جہنمی تھا۔

اسٹیفنی کے ذہن میں تیزی سے تانے بانے جڑنا شروع ہو گئے ہوں جیسے تالے کھلنا شروع ہو گئے ہوں اور پھر اس سے پہلے کہ وہ زیادہ کچھ سمجھ سکتی اس بدبو دار آدمی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے بیڈ کے نیچے اپنی طرف کھینچ لیا۔

☆.....☆.....☆

''کیا یہ وہی عورت ہے.....'' پولیس آفیسر کی ٹارچ کی روشنی اس کے ننگے پاؤں پر پڑی پھر وہ رینگتی ہوئی برہنہ ٹانگوں سے ہوتی ہوئی اس کے بازوؤں پر آ گئی جہاں دانتوں کے کاٹنے کے گہرے سرخ نشان نمایاں تھے جب روشنی اس کے چہرے پر پہنچی تو ڈینیل صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

چہرہ اس بری حالت میں تھا کہ پہچاننا مشکل تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو گزشتہ رات دریا کے کنارے والے کمرے سے غائب ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر جہاں کبھی خوبصورت اور دلکش آنکھیں ہوا کرتی تھیں اب دو سیاہ سوراخ تھے۔

''ہاں..... یہ وہی ہے.....'' ڈینیل بمشکل بول سکا۔

''اوہ.....'' آفیسر نے اپنا سر ہلایا اور پیچھے مڑ کر بروک شائر سرائے کی طرف دیکھا۔ لاش سرائے سے کافی فاصلے پر جھاڑیوں کے پیچھے پولیس کو ملی تھی۔ ڈینیل اس وقت کو یاد کرتا رہا جب وہ کمرے کو صاف کیا کرتا تھا اس وقت اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اسے چھپ کر دیکھ رہا ہے۔

تقریباً چار گھنٹے بعد پولیس نے کمرہ نمبر 110 کا معائنہ ختم کر لیا اور انہوں نے اس کے باہر پیلی ٹیپ لگا دی تھی تاکہ کوئی اندر نہ جا سکے۔ جب کہ اسٹیفنی کی کار کمرے کے بار پارک تھی۔ ڈینیل کچھ سوچ کر کمرے کے عقبی حصے کی طرف چل پڑا وہاں سوائے خاموشی اور ویرانی کے کچھ بھی نہ تھا مگر بیڈ روم کی کھڑکی کے باہر چوکھٹ پر ہاتھوں کے خون آلود نشانات تھے۔

وہ واپس دفتر جانے کے لیے مڑا تو اسے اپنی گردن کے پیچھے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس ہوا، وہ فوراً مڑا اور اپنی آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس کی نظر سیدھی کھڑکیوں کی طرف اٹھی جہاں صرف ایک لمحے کے لیے وہ اسے نظر آئی۔ اس کی آنکھوں کی جگہ خالی گڑھے تھے جن سے لہو بہہ رہا تھا، اس کا منہ چیخنے کے لیے کھلا ہوا تھا مگر کھڑکی کی بند شیشوں کے پیچھے سے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی ڈینیل کی مٹھیاں بھنچ گئیں..... اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا آس پاس کچھ بھی نہیں تھا، غیر ارادی طور پر اس نے دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھا مگر..... اب وہ خالی تھی وہاں کچھ بھی نہ تھا..... اور وہ سوچنے لگا کہ..... کیا یہ اس کا تخیل تھا۔

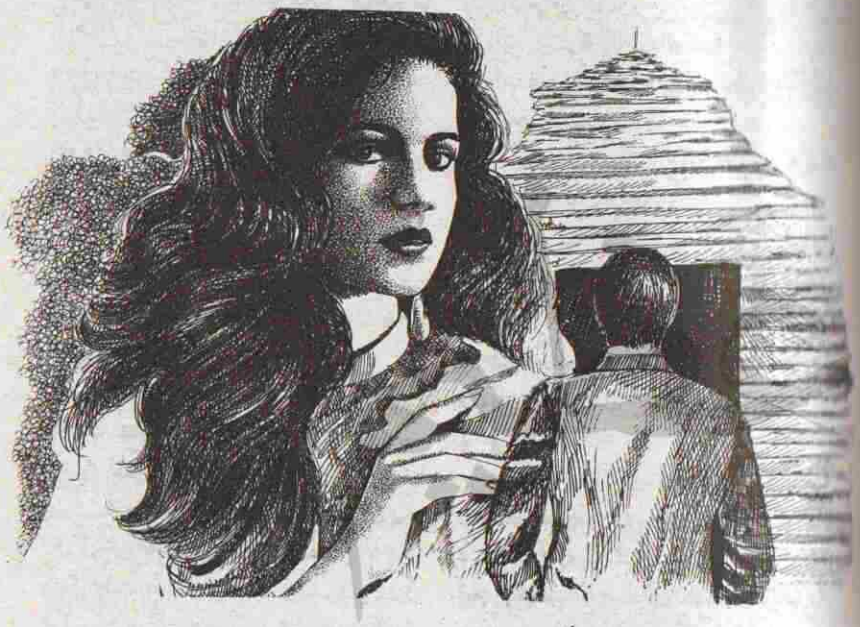

مندر کا حصار

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

کالی ماتا کے ایک مندر کی پراسرار داستان حیرت جو انسانوں سے صدیوں کے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ ایک میل کا فاصلہ جس تک پہنچنا سائنس کے اس دور میں بھی ناممکنات میں سے ہے.....!!

اچنبھے میں ڈالتی، عقل و شعور میں نہ آتی اور چونکا دینے والی ایک پراسرار حقیقی کہانی

کس قدر عجیب بات تھی، وہ مندر گاؤں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا لیکن ایک میل کا یہ فاصلہ میں اور شاہد علی صبح سے اب تک طے نہیں کر سکے تھے۔ دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ دھوپ میں بلا کی شدت آ چکی تھی۔ ہمارے جسم پسینے میں تر تھے۔ دم لبوں پر آ گیا تھا۔ اس پر بھی میں مندر تک جانے کے لئے بضد تھا اور ایک میل کا فاصلہ بدستور قائم تھا۔

میں شاید اس گاؤں میں کبھی نہ آتا، اگر شاہد اس شدومد سے اصرار نہ کرتا۔ وہ میرا کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ موجودہ بنگلہ دیش کا شہر سلہٹ سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر اس کا گاؤں تھا۔ گاؤں کی پرسکون اور سرسبز و شاداب زندگی پر اکثر باتیں کیا کرتا۔ شہروں کے ہنگامے اسے ناپسند تھے۔ شور شرابا اس کے حواس پر گراں گزرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاؤں میں چند دن گزارنے کی دعوت دیا کرتا۔ میں اس کی خواہش تعلیم کے زمانے میں تو پوری نہ کرسکا البتہ والد کی وفات کے بعد جب میں نے کاروبار سنبھالا اور زندگی یکساں نہج کا شکار ہوگئی تو ایسے میں ایک بار پھر شاہد کا خط ملا۔ اب وہ بھی گاؤں میں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔

اس کا خط ماحول کی یکسانیت سے فرار کا ایک راستہ نظر آیا اور میں گاؤں جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں نے اسے بذریعہ تار اطلاع بھی دے دی کہ میں فلاں تاریخ کو آرہا ہوں۔

شاہ آباد ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اس کی مناسبت سے اسٹیشن بھی چھوٹا ہی ہے۔ اسٹیشن پر اترنے والے صرف تین چار آدمی تھے جن میں سے ایک میں تھا۔ گرمیوں کے دن تھے چلچلاتی دھوپ میرا مزاج پوچھ رہی تھی لیکن شاہد کو پلیٹ فارم پر موجود دیکھ کر میری ساری کوفت دور ہوگئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف لپکے اور بغل گیر ہوگئے۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی اس لئے کافی دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔

گاؤں میں ٹیکسیاں اور رکشے نہیں تھے اس لئے ہم ایک تانگے پر بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ ہر طرف کھیت ہی کھیت لہلہا رہے تھے۔ کہیں کہیں کنوئیں اور ہٹ بھی دکھائی دیئے۔ آخر ہم ایک بڑے سے پختہ مکان کے سامنے تانگے سے اترے۔ گھر کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو صحن میں ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکی بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ لڑکی فوراً اٹھ کر اندر چلی گئی۔ شاہد نے اپنی والدہ اور بہن کا ذکر اکثر کیا کرتا تھا۔ اچٹتی سی ایک نظر میں میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی بہن کا رنگ سانولا تھا اور اس کے چہرے میں کوئی کشش بھی نہیں تھی۔ ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر شاہد کی والدہ کے سبزی کاٹتے ہاتھ رک گئے۔ ان کے چہرے پر ایک پرشفقت مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ایسی مسکراہٹ میں نے صرف اپنی والدہ کے چہرے پر دیکھی تھی۔

"یہ میری امی ہیں اور تمہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر جو اندر بھاگ گئی، میری بہن شائلہ ہے۔" شاہد نے تعارف کرایا۔

"اور امی یہ ہے میرا گہرا دوست۔ بس میں نے زندگی میں انور کو ہی دوست بنایا ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور شاہد مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ گھر کا ماحول حد درجہ پرسکون تھا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہ آئی۔ جس کمرے میں شاہد نے مجھے ٹھہرایا، اس میں ایک پلنگ بچھا تھا جس پر سفید چادر موجود تھی۔

پلنگ کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز تھی اور میز کے دوسری طرف ایک کرسی۔ شاہد مجھے پلنگ پر بیٹھانے کے بعد خود کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میری بہن بہت شرمیلی ہے، میں نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ تم سے پردہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تمہارے گھر میں بھی مجھ سے کبھی پردہ نہیں کیا گیا لیکن اس کے باوجود وہ تمہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اندر چلی گئی۔ تم کوئی خیال نہ کرنا۔ وہ بہت سیدھی ہے۔ شہری آب و ہوا اور ماحول سے اسے ذرا بھی واقفیت نہیں۔" جواب میں میں مسکرا اٹھا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں پردہ کرنا تو بہت اچھی عادت ہے۔"

میں دوسری صبح شاہد کے ساتھ غسل خانے کی طرف جانے کے لئے باہر نکلا تو پھر شائلہ پر نظر پڑی اور یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ کل اس کے جو نقوش پھیکے نظر آئے تھے ان میں اس وقت ایک عجیب سی جاذبیت تھی۔ میں اس جاذبیت کی کوئی وجہ نہ جان سکا۔ اسے کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ لڑکی تو وہی تھی نقوش بھی وہی تھے پھر ایک ہی رات میں اس قدر فرق کیسے رونما ہوگیا تھا۔ تو کیا کل میری نظر اس پر غلط رخ سے پڑی تھی؟ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں یہ خیالات میرے ذہن میں گھوم گئے۔ اتنے میں شائلہ پھر اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھی۔

میں نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا اور خود کو لعنت ملامت کی کہ دوست کی بہن کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے لیکن ذہن پھر پھر اکر اس کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

نہا دھو کر ناشتے سے فارغ ہوئے تو گاؤں کی سیر کی ٹھہری۔ ہم گھر سے باہر نکلے۔ اس وقت میری نظر اس مندر پر پڑی۔ مندر صبح کو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کی آب و تاب اور چمک دمک نے مجھے حیرت زدہ کردیا۔ میں نے شاہد سے پوچھا۔ "کیا یہاں ہندو بھی آباد ہیں؟" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا اور کہنے لگا "کبھی تھے۔ اب یہاں صرف مسلمان آباد ہیں۔" مجھے یہ سن کر اور بھی حیرت ہوئی کیونکہ مندر تو بالکل نیا نظر آتا تھا۔ مجھے حیران دیکھ کر شاہد بولا۔ یہ حقیقت ہے کہ مندر بالکل نیا نظر آتا ہے لیکن یہ بہت پرانا ہے۔

ہم پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے مندر کی طرف بڑھنے لگے۔ میں مندر کے بارے میں متجسس ہوگیا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے اندر سے دیکھوں۔ میری اس خواہش کے جواب میں شاہد نے بتایا کہ "ہم قیامت تک بھی چلتے رہیں تو مندر تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"کیا مطلب؟" میں بری طرح چونکا۔

"نہ جانے کتنے لوگ مندر تک جانے کی کوشش کرکے ہار چکے ہیں۔ لیکن آج تک کوئی بھی پہنچ نہیں سکا۔"

"لیکن مندر تو بہت نزدیک ہے۔"

شاہد نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے تجسس میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم نالے تک پہنچ گئے۔ اس نالے میں بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ شاہد نے بتایا کہ "اس نالے سے مندر کا فاصلہ صرف ایک میل ہے۔"

"تو پھر ہم ایک میل کا یہ فاصلہ چند منٹ میں طے کرلیں گے۔ آخر ایسی کیا بات ہے کہ لوگ ایک میل کا یہ مختصر سا راستہ طے نہیں کرسکتے ضرور تمہیں وہم ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔

میرا اصرار حد سے بڑھ گیا تو شاہد میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو ہی گیا۔ ہم نے ایک چھلانگ میں نالہ پار کیا اور پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ یہ پگڈنڈی سیدھی مندر کی طرف جاتی تھی۔ میں دل ہی دل میں شاہد پر ہنس رہا تھا جس کے خیال میں ایک میل کا یہ مختصر سا راستہ ہم قیامت تک بھی طے نہیں کرسکتے تھے، جبکہ میرا خیال تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم مندر کے پاس موجود ہوں گے۔

اچانک مجھے ایک ٹھوکر لگی۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر منہ کے بل دائیں ہاتھ کی طرف کھائی میں گرا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے ساتھ ہی شاہد کو بھی ٹھوکر لگی تھی اور وہ بھی گرا تھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے ہم اٹھے اور دوسرے ہی لمحے حیرت کا ایک پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا کیونکہ ہم دونوں اس جگہ کھڑے تھے جہاں سے ہم نے نالہ پار کیا تھا۔

چند لمحے تک میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ ہم دونوں واپس اس جگہ کیسے پہنچ گئے؟ ٹھوکر تو ہم نے نالے کے پار تقریباً ایک فرلانگ دور کھائی تھی۔ شاہد کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اگرچہ اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ بھی سکتے کے عالم میں تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ایک تھپکی دی اور بولا۔ "فکر نہ کرو دوست ہم سے ضرور غلطی ہوئی ہے۔ ہم ایک بار پھر کوشش کریں گے اور انشاء اللہ اس دفعہ مندر تک پہنچ کر ہی دم لیں گے۔"

"شاہد تھکے تھکے انداز میں مسکرایا اور کہنے لگا۔" یہی تمہاری بھول ہے میرے دوست! میں کہہ چکا ہوں کہ ہم مندر تک نہیں پہنچ سکتے۔" میں نے سر جھٹک دیا اور "آؤ" کہتا ہوا نالہ پار کرگیا۔ شاہد کو مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے اس سے کہا۔ "دھیان رکھنا ٹھوکر ہرگز نہ کھانا۔ اگر ہم نے ٹھوکر نہ کھائی تو کامیابی ضرور ہمارے قدم چومے گی۔" شاہد نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ایک بار پھر ہم اسی راستے پر چلے جارہے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔ پھونک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھونک کر قدم رکھنے کے باوجود ہم نے ٹھوکر کھائی اور نالے کے دوسری طرف آ رہے۔

سورج اب سر پر آ گیا تھا۔ دھوپ نے شدت اختیار کر لی تھی۔ حبس اور گھٹن میں بھی اضافہ ہو چلا تھا۔ ہمارے کپڑے گرد اور کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ سانس پھولنے لگا تھا جیسے میلوں کا فاصلہ دوڑ کر طے کر چکے ہوں اور کھیتوں سے اٹھنے والی بساندھ گھبراہٹ میں اضافہ کر رہی تھی۔ شاہد نے مضمحل لہجے میں کہا۔

"اب کیا ارادہ ہے دوست؟"

میں نے جھلا کر کہا۔ "ایک بار پھر کوشش کریں گے۔"

شاہد نے مجھے بازو رکھنے کی بہت کوشش کی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور گھر کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

"مان جاؤ دوست ہم عمر بھر بھی چلتے رہیں گے تو بھی یہ ایک میل کا فاصلہ کم نہ ہوگا، جوں کا توں رہے گا۔ یہ گاؤں آخری آبادی ہے یہاں دوسری جگہوں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا کسی زمانے میں تو لوگوں کو جنون سا ہو گیا تھا۔ انہوں نے بار بار کوشش کی اور ہر بار منہ کی کھائی۔ یہاں تک سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ لہٰذا آؤ گھر چلتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ جب ٹھنڈی چھاچھ پئیں گے تو ساری کوفت اور تھکن دور ہو جائے گی۔"

اس کی لمبی چوڑی تقریر کا مجھ پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور ایک بار پھر میں نے نالے کے پار چھلانگ لگا دی۔ وہ آخر میرا دوست تھا۔ اسے میرا ساتھ دینا ہی پڑا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ اس وقت میں نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔ "کیا یہ جادو کا مندر ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ ہماری تیسری کوشش تھی لیکن میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ راز کیا ہے؟ میں نے شاہد سے کہا۔ "بس ایک مرتبہ اور کوشش کریں گے۔ اگر پھر بھی نہ پہنچ سکے تو میں ہار مان لوں گا۔"

ہم دونوں نے چھلانگ لگائی اور نالے کے پار پہنچ گئے۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور نالے کے کنارے موجود ایک درخت کی شاخ سے باندھنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" شاہد کے لہجے سے اس مرتبہ طنز کی جھلک عیاں تھی۔

"میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ وہی نالہ ہے جسے ہم بار بار پار کر چکے ہیں یا کوئی دوسرا نالہ ہمارے سامنے آتا ہے۔"

شاہد کو میری بات سن کر ہنسی آ گئی تاہم وہ رکا نہیں۔ پگڈنڈی بادی النظر میں بالکل سیدھی تھی اور مندر تک چلی گئی تھی۔ اس مرتبہ میں نے ہر ممکن احتیاط سے کام لینے کی ٹھان رکھی تھی اور اس سلسلے میں پہلے تر کیب یہ کی کہ شاہد کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اب اگر ہم میں سے کسی کو ٹھوکر لگتی تو گرنے کا احتمال نہیں تھا۔ ہم چلتے گئے لیکن فاصلہ کسی صورت کم ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاہد کا گھر بھی نالے سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا اور عجیب ترین بات یہ تھی کہ یہ فاصلہ بھی زیادہ ہوتا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ فاصلہ نہ کم ہو رہا تھا نہ زیادہ ہم ہر حال میں وہیں کے وہیں تھے۔ اس پر بھی میں قدم اٹھانے سے باز نہیں آیا۔ شاہد کے ہاتھ پر میری گرفت مضبوط تھی۔

"خوب ہوشیاری سے قدم اٹھاؤ، خبردار اس مرتبہ ہم ٹھوکر ہرگز نہیں کھائیں گے۔" میں نے شاہد کو تنبیہ کی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا، البتہ سر ضرور ہلا دیا۔ لیکن جو کچھ ہونا تھا، وہ تو پلک جھپکنے میں ہی ہو گیا۔

"سس..... سانپ!"

بدحواسی کے عالم میں شاہد کے منہ سے نکلا۔ بس اسی لمحے میری توجہ پگڈنڈی سے ہٹ گئی اور میں اچھل کر ویران کھیت میں جا پڑا۔ مجھے ہوش آیا تو اسی مقام پر ہم کھڑے تھے اور نالے کے دوسرے کنارے پر ناریل کے درخت سے اڑتا ہوا رومال ہوا میں لہرا رہا تھا۔ شاہد کے چہرے پر طنز آمیز مسکراہٹ میں تھکن کی آمیزش بھی تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "اب کیا خیال ہے بیٹے؟" میں جھلا

اٹھا اور اس سے بولا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا تم نے بلاوجہ مجھے ڈرا دیا، حالانکہ وہاں سانپ کا نام و نشان نہیں تھا۔"

شاہد نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "سانپ یقیناً تھا، میں نے اسے تمہارے پیروں کے عین نیچے دیکھا تھا۔"

اور میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اگر شاہد سچ کہہ رہا تھا تو پھر سانپ مجھے کیوں نظر نہ آیا؟ اور پھر یہ بھی کچھ کم حیران کن حقیقت نہیں تھی کہ ہر بار ہم نالے کے اس پار پگڈنڈی سے لڑھکتے تھے اور خود کو نالے کے اس پار یعنی شاہد کے گھر کی سمت میں پاتے تھے۔ خدا جانے کیا چکر تھا۔ آخر میں نے کہا۔

"آؤ، ایک بار پھر کوشش کریں۔"

"ٹھہرو! پہلے ایک کہانی سن لو اس کے بعد کوشش کرتے رہنا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شروع میں میں نے تمہیں یہ کہانی اس لئے نہیں سنائی تھی کہ تم اسے کسی مجذوب کی بڑ نہ سمجھو۔ پہلی مرتبہ جب تم نے مندر کے بارے میں پوچھا تھا تو اس وقت میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ کوئی شخص بھی اپنے پیروں سے چل کر مندر تک نہیں جا سکتا۔ بس تم پر بھوت سوار ہو گیا۔ اب تم جان چکے ہو کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"تو اب تم مجھے کوئی کہانی بھی سناؤ گے۔ خیر سناؤ، اس طرح دم لینے کا موقع بھی مل جائے گا۔"

شاہد نے کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ پھر رک گیا۔ پھر کہنے لگا۔ "نہیں اس طرح تمہیں اس کہانی پر یقین نہیں آئے گا، آؤ گھر چلیں وہاں ہمارے ایک بزرگ کی ڈائری موجود ہے۔ اس ڈائری میں اس مندر کے متعلق پوری تفصیل موجود ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اس ڈائری کا مطالعہ کر لو لیکن اس سے پہلے ہم کھانا کھائیں گے کیونکہ بھوک خوب چمک اٹھی ہے۔"

میں نے اس کی تجویز کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور کپڑے جھاڑے اور اس کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی شائلہ اور اس کی والدہ کی نظر ہم پر پڑی اور میں نے شاہد کی والدہ کی آنکھوں میں حیرت دیکھی جبکہ شائلہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شاہد شاید اپنی ماں کو یہ بتانے کے لئے رک گیا تھا کہ ہمارے حلیے کیوں بگڑے ہوئے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو شاہد نے کتابوں کی الماری سے ایک چمڑے کی جلد والی ڈائری نکال کر میرے آگے رکھ دی اور بولا۔ "اب تم لیٹ جاؤ اور لیٹ کر اس ڈائری کی ورق گردانی کرو۔ اس کے بعد تمہیں مجھ سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ ڈائری پڑھنے کے بعد بھی اگر تم مندر تک جانے کا ارادہ ترک نہیں کرو گے تو میں اس وقت تک تمہارا ساتھ دوں گا جب تک کہ تم تھک نہیں جاؤ گے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا اور میں نے پلنگ پر لیٹ کر ڈائری کی جلد الٹ دی۔ شاہد سے یہ تک پوچھنے کا خیال نہ رہا تھا کہ جس شخص کی یہ ڈائری ہے اس کا خود شاہد سے کیا رشتہ تھا۔ پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا۔ "یہ ڈائری سید بشیر احمد کی ملکیت ہے۔" میں نے ورق الٹ کر دیکھا۔ یہ کوئی باقاعدہ تاریخ وار ڈائری نہیں تھی۔ صرف ایک نوٹ بک تھی اور اس پر فوراً ہی وہ کہانی شروع ہو گئی تھی جو شاہد مجھے سنانے والا تھا۔ کہانی کچھ یوں تھی۔

یہ گاؤں میرے والد حضرت شاہ خیر اللہ نے بسایا تھا۔ وہ اپنے وقت کے عالم باعمل اور بہت بڑے بزرگ تھے۔ وہ حضرت شاہ جلال مجرد سلہٹی کے مقرب خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ جلال نے تبلیغ کی غرض سے سلہٹ کو اپنا مرکز بنایا تو اپنے مقرب شاگردوں کو بنگال کے مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کا حکم دیا۔ میرے والد کو شمال مغرب کی طرف کوچ کا حکم ملا۔ وہ سلہٹ سے روانہ ہوئے تو اس جگہ آ پہنچے اور یہ جگہ انہیں کچھ ایسی بھائی کہ اپنے پیر و مرشد کی اجازت سے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے ساتھ ان کے اہل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانہ کے علاوہ نومسلموں کی بھی اچھی بھلی تعداد تھی۔ وہ سب لوگ بھی یہیں آباد ہوگئے۔ پھر آہستہ آہستہ گاؤں کی آبادی بڑھنے لگی۔ میرے والد کا فیض عام ہوگیا۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور بہت سے بے خاماں لوگ بھی یہاں آکر بسنے لگے۔ اکثر غیر مسلم ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد کچھ ہندو ادھر آنکلے۔ انہوں نے قبلہ والد سے اس گاؤں میں بسنے کی اجازت چاہی۔ والد صاحب نے انہیں بخوشی اجازت دے دی۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ ہوسکتا ہے ان میں سے بھی بہت سے ہندو مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ ہندوؤں نے بھی کچے پکے مکان تعمیر کرلئے اور رہنے لگے۔ ان کے مکانات اس مندر کے آس پاس تھے۔ اس وقت یہ مندر نہیں تھا۔ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے دور دور نہیں رہتے تھے۔ آپس میں بات چیت بھی کرتے تھے اور دکھ درد میں بھی شریک ہوتے تھے۔

ان ہندوؤں میں سے ایک کا نام رام داس تھا۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام روپا تھا۔ میں نے اسے اکثر پانی بھرنے کے لئے گھڑا لئے گاؤں کے کنوئیں کی طرف جاتے دیکھا تھا اور نہ جانے کیوں وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ جب بھی وہ مجھے نظر آتی، میں بے سدھ ہوکر اسے تکنے لگ جاتا۔ اس نے کئی بار میری محویت محسوس کیا مگر برا نہیں مانا۔ مجھے اس کی پیشانی پر بل نظر نہیں آئے۔ اس کے نقوش بہت تیکھے تھے اور ان تیکھے نقوش پر اس کا سانولا رنگ سونے پر سہاگہ تھا۔ اس کی ناک پتلی اور ہونٹ بھرے بھرے تھے جن کا رنگ جامنی سا تھا۔ چہرہ کتابی اور پیشانی کشادہ تھی۔ گردن بہت لمبی تھی، شاید ایسی ہی گردنوں کو صراحی دار کہا جاتا ہے۔ میں نے کبھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہ کی، نہ اس کی طرف قدم بڑھائے، بس صرف دیکھتے رہنے پر اکتفا کیا کیونکہ اس کی طرف نہ دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔ اس نے بھی مجھ سے بات کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ ایک ننگ دھڑنگ سا دھو گھومتا گھومتا اس گاؤں میں آنکلا۔ ہندوؤں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور پھر وہ بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ مسلمانوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس وقت کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سادھو کے عزائم کیا ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو شاید اسے گاؤں میں گھسنے ہی نہ دیا جاتا۔ شروع شروع میں سادھو نے کوئی غلط حرکت نہ کی۔ وہ نہایت شریفانہ انداز سے رہتا رہا۔ ہندو اسے بہت پہنچا ہوا بزرگ خیال کرتے تھے۔ وہ اس کے آگے بچھے جاتے لیکن مجھے وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میں نے کئی بار یہ بات محسوس کی کہ وہ روپا کو بری طرح گھورتا ہے۔ لیکن میں مسلمان تھا، اسے روپا کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

پھر سادھو نے پر پرزے نکالنے شروع کردیئے۔ سب سے پہلے اس نے ہندوؤں کو کالی مائی کا مندر تعمیر کرنے کی ترغیب دی۔ ہندو تو پہلے ہی اس کی باتوں پر عمل کرنا اپنا دھرم جانتے تھے۔ انہوں نے فوراً مندر کی تعمیر شروع کردی۔ میرے والد بزرگوار بھلا اس پر کیوں معترض ہوتے، وہ کسی کے مذہبی معاملات میں ٹانگ اڑانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مندر تعمیر ہوگیا۔ ہندو اس میں باقاعدہ پوجا پاٹ کرنے لگے۔ اب تو میرے والد بھی سوچنے پر مجبور ہوگئے۔ مندر میں پوجا کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اب ہندو طاقت پکڑ جائیں گے اور تبلیغ کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا۔ لیکن اب تو مندر بن چکا تھا، ہو بھی کیا سکتا تھا، وہ خاموش ہو رہے۔

انہی دنوں تبلیغ کے لئے والد صاحب کو چند مہینوں کے لئے گاؤں سے باہر جانا پڑا۔ یہ واقعہ ان کے جانے کے دو تین دن بعد کا ہے۔

ایک صبح لوگ بیدار ہوئے تو ایک نوعمر لڑکا غائب تھا۔ لڑکے کے ماں باپ نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا، جب نہ ملا تو ایک ایک سے پوچھتے پھرے لیکن لڑکا تو اس طرح غائب ہوا جیسے کبھی اس کا وجود ہی دنیا میں نہ تھا۔

لیکن ابھی تک ہندو گھروں تک نہیں گئے تھے اب انہیں وہاں بھی جانا پڑا۔ ان سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن لڑکے کا کوئی پتہ نہ چلا۔ لڑکے کے ماں باپ رو دھو کر چپ ہوگئے۔ خیال یہی کیا گیا کہ ضرور اسے کوئی درندہ اٹھا کر لے گیا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان اطراف میں درندے نہیں تھے اس لئے لڑکے کے بارے میں چہ میگوئیاں جاری رہیں۔

ایک صبح ایک نوجوان لڑکی غائب ہوگئی۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف لڑکی کو ڈھونڈا گیا مگر اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ اب تو سب کے رنگ اڑ گئے۔ لڑکے کی گمشدگی کا واقعہ پھر سے ہرا ہوگیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ والد صاحب ان دنوں بھی گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ واپس آئے تو انہیں اس بارے میں بتایا گیا۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ لوگوں کو محتاط رہنے کی ہدایت کی اور خود بھی رات کو گاؤں کا پہرا لگانے لگے۔ ایک سال گزر گیا۔

آدھی رات کا وقت تھا اور میں گہری نیند سو رہا تھا اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت کون آگیا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا اور دھک سے رہ گیا۔ زندگی میں اس سے زیادہ حیرت مجھے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔

دروازے پر روپا کھڑی تھی۔

"وہ......وہ......اس کا بھینٹ دینے والے ہیں۔" وہ ہکلائی زندگی میں پہلی بار وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"کیا مطلب......؟" میں بری طرح چونکا۔

"وقت نہیں ہے......میرے ساتھ آؤ۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، تاہم مقناطیسی انداز میں اس کے ساتھ ہولیا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ ہر طرف گھنگھور تاریکی مسلط تھی۔ روپا مجھ سے دو قدم آگے تھی اور تیز تیز چل رہی تھی۔ مجھے بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تیز چلنا پڑ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ مجھے ایک سایہ سا نظر آرہی تھی۔ گرتا پڑتا میں اس کے پیچھے

چلتا ہندوؤں کی آبادی میں داخل ہوگیا۔

آبادی میں داخل ہوتے ہی وہ مڑی اور اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اب اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے بدن میں کرنٹ سا دوڑنے لگا، مگر شاید وہ میرے احساسات سے بالکل بے خبر تھی یا پھر وہ وقت ہی ایسا تھا، اسے یہ احساس بھی نہیں رہ گیا تھا کہ اس نے ایک غیر مذہب جوان آدمی کا ہاتھ تھام لیا ہے۔ میں یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ اس کا رخ اب کالی مائی کے مندر کی طرف تھا۔ اب اس کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ قدم اٹھاتے وقت ہلکی سی چاپ بھی پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی۔

مندر کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے عجیب و غریب سی آوازیں ابھر رہی تھیں جیسے بہت سے لوگ مل کر بھجن گا رہے ہوں۔ یہ بھجن خالص ہندی زبان میں تھا اور میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ تاہم میں اتنا ضرور سمجھ گیا کہ گیت کالی مائی کی تعریف میں تھا۔ روپا یہاں تک پہنچ کر رک گئی اور اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "آج اسے کالی مائی پر قربان کردیا جائے گا۔ بچا سکتے ہو تو بچالو۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ نہ جانے روپا کس کے بارے میں کہہ رہی تھی وہ کون بدنصیب تھا جسے قربان کیا جانے والا تھا، اور پھر انسانوں کی قربانی میں تھرا کر رہ گیا۔ ایسا تو میں نے کیا کسی بھی مسلمان نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ جن ہندوؤں کو ہم نے گاؤں میں رہنے کی اجازت دی پھر ان کے سادھو مہاراج کو بھی آنے سے نہ روکا، اب وہی لوگ اپنی کالی ماتا پر انسانوں کو قربان کررہے تھے۔ اور مجھے یقین ہوگیا کہ ضرور کوئی مسلمان ہوگا۔

بس اس لمحے، میرا خون کچھ طرح کھولا کہ میں خود پر قابو نہ پاسکا۔ پوری قوت سے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوگیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز بھجن کی لے پر حاوی ہوگئی، گیت کے سر دب سے گئے جیسے نیکی بدی پر غالب آنے لگی ہو۔ اس آواز نے بم کا کام کیا۔ مندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں موجود تمام لوگ اس طرح چونکے جیسے کسی گہرے خواب میں محو تھے۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ میرے سامنے کالی مائی کا ہیبتناک بت تھا۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ کتنے ہی بازو مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کئی انچ لمبی زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی، البتہ اس کالے رنگ کے بت میں صرف آنکھیں سرخ رنگ کی تھیں اور یہ سرخ رنگ کی آنکھیں اس کی خوفناکی میں اور بھی اضافہ کررہی تھیں۔

بت کے آگے ایک قبر نما چبوترا بنا تھا۔ اس چبوترے پر ایک نوجوان بندھا پڑا تھا۔ اس کی گردن چبوترے کی ابھار پر رکھی تھی۔ نوجوان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔

وہ ہمارے گاؤں کی مائی جمن کا نوجوان بیٹا سلیم تھا۔ مائی جمن کا اس کے سوا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتا تھا اور ابھی پچھلے ہی سال اس نے اپنی والدہ کو حج بھی کرایا تھا۔ سب لوگ سلیم سے بہت خوش تھے۔ وہ سبھی کے کام آتا تھا۔ لیکن آج وہی سلیم میری آنکھوں کے سامنے کالی مائی کی قربان گاہ کے چبوترے پر رسیوں سے جکڑا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا ایک سمندر موجزن تھا۔ آنکھوں کے سوا وہ جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا کیونکہ اسے بہت سختی سے باندھا گیا تھا۔ چبوترے کے پاس ہی دیوار میں ایک چوڑے پھل والی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کا پھل دستے کی طرف سے اوپر کی طرف چوڑا ہوتا چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ آخری سرے پر اس کی چوڑائی کم از کم چھ انچ کے برابر تھی۔ یہ تلوار خون میں لتھڑی ہوئی تھی لیکن اس خون کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس سے پہلے جس بد قسمت انسان کی قربانی دی گئی تھی، یہ اس کا خون تھا۔ گویا قربانی کے بعد تلوار کو جوں کا توں لٹکا دیا گیا تھا، اسے صاف کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

میں سلیم اور کالی مائی کے بت کو دیکھنے میں محو تھا اور ہندو مجھے دیکھ رہے تھے۔ یہاں نہ صرف مرد موجود تھے بلکہ عورتیں بھی موجود تھیں، البتہ نوجوان لڑکیاں نہیں تھیں، بچے بھی نہیں تھے۔ شاید اس لئے کہ کہیں وہ خوفزدہ نہ ہوجائیں یا ان کے منہ سے بات نہ نکل جائے اور مسلمانوں تک نہ پہنچ جائے لیکن بات تو مسلمانوں تک پہنچ چکی تھی اور میں ان کے سامنے موجود تھا۔ مگر بالکل نہتا جبکہ مقابلے میں سوڈیڑھ سو کے قریب مرد تھے، عورتیں الگ رہیں۔

چند لمحوں تک نگاہوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور پھر وہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے خوب ہاتھ پیر چلائے۔ ان کے نرغے میں نہ آنے کی لاکھ کوشش کی اور اس کوشش میں ان میں سے کئی کو زخمی بھی کرڈالا مگر ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ رفتہ رفتہ میرے ہاتھ سست پڑتے چلے گئے۔ آخر میرے پیروں میں کھڑے رہنے کی سکت نہ رہی۔ میں دھڑام سے گرا اور پھر وہ چاروں طرف سے مجھ پر لاتیں اور مکے برسانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ میرے سر منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ بندھی ہوئی آنکھوں سے میں نے پورے ہال پر ایک نظر ڈالی۔ روپا وہاں نہیں تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اندر نہیں آئی تھی۔ وہ کم عمر تھی اور اسے مندر کی تقریب میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس نے چھپ کر اندر ہونے والی کاروائی کا معائنہ ضرور کیا تھا ورنہ وہ مجھے کیوں بلا کر لاتی۔ وہ کم عمر بھی تھی اور ناسمجھ بھی۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ میں تنہا اتنے بہت سے لوگوں کا مقابلہ کس طرح کرسکوں گا۔ گاؤں سے چلتے وقت تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر پہلے ہی معلوم ہوجاتا تو میں پوری مسلمان آبادی کو ساتھ لے کر مندر پر حملہ آور ہوسکتا تھا اور قبلہ والد محترم بھی ساتھ ہوتے۔ پھر ان کی مجال نہیں تھی کہ مجھے باندھ سکتے۔ لیکن اب میں ایک بے بس پرندے کی مانند تھا۔

بھجن ایک بار پھر شروع ہوگیا تھا۔ بھجن کی لے پر تمام مرد اور عورتیں تھرک رہے تھے۔ ان کے انگ انگ پھڑک رہے تھے۔ آنکھوں میں وحشیانہ چمک لہرا

رہی تھی۔ اچانک ہال کی دیوار میں ایک دروازہ کھلا اور سادھو اندر داخل ہوا۔ سادھو کا خیال تو میرے ذہن سے نکل ہی گیا تھا۔ اسے بغلی دروازے سے نکلتے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ تو یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا۔ اس کی ترغیب پر ہی انسانی جانوں کی قربانی شروع کی گئی تھی۔ ورنہ اس کے گاؤں میں آنے سے پہلے تو یہاں مندر تک نہیں تھا اور نہ کوئی مسلمان غائب ہوا تھا۔ اب مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے دو مرتبہ ایک نوجوان لڑکا اور ایک لڑکی بھی غائب ہوچکے تھے۔ ضرور انہیں کالی مائی کی بھینٹ ہی چڑھایا گیا تھا۔ میں خوف اور دہشت کے مارے کپکپا اٹھا۔ گویا تیسرے نوجوان کی قربانی میری آنکھوں کے سامنے دی جائے گی اور میں کچھ بھی نہ کرسکوں گا۔ دفعتہً ہال میں موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔ سادھو کو دیکھ کر وہ سب خاموش ہوگئے تھے۔ سادھو چبوترے کے عین سرے پر آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی اور پھر بولا۔

"یہ کہاں سے آ ٹپکا؟"

"پتہ نہیں مہاراج، یہ یہاں کیسے پہنچ گئے۔" ایک پجاری نے جواب دیا۔ "خیر کوئی بات نہیں، آج ایک کی بجائے دو مسلوں کی قربانی دی جائے گی۔ کالی مائی اس مرتبہ ہم سے بہت زیادہ خوش ہوگی۔ سارا سال ہم نعمتوں سے مالا مال رہیں گے۔ اسے بھی چبوترے پر ڈال دو اور اس کے بعد پروگرام شروع کردوں۔"

اس کے الفاظ ہال میں گونج کر رہ گئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے ستون سے کھول کر دوبارہ رسیوں سے جکڑا گیا اور سلیم کے برابر چبوترے پر لٹا دیا گیا۔ اب میری گردن بھی چبوترے کے ابھار پر رکھی تھی جس کا رخ مندر کی چھت کی طرف تھا۔ مندر کی چھت بھی کالے رنگ کی تھی، دیواریں بھی کالی تھیں اور ان سب مردوں اور عورتوں نے بھی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ بس سلیم اور میرے کپڑے سفید تھے۔ مجھے چبوترے پر لٹانے کے بعد سادھو نے ایک عجیب قسم کا اشارہ کیا۔ اس اشارے کے ساتھ ہی سب لوگ چبوترے کے گرد جمع ہوگئے اور زور زور سے اچھلنے کودنے لگے۔ ایک وحشیانہ اور بے ہنگم رقص تھا۔ رفتہ رفتہ رقص میں تیزی آتی گئی۔ اب ان کے جسموں کا ایک ایک انگ تھرک رہا تھا۔ وہ دائرے کی شکل میں چکر بھی کاٹ رہے تھے اور بے معنی اچھل کود بھی جاری تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کیا مرد کیا عورتیں سب بری طرح ہانپنے لگے۔ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے سازندے یہ دیکھ کر اور بھی جوش میں آگئے۔ سازوں میں بلا کی تیزی آگئی۔ مرد اور عورتیں بھی ان سازوں کا ساتھ دینے کی کوشش کررہے تھے لیکن چونکہ سازوں میں بھی کوئی ترتیب نہیں تھی، اس لئے رقص بھی سوائے اچھل کود کے اور کچھ نہیں تھا۔

پھر وہ بے دم ہو ہو کر گرنے لگے۔ یہ رقص اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ آخری مرد بھی بے دم ہو کر نہیں گر گیا۔ آخری مرد کے گرتے ہی ساز یک لخت تھم گیا۔ مندر میں یوں خاموشی مسلط ہوگئی جیسے کبھی کوئی آواز گونجی ہی نہیں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"اپنے اپنے پیالے تھام لو۔" سادھو نے بلند آواز میں کہا۔ "آج تمہیں دو چند خوراک ملے گی۔"

سب نے خوش ہو کر ایک نعرہ لگایا، کالی ماتا کی جے اور ہال کے ایک کونے کی طرف بڑھ گئے۔ میں اس کونے کا جائزہ نہیں لے سکا تھا شاید اس لئے کہ تاریکی میں تھا۔ میں نے گردن گھما کر انہیں دیکھنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ پیالوں کا مطلب البتہ میں سمجھ گیا تھا۔ یہ سب انسانی خون پینے کی تیاریاں تھیں۔ چبوترے کے ایک طرف بنے ٹب نما گڑھے کا مقصد بھی اب میری سمجھ میں آگیا تھا۔ شہ رگ سے نکلنے کے بعد خون سیدھا اس ٹب کا رخ کرتا اور اس ٹب میں سے یہ پیالے بھر بھر کر پیتے۔ میں لرز کر رہ گیا۔

اوہ خدا ان لوگوں کو گاؤں میں بسنے کی اجازت دے کر بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ یہ سب تو اس قابل تھے کہ انہیں فوراً نہ تیغ کردیا جاتا۔ ان کے گھروں کو آگ لگادی جاتی۔ سادھو نے دیوار کے ساتھ ٹنگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تلوار اتار کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ موت کا لمحہ آ پہنچا تھا۔ سادھو تلوار کے ایک ہی وار سے ہم دونوں کی گردنیں اڑانے والا تھا۔ اس وقت میرے دل سے دعا نکلی۔ ”اللہ ہماری مدد کر۔“

دعا میں تاثیر تھی یا کیا بات تھی بجلی کا ایک کڑاکا ہوا، پورے کا پورا مندر اس طرح ہلا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ وہ سب کے سب لڑکھڑائے سادھو نے بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ اور پھر ان پر گویا سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ مندر کا دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھلا تھا اور میں نے دیکھا۔ قبلہ والد چلے آ رہے تھے، کوئی ان کے راستے میں نہ آ سکا، ان پر وار نہ کر سکا۔ وہ سب بتوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

والد منہ منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے نہایت اطمینان سے ہماری رسیاں کھولیں۔ حالانکہ ان سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر سادھو ہاتھ میں وہ خوفناک تلوار لئے کھڑا تھا مگر شاید اس کے ہاتھوں میں سکت نہیں رہ گئی تھی۔ رسیاں آناً فاناً کھل گئیں۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ والد صاحب مندر کے دروازے کی طرف چل پڑے اور ہم دونوں ان کے پیچھے چلتے ہوئے مندر سے باہر آ گئے۔ مندر سے باہر آ کر ہم نے دیکھا والد صاحب وہاں کہیں بھی نہیں تھے۔ ہم سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ اپنے پیچھے ہم نے چیخوں کی آواز سنی۔ شاید وہ لوگ ہمارا تعاقب کر رہے تھے لیکن اب ہم ان کی پہنچ سے باہر تھے۔ آخر گرتے پڑتے ہم اپنی حدود میں داخل ہو گئے۔ یہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ سب لوگ سوئے پڑے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کالی مائی کے مندر میں کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ میں سلیم کو ساتھ لئے اپنے گھر میں چلا آیا۔ ہمیں حیرت اس پر تھی کہ والد صاحب یکا یک کہاں غائب ہو گئے تھے۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو والد بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا۔ ”خدا کا شکر ہے تم آ گئے۔ مجھے روپا نے آ کر اطلاع دی تھی کہ تم مندر میں پھنس گئے ہو۔“

ہم دونوں یہ سن کر بہت حیران ہوئے۔ ہمارے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”حیران ہونے کی ضرورت نہیں میں گھر سے نہیں نکلا البتہ میں نے اپنی روحانی طاقت سے کام ضرور لیا تھا۔“

ہم دھک سے رہ گئے۔ دوسرے دن صبح سویرے والد صاحب نے سادھو کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ اور اس کے ساتھی گاؤں خالی کر دیں مگر سادھو نے نہایت ڈھٹائی سے کہلا بھیجا کہ وہ گاؤں خالی نہیں کریں گے اور یہ کہ رات وہ مقابلے کے لئے تیار نہیں تھا ورنہ انہیں کامیاب نہ ہونے دیتا۔ اب وہ ہر طرح تیار رہے یہ سن کر والد بڑبڑائے گویا مقابلہ ہو گا۔

سادھو کے پاس کالی قوتیں تھیں اور میرے والد کے قبضے میں نوری قوتیں۔ کالی قوتیں برائی کی اور نوری قوتیں نیکی کی مظہر ہیں، لہٰذا یہ جنگ نیکی اور بدی کی جنگ تھی۔ کالی قوتوں کو عام طور پر حصول شہرت اور دولت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس راستے میں بہت کشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیروکاروں میں دولت مندوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ یہ لوگ مزید دولت حاصل کرنے کی خاطر کالی قوتوں کو اپنے قبضے میں کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

سادھو کالی قوتوں کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس نے ان سے سب سے پہلا کام یہ لیا کہ دریائے میگھنا کا کنارہ توڑ دیا۔ دریائے میگھنا گاؤں سے صرف چار پانچ میل دور ہی تو بہتا تھا بس پھر کیا تھا۔ پورا گاؤں سیلاب کی لپیٹ میں آ گیا، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ہندوؤں کے مکانات اور کالی مائی کا مندر سیلاب سے بالکل محفوظ تھے۔ چند گھنٹوں میں ہی ساری مسلم آبادی اور والد صاحب کی اپنے ہاتھوں تعمیر کی ہوئی مسجد منہدم ہو جاتی۔ میرے والد بھی جلال میں آ گئے۔ فوراً گھر سے باہر نکلے ایک ڈھیلے پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اسے سیلاب کے ریلے میں پھینک دیا۔

ردعمل حیران کن تھا، پانی فوراً سمٹنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بڑی غیر مرئی قوت پانی کو واپس

دریا میں دھکیلے دے رہی ہے۔ گاؤں کے سب لوگوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صرف چند گھنٹوں میں سارا پانی سمٹ کر دریا میں سما گیا۔ دریا کا پانی معمول کے مطابق بہنے لگا اور کنارہ آپ ہی آپ اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔ سادھو کا یہ حملہ پوری طرح ناکام ہو گیا تھا۔

اس پر وہ اور بھی سیخ پا ہو گیا۔ ایک ہی دن میں اسے دو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جب لوگوں نے دریا کو دیکھا تو اس کا سارے کا سارا پانی زمین میں جذب ہو گیا تھا اور اب پانی کے دریا کی جگہ ایک ریت کا دریا نظروں کے سامنے تھا، گویا سادھو دوبارہ سیلاب لانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اگر میرے والد صاحب پانی کو دریا میں رہنے دیتے تو سادھو دوبارہ دریائے میگھنا کے کنارے کو توڑنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

یہ اس کی شکست فاش تھی۔ طبقات الارض کے ماہرین اس موقعے پر یہ توضیح پیش کر سکتے ہیں کہ بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں جن میں پانی جذب کر لینے کی استعداد ہوتی ہے۔ یہ درست سہی لیکن اس معاملے میں حقیقت یہ نہیں تھی کیونکہ حالات معمول پر آنے کے بعد انہوں نے پھر سے دریائے میگھنا کو جاری کر دیا تھا۔

سادھو اب باقاعدہ مقابلے پر اتر آیا۔ اس نے اپنی تمام تر کالی قوتوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی مسلمان سیلاب سے بال بال بچے تھے کہ ایک ہولناک قسم کا زلزلہ شروع ہو گیا۔ زمین ہچکولے کھانے لگی مکان ڈولنے لگے، کتنے ہی لوگ کھڑے کھڑے زمین پر گر گئے۔ کئی مکانوں میں دڑاڑیں پڑ گئیں، مٹی نیچے گرنے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ چشم زدن میں تمام مکانات منہدم ہو جائیں گے اور لوگ ان کے نیچے دب جائیں گے۔ ایک کہرام سا مچ گیا۔ کوئی ادھر بھاگا جا رہا تھا تو کوئی ادھر ہر کوئی خوفزدہ تھا۔ والد باہر نکلے انہوں نے ایک مکان کی دیوار تھام کر قرآن شریف کی کوئی آیت پڑھی اور زلزلہ ایک دم رک گیا۔ یہاں تک کہ جن مکانات میں دراڑیں پڑ گئی تھیں، وہ دڑاڑیں بھی غائب ہو گئیں۔

سادھو دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، جان گیا کہ اس کا یہ حربہ بھی ناکام رہا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بدشکل اور ٹیڑھے میڑھے عصا کو ہوا میں لہرایا۔ فوراً ہی اس میں سے ہزاروں سانپ جھڑے، اس نے عصا کا رخ مسلمانوں کے گھروں کی طرف کر دیا۔ تمام سانپ پھن اٹھائے تیزی سے اس طرف بڑھے۔ والد زلزلہ رکنے کے بعد اپنے حجرے میں چلے گئے تھے۔ لوگوں نے فوراً انہیں اطلاع دی کہ ہزاروں سانپ ہمارے گھروں کا رخ کر رہے ہیں۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک رسی کا ٹکڑا لوگوں کو دیا اور اسے سانپوں کی طرف اچھالنے کا حکم دیا۔ لوگ فوراً باہر آئے اور رسی کا ٹکڑا ہوا میں اچھال دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

رسی فضا میں ایک مہیب اژدہے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اژدہا ہوا میں تیرتا ہوا ان سانپوں پر گرا اور پھر ان میں ایک زبردست جنگ شروع ہو گئی۔ تمام سانپوں نے اژدہے کو گھیر لیا تھا اور اپنے پھنوں سے اس پر وار کر رہے تھے لیکن اژدہے پر ان کے زہر کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اژدہا انہیں اس تیزی سے نگل رہا تھا جیسے کوئی وہیل مچھلی چھوٹی بڑی مچھلیوں کو سانس کے زور سے کھینچ لیتی ہے۔ لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے تمام سانپ اژدہے کے پیٹ میں اتر گئے۔ اژدہا واپس ہوا اور سیدھا والد محترم کے حجرے میں گھس گیا۔ لوگ اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا، وہاں رسی کا وہی ٹکڑا پڑا تھا۔

اس پر بھی سادھو باز نہ آیا۔ آخر میرے والد صاحب تنگ آ گئے انہوں نے اس جھگڑے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ چالیس دن تک چلہ کھینچتے رہے اور چلے کے زور سے کالی مائی کے مندر کے گرد ایک حصار کھینچ دیا۔ اس سلسلے میں انہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اپنے پیرو مرشد سے بھی مدد لی۔ وہ بنفس نفیس تشریف لائے۔ انہوں نے بھی مندر کے گرد سات چکر لگائے۔ لوگوں نے رات کے وقت انہیں چکر لگاتے ہوئے پائے گئے وہ سلہٹ میں موجود تھے۔ بہر حال انہوں نے حصار کی مضبوطی کے لئے اپنے شاگرد کی مدد ضرور فرمائی تھی۔ چکر لگانے کے بعد وہ غائب ہو گئے تھے۔ دوسرے دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ گاؤں اور مندر کا فاصلہ غیر محسوس طور پر بڑھنے لگا۔ مندر پہلے گاؤں کے آخری سرے پر تھا، اب یہ ایک میل دور چلا گیا۔ نالہ پہلے بالکل سیدھا تھا اب یہ مندر کے چاروں طرف گھوم گیا۔ یہیں سے اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ حصار کھنچ جانے کے بعد کوئی ہندو مندر تک نہ پہنچ سکا۔ ہندو اپنے سادھو کو لے کر سارا سارا دن مندر کی طرف چلتے رہے لیکن کہیں نہ کہیں انہیں ٹھوکر ضرور لگتی۔ وہ گر پڑتے اور واپس نالے کے دوسری طرف پہنچ جاتے۔

سادھو نے اس حصار کو توڑنے کے لئے اپنی تمام کالی قوتیں آزما ڈالیں لیکن اس حصار کو توڑ کر مندر تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ انہوں نے مل کر نالے کو پار کیا اور حصار میں پھنس کر رہ گئے۔ اب ان کے لئے باہر نکلنے کا راستہ بھی نہ رہا تھا۔ یہ کام بھی والد صاحب نے کیا تھا کیونکہ وہ سب خونی تھے۔ انہوں نے بے گناہ انسانوں کو کالی مائی کی بھینٹ چڑھایا تھا اس لئے انہیں سزا ملنا ضروری تھا۔ وہ کئی دن تک حصار کے گرد چلتے رہے بھوکے پیاسے گرتے پڑتے مندر تک پہنچنے یا نالے سے اس طرف آنے کی کوشش کرتے رہے پھر بھوک اور پیاس کی حالت میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ والد صاحب نے مٹی کی ایک مٹھی بھر کر حصار کے دوسری طرف پھینک دی۔ دوسری طرف بگولے سے اٹھنے لگے۔ بالکل ایسے جیسے صحرا میں چلتے ہیں اور پھر آناً فاناً ان بگولوں نے سادھو اور اس کے چیلوں کاروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ فنا ہو گئے۔

صرف چند گھر ہندوؤں کے باقی بچ گئے تھے جن میں ہندو موجود تھے، وہ سادھو کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ ان میں روپا اور اس کے ماں باپ بھی تھے۔ دوسرے دن روپا اپنے ماں باپ اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ والد صاحب کے پاس آئی اور اسلام لانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے یہ جان کر بے پناہ مسرت ہوئی کہ روپا اور اس کا خاندان مشرف بہ اسلام ہو گئے ہیں۔

میرے دل میں روپا کی محبت چٹکیاں لینے لگیں۔ اب اس کا اور میرا ملاپ ممکن ہو گیا تھا۔ روپا کا اسلامی نام صائمہ رکھا گیا تھا۔

ایک دن والد نے مجھے اپنے حجرے میں بلایا اور کہنے لگے۔ ”مجھے معلوم ہے تم صائمہ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ جاؤ یہ شادی ضرور ہو گی۔“ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ خود روپا کے والدین نے دو ایک آدمیوں کے ذریعے اس خواہش کا اظہار کیا اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔

آج اس واقعے کو چالیس سال گزر چکے ہیں۔ مندر کا حصار جوں کا توں موجود ہے، حالانکہ والد صاحب آج اس دنیا کے رنگ و بو میں موجود نہیں، وہ عالم بالا میں پہنچ چکے ہیں لیکن مندر تک پہنچنا اب بھی ممکن نہیں۔ نہ جانے اس وقت تک کتنے لوگ اس واقعے کو سن کر مندر تک پہنچنے کی کوشش کر چکے ہیں اور تھک ہار چکے ہیں یہاں تک کہ ایک انگریز ڈپٹی کلکٹر بھی اس گاؤں میں آیا۔ اس نے مندر کو اندر سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ مندر تک نہیں جا سکتا۔ وہ نہ مانا اور اپنی سی کر کے دیکھ لی۔ اس نے اپنی ناکامی کی داستان نہایت دلچسپ پیرائے میں ”کلکتہ گزٹ“ میں چھپوائی تھی۔ کلکتہ گزٹ کا وہ شمارہ میں نے بھی خریدا تھا۔ وہ آج تک ہماری لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے کوشش کی۔ آج تک سب حیرت زدہ ہیں اور کوئی اس راز کو حل نہیں کر سکا کہ وہ کونسی طاقت ہے جو لوگوں کو مندر تک نہیں پہنچنے دیتی اور انہیں اٹھا کر واپس پٹخ دیتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تاویلیں ضرور پیش کی گئیں لیکن کوئی بھی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ شاید آئندہ آنے والی

نسلوں میں سے کوئی اس راز کو جان سکے۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی یہ کہانی ختم ہو گئی تھی۔ ڈائری کی باقی صفحات خالی تھے۔ کہانی ختم ہوئی تو میں جیسے ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ڈائری پڑھتے وقت مجھ پر یہی احساس چھایا رہا تھا جیسے کہانی خود مجھ پر گزر رہی ہے جیسے میں خود ہی قربان گاہ کے چبوترے پر لیٹا تھا۔ اب ہوش میں آیا تو شاہد کا خیال آیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو شاہد کرسی پر بیٹھا نظر آیا، اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

”کیوں دوست..... کہانی پڑھ لی، اب کیا خیال ہے۔ کیا اب بھی تم مندر تک جانے پر بضد ہو؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، اس وقت تو نہیں البتہ میں چند روز بعد پھر گاؤں آؤں گا اور یہ کوشش کم از کم ایک بار اور کروں گا۔“

”کیا مطلب؟“ شاہد بری طرح چونکا۔ شاید اسے ایسے الفاظ سننے کی خواب میں بھی توقع نہیں تھی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اب میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں گا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ میں ارادے سے باز ضرور آ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ”سنو دوست شہر میں میرا ایک دوست ہے اس کے والد ملک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں میں انہیں جا کر یہ ساری کہانی سناؤں گا۔ اگر انہوں نے زحمت گوارا کی اور یہاں تک آنا منظور کیا تو میں ان کے ساتھ ایک بار پھر نالے کو پار کروں گا۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔“

شاہد ہنس پڑا اور اس نے مجھے ایسا کرنے کی بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ پھر بولا۔ ”تم یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ اس کہانی کے سلسلے میں صرف ایک بات اور رہ گئی ہے۔ مگر میں وہ بات تمہیں اس کوشش کے بعد ہی بتاؤں گا۔“

گاؤں کی سیر کو ملتوی کر کے میں شہر پہنچا۔ پہلے اپنے دوست سے ملا اور پھر اسے ساتھ لے کر اس کے والد کے سامنے پیش ہوا۔ وہ بہت بوڑھے تھے۔ ان کا نام پروفیسر جمال تھا۔ میں نے انہیں ساری کہانی تفصیل سے سنائی۔ تو وہ سوچ میں ڈوب گئے پھر بولے۔

”یہ سب ناممکن نہیں، ہپناٹزم ہمارے سامنے کی چیز ہے، اس قسم کی کچھ اور پر اسرار قوتیں بھی ہیں جو انسان مسلسل کوشش کے بعد خود میں پیدا کر لیتے ہیں۔ معراج شریف کا واقعہ ہم سب کو معلوم ہے۔ آنحضورؐ کے زمانے میں بھی جادوگر تھے، وہ بھی غالباً ہپناٹزم سے کام لیتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے دور میں بھی جادوگروں نے رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کر دیا تھا اور حضرت موسیٰؑ کے عصا نے اژدہے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی یقیناً ہپناٹزم کی کسی ترقی یافتہ شکل کا ہی مظاہرہ تھا۔ جہاں تک اس حصار کا تعلق ہے میں حتمی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ اولیاء کرام کی کرامات سے کتابیں بھری پڑی ہیں، ان کا منکر نہیں۔ اگر تم ضرور ہی چاہتے ہو تو میں تمہارے ساتھ گاؤں تک چلوں گا اور اپنے ساتھ چند آلات بھی لے چلوں گا تاکہ ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو اٹھا کر نالے کے دوسری طرف پٹخ دیتی ہے۔“ میں بہت خوش ہوا کہ وہ تیار ہو گئے۔

دوسرے دن ہم گاؤں پہنچ گئے۔ شاہد کو اطلاع نہیں دے سکا تھا، اس لئے وہ اسٹیشن پر موجود نہیں تھا۔ ہم ٹانگے پر بیٹھ کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ کچھ دیر ستانے کے بعد آخر تینوں نالے کے پاس پہنچے، چھلانگ لگا کر ہم نے نالہ پار کیا۔ پروفیسر جمال نے اپنے آلات کندھے لٹکا رکھے تھے اور دو ایک چیزیں ان کے ہاتھوں میں بھی تھیں۔ ہم نہایت احتیاط سے قدم اٹھانے لگے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ پروفیسر کی نظریں بدستور آلات پر تھیں۔ ان کے چہرے پر اچانک حیرت کی لکیریں ابھریں ساتھ ہی تینوں نے ٹھوکر کھائی اور ہم نالے کے دوسری طرف پڑے تھے۔

”اوہ خدا..... اس مندر کے چاروں طرف مقناطیسی قسم کی لہریں موجود ہیں، یہ لہریں ہی ہمیں اٹھا کر پھینکتی ہیں۔“ ان کے منہ سے نکلا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیکن اس سے پہلے ہم گرتے کیوں ہیں؟"

"ہم یہی محسوس کرتے ہیں، جیسے ٹھوکر لگی ہے لیکن دراصل ہوتا یہ ہے کہ مقناطیس ہمیں ایک زبردست جھٹکے سے اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔" انہوں نے کہا تو میں نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا اور شاہد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہم نے ایک ایسا حیران کن منظر دیکھا کہ ہمارے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ میرا اور پروفیسر جمال کا وہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

مندر کی طرف سے ایک عورت چلی آرہی تھی، اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نالے تک پہنچ گئی۔ پھر ایک چھلانگ اسے نالے کے اس طرف لے آئی۔ ہم نے دیکھا وہ گاؤں کی طرف چلی جارہی تھی۔

"یہ ..... یہ کون ہے؟" میرے منہ سے بوکھلاہٹ کے عالم میں نکلا۔ "یہ واحد ہستی ہے جو اس حصار کے دوسری طرف مندر تک جاسکتی ہے۔"

"آؤ، اس کے پیچھے چلتے ہیں۔" شاہد نے مسکرا کر کہا۔

ہم اس کے پیچھے چل پڑے۔ اور پھر میں دھک سے رہ گیا۔ وہ شاہد کے گھر میں داخل ہورہی تھی۔ اسی وقت میں نے اپنے دوست کو کہتے سنا۔

"یہ میری بہن شائلہ ہے۔ جب آپ لوگ ستارہے تھے تو میں نے اسے مندر کی طرف بھیج دیا تھا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ یہ ابھی چھوٹی ہی تھی اور اسے حصار کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک دن کھیلتے کھیلتے نالے تک پہنچ گئی۔ مجھے آج بھی حیرت ہے کہ تین چار فٹ چوڑے نالے کو اس نے کیسے پار کرلیا تھا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا نالے کے پاس پہنچا تو یہ مندر کی طرف سے واپس آرہی تھی۔ اور اس دن مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ دنیا میں ایک ہستی ایسی بھی موجود ہے جو مندر تک جاسکتی ہے۔"

"تو ..... تو کیا وہ مندر کے اندر بھی جاسکتی ہے؟"

"نہیں ..... اس کا کہنا ہے کہ مندر کا دروازہ بالکل بند ہے اور اس کے کھولنے پر بھی نہیں کھلا۔"

میں نے پروفیسر جمال کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیسی لہروں والا خیال بھی غلط ہے ورنہ لہروں نے آپ کی بہن کو کیسے گزر جانے دیا۔ میری عقل اس بات کا کوئی جواب دینے سے عاجز ہے۔ ویسے کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ اس لڑکی کا مندر سے کیا تعلق ہے؟"

"جی ہاں۔ ہم اس ماں کی اولاد میں سے ہیں جس نے قربانی کی رات دو بے گناہ انسانوں کو بھینٹ چڑھنے سے بچالیا تھا۔"

اور میں سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس اسرار سے قیامت تک کوئی پردہ نہیں اٹھا سکتا تھا کہ وہ کونسی طاقت ہے جو لوگوں کو مندر تک نہیں پہنچنے دیتی، اور جو شائلہ کا راستہ نہیں روکتی۔

دوسرے دن ہم نے واپسی کی ٹھانی دروازے میں سے نکلتے وقت میں نے شاہد سے کہا۔

"میں نے اس مندر کو فتح کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح چونکا۔

"مطلب تم بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔ چند دنوں تک میں اپنی والدہ کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔"

یہ کہہ کر میں پروفیسر صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا..... شاہد علی شاید میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر میں نے ایک خوشگوار تاثر ابھرتے دیکھا۔

اور پھر اس وقت تانگہ چل پڑا۔

ٹھک ٹھک

ذیشان اقبال عظمی۔ کراچی

رات کے وقت اندھیرے کمرے میں ایک روح کی بے چینی قابل دید تھی۔ اس مکان میں رہائشی شخص نے اس روح کے لئے قرآن خوانی کرائی اور پھر فاتحہ دلوانے کے بعد اس روح کی بے چینی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہوگئی۔

دنیا میں انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اپنے لئے کرتا ہے، اس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

"یہ مکان دوسو چالیس گز پر بنا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر پرانے وقتوں کی ہے اس لئے بنیاد اور دیوار چھتیں وغیرہ بے حد مضبوط اور پائیدار ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی اضافی تعمیر اور رنگ وروغن وغیرہ کروایا گیا ہے۔ آپ کو یہ مکان یقیناً پسند آئے گا۔" پراپرٹی ایلر نے مکان کا تالہ کھولتے ہوئے کہا۔ پورے راستے وہ ہمیں اس مکان کی خوبیاں گنواتا چلا آرہا تھا۔ میں اور ثمین بیزاری سے اس کی بک بک سن رہے تھے۔ ہمیں مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے تقریباً دو مہینے گزر چکے تھے اور اس دوران بھانت بھانت کے اسٹیٹ ایجنٹ ہم سے ٹکرائے تھے۔ ہر مکان دکھانے سے پہلے یہ لوگ اس طرح مکان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے لیکن بعد میں جب مکان دیکھنے کو ملتا تو اس میں کئی ڈھکے چھپے عیب موجود ہوتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۔اگر کوئی اچھا مکان واقعی مل جاتا تو اس کی قیمت آسمان سے باتیں کررہی ہوتی۔ مسقط میں اپنی جوانی کے دس بہترین سال شب و روز محنت کرنے کے بعد میں نے جتنا کچھ پس انداز کیا تھا، میرے حساب سے وہ ایک اچھا مکان خریدنے کیلئے کافی تھا۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد جب میں نے مکان کی تلاش شروع کی تو ایسا لگا جیسے اگر میں مزید بیس سال بھی پیسے جمع کرتا تو وہ بھی شاید ایک اچھا مکان خریدنے کے لئے ناکافی ہوتے۔

''ہر بیڈ روم کے ساتھ اٹیچڈ باتھ کی سہولت موجود ہے۔ ہر کمرہ روشن اور ہوادار ہے۔ کچن گو پرانی طرز کا ہے لیکن کیبنٹ اور ایگزاسٹ فین وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔'' پراپرٹی ڈیلر ہمیں مختلف کمرے دکھاتا ہوا مکان کی پچھلی سمت لے آیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا احاطہ موجود تھا جس کے کونے پر ایک چھوٹا سا کمرہ اور باتھ روم بنا ہوا تھا۔ ''اس جگہ کو آپ کپڑے دھونے سکھانے اور دیگر مقاصد کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔'' اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''یہ کمرہ یہاں کیوں بنا ہوا ہے؟ ایسا لگتا ہے جیسے ابھی کچھ عرصہ پہلے الگ سے بنوایا گیا ہو۔'' ثمین نے احاطے کے کونے میں بنے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی۔جی۔ یہ کمرہ دراصل..... پہلے نہیں بنا تھا۔ مالک مکان نے ابھی پچھلے سال ہی تعمیر کروایا ہے۔'' پراپرٹی ڈیلر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اسے اسٹور روم کے طور پر بھی استعمال کرسکتے ہیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا تو بے اختیار ایک ناگوار سی بو کا بھپکا ہماری ناک سے ٹکرایا۔ ہم نے کراہیت سے اپنی اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

''وہ..... اصل میں کمرہ کافی دن سے بند تھا۔ اس لئے..... صفائی کے بعد یہ کمرہ بہترین ہوجائے گا۔'' پراپرٹی ڈیلر نے کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے کمرے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیواروں پر پلستر موجود نہیں تھا۔ کمرے میں روشنی اور ہوا کے لئے صرف ایک چھوٹا سا روشندان موجود تھا جو یقیناً ناکافی تھا۔

''یہ اسٹور روم تو نہیں لگتا، برابر میں باتھ روم بھی نیا لگتا ہے، یہ تو شاید سرونٹ کوارٹر ہوسکتا ہے۔'' میں نے غور سے باتھ روم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جو بھی ہے جی۔ یہ تو آپ کی مرضی پر ہے کہ اسے کیسے استعمال کرتے ہیں۔ آیئے میں آپ کو باقی مکان دکھادوں۔'' پراپرٹی ڈیلر نے اس بار اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ شاید وہ ہماری جرح سے تنگ آگیا تھا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مکان واقعی بہت اچھا تھا لیکن میں اور ثمین مکان کا جائزہ لینے کے دوران دبے دبے الفاظ میں اس خدشے کا اظہار کرچکے تھے کہ مکان کے رقبے اور تعمیر کے حساب سے اس کی قیمت ہماری پہنچ سے باہر ہوگی۔ مکان دکھانے کے بعد پراپرٹی ڈیلر ہمیں واپس اپنے آفس لے آیا۔ ہم نے راستے میں اس سے قیمت پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹال گیا۔

''دیکھئے۔ ایک بات میں آپ کو صاف صاف بتادوں یہ مکان ہمیں پسند تو ہے لیکن ہمیں نہیں لگتا کہ یہ ہمارے بجٹ کے مطابق ہوگا۔ اس لئے آپ ہمیں کوئی دوسرا مکان دکھادیں۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی صاف الفاظ میں کہا۔

''یہی تو خاص بات ہے جناب! اس کی قیمت آپ کے بجٹ کے عین مطابق ہوگی اور ویسے بھی اچھی چیز کے لئے بندہ انیس بیس کر ہی لیتا ہے۔'' پراپرٹی ڈیلر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ یہ ان اسٹیٹ ڈیلرز کے پرانے حربے تھے جن سے میں پچھلے کچھ عرصے میں کافی حد تک واقف ہوچکا تھا۔ لیکن اس نے جو قیمت بتائی وہ واقعی حیرت انگیز طور پر اس مکان کے لحاظ سے کم تھی۔

لیکن پھر بھی یہ قیمت ہماری پہنچ سے کچھ باہر تھی۔ ہم پراپرٹی ڈیلر کا شکریہ ادا کرکے باہر نکل آئے۔ اس کے بعد ہم نے مزید ایک مہینہ مکان کی چھان پھٹک میں گزارا۔ لیکن جو مکان ہمیں پسند آتے وہ بہت مہنگے ہوتے اور جو مکان سستے ملتے وہ کسی نہ کسی طور سے ہمیں پسند نہ آتے۔ ثمین کے ذہن میں تو وہی مکان بس گیا تھا جسے ہم زیادہ قیمت کی وجہ سے چھوڑ آئے تھے۔ جب بھی کوئی مکان دیکھتی تو کہتی ''اس سے بہتر تو پھر وہی مکان تھا۔ اس مکان کے کمرے زیادہ بڑے تھے۔ قیمت کا صرف اتنا ہی فرق ہے تو پھر وہی مکان کیوں نہ لے لیں؟'' وغیرہ وغیرہ۔

بالآخر ہم نے متفقہ طور پر وہی مکان خریدنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے ثمین کو اپنے زیورات اور مجھے اپنی گاڑی بیچنی پڑی۔ ہم نے اسٹیٹ ایجنٹ کی بھی منت سماجت کرکے قیمت میں کچھ کمی بیشی کروائی حالانکہ وہ اڑا ہوا تھا کہ یہ قیمت پہلے ہی بہت کم ہے۔ بہرحال اس وقت ہمارے ذہن پر اپنی چھت اور چار دیواری کی خواہش چھائی ہوئی تھی اس لئے ہم نے جوڑ توڑ کرکے وہ مکان خرید لیا۔ مالک مکان صرف کچھ دیر کیلئے آیا اور خاموشی سے دستاویزات وغیرہ پر دستخط کرکے چلا گیا۔ بعد میں پراپرٹی ڈیلر نے بتایا کہ ''مالک مکان ایک فضائی کمپنی میں ملازم ہے اور مستقل طور پر بیرون ملک شفٹ ہورہا ہے۔''

ضروری قانونی چارہ جوئی کے بعد ہم اگلے ہفتے مکان میں شفٹ ہوگئے۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بالآخر ہمیں اپنا گھر مل گیا تھا۔ بچے بھی بے حد خوش تھے۔ فی الحال ہم نے ایک کمرے کا فرنیچر سیٹ کرکے اسے قابل استعمال بنالیا تھا۔ رات کو ہم سونے کیلئے لیٹے تو دیر تک گھر کی سجاوٹ اور تزئین و آرائش کے منصوبوں پر باتیں کرتے رہے۔

اچانک کہیں دور سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ یہ کوئی قریب ایک بجے کا وقت تھا۔ سردیوں کے دن تھے اس لئے ماحول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اور ثمین دونوں ہی باتیں کرتے کرتے رک گئے۔ ''یہ کیسی آواز تھی؟'' ثمین نے دھیمی آواز میں کہا۔

''شاید کوئی بلی وغیرہ ہوگی۔'' میں نے ایک لمحہ کیلئے سوچا پھر بے پرواہی سے کہا۔ ثمین نے بھی اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کے بعد ہم نے زیادہ دیر تک بات نہیں کی اور سونے کیلئے لیٹ گئے۔ اگلے روز رات کو پھر کہیں سے ''ٹھک ٹھک'' کی آواز آئی۔ ہم اس وقت سونے کیلئے لیٹ چکے تھے۔ پہلے تو آواز سن کر میں نے سنی ان سنی کردی لیکن کچھ دیر بعد دوبارہ ''ٹھک ٹھک'' کی آواز آئی۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی ہتھوڑی ٹھونک رہا ہو۔ میں نے ناگواری سے آنکھیں کھولیں اور ٹیبل کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

''پتہ نہیں رات کے اس وقت کس کو ٹھونکا پیٹی کی سوجھی ہے۔'' میں نے کروٹ بدل کر بڑبڑاتے ہوئے کہا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بعد تو یہ جیسے روز کا معمول بن گیا۔ روزانہ رات کو ایک ڈیڑھ بجے ''ٹھک ٹھک'' کی آوازیں وقفے وقفے سے آنا شروع ہوجاتیں اور بعض اوقات پوری رات جاری رہتی۔ ہم بھی اس بلاوجہ کی ٹھک ٹھک سے عاجز آچکے تھے۔ رات بھر سوتے جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے صبح کام پر جانے میں مشکل ہوتی، ثمین کے سر میں مستقل درد رہنے لگا اور بچے صبح

دعا

آؤ ایک دعا کریں لمبی دعا کہ جس کے مانگتے
مانگتے ہماری زندگیاں بیت جائیں کیونکہ ہم کبھی
ایک نہیں ہوسکتے ایک دوسرے کے ساتھی نہیں بن
سکتے لیکن شاید ہم دعاؤں میں ایک ہوجائیں۔

(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسکول جاتے وقت رونا دھونا مچاتے۔ دو تین بار میں نے رات کو گھر سے باہر نکل کر ادھر ادھر کا جائزہ بھی لیا لیکن آس پڑوس میں نہ تو کوئی گھر زیر تعمیر تھا، نہ ہی کسی گھر میں روشنی کے آثار نظر آتے جو میں سمجھتا کہ یہاں کوئی اٹھا پٹخ کر رہا ہو۔ رات کو ٹھک ٹھک کی یہ آواز پہلے وقفے وقفے سے آتی، پھر آہستہ آہستہ آواز تیز اور مسلسل آنے لگتی۔ یوں لگتا جیسے کوئی جان بوجھ کر زور زور سے ٹھک ٹھک کر رہا ہو۔ ایک دن چھٹی والے روز میں نے صبح اٹھ کر دو تین پڑوسیوں سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کچھ روز بعد جب میں شام کو گھر واپس آ رہا تھا تو میں نے گھر کے باہر ایک بڑے میاں کو کھڑے پایا۔ وہ بڑے اطمینان سے سر اٹھائے گھر کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم!" میں نے قریب جا کر سلام کیا تو وہ اچانک چونک گئے۔

"وعلیکم السلام!" بیٹا کیا! اب تم یہاں رہتے ہو؟" انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ مکان پچھلے دنوں میں نے ہی خریدا ہے، لیکن خیریت تو ہے؟ آپ یہاں کسی کام سے آئے تھے؟" میں نے پوچھا تو بڑے میاں کے چہرے پر بے اختیار اداسی چھا گئی۔

"نہیں بیٹا! کام تو خیر کوئی نہیں تھا۔ یہاں ایک پرانا دوست رہتا تھا۔ اس کی یاد آئی تو بس گھر دیکھنے چلا آیا۔" انہوں نے اداس لہجے میں کہا۔

"آپ عقیل صاحب کی بات کر رہے ہیں ناں؟ وہ تو سنا ہے بیرون ملک چلے گئے۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں۔ عقیل تو بچہ ہے اپنا۔ ہمارے سامنے کھیل کود کر بڑا ہوا۔ میں تو اس کے باپ ایاز انصاری کی بات کر رہا ہوں۔ ابھی کچھ مہینے تو ہوئے ہیں اس کے انتقال کو۔" بڑے میاں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو میں بھی ایک لمحہ کیلئے خاموش سا ہو گیا۔

"مجھے اس بارے میں معلوم نہیں تھا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"اس کے مرنے کے بعد تو عقیل نے یہ مکان بیچا ہے۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اپنے والد ایاز سے اس مکان کو بیچنے کیلئے کہہ رہا تھا لیکن ایاز کہتا تھا کہ ساری جوانی اس گھر میں گذاری۔ دکھ سکھ دیکھے۔ اپنی مرحومہ بیوی کی یادیں یہاں موجود ہیں، اس گھر کو جیتے جی نہیں بیچوں گا۔ مگر آج کل کی اولاد کے نزدیک یہ فضول باتیں ہیں۔" بڑے میاں گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر خاموشی سے ان کی باتیں سننے لگا۔ "عقیل آئے دن اپنے گھر والوں سے گھر بیچنے کیلئے جھگڑتا تھا، وہ برا لڑکا نہیں تھا مگر شادی کے بعد اس میں بہت تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ اس کی بیوی بھی تیز مزاج کی تھی۔ اس کے بہکاوے میں آ کر عقیل اپنے باپ سے بدتمیزی کرتا تھا۔ اپنے آخری دنوں میں ایاز میرے بے حد قریب رہا۔ پھر اس کی بہو نے اس پر بھی چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا کہ کیسے دوست پال رکھے ہیں، گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمیں بھی کام کاج کرنے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر میں نے بھی دل پر پتھر رکھ کر آنا جانا کم کر دیا۔" بڑے میاں بتا رہے تھے اور میں حیرت اور افسوس سے سن رہا تھا۔

"لیکن عقیل کے والد کو بیماری کیا تھی؟" بڑے میاں سانس لینے کو رکے تو میں نے سوال کیا۔

"بیوی کی موت اور بیٹے بہو کے رویے نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ پھر بالآخر اسے پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا۔ وہ بڑی ہمت اور برداشت والا انسان تھا۔ بیماری کے دوران بھی اپنے سارے کام کاج خود کرتا تھا۔ لیکن پھر ایک بار باتھ روم میں پھسل کر گر پڑا تو گردن اور ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آ گئی جس کی وجہ سے وہ چلنے سے قاصر ہو گیا۔ بجائے اس کی خدمت کرنے کے عقیل نے ایک بڑا ہی بے حس قدم اٹھایا۔ گھر کے پچھلے صحن میں ایک کوٹھری بنوائی اور ایاز کو اس میں لے جا کر ڈال دیا۔" بڑے

میاں نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا تو میں چونک پڑا۔

"تو اس کمرے کا یہ مقصد تھا۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"وہ کوٹھری جس میں روشنی ہوا کا کوئی گذر نہیں تھا، وہاں عقیل نے اپنے باپ کو فرش پر لا کر پھینک دیا۔ وہ دن رات ایک پتلے سے گدے پر پڑا کھانستا رہتا اور اپنی ضروریات کیلئے اپنی بہو یا بیٹے کا انتظار کرتا رہتا۔ جب میں نے پہلی بار اسے وہاں دیکھا تو میں بہت غمزدہ ہوا۔ عقیل سے کہا بھی کہ یہ اپنے باپ کو کہاں لا کر ڈال دیا؟ جواب میں اس نے رکھائی سے کہا کہ "ابا رات بھر کھانستے رہتے ہیں جس سے بچوں کی نیند خراب ہوتی ہے اور صبح اسکول جاتے وقت روتے ہیں۔

لیکن آفرین ہے ایاز پر کہ اس نے ایسی حالت میں بھی کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا۔ آخری بار جب میں اس سے ملنے گیا تو اس کی حالت ابتر تھی۔ اس کا گدا غلاظت سے بھرا ہوا تھا اور کپڑے میلے کچیلے ہو رہے تھے۔ اس کے برابر میں ایک ایک پلاسٹک کا مگ اور پلاسٹک کی پلیٹ پڑی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ اب اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ کسی کو بلانے کیلئے وہ پلاسٹک کا مگ زور زور سے فرش پر مارتا ہے۔ تب گھنٹوں بعد کوئی آتا ہے۔

بعض اوقات وہ رات رات بھر درد اور تکلیف سے مگ فرش پر مارتا رہتا ہے لیکن پوری رات کوئی نہیں آتا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ میرے گھر چلو لیکن اس نے اشارے سے کہا کہ اس گھر میں زندگی گزاری ہے، اس گھر میں مروں گا۔" اتنا کہہ کر بڑے میاں کا سانس پھول گیا اور وہ آنکھوں میں آنے والے آنسو پونچھنے لگے۔ میں سکتے میں بیٹھا ان کی یہ داستان سن رہا تھا۔

اس پر اسرار "ٹھک ٹھک" کی آواز کا راز اب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ یہ آواز بلاشبہ اس کمرے سے آتی تھی جہاں عقیل کے والد پڑے رہتے تھے۔ مرنے کے بعد بھی ان کی روح کو سکون نہیں ملا تھا۔ ملتا بھی کیسے۔

جب اپنی اولاد ہی والدین کو مرنے کیلئے تنہا چھوڑ دے اور بوڑھا بیمار باپ اولاد کو بلاتے بلاتے مر جائے تو اس کی روح بھلا کس طرح سکون پائے گی۔ دکھ اور افسوس سے میری بھی آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔ میں نے بڑے میاں کو اس آواز کے بارے میں بتایا تو ان کی آنکھوں سے مزید آنسو بہہ نکلے۔

"وہ ضرور اب بھی تکلیف میں ہے، لیکن اب اس کی روح کو کیسے قرار آئے گا۔ بیٹا تو سب کچھ بیچ کر پردیس جا بیٹھا۔" انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔

اگلے روز میں اپنے پرانے محلے کی مسجد گیا جہاں کے مولوی صاحب سے میں نے بچپن میں قرآن شریف پڑھا تھا۔ وہ وظائف اور دم درود میں بھی شغف رکھتے تھے۔ میں نے کھل کر ساری بات انہیں بتائی۔ انہوں نے مجھے کچھ دم کیا ہوا پانی دیا اور ساتھ ہی کچھ ہدایات دیں۔ ان کی ہدایات کے مطابق میں نے جمعہ کے دن اس کمرے کی صفائی کروا کر وہاں مولوی صاحب کا دم کیا ہوا پانی چھڑکا اور بعد نماز جمعہ قرآن خوانی کروائی۔ شام میں جب سب وہاں سے چلے گئے تو میں نے خالی کمرے میں جا کر بلند آواز سے کہا۔

"میں آپ کا دکھ اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں آپ کے بیٹے کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھ سکتے ہیں۔ میری اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ آپ کو صبر و قرار ملے اور اللہ آپ کی قبر کو منور کرے۔" اتنا کہہ کر میں واپس پلٹ آیا۔ بعد ازاں میں نے ایک مدرسے میں ان کے نام سے ایک حافظ قرآن کی تعلیم کیلئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ آواز پھر کبھی نہیں آئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

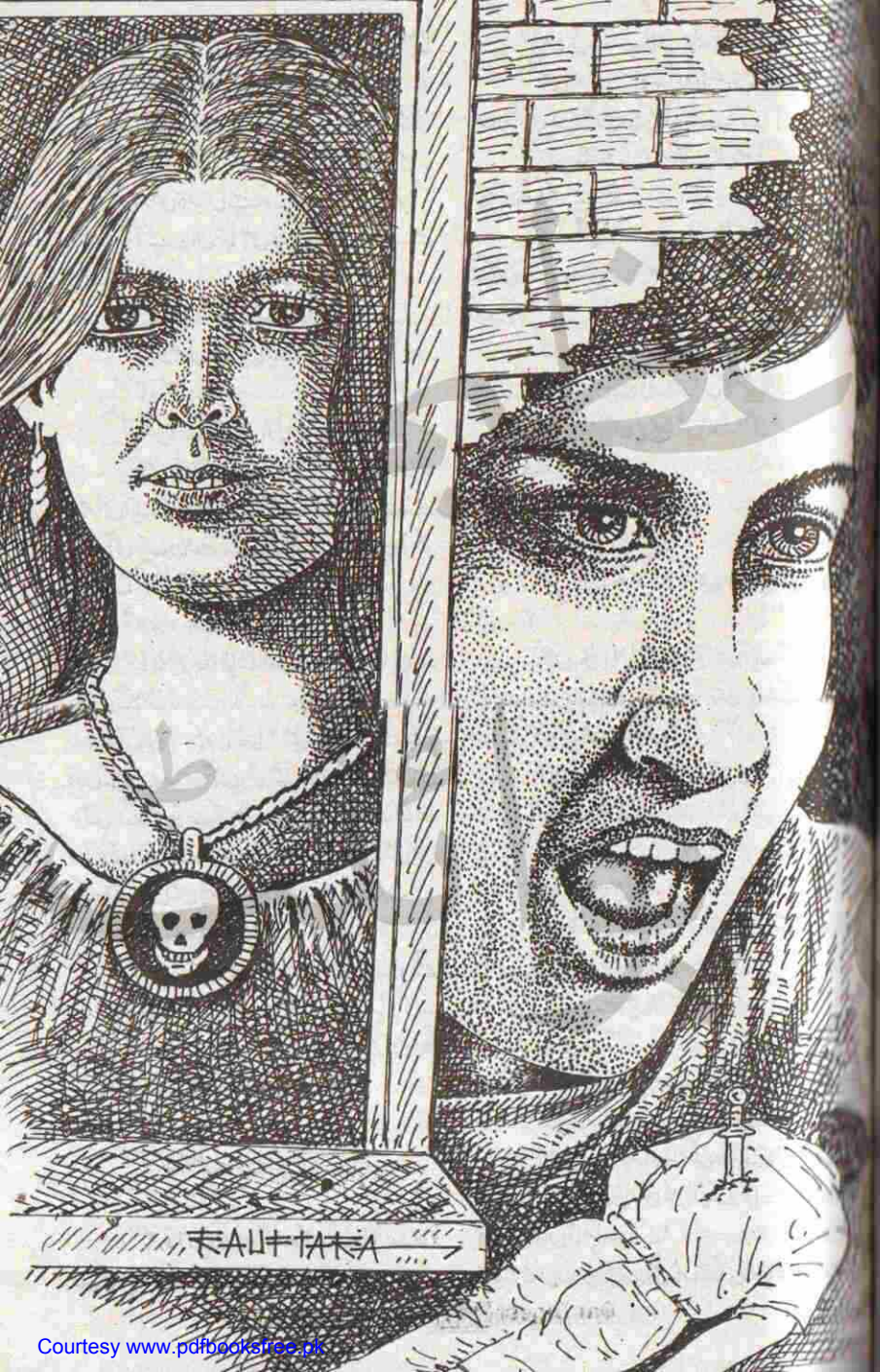

شہر وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر:16

رات کا گھٹا ٹوپ اندھرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقه اور وحشت و دهشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکته طاری کرتا لرزیده لرزیده سناٹا، نادیده قوتوں کی عشوه طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکرائو، کالی طاقتوں کی خونی لرزه بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیده دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری هوجائے گی، برسوں ذهن سے محو نه هونے والی اپنی مثال آپ کهانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیروشر کی انوکھی کہانی

آنکھوں میں ہونے والی شدید جلن نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ میں اپنی بے چینی کا اظہار جے پالی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر یہ جلن شدید ترین ہوتی چلی گئی۔ اور میں نے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔ مورتی میرے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک میں اپنی آنکھیں ملتا رہا۔ یہ شاید اسی پانی کا اثر تھا۔ جو جے پالی نے میرے چہرے پر ڈالا تھا۔ اس پانی میں مرچیں یا ایسی کوئی چیز شامل تھی کہ کچھ دیر کے لئے میری آنکھیں بالکل بند سی ہوگئی تھیں، پھر یہ جلن ختم ہوگئی لیکن میں اب بھی آنکھیں مل رہا تھا، اور پھر آہستہ آہستہ یہ جلن ختم ہوگئی۔ میں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

لیکن......لیکن......یہ کون سی جگہ تھی۔ سارا منظر ہی تبدیل ہوگیا تھا۔ اب نہ وہ مندر تھا، نہ شیلا کا مجسمہ اور نہ جے پالی میرے سامنے تھی بلکہ میں ایک میدانی ڈھلان پر کھڑا تھا۔ ایک ایسا میدانی ڈھلان جس پر مختلف قسم کے خودرو پودے اگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں لمبی گھاس ان پودوں کے درمیان جھانک رہی تھی ۔ دور دور تک کھلا میدان نظر آتا تھا۔ کافی دور ایک سڑک نظر آ رہی تھی۔ میں اس سڑک کی طرف چل پڑا۔

دل میں یہی خیال تھا کہ کسی طرح اس سڑک تک پہنچ جاؤں اور کسی ایسے شخص کو تلاش کروں جو آباد علاقے کا راستہ بتائے یا مجھے وہاں لے جائے چنانچہ میں چلتا رہا اور پھر سڑک تک پہنچ گیا۔ یہ ایک شفاف سڑک تھی۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا نام ونشان نہ تھا۔ سڑک کے دوسری طرف بھی ایسے ہی ڈھلان تھے۔ کافی دیر تک میں اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر ایک جانب دھول اڑتی ہوئی نظر آئی غالباً کوئی گاڑی اس طرف آ رہی تھی۔ میرا اندازہ درست نکلا کیونکہ اس دھول سے ایک گاڑی برآمد ہوئی۔ دراصل یہ وہ مٹی اور دھول تھی جو اس سڑک کے کناروں پر موجود تھی اور تیزی سے گزرنے والی گاڑیاں اس دھول کو اڑاتی ہوئی گزرتی ہوں گی۔

بہرحال میں اس بات کے لئے تیار ہوگیا کہ اس گاڑی کو ضرور روکوں گا۔ چنانچہ میں سڑک کے درمیان آ گیا۔ البتہ اتنی جگہ میں نے ضرور چھوڑ دی تھی کہ اگر گاڑی والا مجھے نہ دیکھ پائے تو میں ایک طرف ہو جاؤں تاکہ محفوظ رہوں۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے اور زور، زور سے اس انداز میں ہلانے شروع کر دیئے۔ جیسے میں مدد چاہتا ہوں۔ پھر اس گاڑی والے نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا کیونکہ اس کی گاڑی کی رفتار کم ہونا شروع ہوگئی۔ گاڑی میرے قریب آ کر رک گئی۔ یہ بالکل نئی چمکتی ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاڑی تھی۔" پھر اس میں سے ایک آدمی باہر نکلا۔ اچھا خوش شکل آدمی تھا۔ رنگ گورا، خوبصورت لمبے بال، جو شانوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سنہری فریم کی عینک ہاتھوں میں انگوٹھیاں، گلے میں چین پڑی تھی۔ جدید تراش خراش کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔

"آپ یہاں تنہا اس ویرانے میں کیا کر رہے ہیں۔؟"

"کچھ نہیں..... ایک مسافر ہوں۔"

"راستہ بھول گئے ہیں کیا۔؟"

"جی۔"

"لیکن آپ کے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔"

"نہیں جی! میں شہر جانے والی بس میں سوار ہوا تھا۔ پھر بس ایک جگہ رکی سب نیچے اتر کر ادھر ادھر گھومنے لگے۔ میں بھی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو بس جا چکی تھی۔"

"اوہو..... یہ تو بہت برا ہوا۔"

"جی! شہر جانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

"ہاں..... کیوں نہیں؟ میں شہر کی طرف جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلیں، شہر میں آپ جہاں کہیں بھی کہیں گے میں آپ کو اتار دوں گا۔" اس نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والا دروازہ کھول دیا۔ میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پھر اچانک اس نے کہا۔

"آپ کا سامان وغیرہ؟"

"وہ بس میں ہی تھا۔" سامان کے ذکر سے مجھے مورتی یاد آ گئی جو میں نے اندرونی لباس میں چھپالی تھی۔

"اوہ..... یہ تو بہت برا ہوا۔ آپ کا پرس وغیرہ تو ہے۔ آپ کے پاس؟"

"جی نہیں۔"

"تو کیا وہ اس سامان کے ساتھ....."

"جی ہاں! بالکل۔"

"پھر تو اس کو تلاش کرنا ہوگا۔ اگر سامان نہ ملا تو اس کی رپورٹ کرنا ہوگی۔"

"چھوڑیں صاحب! اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔"

"لیکن پھر بھی اہم کاغذ، کوئی ایسی دستاویز، جو اہم ہو، اور جس کے لئے رپورٹ کرنی پڑے۔"

"نہیں صاحب! اس سامان میں صرف میرے کپڑے اور کچھ پیسے تھے۔"

"چلو! یہ بھی غنیمت ہے۔ بہر حال بہت برا ہوا۔ تم کہو تو اس سامان کے حصول کے لئے میں کوشش کروں؟"

"نہیں صاحب! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔؟" جانے والی چیز تھی چلی گئی۔ اب اس کا غم کیا کرنا۔"

"تمہارا نام نہیں پوچھا میں نے ابھی تک تمہارا نام کیا ہے۔؟"

"علی خان ہے جی میرا نام۔"

"مجھے شیر گل کہتے ہیں۔"

"علی خان! تم رہتے کہاں ہو؟ کیا اسی شہر میں.....؟"

"نہیں جی! اس شہر میں تو میں ایک اجنبی کی حیثیت سے جا رہا ہوں۔ میں تو کرشن پور کے ایک علاقے ممبئی بستی میں رہتا ہوں۔"

"اچھا آپ کے والد کیا کرتے ہیں۔؟"

"والد نہیں ہیں۔"

"اور والدہ۔؟"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

"بڑا افسوس ہوا سن کر..... آئی ایم سوری۔" جواب میں، میں خاموش رہا۔

"آپ پڑھتے ہیں؟"

"نہیں جی!"

"پھر کوئی کام وغیرہ کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ایک دکان پر ملازم ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" پھر وہ خاموش ہو گیا۔ کافی دیر تک اسی طرح خاموشی چھائی رہی پھر اس نے کہا۔ "شہر جنگ آباد میں کہاں قیام کریں گے؟"

اس کے پوچھنے پر پہلی بار مجھے اس شہر کا نام پتہ چلا

جہاں ہم جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "وہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔"

"اور آپ کے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔"

"جی۔" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میرے ہاں قیام کریں۔؟ بلکہ یہی مناسب رہے گا۔"

"جی آپ کا یہ احسان ہی بہت ہے کہ آپ مجھے شہر تک لے جا رہے ہیں ورنہ میں تو ان بیابانوں میں سر ٹکراتا پھرتا۔"

"اس میں احسان کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بحیثیت انسان یہ میرا فرض ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ سب نہیں کرتا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسانیت سے خارج ہے۔ چنانچہ آپ کیلئے بہتر ہے کہ آپ کچھ روز میرے ہاں قیام کریں۔ جس مقصد کے لئے آپ یہاں آئے ہیں اسے پورا کیجئے۔ اور پھر اپنے شہر روانہ ہو جایئے۔"

"جی..... میرے خیال میں۔"

"خیال وغیرہ آپ چھوڑیں، آپ کو اب میرے گھر رہنا پڑے گا، اللہ کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور ہاں رقم وغیرہ کی پرواہ بھی بالکل نہ کیجئے گا۔"

میں اس کا کیا جواب دیتا؟ خاموش رہا۔ پھر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی شہر میں داخل ہو گئی۔ گاڑی کچھ دیر تک مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی راستے میں مجھے اندازہ ہوا کہ یہ چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن صاف ستھرا ماحول ہے۔ سڑکیں خوبصورت ہیں۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی چھائی ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بازار ہیں۔ بڑا ہی پرسکون ماحول ہے۔

میں اب تک پریشان رہا تھا۔ لیکن اب کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اب مجھے ایک مقصد مل گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ طاقت بھی دی گئی تھی۔ ایک ایسی طاقت جو بہر حال ایک حیثیت رکھتی تھی اور یہ شخص..... یہ شخص تو میرے لئے فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔

پھر گاڑی مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی پھر اس آدمی نے ہارن بجایا۔ ایک ملازم نے دروازہ اندر سے کھول دیا اور شیر گل گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔ اس نے گاڑی ایک جگہ روک دی۔

"آؤ....." اس نے کہا۔ اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

میں بھی نیچے اتر آیا تھا۔ میں نے شیر گل، کو دیکھا۔ اچھا خاصا لمبا چوڑا تھا۔ انتہائی شاندار شخصیت تھی اس کی، پھر میں نے کوٹھی پر نظر دوڑائی۔ انتہائی خوبصورت کوٹھی تھی۔ ایک طرف وسیع لان تھا، جس میں مختلف قسم کے پھول لگے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ناریل کے درخت بھی تھے۔ کوٹھی کی شان و شوکت سے مجھے شیر گل کی حیثیت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص انتہائی دولت مند ہے۔ بڑی آن بان ہے اس کی۔"

شیر گل مجھے لئے ہوئے آگے بڑھا، اور سامنے کی سمت جانے کی بجائے دائیں سمت چلنے لگا۔ آگے جا کر میں نے دیکھا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ چار پانچ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں پودے لگے ہوئے تھے۔ پھر شیر خان ان کمروں میں سے ایک کے دروازے کے پاس آیا۔ اور زور سے کسی کو آواز دی۔ "پیر شیر..... او..... پیر شیر۔"

جواب میں اندر سے آواز سنائی دی۔ "..... آتا ہے گل جاناں ابی آتا اے....." دو منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ اور اندر سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ مضبوط ہاتھوں، پیروں والا پٹھان تھا۔ معمولی لباس پہنے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

"سلام..... صاب، تم آ گیا صاحب۔"

"تو کیا نہ آتا۔؟"

"نئیں صاب! کیا بات کرتا اے، ام تو انتظار کرتا تھا آپ کا۔"

"چلو انتظار ختم ہو گیا اب تمہارا۔ اب خوش ہوناں۔؟"

"جی ہاں۔ بہت خوش ہوں۔"

"اچھا۔ سنو یہ ہمارے مہمان ہیں یہ کچھ دن یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قیام کریں گے۔"

"جی اچھا صاب!" انہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگا۔ آپ فکر مت کرو۔"

"دیکھو علی خان! تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، تم یہاں رہو۔ اپنا کام کرو، اور یہ کچھ پیسے ہیں، انہیں رکھو۔" اس نے جیب سے سو سو کے چند نوٹ نکال کر میری جانب بڑھا دیئے۔

میں جھجکتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

"ارے اس میں جھجکنے کی کیا بات ہے۔ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو، اور کھانے پینے یا دوسری چیزوں میں بھی تکلف نہ کرنا۔ جو چاہئے ہو، بلا جھجک کہنا۔ ٹھیک ہے ناں؟"

"جی۔"

"اور یہ....." اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیسوں کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "یہ آپ رکھیں۔"

"نہیں! اگر مجھے ضرورت ہوئی تو آپ سے مانگ لوں گا۔"

"ارے نہیں! یہ..... رکھ لو....." اس نے زبردستی نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیئے تھے۔

پیر شیر نے مجھ سے کہا۔ "آؤ صاب!" اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ کمرہ اچھا خاصا تھا۔ صاف ستھرا، ایک جانب درمیان میں ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی سامان نہیں تھا۔ بہر حال سر چھپانے کا بہتر ٹھکانہ مل گیا تھا۔ میں نے سوچا کچھ دن یہاں رہوں گا۔ اس کے بعد یہاں سے نکل کر کوئی دوسری جگہ تلاش کرلوں گا۔ ابھی تو جے پالی کا کام بھی کرنا تھا۔

"صاب! یہ آپ کے رہنے کا کمرہ ہے۔ اگر کوئی چیز چاہئے ہو، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، تو آپ بلا جھجک کہو ہم آپ کا خدمت کیلئے تیار ہے۔"

"جی اچھا۔"

"صاب آپ اب حکم کرو۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"صاب ہم ابھی آپ کیلئے کھانا بھجواتا ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھولو۔ وہ دیکھو..... وہ باتھ روم ہے۔" اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ کمرے کے ساتھ ہی باتھ روم بنا ہوا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ اور باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ اچھی طرح منہ دھویا مجھے مورتی کا خیال آیا۔ اور میں نے اپنے لباس سے مورتی نکال لی۔ مورتی بالکل صحیح سلامت تھی۔ میں نے اس کو واپس اپنے لباس میں رکھ لیا۔ پھر میں باہر آگیا کچھ دیر کے لئے مسہری پر لیٹ گیا۔ آرام دہ مسہری تھی۔ اور لیٹنے میں لطف آرہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون؟"

"میں ہوں۔ ملازمہ..... آپ کے لئے کھانا لائی ہوں۔"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ پندرہ سولہ، سال کی ایک پیاری سی لڑکی کھانے کی ٹرے ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ میں ٹرے اس کے ہاتھ سے لینے لگا تو وہ بولی۔ "ارے آپ کیوں تکلیف کررہے ہیں۔ میں کھانا میز پر لگا دیتی ہوں۔" اس نے کہا تو میں نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ پھر اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔ ساتھ پانی کا جگ بھی تھا۔ کہنے لگی۔

"کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے۔ میں ابھی دوبارہ چکر لگاؤں گی۔"

"نہیں تم جاؤ، بس اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔ اور وہ چلی گئی میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے اندر عجیب سی بے چینی ہے۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔ بہر حال وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے میز مسہری کے قریب ہی کھسکالی، اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ انتہائی مزیدار کھانا تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ برتن میز پر ہی رہنے دیا۔ اس کے بعد میں مسہری پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ "اجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔" میں نے کہا۔ وہی لڑکی دروازہ کھول کر

اندر داخل ہوگئی۔

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خاموشی سے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"نہیں..... شکریہ۔!" میں نے کہا، اور وہ واپسی کیلئے مڑ گئی۔ میں اسے دروازے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پھر میں آرام کرتا رہا۔ میں نے اپنے خیالات کو اب ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اور کافی حد تک پرسکون بھی ہوگیا تھا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

"کون؟ اندر آجاؤ۔" میں نے کہا۔ اور پیر شیر اندر داخل ہوگیا۔ میں ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"او..... لیٹے رہو..... صاب! ہم تو یہ پوچھنے کو آیا کہ تم نے کھانا کھالیا۔؟"

"ہاں..... پیر شیر" میں نے جواب دیا۔

"اور چائے۔؟"

"نہیں چائے نہیں پی۔"

"اوہ..... صاب! تم بہت شرماتا ہے اس بی بی سے چائے کا بول دیتا۔ دو منٹ میں آجاتا..... اچھا..... ہم خود چائے لے کر آتا ہے۔" پیر شیر نے کہا اور باہر چلا گیا۔ بہت اچھا، رویہ تھا ان لوگوں کا میرے ساتھ۔ ایک تو کھانا ہی اتنا شاندار تھا۔ اس کے بعد چائے اور دوسری چیزیں، میں بہر حال ان لوگوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد پیر شیر، چائے لے کر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ جس میں چائے کی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی دو پیالیاں بھی تھیں۔ یہ برتن بھی انتہائی خوبصورت تھے۔ پیر شیر بولا۔ "صاب! تم کو بُرا نہ لگے تو ہم بھی آپ کے ساتھ؟"

"ہاں..... پیر شیر، اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ اور پیر شیر، نے دونوں پیالیوں میں چائے انڈیلی۔ پھر ایک کپ میری جانب بڑھا دیا۔ اور دوسرا کپ لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ پیر شیر کے چہرے پر کچھ ہچکچاہٹ کے آثار ہیں۔ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"کچھ کہنا چاہتے ہو۔ پیر شیر۔؟"

"ہاں..... صاب! ہم جانتے ہیں۔ جو کچھ ہم کہیں گے۔ اس سے ہماری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لیکن ہمارا دل چاہتا ہے کہ....."

"کہو..... پیر شیر!" میں نے کہا۔ لیکن اس وقت ایک عجیب سی آہٹ ہوئی اور پیر شیر کا چہرہ سفید پڑ گیا۔"

پیر شیر خوفزدہ نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھتا رہا۔ جیسے کسی کی آمد کا منتظر ہو۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد آہٹیں ختم ہوگئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی دروازے کے پاس سے گذر رہا تھا اور اب وہاں سے چلا گیا تھا۔ پھر بھی احتیاط" پیر شیر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اور باہر جھانکنے لگا۔

میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ پیر شیر کس سے خوفزدہ ہو رہا ہے۔ یا جو کچھ بھی وہ مجھ سے کہنا چاہتا ہے۔ وہ کیا ہے۔ صورتحال جو کچھ بھی تھی۔ میرے علم میں تھی۔ لیکن شیر گل کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ پیر شیر پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد واپس پلٹا، اور میرے پاس آگیا۔ اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"صاب! بات کو جلدی ختم کرتا ہوں۔ اصل میں آپ کی شکل میرے چھوٹے بھائی سے بڑی ملتی جلتی ہے۔ میرا چھوٹا بھائی میری بستی میں دشمنی میں مارا گیا۔ ہمارے خاندانوں میں دشمنی چلتی رہتی ہے صاب! بس آپ یہ سمجھ لو آج تک مجھے اپنا بھائی نہیں بھولا۔ میں اپنے بھائی کے قاتلوں میں سے چار کو ختم کر چکا ہوں۔ مگر ابھی میرے سینے میں انتقام کی آگ روشن ہے۔ خیر! چھوڑو صاب! میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ آپ میرے بھائی کے ہم شکل ہو۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ آپ ان لوگوں کے جال میں پھنسو، جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا۔ تو اس وقت میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر مجھ سے ممکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوسکا تو میں آپ کی جان بچاؤں گا۔

صاب! ادھر سے نکل جاؤ، یہ خطرناک لوگ ہیں۔ یہ ان کا اڈہ ہے۔ ہم لوگ ادھر ہیروئن بیچتے ہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اسمگلنگ کرتے ہیں۔ سارے کام ادھر ہوتے ہیں۔ صاب! کسی بھی وقت ہماری زندگی خطرے میں پڑسکتی ہے۔ آپ کو یہ لوگ ادھر لائے ہیں۔ ابھی آپ لوگوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کریں گے۔ پھر آپ کے ہاتھوں قتل کرادیں گے اور اس کے بعد آپ کو اپنے جال میں پھانس لیں گے۔ بس یوں سمجھ لو صاب! آپ زندگی بھر ان لوگوں کے جال سے نہیں نکل سکتے۔ پھر آپ یہ سب کام کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ابھی آپ آزاد ہو۔ ادھر سے نکل جاؤ۔"

"پیر شیر کے منہ سے ابھی اتنی ہی آواز نکلی تھی کہ اچانک باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے ساتھ پیر شیر بھی چونک پڑا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"پناہ خدایا۔" اس کے بعد دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

گولیاں بڑے زور و شور سے چل رہی تھیں۔

اس کے بعد ایک آواز سنائی دی۔ وہ غالباً لاؤڈ اسپیکر پر سنائی دے رہی تھی۔ آواز نے کہا۔

"خبردار! پولیس نے تم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اگر ایک بھی گولی اندر سے چلائی گئی۔ تو ساری عمارتوں کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔ پولیس کی بہت بڑی تعداد نے تم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ سامنے کے دروازے سے ایک ایک کرکے ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔ تو تمہاری زندگی بچ جائے گی۔ خیال رکھنا اگر پتھر بھی پھینکا گیا تو اس کا جواب گولی سے ملے گا۔"

پولیس بار بار یہ اعلان کررہی تھی۔ اور میں بدحواسی اور پریشانی کے عالم میں سوچتا رہا کہ پولیس نے بھی چھاپہ مارنے کیلئے یہی وقت مقرر کیا تھا۔ پیر شیر کی تفصیل بتانے کے بعد ممکن تھا کہ میں فوری طور پر یہاں سے نکل جاتا۔ پیر شیر ضرور میری مدد کرتا۔ لیکن تقدیر نے اس کا موقع نہیں دیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں کیا کروں؟ پریشانی کی لہر میرے پورے وجود میں دوڑ رہی تھی۔ اور میرا ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے معذور تھا۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا رہوں۔ باقی لوگ کیا کریں گے۔ یہ ان کا معاملہ ہے۔ اگر میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو اس پر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

باہر ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ لیکن فائرنگ نہیں ہوئی تھی۔ یا تو ان لوگوں نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ پولیس نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اور ایسا کر ڈالا جائے گا۔ چنانچہ جان بچانا ضروری تھی۔ اور میرا یہی خیال درست ثابت ہوا۔ بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بھاگ دوڑ ہورہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد میرے کمرے کے دروازے پر لات ماری گئی۔

اس کے بعد چند طاقتور پولیس والے اندر گھس آئے۔ وہ اس طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جیسے جانور پکڑ رہے ہوں۔ ایک لمحے کے اندر اندر میری کلائیوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ میرے منہ سے ایک مدھم سی آواز نکلی تھی۔

"سنو..... تو..... میری بات سنو....."

لیکن میری بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے عمارت سے باہر لے آئے اور پھر ایک ٹرک میں اٹھا کر پھینک دیا۔ ٹرک میں اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ ان میں پیر شیر بھی تھا۔ جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ عمارت کی صفائی کی جارہی تھی۔ تیرہ افراد پکڑے گئے تھے۔ شیر گل ان میں نہیں تھا۔ ابھی اندر تلاشی ہورہی تھی۔ لڑکیاں بھی تھی۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھیں۔ جس نے مجھے کھانا دیا تھا۔ سب سہمے ہوئے نظر آرہے تھے۔

بہت دیر تک یہ ہنگامہ آرائی ہوتی رہی اور اس کے بعد پولیس کا ٹرک اسٹارٹ ہوکر چل پڑا۔ اس کی منزل پولیس ہیڈ کوارٹر تھی۔ جس کا بورڈ مجھے نظر آگیا تھا۔ پولیس کی ایک جیپ بھی ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ اور میں دل میں سوچ رہا تھا کہ منشیات کے اڈے سے پکڑا گیا ہوں۔

دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہمیں بہت بڑے ہال میں پہنچادیا گیا۔ ہال خوب روشن تھا۔ ہتھکڑیاں پڑے ہوئے لوگ زمین پر بیٹھ گئے۔ پولیس والے ان میں سے بعض کو ٹھوکریں بھی مار رہے تھے۔ لیکن شکر تھا کہ میری طرف کوئی متوجہ نہیں ہوا تھا۔ رات آدھی کے قریب گزر گئی۔ اندر کے ماحول سے اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اتنی رات ہوگئی ہے۔"

پھر ایک ایس پی تین انسپکٹروں اور کچھ سب انسپکٹروں کے ساتھ اندر آیا۔ وہ ایک ایک کرکے ان لوگوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ان میں سے کچھ کو اس نے نام لے کر آواز دی تھی۔ اور بڑے طنزیہ الفاظ کہے۔ پھر وہ میرے پاس پہنچا اور اچانک ہی اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے ایڑیاں بجا کر مجھے سیلوٹ کیا اور بدحواسی سے بولا۔

"ارے سر..... آپ..... آپ کو..... سوری سر..... بیوقوفو! جلدی کرو۔ چابی منگوا کر ہتھکڑی کھولو، تمہیں۔ تمہیں معلوم نہیں۔ یہ کون ہیں؟"

ایس پی کے چہرے پر ایسے بدحواسی کے آثار نظر آرہے تھے۔ جیسے اس نے بہت ہی بڑے اور معزز شخصیت کو دیکھ لیا ہو۔

انسپکٹر بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ ایس پی نہایت معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ "سر آپ یقین کریں ان گدھوں سے غلطی ہوئی ہے..... سراصل میں اس آپریشن کا انچارج میں ہی ہوں۔ سر..... پلیز..... پلیز سر..... آپ مجھے معاف کردیں۔ کاسٹیبل احمق ہوتے ہیں۔ اور پھر سر آپ۔"

میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ پولیس آفیسر کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہے لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی۔ اور میری آرزو بھی تھی۔ کہ غلط فہمی کسی حد تک ایسے ہی رہے۔ تاکہ میری جان بچ جائے۔ ویسے بھی اس پورے کھیل میں، میں کوئی کردار نہیں رکھتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہتھکڑیوں کی چابی آگئی میری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ اور اس کے بعد ایس پی نے گرج کر ایک انسپکٹر سے کہا۔ "صاحب کو اپنے ساتھ لے جاکر میرے گھر پہنچادو۔ میں گھر ٹیلی فون کئے دیتا ہوں۔ ..... سر! پلیز، آپ اس وقت مجھ سے کچھ مت پوچھیں، بس آپ چلیں۔ سر پلیز!..... جس طرح سے بھی آپ کہیں، میں آپ سے معذرت کیلئے تیار ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ بھائی تیری غلط فہمی قائم رہے۔ اور میری زندگی بچ جائے۔ ورنہ نجانے کیا سلوک ہو میرے ساتھ۔"

بہرحال میں وہاں سے چل پڑا۔ انسپکٹر بڑے پر احترام انداز میں میرے ساتھ باہر آیا۔ باہر پولیس کی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے جیپ میں بیٹھنے کی پیشکش کی اور جب میں بیٹھ گیا تو وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ راستے بھر اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایس پی کے گھر والے نجانے میرے ساتھ کس طرح پیش آئیں۔

بہرحال! ابھی تک وہ عالم بدحواسی میں تھا۔ یقینی طور پر ایس پی نے اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں ہدایت کردی ہوگی۔ ورنہ اتنی رات گئے کوئی خوبصورت کوٹھی اس طرح روشن ہوسکتی تھی۔ جتنی ایس پی کی کوٹھی روشن تھی۔

برآمدے ہی میں ایک عورت ساڑھی باندھے ہوئے کھڑی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی موجود تھا۔ ان کے پاس دو ملازم بھی تھے۔ عورت نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"سر! میرا نام ہے راج کماری۔ میں ایس پی گوپال سکسینہ کی بیوی ہوں۔ یہ ہمارے بچے ہیں۔ بیٹی کا نام کرینہ، اور بیٹے کا نام وشال ہے۔ سر! گوپال سکسینہ نے ہمیں آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ آیئے پلیز! یہ گھر آپ کے قابل تو نہیں ہے لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں آئے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ یہی میری خوش قسمتی ہے کہ میں تھانے کے لاک اپ کے بجائے یا پھر کانسٹیبلوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ہاتھوں مار کھانے کی بجائے یہاں تک آیا دیکھنا یہ ہے کہ یہ خوش قسمتی کب تک قائم رہتی ہے۔ بہرحال! وہ لوگ مجھے اندر لے گئے۔ راجکماری نے کہا۔

"سر! آپ لباس تبدیل کر لیجئے۔ ہوسکتا ہے۔ وہ آپ کے جسم پر فٹ آجائے، گوپال سکسینہ کا جسم آپ کے جسم سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے۔ سر..... کوئی ایسی، ویسی بات ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ ہم لوگ اصل میں نیند سے جاگے ہیں گوپال تو اپنی ڈیوٹی پر چوبیس گھنٹے مصروف رہتے ہیں، ہم ان کا انتظار نہیں کرتے، سو جاتے ہیں، آیئے پلیز۔!"

میں نے بھی دل میں یہ ہی سوچا تھا۔ کہ جتنی آسانیاں مجھے یہاں حاصل ہو رہی ہیں انہیں حاصل کرنے سے گریز نہ کروں۔ کیونکہ اس کے بعد جو ہونا ہے اس کا مجھے اچھی طرح پتہ تھا۔ بہرحال! غسل خانے میں گیا۔ جو لباس مجھے دیا گیا تھا۔ وہ پہنا..... گوپال سکسینہ پر تو میں نے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کا لباس میرے بدن پر پوری طرح فٹ تھا۔ میں اسے پہن کر باہر آیا تو نوجوان لڑکی میرا انتظار کر رہی تھی۔ "آیئے سر! اب ایک کپ کافی تو ہمارے ساتھ ہی ہو جائے۔ نیند تو آپ کی خراب ہو ہی گئی ہے۔"

کافی کا نام سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ چنانچہ میں کرینہ کے ساتھ اس بڑے سے ہال میں پہنچ گیا جہاں ایک ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ یہاں وشال بھی تھا۔ راجکماری بھی تھی۔ کرینہ مجھے لئے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پہنچی۔ ایک کرسی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب میں بیٹھ گیا تو وہ ایک کرسی پر میرے سامنے مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔ میز پر بہت سی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ یہ وقت کا کھیل تھا۔ لیکن بات وہی تھی میں اس کھیل کو عارضی سمجھ رہا تھا۔ ظاہر ہے۔ اس کے بعد جو میری حجامت ہوگی، وہ دیکھنے کے قابل ہوگی۔

میں کھانے پینے سے فراغت حاصل کر چکا تو راج کماری نے کہا۔ "سر! اب آپ کچھ دیر آرام کرنا پسند کریں گے، آیئے میں آپ کو بیڈ روم تک پہنچا دوں۔"

"ہاں۔ ضرور" میں نے کہا۔ اور راجکماری مجھے ایک خوبصورت بیڈ روم تک لے آئی۔ سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ بہت ہی کشادہ کمرہ تھا۔ ایئر کنڈیشن چل رہا تھا۔ کمرے کا ماحول بڑا رومانی تھا۔ میں نے راجکماری کا شکریہ ادا کیا اور وہ مجھے گڈ نائٹ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے دل میں سوچا کہ "بی بی تھوڑی دیر تک تو گڈ نائٹ ہے اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کا مجھے علم نہیں۔"

میں مستانہ چال چلتا ہوا بیڈ پر جا بیٹھا گنتیو کی مورتی میں نے اپنے لباس سے نکال کر سرہانے رکھ لی۔ بہرحال ابھی تک اس کے نفع و نقصان کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں تو جن حالات سے گزر رہا تھا۔ وہ میرے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث تھے۔ میں بیڈ پر لیٹ گیا، نیلا مدھم بلب جل رہا تھا۔

لیٹنے کے بعد میں نے اس کمرے کے خوشگوار ماحول پر نظر ڈالی اور اچانک ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ دیوار پر ایک خوبصورت فریم آویزاں تھا۔ اور اس میں ایک عورت کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہ عورت۔ میرے خدا۔ اس عورت کو تو میں لاکھوں میں کیا کروڑوں میں پہچان سکتا ہوں۔ یہ جے پالی تھی۔ جو گہری آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے جے پالی کا جائزہ لیتا رہا۔ ایس پی گوپال سکسینہ کی غلط فہمی کا راز مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ مجھے سر، سر، کیوں کہہ رہا تھا۔ لیکن ایک بار بھی اس نے نام لیکر نہیں پکارا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو کم از کم مجھے یہ تو پتہ چل جاتا کہ اس کی غلط فہمی کی وجہ کیا ہے۔ لیکن ایس پی کا تعلق کسی طور جے پالی سے ہوگا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔

"اوہ..... میرے خدا! یہ بڑی خوفناک بات ہے۔ ایس پی بھی میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ مگر جے پالی..... کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اب میں بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔

اسی وقت آوازیں سنائی دیں اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا باہر پولیس کی گاڑی آکر رکی تھی۔ میں

ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اور میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ ایس پی غالباً اپنی ڈیوٹی سے واپس آگیا تھا۔ ملازم اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ پھر وہ اندر چلا گیا۔ میرے لئے اس کے پاس جانے یا اس سے ملنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں وہاں سے ہٹا، اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ جے پالی کی تصویر کے پاس آگیا۔ اسی وقت مجھے جے پالی کی آواز سنائی دی۔

"کہو، لطف آرہا ہے نا زندگی کا؟"

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی موجود نہیں تھا۔ ایک بار پھر میری نگاہیں اس نیم تاریک ماحول میں تصویر کا جائزہ لینے لگیں۔ تو میں نے جے پالی کی تصویر کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ تو کیا یہ تصویر بولی ہے؟"

"بتایا نہیں تم نے....." اس بار جے پالی کی تصویر کے ہونٹ ہلے اور میں نے گہری سانس لی۔

"جے پالی! تم.....؟"

"تم نے مجھے بہت پیار سے مخاطب کیا ہے۔ میں خوش ہوں۔ ہاں..... یہ میں ہی ہوں۔ گن تیرہ کے کمالات نہیں دیکھ رہے تم؟"

"گن تیرہ۔"

"تو اور کیا، پیر شیر یا اس سے بھی پہلے چلے جاؤ تمہیں جس محبت سے وہ لوگ شہر تک لے کر آئے۔ اس کے بارے میں تم کیا سمجھتے ہو؟ پھر پیر شیر نے تمہیں اپنے بھائی کا ہم شکل پایا۔ یہ بھی گن تیرہ کا کمال تھا۔ اس کے بعد اتفاقیہ طور پر پولیس نے اسی وقت ریڈ کر دیا تھا۔ تم پکڑے گئے لیکن ایس پی گوپال سکسینہ نے تمہیں دیکھا۔ کوئی بڑا آفیسر سمجھ لیا۔ یقینی طور پر وہ یہ سوچ رہا ہے کہ اس گروہ کا سراغ لگانے کے لئے اس میں داخل ہوئے تھے۔ ان ساری باتوں کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔؟"

"میں نہیں جانتا جے پالی۔"

"سب میری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ گن تیرہ کے حصول کے بعد تم جتنے بڑے انسان بن گئے ہو۔ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ لیکن جو وعدہ تم نے مجھ سے کیا ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد ہی تم مکمل ہو سکو گے۔"

"وعدہ.....؟"

"ہاں..... پانچ شکار..... میرے پانچ شکار..... یاد نہیں ہے۔ وہ وعدہ تمہیں؟"

"یاد ہے۔"

"اور جانتے ہو کہ پہلا شکار کون ہے۔؟"

"کون؟" میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"ایس پی، گوپال سکسینہ" وہ بولی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تصویر کو تکتا رہ گیا۔ میرے دل میں اچانک ایک بغاوت کا احساس ابھرا تھا۔ ایس پی گوپال سکسینہ نے غلط فہمی ہی کی بنیاد پر سہی، لیکن اب تک جو میرے ساتھ سلوک کیا تھا۔ میرا رواں رواں اس کا احسان مند ہو گیا تھا۔ اور یہ عورت کہہ رہی ہے کہ ایس پی گوپال سکسینہ اس کا شکار ہے مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ اس نے یہ بات کہی تھی۔ مجھ سے کہ اسے پانچ آدمیوں کا خون درکار ہے۔ اگر ان پانچوں میں گوپال سکسینہ بھی شامل ہے تو کیا مجھ سا کوئی کمینہ انسان روئے زمین پر دوسرا بھی ہوگا۔؟ وہ میرا محسن ہے۔ اور میں اسے نقصان پہنچاؤں؟

اچانک ہی جے پالی کی آواز ابھری۔ "کس سوچ میں پڑ گئے۔؟ خاموش کیوں ہو گئے۔؟"

"جے پالی! میں ایس پی، گوپال سکسینہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"میرا دشمن ہے۔ یہ۔ اس دشمنی کی وجہ تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ لیکن مجھے اس کا خون درکار ہے۔ جانتے ہو یہ وہ پائل ہے۔"

"پائل؟"

"ہاں۔"

"پائل کیا ہوتا ہے۔؟"

"جو ماں کے پیٹ سے پیروں کے بل دنیا میں آیا ہو۔ وہ پائل کہلاتا ہے۔ اور اس میں ایسی خصوصیت ہوتی ہے۔ کہ ہم کالے جادو والے ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایسے پانچ افراد کا خون جب میں اپنے بدن پر ڈال کر پورن ماشی کی رات کو اس سے نہاؤں تو مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امر شکتی حاصل ہو جائے گی۔ میں اپنے جیون کو ہزاروں سال لمبا کر سکتی ہوں۔ سن رہے ہو؟"

"ہاں۔!"

"یہ تمہاری مسہری ہے ناں۔؟"

"جی۔"

"اس کے پیچھے ایک خنجر اور ایک برتن رکھا ہوا ہے۔ ایس پی تھکا ہوا آیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سو جائے گا۔ تم جاؤ گے۔ اس کی شہ رگ کاٹو گے۔ اور خون پیالے میں بھر کر لے آؤ گے۔ میں تمہیں اس کے بعد بتاؤں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اس عمارت سے سیدھے باہر نکل جانا کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔ یہ میرا پہلا کام ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گے۔ گن تیرہ تمہیں دے کر میں نے تمہیں امر شکتی دے دی ہے۔ گن تیرہ تمہارے لئے وہ کچھ کرے گی کہ آگے آگے دیکھنا تم کیا سے کیا بن جاتے ہو۔ لیکن پانچ آدمیوں کا خون مجھے دینے کے بعد۔"

میرے ہاتھوں میں لرزش شروع ہو گئی تھی۔ ساری زندگی امن و امان سے گزاری تھی۔ کسی کا خون کبھی نہیں کیا تھا۔ میں تو کسی جانور کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میرے ہوش و حواس رخصت ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر تصویر کی طرف دیکھا۔ جے پالی کی تصویر نے آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے پھر کہا۔ "اب میں خاموش ہو رہی ہوں۔ جاؤ! اپنا کام کرو۔"

میں آہستہ آہستہ مسہری کی جانب بڑھ گیا۔ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ مسہری کے سرہانے گن تیرہ کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ کیا اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں۔ اور ان ساری مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کروں یا پھر..... یا پھر....."

اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میرے ہاتھ پیروں میں کھنچاوٹ سی ہو رہی ہے۔ میں مسہری کے عقبی حصے میں جھکا۔ یہاں مجھے ایک چمکدار خنجر رکھا ہوا نظر آ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک پیالہ بھی جو پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔ آہ..... مجھے وہی کرنا ہے۔ جو اس نے کہا ہے۔ میں جادو کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔ اس جادو سے نکلنا میرے لئے کسی طور ممکن نہیں ہے۔

جو کچھ بھی کرنا ہے۔ مجھے اس کے احکامات کے تحت کرنا ہے۔ میرے لرزتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھے۔ میں نے خنجر اپنی مٹھی میں دبایا اور اس کے بعد پلاسٹک کا پیالہ بھی اٹھایا اب میں اپنی جگہ کھڑا ہوا کانپ رہا تھا۔ اور یہ سوچ رہا تھا کہ "مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

پھر آہستہ آہستہ حواس قابو میں آنے لگے۔ ایک بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں نے جے پالی کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ تو پھر ایسے طلسمی جال میں پھنس جاؤں گا۔ جس سے نکلنا میرے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ شیطان زادی میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوتی ہے۔ اور..... اور کچھ حاصل کرنے کے لئے مجھے اس کے احکامات پر عمل کرنا ہی تھا۔

☆.....☆.....☆

علی خان کی کہانی جاری تھی کہ اندر سے بلاوہ آ گیا۔ اور وہ ادھوری کہانی چھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن نعمت علی اس کہانی میں کھویا ہوا تھا۔ "پھر کیا ہوا۔ علی خان، راجہ پرمیت سنگھ کے پاس کیسے پہنچ گیا نعمت علی کے ذہن میں ایک تجسس تھا۔ کیا راجہ کو اس کے بارے میں معلوم ہے۔ مسلمان ہے۔" غرض یہ خیالات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے اسی رات چوبداروں نے اسے راجہ پرمیت سنگھ کا پیغام دیا۔

"راجہ صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ چوبدار نعمت علی کو لے کر چل پڑا خوبصورت محل کی کئی غلام گردشیں طے کی گئیں اور پھر چوبدار ایک دروازے پر جا کر رک گئے۔

"جاؤ۔ اندر جاؤ۔" اسی نے کہا۔ اور نعمت علی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ لیکن یہ کیا۔ یہ تو دنیا ہی نئی تھی۔ اس طلسم گاہ کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سرزمین ہندوستان، قدیم دیویوں، دیوتاؤں کا ملک، جہاں پر اس عقائد کے ساتھ انوکھے طلسم کدے بکھرے ہوئے تھے اور اس وقت بھی ایک انوکھی دنیا نعمت علی کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ ایک انوکھی داستان کا دیدہ ور بن گیا تھا۔

داستان ایک ناگ قبیلے اور آدمخوروں کی تھی۔ اس قبیلے کا سردار غورال تھا۔

غورال جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا تھا۔ چھوٹی موٹی جادوگری کی باتیں بھی اسے آتی تھیں۔ لیکن علاقہ ایسا تھا کہ قدم قدم پر ایک سے ایک جادوگر پایا جاتا تھا۔ قبیلوں میں جب ہنگامہ آرائی ہوتی تھی۔ تو اس کے دو حصے ہوا کرتے تھے۔ ایک جادو ٹونوں والا دوسرا جنگ و جدل والا۔ جب جادو ٹونوں کی جنگ ہوتی تو ماحول بہت عجیب ہو جایا کرتا تھا۔ اور اس میں بڑی خود پڑی ہوا کرتی تھی۔ لیکن ذرا مختلف طریقے سے اور جب تلوار کلہاڑوں اور نیزوں کی جنگ ہوا کرتی تھی۔ تو فیصلے لمحوں میں ہو جایا کرتے تھے۔

ان کا قبیلہ تباہ ہوا تو غورال نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اپنے اہل خاندان کے ہمراہ دریائی راستے اختیار کر کے ایک طویل سفر منتخب کر لیا۔ اور آخر تقدیر نے اسے یہاں تک پہنچا دیا۔ مقصد وہی تھا۔ کوئی ٹھکانہ بچوں کی زندگی۔ اور یہ ہی سب کچھ انسان ہمیشہ سے سوچتا آیا ہے۔

اس کے بچے جوان ہو چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ انہیں دے سکتا ہے اس کے بعد باقی زندگی انہیں اپنے طور پر ہی گزارنی ہے۔ چنانچہ اس پر اس نے اپنا کوئی تسلط قائم کرنے کی بجائے ان سب کو آزادی دے دی تھی۔ وہ سب اپنی اپنی راہوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

لوگا نہ کچھ زیادہ ہی خوش قسمت تھی۔ اسے بالکل انسانوں کے انداز میں زندگی گزارنا پسند آ گیا تھا۔ اور اب اس کے جینے کا انداز بدل گیا تھا۔ ادھر دوسری لڑکیاں بھی اپنے اپنے مستقبل تلاش کر رہی تھیں۔ غورال نے ان کے فیصلے انہی پر چھوڑ دیئے تھے۔ اور وہ اپنی راہوں کے انتخاب میں تھیں۔

ادھر لڑکوں میں ہیموش نے سب سے پہلے اپنی منزل تلاش کر لی تھی۔ اصل مسئلہ انسانوں کے درمیان رہ کر انسانوں کی فطرت سے مکمل واقفیت کا تھا۔ جو بہر حال تھوڑے عرصے میں نہیں ہو جاتی۔ دنیا میں کوئی ایسا علم نہیں ہے۔ جو وقت سے پہلے تجربات دے، تجربے صرف عمر ہی کی دین ہوتے ہیں۔ ماحول سے واقفیت ماحول میں رہ کر ہی ہوتی ہے غورال نے اپنے بچوں کو فطری طور پر ناگ بنا دیا تھا۔ تمام تر خصوصیات کے ساتھ۔ اور اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ باقی کام انہیں خود کرنے تھے۔

ہیموش نے اس سلسلے میں سب سے پہلے تیر مارا تھا کہ اس نے لوگا کو اپنے وجود میں اتار لیا تھا۔ اور لوگا بہر حال ایک پراسرار بیر تھا۔ ہیموش کو اس سے خاصا فائدہ ہو رہا تھا۔ ایک دن اس نے لوگا سے پوچھا۔

"لوگا! یہ بتا۔ اس دنیا میں رہنے والے انسان بہتر اور خوبصورت زندگی کیسے گزارتے ہیں۔؟"

لوگا نے خود اسے اس کی زبان میں جواب دیا۔ "شاطر، یہ لوگ گھر بنا کر رہتے ہیں۔ یہ جو پتھر، سیمنٹ، اور مٹی کے گھر دیکھ رہا ہے۔ ان میں سے ہر گھر کی ایک کہانی ہے۔ بچپن سے یہ لوگ ماں باپ کے زیر سایہ پروان چڑھتے ہیں۔ جوان ہوتے ہیں تو اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ بوڑھے ہوتے ہیں تو اپنی بیوی بچوں کے سہارے بقیہ وقت گزار کر آخر کار ختم ہو جاتے ہیں۔ ضرورتوں میں دولت بنیادی چیز ہے۔ اور دولت کے حصول کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔"

"فرض کرو۔ میں دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"میں تجھے سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ ہیموش!"

پھر لوگا۔ اسے ریس کورس لے گیا۔ دوڑتے ہوئے گھوڑے ہیموش کو بڑے دلچسپ لگے تھے۔ لوگا نے اس کے اندر سے کہا۔

"یہ تھوڑی سی رقم جو تیری جیب میں آ چکی ہے لے اور گھوڑوں پر جوا کھیل۔"

"وہ کیسے کھیلا جاتا ہے۔؟ کیا ان کی پیٹھ پر بیٹھ کر جس طرح یہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو گھوڑوں کو دوڑاتے ہیں۔"

"نہیں ادھر جا کر۔ گھوڑوں پر نمبر لگا کر۔ میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور پھر ریس میں ہیموش جیتا تھا۔ اور اسے نوٹوں کا پورا تھیلا لے کر ریس کورس آفس سے آنا پڑا تھا۔ ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اس نے اور اس کے بعد لوگا اسے مختلف طریقوں سے دولت حاصل کرنے کے گر بتاتا رہا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہیموش ایک دولت مند آدمی بن گیا۔ اس نے ایک بہت خوبصورت مکان خریدا۔ لوگا اسے ہر طرف سے گائیڈ کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہیموش ایک امیر آدمی کی حیثیت سے اس مکان میں مقیم ہوگیا۔ اس نے لوگا سے کہا۔

"اب مجھے کیا کرنا ہے۔؟"

"بہتر یہ ہے کہ اب تو اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دے۔ ایک عزت دار آدمی کی حیثیت سے تو یہاں پہنچ گیا ہے۔ آگے اپنے آپ پر بھروسہ کر، اور میری بات سن، میں تجھے یہاں تک تو لے آیا ہوں۔ لیکن تیرا دوست بن کر۔ اس وقت تیرا صحیح ساتھی بنوں گا۔ جب تو مجھے آزاد کردے۔"

"تجھے آزاد کرنے کا کیا طریقہ ہوگا۔؟"

"وہ میں تجھے بتادوں گا۔ لیکن ایک شرط پر۔"

"ہاں..... بول۔"

"سوچ سمجھ کر مجھ سے یہ طریقہ پوچھنا۔ اور اگر خلوص دل سے مجھے آزاد کرنے پر آمادہ ہو۔ تو میری بات پر عمل کرنا۔ اگر تو نے میری بات سننے کے بعد مجھے آزاد کرنے سے انکار کیا تو میں تیرے پیٹ میں رہ کر تیرے سارے وجود میں زہر پھیلادوں گا اور تو مرجائے گا۔"

ہیموش دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ اس نے لوگا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ درحقیقت میں وہ تو ایک ناگ ہے۔ زہر چاہے کسی بھی طرح کا ہو۔ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بہرحال اس نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

ادھر دوسرا کردار نیرون تھا۔ نیرون دوسرا ذہین نوجوان تھا۔ جو ابھی اپنی زندگی کے لئے بہتر راستے تلاش کر رہا تھا۔ شلوگ جو غورال کا منجھلا بیٹا تھا۔ ابھی دنیا کے تجربے ہی کر رہا تھا۔ لیکن نیرون کی زندگی میں خود بخود ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے اسے طویل کہانی سے منسلک کردیا۔ ابھی تک اس نے اپنے لئے کوئی ایسی جگہ منتخب نہیں کی تھی۔ جو مستقل ہوتی۔ ویسے بھی ان میں سے ہر شخص ابھی تک اس دنیا کو سمجھ رہا تھا۔

نیرون اس دن شہر کے ہنگامی ماحول سے کسی قدر تنگ آکر ویرانوں کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ اور لمبا سفر طے کر کے شہری آبادی سے دور نکل آیا تھا۔ ذہنی طور پر سکون کا سمندر موجزن تھا۔ نہ آدم، نہ آدم زاد۔

قرب وجوار میں پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ ایک ٹیلے کی بلندی پر پہنچ کر بیٹھ گیا۔ باپ نے انہیں سانپوں کی فطرت بخش دی تھی۔ اور وہ سب اندرونی طور پر ناگ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مدھم سی بین کی آواز نیرون کے ذہن پر زور کی لہریں طاری کردیں۔ بین کی مدھم آواز دور سے آرہی تھی۔ لیکن ہوا کی لہریں اسے اپنے کندھوں پر سوار کر کے سفر کرا رہی تھیں۔ اور نیرون اس آواز کو سن کر مست ہوتا جا رہا تھا۔

بہت دیر تک بین بجتی رہی اور وہ مستی میں ڈوبا رہا۔ پھر جیسے ہی بین کی آواز بند ہوئی اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اب اس نے انسان کی حیثیت سے سوچا کہ بین کی آواز آخر کہاں سے آرہی ہے۔؟"

اس خیال کے تحت اس کی آنکھیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ اور پھر اسے وہ روشنی نظر آگئی جو کافی فاصلے پر تھی۔ غالباً آگ کا الاؤ روشن کیا گیا تھا۔ اس کے شعلے فضاء میں بلند ہو رہے تھے۔ اور ان شعلوں کے سائے میں کچھ انسانی بدن چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ نیرون بھلا خوفزدہ کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ تو خود ایک آوارہ روح تھا۔ ایک ناگ جو انسانی شکل میں تھا۔ لیکن ضرورت کے وقت ناگ بن سکتا تھا۔ ایک خوفناک آدم خور قبیلے سے اس کا تعلق تھا۔ بہرحال یہ سوچنے لگا کہ ذرا پتہ چلائے کہ آخر یہ کیا ہے؟ چنانچہ اس کے قدم اس جانب اٹھ گئے۔ ایک انسان ہی کی حیثیت سے وہ آگے بڑھتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس جگہ پہنچ گیا جہاں چھوٹے چھوٹے کٹے پھٹے خیمے لگے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے تھے۔ غالباً کوئی خانہ بدوش گھر وہاں قیام پذیر تھا۔ اور وہ اپنی کاروائیوں میں مصروف تھا۔

وہ انہیں دیکھتا رہا۔

زندگی رواں دواں تھی۔ ان کے درمیان، خانہ بدوش عورتیں کافی خوبصورت تھیں۔ لیکن ان میں ایک وحشت سی پائی جاتی تھی۔ اور وہ وحشت کافی دلکش لگ رہی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے سب تھے۔ پھر نیرون نے ان خانہ بدوشوں میں ایک اور عورت دیکھی نوجوان لڑکی تھی۔ حسن و جمال کا ایک دلکش شاہکار کہ آنکھیں اس پر جم کر رہ جائیں۔ اسے دیکھ کر ذہن پر ایک انوکھا سا تصور ابھرتا تھا۔ نیرون کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کی چال میں ایک انوکھا سا بانکپن ہے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ روشنی کا ایک ستون ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ پھر اچانک اس نے ایک ایسے خوبصورت نوجوان کو دیکھا۔ جوان کے قریب آ کر رک گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نجانے کیوں نیرون کے سینے میں ایک رقابت کا سا انداز پیدا ہو گیا۔ یہ نوجوان اگر اس لڑکی کا شوہر یا منگیتر ہے تو اسے اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیوں کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔

بہر حال نوجوان اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے آگے چل پڑے اور ایک ٹیلے کی آڑ میں پہنچ کر رک گئے۔ نوجوان لڑکی نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ کیلاش کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی ہو۔ مجھ سے۔؟"

"تم کوئی اچھے آدمی نہیں ہو۔ زولا۔"

"کیا مطلب۔؟"

"یہ آنے والا وقت ہے۔؟ اتنی دیر میں آئے ہو۔"

"اوہ۔ تم نہیں جانتی کیلاش کہ مجھے کیسی کیسی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چھوڑو۔ ان باتوں کو دیکھو موسم کتنا خوبصورت ہے۔ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ چاند نکلتا ہے اور چھپ جاتا ہے۔ تو یوں لگتا ہے جیسے ہم چاند سے کھیل رہے ہوں۔ آؤ..... ہم ایک دوسرے سے کھیلیں۔" نوجوان نے لڑکی کو مخاطب کیا اور وہ بے اختیار مسکرا دی۔

پھر دونوں ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ نیرون گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ ذرا سا اندازہ لگایا جائے کہ ان لوگوں کا طرز زندگی کیا ہے۔؟ کسی خاص قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر ایسے ہی جنگلوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔؟

بہر حال اس کے بعد اس نے بقیہ وقت وہیں گزارہ یہاں تک کہ رات گزر گئی۔ اور دوسری صبح آ گئی۔ وہ ان لوگوں کا طرز زندگی دیکھتا رہا۔ اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے کچھ سوکھی لکڑیاں چن کر لائے تھے۔ تاکہ ان پر کھانا پکایا جا سکے۔ ان کے ساتھ جانور بھی تھے۔ جن کا دودھ وغیرہ نکال کر وہ اپنے لئے استعمال کر رہے تھے۔ نیرون ان کی زندگی کا مکمل طور پر تجزیہ کر رہا تھا۔ جنگل کے بیل بوٹے، چھوٹے موٹے جانور، ان کی خوراک بنتے تھے۔ نیرون دلچسپی سے ان لوگوں کا جائزہ لیتا رہا۔ یہاں تک کہ دوسری رات آ گئی۔ چاند نکل آیا تھا۔ اور آج آسمان روشن تھا۔ ستارے آسمان سے جڑے ہوئے تھے۔ اور ان کے بیچ و بیچ، چاند بے حد حسین لگ رہا تھا۔

نیرون ماحول کی رنگینیوں سے دلچسپی لیتا رہا۔ لیکن اچانک ہی وہ چونک پڑا۔ اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ پھر اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ جہاں ایک سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے دیکھا ایک انتہائی چوڑے پھن کا ناگ کنڈلی مارے کھڑا ہوا ہے۔ اس کا پھن پھیلا ہوا تھا۔ اور اس کا چمکدار خوبصورت بدن ہلکی ہلکی لہریں لے رہا تھا۔ اس کی ننھی منی خوبصورت آنکھیں نیرون پر گڑی ہوئی تھیں۔ نیرون حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ یعنی غورال کے بیٹوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ نیرون اچھی طرح اپنے سارے بہن بھائیوں کو پہچانتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ناگ اس کے سامنے کیوں آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔؟

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اور اس کا پھن

اس انداز میں پھیلا ہوا تھا۔ جیسے وہ اس پر پوری پوری نگاہ رکھنا چاہتا ہو۔ بڑی دیر ہو گئی۔ نیرون کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد سانپ نے اپنا پھن سکوڑا۔ اور پھر تیزی سے ایک جانب چل پڑا۔

لیکن نیرون کو اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خود ناگوں میں سے ایک تھا۔ اور ناگ ہی بنا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ تیز رفتاری سے وہاں سے آگے بڑھا۔ اور سانپ کے پیچھے چلتا ہوا۔ ایک ٹیلے کی اوٹ میں چلا گیا۔ جیسے ہی نیرون ٹیلے کے دوسری جانب مڑا تو وہ حیران رہ گیا۔

دوسری جانب کیلاش تھی۔ جو حیران سی کھڑی ہوئی تھی۔ نیرون اسے دیکھ کر ایک لمحے کیلئے ٹھٹھک گیا۔ کیلاش کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ کچھ قدم آگے بڑھی۔ اور اس کی مترنم آواز ابھری۔

"کون ہو تم؟ ہمارے قبیلے کے تو نہیں ہو۔ اجنبی ہو؟ کہاں سے چلے آ رہے ہو۔؟" بہت سے سوالات اس نے ایک ساتھ کر دیئے۔ نیرون اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اور نجانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے لڑکی کی آنکھوں میں اسکے لئے دلچسپی سی ہے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور بولا۔

"یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں تم آسمان سے اتری ہو یا زمین سے نکلی ہو۔ اتنی حسین ہو کہ انسان کو اپنے اوپر قابو پانا مشکل ہو جائے۔"

نیرون بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیلاش ہے۔ میرا نام۔ اور تم کون ہو۔؟" لڑکی کی آواز ابھری۔

"نیرون"

"انسان ہو۔؟"

"ہاں..... انسان ہی کہہ لو۔"

"کوئی سادھو، سفت ہو؟"

"وہ کیا ہوتا ہے..... میں نہیں جانتا۔"

"ارے تم سادھو..... سفت نہیں جانتے۔؟"

"نہیں۔"

"حیرت ہے۔ خیر تم جو کچھ بھی ہو مجھے یونان کے دیوتا معلوم ہوتے ہو۔"

"تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو۔ اتنی خوبصورت لڑکی اگر مجھے یونان کا دیوتا کہہ رہی ہے۔ تو میرے لئے یہ حیرانی کی بات ہی ہو سکتی ہے۔" تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو۔"

"نہیں دیوتاؤں کو بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اور خاص طور پر مجھ جیسی معمولی عورت۔"

"تم اور معمولی۔"

"تو پھر؟" وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

"تم..... میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں۔ جو تمہارے حسن کی تعریف کر سکیں۔"

"واہ اتنی خوبصورت باتیں کرتے ہو تم کہ دل عجیب عجیب سا ہو رہا ہے۔"

"کیلاش..... تمہیں دیکھ کر میں اپنا سب کچھ بھول گیا ہوں۔"

"چلو مان، لیتی ہوں۔ تمہاری بات۔ اچھا بتاؤ کہاں رہتے ہو تم۔؟ یہاں کوئی جگہ ہے۔ تمہارے رہنے کے لئے۔ یا کہیں سے چل کر آ رہے ہو۔؟"

"نہ سادھو، ہوں۔ نہ سفت ہوں۔ نہ جوگی ہوں۔ لیکن یہ سمجھو میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ بس بھٹکتا رہتا ہوں۔"

"آؤ..... میرے ساتھ..... بڑی خوبصورت جگہ لے کر چل رہی ہوں تمہیں۔"

نیرون اس کے ساتھ چل پڑا۔ آگے ایک چھوٹا سا آبشار نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے لے کر اس آبشار کے پاس پہنچ گئی جہاں درخت اگے ہوئے تھے۔ یہ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ آسمان سے اتری چاندنی میں نیرون کیلاش کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گیا۔ کیلاش نے کہا۔

"تمہیں دیکھ کر تو اپنے آپ کو بھول جانے کو دل چاہتا ہے۔ تم اس بات کو تسلیم نہیں کر رہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم ضرور کوئی دیوتا ہو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم، اور میں خود تمہیں کوئی دیوی سمجھ رہا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دیوی اور میں۔؟ چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری دیوی اور تم میرے دیوتا۔" وہ آگے بڑھی اور اپنا چہرہ نیرون کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ حیران بھی تھا۔ اور خوش بھی اس کی پسند کی حسینہ خود بخود اس کی جانب مائل ہوگئی تھی۔ لیکن وہ جسے اس نے پچھلی رات اس حسینہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا کیا ہوگا۔ اچانک ہی نیرون کو دور کہیں سے ایک آواز سنائی دی، وہ زولا کی آواز تھی۔

"یہ کون ہے۔؟"

"ایک پاگل سر پھرا۔ جو میرے پیچھے پڑا ہے۔ لیکن جو تم سے دل لگالے اس کی نگاہوں میں بھلا اور کوئی کیسے رہ سکتا ہے۔؟" کیلاش نے کہا۔

نیرون خاصا متاثر ہوگیا تھا۔ لیکن رقیب روسیا کا تصور اس کے لئے بھی بڑا عجیب تھا۔ وہ دور سے زولا کے سائے کو دیکھتا رہا۔ زولا، دیوانوں کی طرح کیلاش کو آوازیں دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن کیلاش نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اور منہ سے کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ بہر حال زولا۔ وہاں سے تھوڑی دوری پر جاتے ہوئے آگے نکل گیا۔ کیلاش خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"اب تم یہ بتاؤ۔ تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے؟ میں تم سے کہاں مل سکتی ہوں۔"

"اسی جگہ ہر رات۔" نیرون نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اسی وقت آجایا کروں گی۔"

چنانچہ نیرون اس سے رخصت ہوگیا۔ بڑی دلچسپ بات یہ تھی کہ کیلاش کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو نیرون کو بے حد متاثر کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیلاش سے اسے اپنائیت کیوں محسوس ہو رہی ہے۔

لیکن اس دن اسے ایک بوڑھا سپیرا ملا۔ اس کے ہاتھوں میں بین تھی۔ اور وہ ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ نیرون کو دیکھ کر وہ اس کے قریب آگیا۔ اور اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"نوجوان۔ کیا تم سپیرے ہو؟ سپیروں کی اس وادی سے تمہارا کیا تعلق؟"

"نہیں بابا۔ لیکن تم کون ہو؟"

"میں سپیرا ہوں۔ ایک ناگن کو تلاش کر رہا ہوں۔ وہ ناگن جو اچھا دھاری ہے۔ یعنی اپنی جون بدل سکتی ہے۔ اتنی خوبصورت بن جاتی ہے کہ تم اسے دیکھ کے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ وہ ناگ رانی ہے۔ اور اس ناگ رانی کو قابو میں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان سپیروں میں سب سے بڑا سپیرا بن جائے۔ اگر میں نے اس ناگ رانی کو پکڑ لیا تو میرے قبیلے والے مجھے سردار بنالیں گے۔" نیرون نے گہری نگاہوں سے اس بوڑھے سپیرے کو دیکھا۔ اسے نجانے کیوں یہ شبہ ہوا تھا۔ کہ وہ یہ الفاظ کیلاش کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ لیکن ابھی وہ اس وقت تک بوڑھے سپیرے سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جب تک وہ کیلاش پر حملہ آور نہ ہوجائے۔

☆.....☆.....☆

شلوگ ان دونوں بھائیوں میں ذرا مختلف طبیعت کا مالک تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی وحشیانہ فطرت کے مطابق وہ بھی آدم خور تھا۔ اور اس کے مشاغل بھی مختلف نہیں تھے۔ وحشت اور دیوانگی میں وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود اس کے اندر شدید تجسس تھا۔ وہ اس نئی دنیا میں آکر بہت خوش تھا۔ اور اپنی فطرت و تجسس کے مطابق کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ہیموش اور نیرون تو دو مختلف راستوں پر نکل ہی کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن شلوگ اپنی چیزوں کی کھوج میں تھا۔ جو اسے اس نئی دنیا کے ماحول سے روشناس کرا سکیں۔

سر پر چمکتا ہوا نیلا آسمان، زمین کی گہرائیاں، اس نئی دنیا میں موجود وہ تمام چیزیں جو سمجھ میں نہ آئیں۔ وہ ان کے لئے بڑی دلکشی رکھتی تھیں۔ وہ مستقل اسی کھوج میں رہتا کہ کوئی نئی بات اسے معلوم ہو۔ وہ انوکھی عمارتیں اس کے لئے نہایت حیران کن تھیں۔ جہاں وہ پہنچا تھا۔ جو درحقیقت سائنسی تجربہ گاہیں تھیں۔ وہاں اندر داخل ہونے کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن شلوگ اس میں داخل ہو کر صورتحال کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

یہاں تک کہ ایک دن وہ سانپ بن کر ایک گٹر کے راستے اس عمارت میں داخل ہوگیا۔

عمارت اندر سے خاموش اور سنسان تھی۔ یہ خلائی تحقیقاتی ادارہ تھا۔ اور یہاں ہر طرف خلائی تحقیقات پر کام ہوا کرتے تھے۔ اس وقت یہاں کام کرنے والے تمام افراد چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ شلوگ کو یہی غنیمت محسوس ہوا کہ وہ سانپ بن کر مختلف جگہوں کی سیر کرتا رہے۔ چنانچہ وہ کونے کھدروں سے گزرتا ہوا اس عظیم الشان لیبارٹری میں داخل ہوگیا۔ جہاں ہزاروں سائنسی آلات بکھرے ہوئے تھے۔ عجیب و غریب آوازیں فضا میں گردش کر رہی تھیں۔

شلوگ کو یہ سب کچھ بہت دلکش محسوس ہوا۔ یہاں سائنس کی فضائی تاریخ موجود تھی۔ وہ سانپ کی حیثیت سے ان تمام مشینوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دفعتاً ہی اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ یہ باتیں کرنے کی اور انسانی قدموں کی آوازیں تھیں۔ کچھ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے۔ شلوگ کے پاس چھپنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ تیزی سے ایک سمت بڑھا۔ اور جونہی اسے ایک سوراخ نظر آیا۔ وہ اس میں داخل ہوگیا۔ حالانکہ وہ بڑی خوبصورت جگہ بنی ہوئی تھی۔ سانپ کی حیثیت سے شلوگ کو سوراخ میں چھپ کر بیٹھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ لیکن یہ عجیب و غریب خلائی مشین تھی۔ جو اشیاء کو خلاء میں منتشر کر دیتی تھی۔ اور وہاں مختلف سیاروں پر پہنچا دیتی تھی۔

شلوگ کے فرشتوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کہ کیا ہونے والا ہے۔ چند ہی لمحوں کے بعد اچانک ہی اسے اپنے بدن میں تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ اور پھر ایک عجیب و غریب دھواں اس مشین کے اندر بھر گیا۔ شلوگ کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کا جسم ذرات میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اسے یوں لگا۔ جیسے اس کے جسم کے یہ ذرات مشین سے نکل کر فضا میں منتشر ہوگئے ہوں۔

کچھ لمحوں کے لئے۔ اس کے ہوش و حواس رخصت ہوگئے تھے۔ اور نجانے کتنی دیر گزری تھی کہ اس نے اپنے آپ کو انسانی جسم میں محسوس کیا۔ اس نے اپنے اطراف میں چاروں طرف دیکھا۔ اس کے اطراف میں ریت بکھری ہوئی تھی۔ اور وہ اسی ریت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ لیکن اس کے اندر ایک عجیب و غریب سوچ ابھری رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ایک نئی نسل کا نمائندہ ہو۔

ایک انوکھا ذہن اس کے ذہن میں داخل ہوگیا تھا۔ غالباً یہ سب کچھ اسی مشینی عمل کا نتیجہ تھا۔ جو غیر متوقع طور پر سرزد ہوگیا تھا۔ وہاں موجود سائنس دان کوئی بہت ہی پراسرار تجربہ کر رہے تھے۔ اور یہ تجربہ شلوگ پر منتقل ہوگیا تھا۔

اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اس کے ارد گرد چند نیلی جھاڑیاں تھیں۔ قریب سے ایک چھپکلی دوڑتی ہوئی نکلی۔ اس کا رنگ بھی نیلا تھا۔ اور کئی پاؤں تھے۔ شلوگ نے اوپر فضاء میں دیکھا۔ اس سر زمین پر ایک گنبد نما چھت سی تھی۔ جو چاروں طرف سے ریت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ اور اس گنبد کی آخری سرحد اس سے صرف ایک سو گز پرے تھی۔ فضاء کا قطر صرف ڈھائی سو گز تھا۔ یہاں سب کچھ نیلا تھا۔ سوائے ایک سرخ چیز کے جو دور سے ایک گز قطر کے دائرے میں چمک رہی تھی۔ اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

"کیا یہ سب ایک خواب ہے؟ یہ گرمی! یہ ریت، سرخ چیز، کی طرف دیکھنے پر عجیب خوف کا احساس ہوا تھا۔ نہیں، نہیں..... یہ خواب نہ تھا۔ کیونکہ خلائی جنگ کے دوران وہ سو نہیں سکتا تھا۔ پھر کیا یہ موت ہے؟ نہیں، یہ موت بھی نہیں۔ موت اس طرح نہیں ہوسکتی۔ نیلی گرمی، نیلی ریت، اور سرخ خوفناک چیز.....اف۔"

وہ انہی باتوں کو سوچ رہا تھا۔ کہ اس نے ایک آواز سنی۔ اور یہ آواز اس نے اپنے کانوں کے بجائے اپنے سر کے اندر سے سنی۔ ان فضاؤں۔ اور اطراف و جوانب میں الفاظ اس کے دماغ میں سمانے لگے۔

اور اس جگہ وہ اسی وقت میں دو نسلوں کو موجود پاتا ہوں جو ایک زبردست جنگ میں کودنے والی ہیں۔ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسی جنگ جو کسی ایک نسل کو بالکل ختم کردے گی۔ اور دوسری کو اس قدر کمزور بنادے گی۔ کہ اس کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔ اور وہ رفتہ رفتہ خاک میں مل جائے گی۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔"

"کیوں..... تم کون ہو۔ جو یہ الفاظ کہے جارہے ہو۔؟" شلوگ کے دماغ سے یہ سوال اٹھا۔

"تم اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔" اور یہ الفاظ شلوگ کے دماغ میں رک گئے۔ "میں ہوں۔ ایک قدیم نسل کی اڑھائی منازل کی ایک انتہائی قدیم کہ جس کی ابتداء کو ان الفاظ میں بتایا ہی نہیں جاسکتا جو تمہارے دماغ میں موجود ہیں۔ ایک ایسی نسل جو ایک واحد ذات پر مرتکز ہوگئی ہے۔ اور ابدی ہے۔ پس میں آنے والی جنگ میں مداخلت کرتا ہوں۔ وہ جنگ جو بالکل ایک جیسی طاقت رکھنے والے جنگلی لٹیروں میں ہوگی۔ اور جس کا انجام تمہاری اور بیرونی حملہ آوروں دونوں کی نسل کو ختم کردے گا۔ لیکن ایک کو لازماً زندہ رہنا چاہئے۔ ایک کو لازماً ترقی پانا اور باقی رہنا ہے۔"

"ایک کو.....؟" شلوگ نے سوچا۔ "میری نسل یا دوسرے کی نسل۔؟"

"یہ میرے اختیار میں ہے۔ کہ جنگ کو ختم کردوں۔ بیرونی حملہ آوروں کو ان کی کہکشاؤں میں واپس بھیج دوں۔ لیکن وہ پھر حملہ کرنے آجائیں گے۔ یا تمہاری نسل کے لوگ جلد یا بدیر ان کو وہاں جالیں گے۔ اگر دونوں ہی اس فضاء میں موجود ہوں گے۔ تو میں ایک دوسرے کو تباہ ہونے سے نہ روک سکوں گا۔ اور پھر میں بھی باقی نہ رہ سکوں گا۔" الفاظ اس کے دماغ میں ریکارڈ ہونے لگے۔ واپس مجھے لازماً دخل دینا ہے۔ میں ایک بیڑے کو تباہ کردوں گا۔ دوسرے کی تباہی کے بغیر، اس طرح ایک تہذیب کو لازماً باقی رہنا ہے۔"

شلوگ نے سوچا۔ "خواب!"..... لیکن یہ خواب نہیں ہوسکتا ہے۔ پھر اس نے سوچا۔ "کون سی تہذیب اور نسل باقی رہ جائے گی؟"

"خاموش!" آواز نے کہا۔ "زیادہ طاقت والا لازماً رہے گا۔ میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ میں صرف اس لئے دخل دے رہا ہوں۔ کہ مکمل فتح حاصل ہو۔ میں نے اس قبیلے کے لئے میدان جنگ سے دو انسان چن لئے ہیں۔ ایک تم اور دوسرا وہی اجنبی۔ میں تمہارے ذہن سے معلوم کرچکا ہوں کہ تمہارے ابتدائی دور میں دو قوموں کی جنگ کا فیصلہ کرنے کے لئے طرفین کے دو پہلوانوں کی لڑائی غیر معروف نہ تھی۔ تم اور تمہاری مخالف یہاں میدان میں موجود رہو۔ اور بغیر کسی ہتھیار کے۔ اور دونوں ہی ان حالات میں ایک دوسرے سے تم دونوں قطعاً ناواقف ہو۔ اس جنگ کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں بچ جانے والا اپنی نسل کا ہیرو ہوگا۔ اور اسی کی نسل بقاء حاصل کرے گی۔"

"لیکن شلوگ کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ اس کے سوال کا جواب آ گیا۔ "یہ بالکل صحیح طریقہ ہے۔ دونوں کے حالات ایسے ہیں کہ جسمانی قوت حتمی طور پر مسئلہ کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ یہاں ایک دیوار ہے۔ ذہنی طاقت اور ہمت حوصلہ زیادہ اہم ہوگا۔ قوت کے مقابلہ میں سب سے اہم حوصلہ بہادری اور جرأت ہے۔ جو بچنے والے کے اندر ہوگی۔"

"لیکن جب ہم لڑ رہے ہوں گے تو دونوں کے خلائی بیڑے۔؟" شلوگ نے سوچا۔

"نہیں۔ تم ایک دوسری فضا میں ہو۔ میں ایک دوسرے وقت میں اس لئے کہ جب تک یہاں ہو فضا میں وقت خاموش رہے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم تعجب کررہے ہو کہ یہ جگہ حقیقی ہے۔ ہاں۔ یہ حقیقی ہے۔ اور حقیقی بھی نہیں جیسا کہ میں تمہاری محدود ذہانت کے لحاظ سے ہوں بھی، نہیں بھی۔ میرا وجود ذہنی ہے۔

جسمانی نہیں۔ تم نے مجھے ایک سیارے کی شکل میں دیکھا ہے۔ یہ ایک ذرہ ہوسکتا ہے۔ یا ایک سورج۔ لیکن تمہارے لئے اب یہ جگہ حقیقی ہے۔ یہاں جو کچھ تم کروگے وہ اصل ہوگا اور تمہارا وہی عمل آخری ہوگا۔ اور اگر یہاں تم مرگئے۔ تو وہ حقیقی موت ہوگی۔ یہاں تمہاری ناکامی تمہاری نسل کا خاتمہ ہوگی۔ تمہارے جاننے کے لئے

اتنا ہی کافی ہے۔" اور تب آواز بند ہوگئی۔

اب وہ پھر اکیلا تھا۔ لیکن بالکل اکیلا نہیں۔ اس لئے جب شلوگ نے اوپر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سرخ شے وہ خوفناک سرخ حلقہ ہی اجنبی تھا۔ اور اس کی طرف لڑھکتا ہوا آرہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نہ تو ٹانگیں ہیں نا بازو اور نہ کوئی جسمانی ساخت، وہ پتلی ریت پر لڑھکتا ہوا آیا۔ پارے کی سی تیزی کے ساتھ، وہ اسی وقت شلوگ کے دماغ میں اس کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

دشمن دور سے لڑھکتا ہوا آرہا تھا۔ شلوگ نے قریب سے ایک پتھر اٹھایا تاکہ مقابلہ کرسکے۔ لیکن دشمن اتنی تیزی سے سر پر آ گیا۔ کہ اسے جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا۔ اس کے پاس اتنا بھی وقت نہ تھا۔ کہ دشمن سے لڑائی کے متعلق سوچ سکے۔ اسکیم بنا سکے۔ ایک ایسی مخلوق سے جنگ کی اسکیم جس کی طاقت، جس کے عادات واطوار، اور جس کے طریق جنگ کے متعلق اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔

پانچ گز کے فاصلے پر دشمن رک گیا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اسے زبردستی روک دیا ہو۔ سامنے ایک نہ دکھائی دینے والی دیوار تھی۔ جس سے آگے دشمن نہ آسکتا تھا۔ تب شلوگ کو یاد آیا کہ یہ جنگ جسمانی طاقت سے نہیں جیتی جاسکتی۔ بلکہ اس کے لئے ذہنی قوت سے کام لینا ہوگا۔ گیند نما دشمن بار بار دیوار سے ٹکراتا تھا۔ اور پیچھے گر جاتا تھا۔ شلوگ بارہ قدم آگے آیا۔ تو اس کے ہاتھوں نے بھی دیوار کو محسوس کرلیا۔ یہ شیشے کی بجائے ربڑ کی چادر کی طرح نرم تھی۔ اور چھونے سے گرم محسوس ہوتی تھی۔ اس نے دیوار کو اوپر سے اور دائیں بائیں اطراف سے دیکھا۔ لیکن دوسری طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اسے خیال آیا کہ دیوار کے نیچے سے کھود کر دوسری طرف جانے کا راستہ بنائے۔ اور دشمن پر حملہ کرے۔ نادیدہ ربڑ کی دیوار چھونے سے گرم محسوس ہوتی تھی۔ لیکن یہ انتہائی عجیب تھی۔ کہ بالکل قریب سے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود بھی ربڑ کی دیوار نظر آتی تھی۔ شلوگ نے کچھ سوچ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر ایک طرف ڈال دیا۔ اور دونوں ہاتھ نادیدہ دیوار پر رکھ کر اسے دھکیلا۔ اس میں بلاشبہ لچک موجود تھی۔ لیکن زیادہ نہیں۔ پوری قوت صرف کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نہ نکلا کہ دیوار چند انچ پرے ہوکر پھر اصل جگہ پر واپس آ گئی۔

پھر شلوگ اپنے پنجوں کے بل کھڑا ہوکر دیوار کی بلندی معلوم کرنے لگا۔ جہاں تک اس کی انگلیاں پہنچ سکیں۔ وہاں تک دیوار موجود تھی۔ شلوگ نے دیکھا کہ گیند نما سرخ دشمن لڑھکتا ہوا۔ پھر اس کی جانب آرہا ہے۔ اسے دوبارہ ابکائی سی محسوس ہوئی۔ اور وہ دیوار سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ لیکن دشمن نہیں رکا۔ وہ اپنی طرف دیوار کے ساتھ ساتھ ایک جانب چلا آیا تھا۔ شلوگ کے دل میں خیال آیا شاید یہ نادیدہ دیوار محض زمین کی سطح تک ہی قائم ہو۔ اور زمین کھود کر دوسری جانب نکلنے کا راستہ مل سکے۔ یہ سوچ کر وہ جھکا اور ریت ہٹانے لگا۔ ریت بہت نرم اور ہلکی تھی۔ اور اسے آسانی سے کھودا جاسکتا تھا۔ چند منٹ میں اس نے دو فٹ گہرائی تک ریت نکال ڈالی اور پھر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو وہاں بھی نادیدہ دیوار کی رکاوٹ محسوس ہوگئی۔

سرخ دشمن واپس پلٹ رہا تھا۔ ظاہر ہے۔ اسے بھی اپنی حدود سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملا۔ شلوگ نے سوچا ضرور بالضرور اس دیوار سے گزرنے کا کوئی راستہ ہونا چاہئے۔ کوئی ایسا طریقہ جس کے باعث ہم دو دشمن ایک دوسرے کے آمنے سامنے آسکیں۔ ورنہ یہ لڑائی قطعی فضول ہے۔ لیکن یہ پراسرار راستہ تلاش کرنے کے لئے ابھی جلدی کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے ایک کوشش اور کرنی چاہئے۔

گیند نما دشمن اب نادیدہ دیوار کے بالکل پاس موجود تھا۔ انداز آدھ فٹ کے فاصلے پر۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ شلوگ کی شخصیت کا بغور جائزہ لے رہا ہے۔ شلوگ نے بھی اس پر نگاہیں جمادیں۔ خدا کی پناہ، کتنی عجیب وغریب شے ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر اس کو دنیا کی کسی چیز یا شکل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔؟ اس کے ذہن میں اس عجیب دشمن کی شخصیت محسوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے لئے کوئی خارجی شہادت موجود نہ تھی۔

اس کے کان، آنکھیں، منہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ محض گولائی، البتہ شلوگ نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ اس کے جسم میں بہت سے سوراخ ہیں۔

اور پھر دفعتاً ان سوراخوں میں سے دو لمبے لمبے پنجے برآمد ہوئے اور ریت میں دھنس گئے۔ جیسے وہ ریت کا معائنہ کر رہے ہو۔ ان حیرت انگیز پنجوں کا قطر ایک انچ کے قریب اور لمبائی شاید ڈیڑھ فٹ تک تھی۔ لیکن یہ پنجے سوراخوں میں پوشیدہ رہتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت ہی باہر نکلتے تھے۔ اور جب سرخ دشمن کا جواب دے سکے۔ اور بلاشبہ اس کا جواب موصول ہوا اور شلوگ دہشت سے لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جنگ کا خواہشمند تھا۔ اس کا پیغام اتنا صاف نہیں تھا۔ جتنا ذات ابدی نے شلوگ کے دماغ میں داخل کیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کا مطلب سمجھ گیا اس نے اپنے ذہن سے دشمن کے خوف کا احساس خارج کیا۔ اب وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اور اپنے آپ کو نحیف محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ابھی سوچنے سمجھنے کی قوت بحال تھی۔ اور وہ وہیں کھڑا ہو کر اس عجیب و غریب دشمن کو بندر دیکھتا رہا۔ اور ذہنی جنگ کے دوران اس کا دشمن بھی بے حس و حرکت اپنی جگہ پر موجود رہا۔ اور یہ جنگ وہ تقریباً جیت چکا تھا۔

پھر وہ چند منٹ تک لڑھک کر اس جگہ ٹھہر گیا جہاں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پھر اس کے جسم کے سوراخوں میں سے تین پنجے برآمد ہوئے۔ اور انہوں نے جھاڑیوں کا معائنہ شروع کر دیا۔

"اچھا، دوست، پھر جنگ ہی سہی۔" شلوگ نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا۔ "اگر میں نے تمہارا پیغام صحیح طور پر وصول کر لیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم امن پسند نہیں ہو۔ اب موت ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔"

لیکن اس فقرے کا مطلب کیا تھا۔ ایک نسل کا بالکل خاتمہ، قطعی تباہی خواہ وہ نسل شلوگ کی دنیا میں بسنے والی ہو، یا خلاؤں میں بسنے والی سرخ دشمن کی نسل ہو۔ ان دونوں میں سے ایک کا اختتام لازمی تھا۔ اور یہ خیال آتے ہی دفعتاً اس کا دل انسانی ہمدردیوں اور محبت سے لبریز ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ انسانی نسل ختم ہو جائے گی جتنا زیادہ وہ اس پر غور کرتا اسے یہ وہم حقیقت بنتا محسوس ہوتا تھا۔

شلوگ کو ایک ایسی طاقت نے جو عقل انسانی کے دائرے سے خارج ہے۔ اپنے مدعا اور طاقتوں کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ سب سچ تھا۔ اور اب نسل انسانی کی قسمت کا دارومدار محض ایک ذات واحد شلوگ پر رہ گیا تھا۔ خدا رحم کرے، اسے محسوس کرنا ہی کتنی اذیت ناک بات تھی۔ لیکن پھر اس نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دیا۔ وہ موجودہ صورتحال پر غور کرنا چاہتا تھا۔ بار بار اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ اس نادیدہ دیوار کو عبور کر کے دشمن کو ہلاک کرنے کا کوئی راستہ ضرور ہے۔ ضرور ہونا چاہئے۔ کیا دماغ راستہ ہوگا؟" اگر ایسا ہے تو پھر اس کا دشمن ذہنی طور پر اس سے زیادہ طاقتور ہے۔ چونکہ وہ اس کی ذہنی پیغام رسانی کی طاقت کا تجربہ کر چکا تھا۔

شلوگ اپنے ذہن میں دشمن کے متعلق تمام تصورات و احساسات کو خارج کر دینے کے قابل تھا۔ لیکن اس کا دشمن بھی اس بات پر قادر ہے۔ شلوگ اسے ٹکٹکی باندھ کر تکنے لگا۔ اور اپنے ذہن کی تمام قوت کو اس پر مرکوز کر کے دل میں کہنے لگا۔

"مرنا ..... ہے تمہیں ..... تمہیں مرنا ہے۔ تم مر رہے ہو۔ تم مر....." شلوگ کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اور اس دماغی جدوجہد اور دباؤ کے باعث اس کا جسم کانپنے لگا۔ لیکن اس عجیب و غریب مخلوق پر اس کا کوئی اثر محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے جھاڑیوں کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس جدوجہد اور ذہنی طاقت صرف کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شلوگ اپنے آپ کو نحیف محسوس کرنے لگا۔ بے پناہ گرمی کی بدولت اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ اور اس پر غنودگی کی حالت طاری ہو گئی تھی۔

وہ آرام کے لئے ریت پر لیٹ گیا۔ اور پوری توجہ سے اس عجیب چیز کی حرکات کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس

نے سوچا۔ ممکن ہے۔ اس قریبی مطالعے سے اسے اپنے دشمن کی قوت اور کمزوریوں کا سراغ مل جائے۔ سرخ دشمن جھاڑیوں کی شاخیں اکھاڑ رہا تھا۔ شلوگ ہوشیاری سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ جھاڑیوں سے شاخیں اکھاڑنے کا کام کتنا سخت ہو سکتا ہے۔

اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنے حصے میں بھی ایسی ہی جھاڑیوں سے شاخیں جھاڑیوں سے شاخیں اکھاڑنے کی کوشش کرے۔ تاکہ اپنے بازوؤں اور جسمانی قوت سے مقابلہ کر سکے۔ اس نے دیکھا کہ سرخ مخلوق کو شاخیں اکھاڑنے میں سخت محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اور اس کام میں اس کا ہر پنجہ مصروف تھا۔

شلوگ نے دیکھا کہ ڈیڑھ فٹ لمبے پنجے میں دو انگلیاں اور ان انگلیوں میں بڑے بڑے ناخن ہیں۔ لیکن یہ ناخن زیادہ خطرناک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اگر انسانی ناخنوں کو بڑھنے دیا جائے۔ تو شاید وہ بھی ایسے ہی ہو جائیں۔ شلوگ نے اپنے حصے میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور بلاشبہ دائیں طرف وہی نیلی جھاڑی موجود تھی۔ وہ اس کے قریب گیا۔ اور ایک شاخ اکھاڑ لی یہ شاخ ہلکی سی تھی۔ اور آسانی سے توڑی جا سکتی تھی۔ دوسری جانب شلوگ یہ سوچ رہا تھا کہ دشمن کو کیسے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔؟ اگر اسے موقع مل گیا تو دشمن کو کس طریقے سے مجروح کر سکے گا؟ پھر وہ واپس آ گیا۔ اور سرخ مخلوق کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ کافی سخت نظر آتا تھا۔ اور اس پر ضرب پہنچانے کے لئے کسی تیز ہتھیار کی ضرورت تھی۔

شلوگ نے وہی لمبا سا پتھر پھر اٹھا لیا۔ یہ بارہ انچ لمبا نوکیلا پتھر تھا۔ اور نوک کی جانب سے کافی تیز تھا۔ دوسری طرف سرخ مخلوق مسلسل نیلی جھاڑیوں کا معائنہ کرنے اور شاخیں اکھاڑنے میں مصروف تھی۔ ایک جھاڑی کے نیچے سے ایک چھوٹی سی نیلی چھپکلی نکل کر بھاگ نکلی۔

وہی چھپکلی جو شلوگ اس سے پیشتر دیکھ چکا تھا۔

لیکن سرخ مخلوق کا ایک پنجہ تیزی سے اس پر جھپٹا اور چھپکلی کی ٹانگیں اکھاڑنے لگا۔ بالکل اسی طرح سکون و اطمینان سے جیسے وہ جھاڑیاں اکھاڑ رہا تھا۔ چھپکلی اس کے پنجے میں دبی ہوئی تھی۔ اور اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اس دوران میں چھپکلی نے ایک ہلکی سی چیخ ماری۔ اور یہ پہلی آواز تھی جو اس خاموش فضاء میں شلوگ کے کانوں نے سنی۔

یہ منظر دیکھ کر شلوگ ایک بار پھر کانپ اٹھا۔ وہ اس جگہ سے اپنی نظریں ہٹا لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے طبیعت پر قابو پا کر یہ تماشا دیکھنا جاری رکھا۔ کیونکہ اپنے اور مد مقابل کی ہر حرکت کا مضبوط مطالعہ کرنا ہی اس کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اور پھر چند ہی منٹ بعد ہی چھپکلی بے جان ہو کر سرخ مخلوق کے پنجوں میں دبی ہوئی تھی۔

ابھی اس کی ٹانگیں باقی تھیں۔ لیکن سرخ مخلوق نے انہیں اکھاڑنے کی ضرورت نہ سمجھی اور دفعتاً وہ مری ہوئی چھپکلی شلوگ کی جانب اچھال کر پھینک دی۔ مری ہوئی چھپکلی فضا میں اڑتی ہوئی آئی اور شلوگ کے پیروں کے قریب گر پڑی۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ مری ہوئی چھپکلی نادیدہ دیوار کو عبور کر کے آئی تھی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نادیدہ دیوار اب غائب ہو چکی ہے۔؟

پتھر کا چاقو ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر شلوگ بجلی کی مانند اپنے دشمن کی جانب لپکا سنہری موقع تھا۔ اسے ہلاک کرنے کا وہ نادیدہ دیوار اگر موجود نہ ہو تو۔ لیکن افسوس دیوار غائب نہیں تھی۔ وہ ویسے ہی قائم تھی۔ شلوگ کا سر شدت سے دیوار سے ٹکرایا۔ اور وہ پیچھے کی جانب جا پڑا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے اچانک اس نے دیکھا کہ کوئی شے فضاء میں بلند ہوتی ہوئی اس کی جانب آ رہی ہے۔ اس سے بچنے کیلئے وہ ریت پر لیٹ گیا۔

لیکن وہ پھر بھی محفوظ نہ رہا۔ ایک پتھر بڑے زور سے اس کی بائیں ٹانگ کی پنڈلی پر پڑا اور درد کی ایک زبردست ٹیس سارے جسم میں دوڑ گئی۔

لیکن وہ اس تکلیف کو نظر انداز کر کے جلدی سے پیچھے لڑھک گیا۔ کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سرخ دشمن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک اور پتھر پھینکنے کی تیاری کررہا ہے۔ اس نے اپنے دو پنجوں میں پتھر پکڑ رکھا تھا۔ اور پھر پتھر سنسناتا ہوا۔

شلوگ پتھر کی زد سے دور پہنچ چکا تھا۔ سرخ دشمن کا پتھر زیادہ دور تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پہلے پتھر کی ضرب سے شلوگ بے خبری میں زخمی ہوگیا ورنہ وہ ضرور محفوظ ہوجاتا۔

پھر شلوگ نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اور پوری قوت سے ایک پتھر سرخ دشمن کی جانب پھینک دیا۔ اور پتھر نادیدہ دیوار پار کرکے دشمن کی سرحد میں جا پڑا۔ اب سرخ مخلوق کے بھاگنے کی باری تھی۔ بڑی تیزی سے گردش کرتا ہوا وہ اپنے میدان کے آخری کنارے تک پہنچ گیا۔ شلوگ اپنی فتح پر ہنس پڑا۔

لیکن جونہی اس کی نظر اپنی پنڈلی کے زخم پر پڑی۔ اس کی ہنسی یکلخت رک گئی دشمن کے پتھر نے اس کی ٹانگ کو بڑا گہرا زخم پہنچایا تھا۔ کئی انچ لمبا زخم تھا۔ اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ شلوگ نے سوچا اگر خون خود رک جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ ورنہ سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس زخم کے بدلے میں اب وہ ایک نئی حقیقت دریافت کرچکا تھا۔ یعنی نادیدہ دیوار کی ایک خصوصیت۔ وہ دوبارہ اس دیوار کی جانب گیا۔ اور اپنے ہاتھوں سے اسے چھوا۔

پھر ایک دیوار پر ہاتھ رکھ کر اس نے دوسرے ہاتھ سے مٹھی بھر ریت پھینکی۔ وہ دیوار سے پار ہوگئی۔ لیکن اس کا ہاتھ باہر نہ جاسکا۔ عجیب بات تھی۔ مادی اشیاء اور غیر مادی اشیاء میں یہ دیوار فرق محسوس کرلیتی تھی۔ لیکن نہیں، مری ہوئی چھپکلی نے بھی تو یہ دیوار عبور کرلی تھی۔ اور ایک چھپکلی خواہ زندہ ہو یا مری ہوئی یقیناً ایک مادی شے نہیں ہوسکتی۔

شلوگ نے ایک شاخ توڑی اور اسکو دیوار سے گزارنا چاہا۔ شاخ دیوار سے گزر گئی جب انگلیاں دیوار کے قریب آئیں تو وہ باہر نہ نکل سکیں۔ آہ، نہ تو وہ خود اس حد سے نکل سکتا تھا۔ اور نہ دشمن اس کی حد میں آسکتا تھا۔ لیکن پتھر، ریت، شاخیں اور ایک مردہ چھپکلی؟ کیا زندہ چھپکلی بھی اس نادیدہ دیوار سے باہر نکل سکتی ہے۔؟

جھاڑیوں کے اندر سے اس نے ایک چھپکلی پکڑی اور اسے آہستہ سے نادیدہ دیوار کی طرف پھینکا۔ لیکن چھپکلی دیوار کے پار نہ جاسکی۔ اور اس سے ٹکرا کر گر گئی۔ اور تیزی سے ایک جھاڑی میں چھپ گئی۔ لیکن شلوگ کو اس معمے کا حل مل چکا تھا۔ زندہ اشیاء اس دیوار کو پار نہ کرسکتی تھیں۔ البتہ مرا ہوا جسم یا مادی اشیاء کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ پھر اس کا دھیان اپنی زخمی پنڈلی کی طرف گیا۔ خون بہنا کم ہوگیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اسے اس کے لئے اب زیادہ فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن کم از کم پانی تو ضرور ملنا چاہئے۔ بشرطیکہ یہاں پانی دستیاب ہوسکے۔ اور زخم دھویا جاسکے۔

پانی کا خیال آتے ہی۔ شلوگ کو محسوس ہوا کہ پیاس سے اس کا حلق سوکھ گیا ہے۔ اسے ہر قیمت پر پانی تلاش کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ جنگ اس کے لئے مہلک بن جائے گی پس وہ لنگڑاتا ہوا اپنے حصے کے میدان میں چکر لگانے لگا۔ دائیں طرف کی آخری حد تک پہنچ کر اس نے اس پراسرار نادیدہ دیوار کو دیکھ لیا۔ یہاں وہ صاف نظر آرہی تھی۔ نیلی مائل بھورے رنگ کی دیوار اور اس کی سطح ویسی ہی تھی۔ جیسی درمیانی حصے کو محسوس ہوتی تھی۔ گرم اور ربڑ کی مانند لچکدار۔ یہاں بھی اس نے دیوار پر ریت پھینک کر تجربہ کیا اور واقعی ریت پار ہوگئی۔

کئی بار وہ ادھر سے ادھر اس طویل قید خانے میں آیا گیا۔ لیکن پانی کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ پیاس کا احساس اس پر شدت سے طاری ہورہا تھا۔ بے پناہ حرارت تھی۔ اندازے کے مطابق ایک سو تیس فارن ہائیٹ اور فضاء میں ہوا کی ہلکی سی تحریک نہ تھی۔ بار بار چلنے سے اسکی پنڈلی کا زخم اور خراب ہوگیا تھا۔ اور اب وہ بمشکل چل سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی اندازہ کیا کہ سرخ دشمن کی حالت بھی غالباً صحیح نہیں رہی۔ کیونکہ ذات ابدی نے بتایا تھا کہ اس مقام کی فضاء دونوں کے لئے اجنبی اور غیر تسکین دہ ہے۔ ممکن ہے دشمن کسی ایسے سیارے سے آیا ہو جہاں دو سو درجۂ حرارت بھی نارمل کہلاتا ہو اور ممکن ہے، اسے یہاں سردی محسوس ہورہی ہو۔

(جاری ہے)

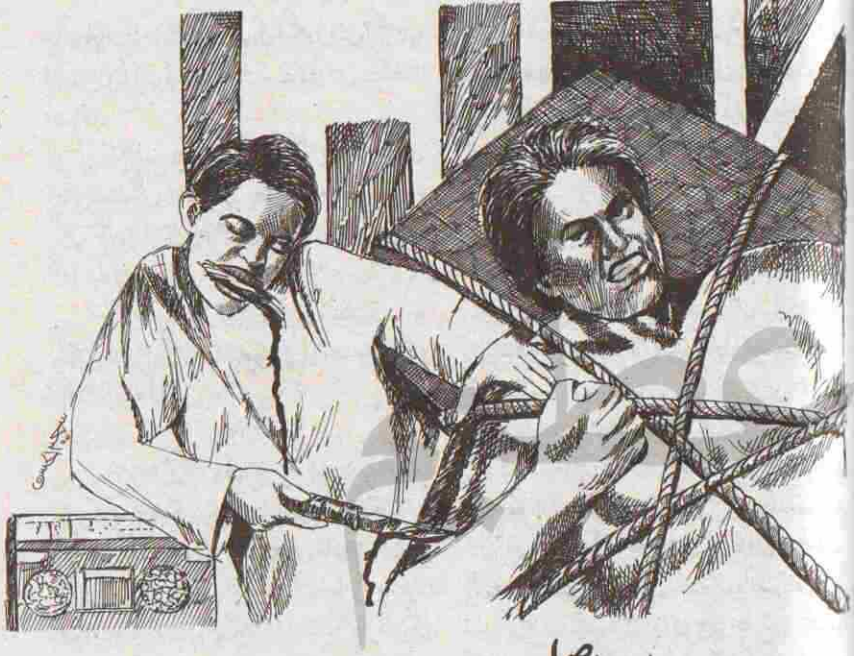

لاحاصل

ذوالقرنین خان-کوئٹہ

سامنے کھڑے وجود کی آنکھوں سے اچانک سرخ روشنی نکل کر نوجوان کی طرف بڑھی کہ نوجوان نے اپنی سیدھی انگلی سامنے کردی تو اس کی انگلی سے سفید روشنی نکل کر آگے بڑھی کہ سرخ روشنی پلٹ گئی اور اپنے ہی عامل کو جلا کرخاکستر کردیا۔

رات کی تاریکی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں رونگٹے کھڑے کرتی دہشت ناک کہانی

اسے نہیں معلوم تھا۔ اس کا یہ فیصلہ درست ہے یا وہ ایک بہت بڑی غلطی کرنے جارہا ہے۔ اگر یہ ایک درست فیصلہ تھا تو وہ، وہ سب کچھ پالیتا جس کا اسے بچپن سے ارمان تھا اور اگر یہ فیصلہ غلط ثابت ہوتا تو اس غلطی کا انجام بہت بھیانک تھا۔ اس کے پاس سوچنے کی مہلت ختم ہورہی تھی۔ اس کے سامنے شیشے کے ایک عجیب نمونہ کے برتن میں قید ریت ایک حصے سے دوسرے حصے میں تیزی سے سرک رہی تھی، جیسے ہی یہ ریت اوپر والے حصہ سے نیچے والے حصے میں منتقل ہوجاتی تو اس کے پاس فیصلے کا وقت ختم ہوجاتا۔ اس کے دماغ پر دباؤ مسلسل بڑھتا جارہا تھا۔ اسے اپنی ماں کی یاد اور اپنی اکلوتی بہن کی شرارتیں یاد آرہی تھیں۔ مگر پھر اس نے یہ سب اپنے دماغ سے جھٹک دیا، وہی کچھ نیا کرنے کی دھن اس پر غالب آنے لگی تو اس نے ایک طویل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سانس لیا اپنے سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جو اس کی اس کیفیت سے کافی دیر سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" اس کی فیصلہ کن آواز سامنے شخص کی سماعتوں سے ٹکرائی تو یہ سن کر جیسے وہ شخص اچھل پڑا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آنے لگی۔

"تو پھر آج ہی سے کام شروع کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس شخص کے چہرے پر خباثت کچھ اور بھی زیادہ نظر آنے لگی۔

☆......☆......☆

عامر صدیقی انڈیا کی ریاست گجرات کے شہر احمد آباد کے گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اس کے والد انگلش کے پروفیسر تھے۔ والدہ سادہ سی گھریلو خاتون تھیں اس کی صرف ایک بہن تھی۔ عامر کو پراسرار کہانیوں سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اسٹیفن کنگ کی (Every thing's Eventual) اس کی پسندیدہ ترین کتاب تھی۔ کسی بھی انہونے واقعہ کا سن کر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ خصوصاً جب اس کے ہندو دوست اسے کسی عجیب و غریب واقعہ کے بارے میں بتاتے تو وہ بہت دلچسپی سے سنتا اور بعض اوقات کھوج لگانے کی بھی کوشش کرتا۔ کچھ نیا سیکھنے کی دھن اسے ہمیشہ بے چین رکھتی، کچھ ایسا جو دوسروں کو حیران کر دے اور وہ عام اصول وقوانین سے ہٹ کر ہو۔

کالج میں ایک تقریب کے سلسلے میں اس دن کوئی بھی پریڈ نہیں ہوا، باغیچے میں بیٹھے اسٹوڈنٹ گپے ہانک رہے تھے۔ باتوں کا رخ اچانک بدر پور کے ایک سادھو کی جانب پھر گیا جو چند مہینوں سے وہاں موجود تھا اور اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ بدر پور کے لوگوں نے پہلے پہل تو اس سے کوئی تعرض نا رکھا۔ مگر ایک دن ایک عجیب و غریب اور انوکھے واقعے نے ان سب کی توجہ اس سادھو کی طرف مبذول کروادی۔

کالی داس جو کوڑھ کے لاعلاج مرض میں مبتلا تھا اور قریب المرگ تھا۔ بدر پور گاؤں کے لوگوں نے اس کے لئے گاؤں سے دور ایک جھونپڑی بنا دی تھی۔ صبح شام اس کی جھونپڑی کے قریب کھانا رکھ دیا جاتا۔ وہ گھسٹ کر جھونپڑی سے نکلتا کھانا اٹھاتا اور جھونپڑی میں گھس جاتا۔

اس شام بلراج نے کھانا پہنچانا تھا۔ وہ کھانا لے کر کالی داس کی جھونپڑی کی طرف چل دیا، وہاں پہنچ کر دیکھا صبح کا کھانا جوں کا توں پڑا ہے۔ اس نے زوردار آواز سے کالی داس کو آوازیں دیں مگر کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

ہمت کر کے وہ آگے بڑھا جھونپڑی میں جھانک کر دیکھا تو وہ خالی تھی۔ اس نے پھر زوردار آواز میں کالی داس کو پکارا، بغور اردگرد کا مشاہدہ کیا مگر اسے دور دور تک کالی داس نظر نہیں آیا۔ وہ پریشانی میں گاؤں کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر میں گاؤں کے سرکردہ لوگ جھونپڑی کے باہر موجود تھے۔ ابھی وہ اسی سوچ بچار میں تھے کہ انہیں دور سے ایک شخص اپنی طرف آتا دکھائی دیا، اس کے ہیولے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی مضبوط جسم کا شخص تھا جب وہ قریب آیا تو اسے دیکھ کر بہت سے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں اور باقی حیرت سے گنگ ہو گئے کیونکہ وہ کالی داس تھا۔ جو بھلا چنگا اپنی ٹانگوں پر چل کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ یہ بات کچھ ہی دیر میں گاؤں میں پھیل گئی، یہ سب اس سادھو کی کرامات کی بدولت تھا۔ کالی داس کا لاعلاج مرض بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔

اگلے دن لوگ جوق در جوق اس سادھو کے پاس حاضر ہونے لگے۔ علاقے کے دوسرے گاؤں تک بھی یہ خبر پھیل چکی تھی بلکہ کچھ باتیں خود سے بھی لوگوں نے گھڑ لی تھیں۔ لوگ اس سادھو سے ملنے کے لئے بہت بے چین ہو رہے تھے۔ ادھر سادھو تنگ آ گیا، ہر وقت اس کی جھونپڑی کے باہر سودوسو لوگوں کا مجمع رہنے لگا۔ بالآخر تنگ آ کر سادھو نے لوگوں سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ساتھ ہی دھمکی دی اگر مزید اس کے آرام میں خلل ڈالا گیا تو وہ یہ جگہ ہی چھوڑ دے گا۔

بدر پور والوں نے جب یہ سنا کہ اتنا بڑا گیانی انہیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اور وہ اس کی برکت سے محروم ہو جائیں گے۔ لہذا انہوں نے سادھو کی جھونپڑی کے باہر سخت پہرا قائم کر دیا۔ اور وہاں موجود لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ اس خدمت کے نتیجے میں بدر پور والے سادھو کے ہم خیال ٹھہرے، سادھو نے ان کے کافی مسئلے حل کیے۔

بدر پور اور سادھو کا سن کر عامر کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ بدر پور دراصل اس کا ننھیال تھا۔ اس نے اس وقت تہیہ کر لیا کہ وہ ضرور اس سادھو سے ملے گا۔

بدر پور احمد آباد کے مشرق میں بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ گھر پہنچ کر عامر نے اپنے والد اور والدہ سے بدر پور جانے کی اجازت چاہی۔ اس اچانک پروگرام سے وہ حیران تو ہوئے مگر اجازت دے دی۔

اور اب وہ سادھو کے سامنے بیٹھا تھا۔ سادھو کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ اس عجیب نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔ جو دوسروں کی طرح اپنا مسئلہ حل کروانے کے بجائے اس سے وہ علم سیکھنا چاہ رہا تھا جس کے ذریعے وہ دوسروں کے مسائل حل کرتا تھا۔

"بالک! یہ بہت کٹھن راستہ ہے، تو ابھی جوان ہے اپنی جوانی خراب نا کر، یہ موت کا کھیل ہے موت کا...... ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے؟" سادھو نے ناصحانہ انداز میں عامر کو سمجھایا۔

"مگر بابا میں یہ موت کا کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔ ہر حال میں وہ علم سیکھنا چاہتا ہوں جو آپ کے پاس ہے۔" عامر نے سادھو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوط لہجے میں کہا۔

سادھو کچھ دیر اس کی طرف ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور اس کی دلیرانہ جرأت سے سادھو کچھ متاثر ہو گیا "تو پھر رات کو دو بجے تو مجھے سامنے والے برگد کے درخت کے پاس آ کر مل، پھر معلوم ہو جائے گا کہ تو کتنے پانی میں ہے اگر تو امتحان میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھے ضرور وہ علم دوں گا۔ ناکامی کی صورت میں اس راہ پر چلنے کا خیال دل سے نکال دینا۔" یہ کہہ کر سادھو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے۔

سادھو کے سامنے تو اس نے بہت آسانی سے موت کا کھیل کھیلنے کی آرزو کا اظہار کر دیا مگر جیسے جیسے اندھیرا چھا رہا تھا اس کے دماغ میں خوف کی لہریں بھی بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

رات ڈیڑھ بجے کا وقت تھا اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، اتنا سخت اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کشش و پنج میں مبتلا تھا کہ کیا کرے؟ سادھو کی طنزیہ مسکراہٹ اس کے تصور میں آ گئی۔ "اگر وہ نا پہنچا تو سادھو اس کے بارے میں کیا سوچے گا۔" اس تصور نے اس کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ فوراً اٹھا اور خوف کو اسی کمرے میں چھوڑ کر جنگل کی سمت چل پڑا۔

سادھو دھونی رمائے ایک درخت کے نیچے موجود تھا۔ آگ مسلسل جل رہی تھی مگر حیران کن بات یہ تھی کہ وہ آگ بغیر ایندھن کے جل رہی تھی۔

عامر آگ کو ہی دیکھتا رہتا اگر سادھو کی آواز اس کے کانوں سے نہ ٹکراتی۔

"بالک! اس چھوٹے سے شعبدے کو دیکھ کر حیران ہو گیا تو، آگے کچھ نہیں کر سکے گا۔ مجھے یقین تو نہیں تھا کہ تو آئے گا مگر تو دھن کا پکا لگتا ہے، تیار ہے موت کا کھیل کھیلنے کے لئے۔" سادھو نے موت کے کھیل پر زور دیتے ہوئے کہا۔

عامر نے سادھو کی آنکھوں میں دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس طرف سیدھا جنگل میں چلا جا۔" سادھو نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں تجھے ایک بڑا پتھر دکھائی دے گا۔ اس کے نیچے ایک کالا ناگ بیٹھا ہے، جا اسے پکڑ کے لے آ۔" سادھو نے ایسے کہا جیسے یہ بہت آسان کام ہے۔ عامر نے جب یہ سنا تو اس کو گرمی میں ٹھنڈے پسینے آنے لگ گئے دہشت کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ سادھو نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کتنے اطمینان سے اس کو اتنے بڑے اور خوفناک امتحان میں ڈال دیا تھا۔

"تم اب بھی واپس جاسکتے ہو، میں نے تمہیں پہلے ہی متنبہ کردیا تھا۔ مگر تمہاری اپنی خواہش تھی۔" اسے بے حس و حرکت کھڑا دیکھ کر سادھو نے کہا۔

سادھو کی اس بات نے اس میں بجلی بھر دی اسے اپنی بزدلی پر بہت غصہ آیا۔ اور وہ تیزی سے اس سمت روانہ ہوگیا۔

پتھر تک پہنچتے پہنچتے اس نے خود پر کافی حد تک قابو پالیا تھا۔ مگر پھر بھی اندھیری رات اور کالا ناگ ان دونوں کے خوف سے وہ مکمل طور پر نہیں نکل سکا۔ چاروں اطراف موجود درخت اس وقت ایسے ایستادہ تھے جیسے لمبے لمبے ہاتھ کھولے اس کی طرف بڑھ رہے ہوں کہ اچانک اس جگہ تیز روشنی پھیل گئی اور اسے ایک بڑا پتھر نظر آیا تو اس نے پتھر کے نیچے جھانک کر دیکھا تو دو خوفناک چمکدار آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ اس پر سانپ کی نظر پڑتے ہی سانپ نے زبردست پھنکار ماری اور اس کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں لیکن عامر نے ہمت کرکے قریب ہی پڑی درخت کی ایک شاخ اٹھائی اور اس کی مدد سے سانپ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

سانپ نے پہلے تو پھن اٹھا کر اس پر حملہ کرنا چاہا مگر پھر بھاگ کھڑا ہوا، اسے یوں بھاگتا دیکھ کر بوکھلاہٹ میں عامر نے اس سانپ کی دم پکڑ لی۔ حیرت کا ایک شدید جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ سانپ دھواں بن کر غائب ہوگیا۔

وہ اچھل کر رہ گیا۔ دہشت اور حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دھڑکن کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔ وہ تیزی سے مڑا مگر اس کے قدم وہیں جم کر رہ گئے سادھو بالکل اس کے سامنے موجود تھا۔

"بالک! بہت خوشی ہوئی تیری بہادری اور جرأت دیکھ کر، ہزاروں میں کوئی ایک آدھ ہی ایسا جگرے والا ہوتا ہے۔ چل تجھے انعام دوں۔" سادھو نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

دس قدم چلنے کے بعد وہ جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے حالانکہ سادھو کی جھونپڑی وہاں سے کم از کم 20 منٹ کی مسافت پر واقع تھی۔ عامر کو ہکا بکا، دیکھ کر سادھو نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا اور بولا۔

"اب ان باتوں کی عادت ڈال لے۔ یہ تو بہت معمولی باتیں ہیں۔ اس سے کئی گنا زیادہ طاقت تو ایک یادی کے پاس ہوتی ہے اور تیرا واسطہ تو شاہ یاد سے پڑا ہے۔" سادھو نے فخریہ لہجے میں اس کے کندھے کو تھپکاتے ہوئے کہا۔

"یادی! شاہ یاد؟" عامر نے سوالیہ نظروں سے سادھو کی طرف دیکھا۔

"سمجھ جائے گا جلد سمجھ جائے گا، آ تجھے تیرا انعام دوں، تو بھی کیا یاد رکھے گا، کس سے تیرا پالا پڑا تھا۔"

سادھو نے گٹھڑی سے کچھ نکالتے ہوئے کہا۔

عامر نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شفاف بوتل تھی جس میں سفید مائع بھرا ہوا تھا۔ سادھو نے وہ بوتل عامر کو تھمادی اور اس مائع کو آنکھوں میں ڈالنے کو کہا، پہلے تو عامر ہچکچایا۔ مگر سادھو کی تیوری پر بل پڑتے دیکھ کر اس نے جلدی سے اس مائع کو پہلے ایک آنکھ میں اور پھر دوسری آنکھ میں ڈال لیا۔

ایک عجیب پرسرور ٹھنڈک اس کی آنکھوں میں اترتی چلی گئی۔ اس کا دماغ بھی مسحور ہوتا چلا گیا۔

اس کے رگ و پے میں لطف کی لہریں دوڑنے لگیں، کافی دیر اس نے آنکھیں بند رکھیں پھر سادھو کے کھنکھارنے پر اس نے آنکھیں کھولیں۔

ایک مرتبہ پھر وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کے اردگرد سے اندھیرا چھٹ چکا تھا اور اب ہر چیز اسے صاف نظر آرہی تھی۔

"اس دوا کی دو خاصیتیں ہیں۔ ایک تم اندھیرے میں بھی دیکھ پاؤ گے، دوسری تمہاری آنکھوں میں تمہارے ہاتھوں سے سوگنا زیادہ طاقت آگئی ہے۔ آنکھوں کی مدد سے 30 فٹ کے دائرے میں تم کسی بھی

چیز کو اب پکڑ سکتے ہو۔" سادھو نے عامر کو اس دوا کے بارے میں بتایا۔

عامر کو واقعی ایک انوکھی طاقت کا احساس ہو رہا تھا۔

"جاؤ بالک اپنے اس نئے علم کو آزماؤ مگر دھیان رہے کسی کی نظروں میں نہیں آنا، نقصان بھی ہوسکتا ہے۔" سادھو نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

عامر احمد آباد کالج میں اپنے دوستوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا تھا۔ اس کے کچھ فاصلے پر کچھ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ عامر نے صرف چند سیکنڈ بغیر کسی مقصد کے بوتل کو گھورا۔ اچانک ایک بوتل دھماکے سے پھٹ گئی۔ پوری کینٹین میں بھگدڑ مچ گئی۔

اشوک باندرے ایک وزیر کا بیٹا تھا۔ ہندو انتہا پسندوں کے ساتھ اس کے گہرے روابط تھے۔ عامر کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ عامر نے دیکھا کہ وہ اس تالاب کے پاس کھڑا ہے جو بنا تو کالج کی خوبصورتی میں اضافے کے لئے تھا مگر مناسب دیکھ بھال نا ہونے کے باعث کائی نے اسے سبز کردیا تھا اور اب مینڈک اس میں لڑاتے تھے۔

عامر نے لمحے میں سوچ لیا۔ "اسے کیا کرنا ہے۔" تھوڑی دیر بعد غڑاپ کی آواز آئی۔ کالج کے طالب علموں نے حیرت انگیز منظر دیکھا اشوک اس تالاب میں جا گرا ہے اور اب تین فٹ گہرے تالاب میں لوٹنیاں لگا رہا ہے اور ساتھ ہی بچاؤ بچاؤ کی آوازیں بھی لگاتا جاتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کے ساتھیوں نے اسے باہر نکالا اس تمام واقعے میں کسی کی بھی توجہ عامر پر نہیں گئی جس کی آنکھیں سرخ ہوچکی تھیں، مگر آہستہ آہستہ اس کی طاقت ماند پڑتی چلی گئی۔ ایک ہفتے بعد بالکل ختم ہوگئی۔ عامر پھر بدر پور جا پہنچا۔

"ہماری خوش قسمتی کہ تمہیں دیکھنا نصیب ہوا۔" سادھو نے اسے دیکھ کر ہانک لگائی۔

"میری وہ طاقت ختم ہوچکی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟" عامر نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا؟

"تمہارا کیا خیال ہے وہ طاقت تمام عمر تمہارے ساتھ رہتی۔ نابالک! وہ تو چھوٹا سا نمونہ تھا۔ یہ علم اتنا سستا نہیں۔ پھر تم نے سوائے لوگوں کو تنگ کرنے کے کچھ بھی نہیں کیا۔ اور یہ تو بہت معمولی طاقت ہے۔ تم اس سے کہیں زیادہ طاقت ور بن سکتے ہو مگر قیمت ادا کرنے کے بعد۔" سادھو نے سامنے جلتی آگ میں کچھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"قیمت! کیسی قیمت؟" عامر نے آہستگی سے کہا۔ اس کے خیال میں سادھو پیسوں کی بات کررہا ہے۔

"ارے ناسمجھ! میں پیسوں کی بات نہیں کررہا۔" سادھو نے جیسے اس کا دماغ پڑھ لیا تھا۔

"تمہیں میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے، کام ہے تو چھوٹا مگر ہے بہت پرخطر، ہوسکتا ہے تم زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔"

"کیسا کام؟ آپ مجھے بتائیں ہوسکتا ہے میں کرلوں۔" عامر نے جلدی سے کہا۔

"ہوسکتا ہے" کو بھول جاؤ، ایک بار اگر میں نے تمہیں کام بتادیا تو تمہیں ہر حال میں وہ کام سرانجام دینا ہوگا۔ پھر تم پیچھے نہیں ہٹ سکو گے، مکر جانے کی صورت میں بھیانک موت تمہارا انجام ٹھہرے گی۔"

یہ سن کر عامر پل بھر کو خوفزدہ ہوگیا مگر جب سے اس نے آنکھوں کی طاقت کو کھویا تھا تب سے اسے زندگی بدمزہ اور پھیکی پھیکی لگ رہی تھی۔

"میں تیار ہوں آپ مجھے کام بتائیے۔" عامر نے جبڑے بھینچتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسے نہیں تم بیٹھ جاؤ۔" سادھو نے اسے ایک طرف بیٹھنے کو کہا۔ پھر ایک ریت گھڑی اس کے سامنے رکھ دی۔ ریت اوپر والے حصے سے نیچے سرک رہی تھی۔

"اس ریت کے اوپر سے نیچے سرکنے تک تمہارے پاس مہلت ہے، جو بھی فیصلہ ہے سوچ سمجھ کر کرو۔" سادھو نے اس ریت گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" آخر اس نے فیصلہ کرلیا۔

"تو اب جو میں بتانے جارہا ہوں غور سے سنو۔" سادھو عامر کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہاری دنیا کا باسی نہیں ہوں بلکہ میں سائی یاد کا رہنے والا ہوں، تم انسانوں کی دنیا کی طرح ہماری بھی ایک دنیا ہے، جیسے تم انسان کہلاتے ہو ویسے ہم یادی کہلاتے ہیں، تم انسانوں کے پاس بہت محدود طاقتیں ہیں۔ مگر ہم یادیوں کے پاس محیر العقول طاقتیں اور لامحدود عمریں ہوتی ہیں۔ ہماری دنیا میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو، ان طاقتوں پر اس حد تک تصرف حاصل کرلیتے ہیں کہ وہ ایک ہزار یادیوں کے مقابل آجاتے ہیں، انہیں دیو یاد کہا جاتا ہے پھر انہی دیو یادوں میں سے مزید آگے بڑھ کر شاہ یاد بن جاتے ہیں اور ایک شاہ دس ایک ہزار دیو یاد کی طاقتیں رکھتا ہے، ہماری دنیا میں کوئی سو کے قریب شاہ یاد ہیں۔ پھر ان میں سے ایک شہنشاہ یاد بنتا ہے۔

یہ باتیں سن کر عامر کی ازلی دلچسپی جاگ اٹھی تھی اور وہ بہت مگن ہوگیا تھا۔ اور یہ بھی بھول گیا کہ وہ اس راستے کو منتخب کرچکا ہے جس پر موت سایہ فگن ہے۔

سادھو کی نظریں خلا میں غیر مرئی نکتے پر مرتکز تھیں۔" اور وہ بولتا جارہا تھا۔

"میرا نام برگیز ہے اور میں شاہ یاد ہوں۔ میں نے یہ مقام بہت محنت اور وقتوں سے حاصل کیا۔ ایک ہزار سال کی جان توڑ ریاضت کے بعد یہ مقام حاصل کیا پھر کچھ حاسدوں نے مجھ سے یہ مقام چھین لیا۔ میری تمام طاقتیں مجھ سے چھین لیں۔ میرے بیوی بچے قتل کرڈالے، وہ مجھے بھی قتل کردیتے، مگر سارا سحر کے ذریعے میں حلیہ بدل کر تمہاری دنیا میں داخل ہوگیا۔

اب تم نے مجھے میری طاقتیں واپس لوٹانی ہیں۔" شاہ یاد برگیز نے عامر کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"مگر شاہ یاد میں کیسے آپ کی طاقتیں لوٹاؤں گا؟ آپ خود کہہ رہے ہیں کہ ایک یادی انسان سے ہزار گنا طاقتور ہے۔ پھر شاہ یاد سے طاقتیں چھیننے والے عام لوگ تو نہیں ہوں گے۔" عامر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ کام کیسے کرے گا۔

"جب تم اس دنیا میں داخل ہوگے تو تم بھی کچھ طاقتیں حاصل کرلوگے۔ پھر وہاں میرے کچھ وفادار بھی ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ اب میں تمہاری دنیا میں داخل ہوچکا ہوں، اس لئے اس دنیا کا ہی کوئی بندہ وہاں جاکر میری طاقتیں مجھے دلاسکتا ہے، یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔

تمہیں گرداشیں کی عمارت تک رسائی حاصل کرکے وہاں موجود دودھیا رنگ کا ایک پتھر جو میرے مجسمے پر رکھا ہوگا اسے مجسمے کے سینے میں بنے سوراخ میں رکھنا ہوگا۔ جیسے ہی تم یہ کام سرانجام دوگے میں دوبارہ شاہ یاد بن جاؤں گا۔ ایک بار تم میرا یہ کام کردو، تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم کتنی طاقتیں حاصل کرلوگے، ان طاقتوں کے ساتھ، میں تمہیں تمہاری دنیا میں لوٹادوں گا۔"

"مجھے آپ کی دنیا میں کب جانا ہوگا؟" عامر یہ سب کچھ سن کر اضطراب کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ اوکھلی میں سر تو دے ہی چکا تھا اب جلد از جلد اس کام کے لئے نکلنا چاہتا تھا۔

نئی دنیا کے بارے میں سن کر اس کا تجسس بھی جاگ اٹھا تھا۔ "تم چاہو تو ابھی تمہیں وہاں پہنچا دیتا ہوں۔" شاہ یاد برگیز نے جواب دیا۔ "مگر یاد رہے وہاں سے واپسی کی ایک ہی صورت ہے، میرا کام مکمل کردو۔"

"ابھی اس وقت؟" عامر کو اپنے گھر والے یاد آگئے وہ کیا سوچیں گے جب وہ یوں اچانک غائب ہو جائے گا۔

"تم ان کی فکر مت کرو انہیں میں سنبھال لوں گا، وہ تمہاری طرف سے پریشان نہیں ہوں گے۔"

ایک بار پھر سادھو نے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ اس نے عامر کو دلاسا دیا۔

شاہ یاد برگیز نے اسے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔

آنکھیں بند کرتے ہی وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے کسی گہرے کنویں میں گرتا جارہا ہو۔ پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

کتنی دیر گزر گئی کتنا وقت بیت گیا جب اس کی آنکھ کھلی اسے کچھ معلوم نا ہوسکا۔ وہ ایک میدان میں موجود تھا۔ پہلا احساس اسے یہ ہوا کہ اس کا جسم اب ٹھوس نہیں تھا بلکہ ہوا کی مانند تھا۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ لبادہ تھا۔ اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہاں تمام چیزیں ہوا سے بنی تھیں، حتیٰ کے زمین بھی۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اٹھتے ہی وہ بھونچکا رہ گیا، وہ اڑ رہا تھا اور اس کے پاؤں سرے سے موجود ہی نہیں تھے۔ وہ ایک طرف کو بڑھا اس کی رفتار حیرت انگیز تھی۔ کافی دیر وہ چکر لگاتا رہا مگر کوئی بھی اسے نظر نہیں آیا۔ اس نے محسوس کیا اتنی تیز رفتاری سے حرکت کے باوجود اسے تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ مگر وہ اس بات سے پریشان تھا۔ وہاں اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کہیں سادھو اس کے ساتھ ہاتھ تو نہیں کرگیا، وہ انہیں سوچوں میں غلطاں و پیچاں آگے بڑھ رہا تھا۔ "چلو اب گھر جاؤ بہت سیر کرلی تم نے۔" اسی کی طرح کے دو جسم ہوا میں معلق تھے اور اس گھر جانے کو کہہ رہے تھے۔ مگر اس نے دیکھا ان کے جسموں پر سبز چوغے تھے۔

"پتہ نہیں اس وقت یہ یہاں کیا کررہا ہے ہمیں دقت میں ڈال دیا۔" ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا، جسے عامر نے سن لیا۔

وہ اس جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہا، گھر کیسے اور کہاں جانا ہے اسے معلوم نہیں تھا۔ ہر طرف تو چٹیل ہوائی میدان تھا۔

"تم نے سنا نہیں وقت ختم ہوچکا ہے۔ یہاں سے کھسک لو۔ ورنہ تمہیں سزا بھی ہوسکتی ہے۔" اسے یوں کھڑا دیکھ کر ان میں سے ایک بولا۔

"غوطہ لگاؤ جلدی!" اچانک سانپ کی پھنکار سے مشابہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

آواز سنتے ہی اس کا ذہن روشن ہوگیا۔ اس سے پہلے وہ کوئی اور بات کرتے اس نے غوطہ لگایا اور وہاں کی زمین میں نیچے بڑے آرام سے اترتا چلا گیا۔ نیچے پہنچ کر اس نے ہوش ربا منظر دیکھے اگر اس کے پاس اس وقت دل ہوتا تو یقیناً رک جاتا۔ ایک مافوق البیان دنیا اس کے سامنے موجود تھی۔ ہر چیز اسے حیرت میں ڈال رہی تھی۔ ہوا میں معلق گھر، بغیر ستونوں کے چھت اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب کے سب ٹھوس تھے اور جب سے وہ اندر آیا تھا اس کا جسم بھی ٹھوس ہیت اختیار کرچکا تھا پھر بھی وہ اڑ سکتا تھا۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کے کان میں پھر کسی نے سرگوشی کی۔ "آنکھیں بند کرکے، گردمالا بولو۔"

اس نے فوراً اس بات پر عمل کیا۔ مگر اسے کچھ محسوس نہیں ہوا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو اب منظر بالکل بدل چکا تھا۔

اس سے دو فٹ نیچے زمین موجود تھی۔ اور سامنے کالے رنگ کی نادر نقشہ کی حامل عمارت موجود تھی۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ ایک کالے رنگ کا نہایت خوفناک شکل والا اسی کی بناوٹ کا شخص اس عمارت سے باہر آیا۔ اور پورا منہ کھول کر اسے خوش آمدید کہا اور اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

عمارت اندر سے بہت خوبصورت تھی۔ اسے مشروب پیش کیا گیا۔ وہ بھی ہوا ہی تھی۔ مگر جب اس نے منہ میں انڈیلنا شروع کیا تو اسے بہت لطف آیا۔ منہ میں آتے ہی وہ مائع بن جاتا۔ بھوک پیاس تو اسے محسوس ہی نہیں ہوئی تھی صرف لطف کیلئے وہ کھا پی رہا تھا۔ جب وہ اچھی طرح لطف اندوز ہوچکا۔ وہی کالا دوبارہ نمودار ہوا۔ اور بولا۔

"اب کچھ کام کی بات ہوجائے۔" اس نے دیکھ لیا تھا کہ عامر خوب سیر ہوچکا ہے۔

"ہاں جلدی بتاؤ کیا کرنا ہے مجھے؟ میں جلد سے جلد اپنا کام سرانجام دینا چاہتا ہوں۔" عامر نے اس کالے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"برگیز نے تمہیں بتا ہی دیا ہوگا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" کالے نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے ہاتھ میں کچھ موجود تھا، اس نے وہ چیز عامر کے سامنے پھیلا دی۔ وہ کسی عمارت کا نقشہ تھا۔

"گرداشیس کے اردگرد بہت کڑا پہرہ ہے ایک طرح سے یہ جیل ہے مگر اس جیل میں سرکش شاہ زادقید کیے جاتے ہیں۔ یہ عمارت اس طرح تعمیر کی گئی ہے اس میں راستہ بھٹک جانے والا لاکھوں سال بعد بھی اس میں سے نہیں نکل سکتا۔ اس عمارت میں ہزاروں کی تعداد میں کمرے ہیں۔ بزرگ برگیز کے علاوہ اس عمارت سے کوئی بھی فرار نہیں ہو سکا مگر ان کی طاقتیں وہیں رہ گئیں۔ بہت دقتوں کے بعد ہم نے یہ نقشہ حاصل کر لیا ہے۔

یہ نقشہ تم ساتھ لے جاؤ گے اور یہ جو سرخ نشان ہے۔" اس نے نقشے کے وسط میں ایک چھوٹے سے نکتے پر انگلی رکھ دی۔ "اس مقام پر برگیز محترم کا مجسمہ ہے، باقی تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" اس کالے یادی نے تمام کی تمام تفصیل عامر کے گوش گزار کر دی۔

"یہ عمارت یہاں سے کتنی دور ہے؟" عامر نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"80 ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔" کالے یادی نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

"80 ہزار میل!!" یہ الفاظ اچنبھے کی حالت میں عامر نے ادا کیے۔

پہلے تو اس کالے یادی کو سمجھ نہیں آیا اس نے ایسی کیا بات کر دی جس نے عامر کو حیران کر دیا۔ پھر وہ مسکرا اٹھا۔ "یقیناً تم فاصلے کا سن کر حیران ہو گئے۔ دوست! یہ تمہاری دنیا نہیں یہاں ایک میل اور ایک لاکھ میل کا فاصلہ آنکھیں بند کر کے جگہ کا نام لینے سے طے ہو جاتا ہے بے فکر رہو۔"

"تم نے کہا پہرہ بھی ہے تو اس کا کیا حل نکالا تم نے؟" عامر نے استفسار کیا۔

"اس کا حل تمہاری رفتار ہے۔ اس وقت تم دیو یاد ہو۔ پہرے دار بلاشبہ بہت ماہر ہیں مگر بہر حال وہ تمہاری رفتار کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ ایک بار تم اندر داخل ہو گئے تو وہ اندر جانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ عمارت بھول بھلیاں ہے۔ اور تم سن کر پھر حیران ہو جاؤ گے کہ یہ عمارت تمہاری دنیا سے دس گنا زیادہ بڑی ہے۔" اس کالے یادی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی یہ بات سن کر عامر کو سچ مچ جھٹکا لگا حالانکہ اب اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ یہاں کسی بھی بات سے حیران نہیں ہوگا۔

"مگر یاد رکھنا تمہارے پاس وقت انتہائی محدود ہوگا تم جیسے ہی عمارت میں داخل ہو گے۔ پہرے دار فوراً جسارا کو خبردار کر دیں گے۔ وہ گرداشیس کی منتظم ہے اور شہنشاہ یاد کی بیٹی ہے۔ وہ اس عمارت کے چپے چپے سے واقف ہے۔ خبر ملتے ہی وہ تم تک پہنچ جائے گی۔ اس لئے تم نقشے کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ تاکہ بغیر ادھر ادھر بھٹکے صحیح مقام پر پہنچ سکو۔" کالے یادی نے تمام منصوبہ اس کے سامنے بیان کر دیا۔ "فرض کرو اگر میرے شاہ یاد کے مجسمے تک پہنچنے سے پہلے جسارا اس جگہ پہنچ گئی تب کیا ہوگا؟" عامر نے خدشے کا اظہار کیا۔

"تب صرف اتنا ہوگا کہ تمہیں تمام عمر کے لئے قید میں ڈال دیا جائے گا اور تم کبھی واپس نہیں جا سکو گے۔ اور ہاں! ہماری دنیا میں کم سے کم عمر ستر ہزار سال ہے۔ خود سوچ لو۔"

کالے یادی کی اس بات نے عامر کے ہوش و حواس گم کر دیے، پکڑے جانے کی صورت میں ستر ہزار سال قید، اس تصور سے ہی وہ کانپ اٹھا تھا۔ مگر اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

کالے یادی اور عامر نے ایک بار پھر منصوبے پر نظر ثانی کی۔ عامر نے تمام نقشہ اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ اور پھر منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا وقت آ گیا۔ عامر نے آنکھیں بند کیں اور آہستہ سے گرداشیس بولا، ہلکا سا ایک جھٹکا لگا اور 80 ہزار میل کا فاصلہ طے ہو گیا۔ وہ پرشکوہ عمارت کے بالکل سامنے تھا سر بفلک عمارت نہایت خوبصورت تھی۔ اپنی تمام توانائی کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ اپنی

عملیات کا نچوڑ کالے علم کا توڑ

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں

سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارہ بن سکتی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ

چلہ کشی کے پر عمل عملیات سے مصیبت کا فوری خاتمہ

میرا پیغام دکھی بہن بھائیوں تک پہنچا دیں

علم کے ذریعے لوگوں کی خدمت کرنا یہ ہمارا خاندانی کام ہے مجھ سے پہلے یہ کام میرے دادا حضور کرتے تھے جن کے آج بھی ہزاروں کی تعداد میں مرید ہیں اور وہ مجھ سے رابطہ کرتے ہیں عملیات کا کام کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے ہم سے پوچھیں کہ ہم نے ان کام میں کتنی اذیت سہی ہے میں اس وقت یہ اذیت بھول جاتا ہوں جب کوئی انسان روتا ہوا آتا ہے اور ہنستا ہوا جاتا ہے تمام دکھی بہن بھائیوں کو دعوت عام ہے کہ آئیں مسئلہ چاہے کچھ بھی ہو پہلی فرصت میں کامیابی حاصل کریں ناممکن کو ممکن بنائیں جو چاہیں وہ پائیں چیونٹی سے لے کر جتنے جانور ہیں اتنے ہی انسان کے کام ہیں ہر کام میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے رابطہ کریں۔ آپ کا ہر کام جس کو آپ ناممکن سمجھتے ہیں میرے پیر و مرشد دادا حضور کے تابع کردہ جنات و موکلات کے ذریعے ایک خاص عمل کی بدولت کامیابی پائیں

★ ★ نوٹ: من پسند شادی کرنے کے لئے لڑکیاں خود یا ان کے والدین رابطہ کریں ★ ★

شادی کرنا ہو یا شادی رکوانا ہو

جادو کا توڑ ہو یا جادو چلانا ہو

شوہر کی بے رخی ہو یا اولاد کی نافرمانی

کاروباری بندش ہو یا نوکری کی رکاوٹ

گھریلو جھگڑے ہو یا جائیداد کا مسئلہ

ہر کام گارنٹی سے کروائیں

خواہش زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

اولاد نہ ہونے کی وجہ سے کئی گھرانے برباد ہو گئے لہذا مزید وقت ضائع نہ کریں

آپ کے ہاں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے آپ رابطہ کریں انشاء اللہ کامیابی ہوگی

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آزمائیے

سید نثار شاہ

باغبانپورہ حافظ آباد روڈ نزد مسجد گوجرانوالہ شہر

0300-6427588

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رفتار دیکھ کر وہ خود بھی ششدر رہ گیا تھا۔

عمارت کے پہرے دار صرف ہو ہو کی آوازیں نکالتے رہ گئے، وہ اندر گھستا چلا گیا۔ نقشے کے مطابق عمارت کے اندر گھستے ہی اسے سیدھا جانا پھر سو ویں گلی میں دائیں طرف مڑنا تھا۔ اس طرح مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے اسے آگے جانا تھا۔ اچھی طرح نقشہ ازبر کرنے کے باوجود بدحواسی میں اس سے غلطی ہوگئی اور وہ بھٹک گیا۔ نقشہ اس کے پاس تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا وہ کہاں ہے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھا، اب کیا کرے؟ وہی جانی پہچانی سانپ سے مشابہہ سرگوشی اسے سنائی دی۔ ”سامنے گلی میں اٹھارہواں کمرہ ہے۔“ یہ سنتے ہی عامر چند لمحوں میں اسی کمرے میں پہنچ گیا۔ بالکل سامنے اسے شاہ یاد برگیز کا مجسمہ دکھائی دیا۔ اس کے سر پر ایک دودھیا روشنی والی گول سی چیز لہرا رہی تھی۔ مجسمہ شفاف موم سے تیار کیا گیا تھا۔

”جلدی کرو وقت کم ہے۔“ وہی سرگوشی عامر کو سنائی دی۔

عامر کو جیسے ہوش آ گیا وہ تیزی سے آگے بڑھا اور وہ گول پتھر نما چیز جس سے دودھیا روشنی نکل رہی تھی اسے پکڑ لیا، اس سے پہلے کہ وہ اسے مجسمے کے سینے میں بنے سوراخ میں رکھتا۔ اسے نسوانی مگر انتہائی بارعب اور گرج دار آواز سنائی دی۔

”رک جاؤ ایسا مت کرو۔“

بے اختیار اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

اپنی دنیا کے لحاظ سے وہ بے انتہاء خوبصورت عورت تھی۔ سرخ لبادے میں ملبوس اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی کچھ لمحوں کے لئے اس کے حسن نے عامر کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ مگر پھر عامر کو وہی سانپ کی آواز سے مشابہ سرگوشی سنائی دی۔ ”اس کی چال میں مت آؤ، اپنا کام کرو جلدی۔“

پراسرار سرگوشی سنتے ہی عامر کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ تیزی سے مڑا اور فوراً وہ پتھر نما شے مجسمے کے سینے میں بنے سوراخ میں رکھ دی۔ جیسے ہی وہ اس پتھر نما شے کو رکھ کر پیچھے ہٹا۔ ایک انتہائی تیز روشنی کمرے کے اندر داخل ہوگئی۔ اس روشنی کی وجہ سے عامر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کافی دیر تک اس کی یہی کیفیت رہی پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی اس کے سامنے حیرت ناک منظر تھا۔ سادھو سے ملتا جلتا ایک جوان شخص اس کے سامنے موجود تھا۔ مجسمہ غائب ہو چکا تھا۔

”تم نے میرا بہت بڑا کام کیا ہے بالک!“ اس نوجوان نے عامر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

بالک کا لفظ سن کر عامر کے سامنے یہ بات عیاں ہوگئی کہ وہ سادھو ہی ہے۔

سادھو کو اپنے سامنے دیکھ کر عامر مطمئن اور بہت خوش ہوا۔ ”میں نے اپنا کام پورا کر دیا اب تم بھی اپنا وعدہ پورا کرو مجھے طاقتیں دو اور واپس مجھے میری دنیا میں بھیجو۔“ عامر کو واپسی کی جلدی تھی۔

”میں تو چاہ رہا تھا تم کچھ دن یہیں ہو، میں تمہیں یہاں کی سیر کرواتا مگر چلو تمہیں بہت جلدی ہے تو ابھی تمہارا بندوبست کیے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سادھو جس کا نام برگیز تھا آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگا۔ پھر اچانک اس نے اپنی شہادت کی انگلی کا رخ عامر کی طرف کر دیا ایک کالی بجلی نما روشنی اس کی انگلی سے نکلی اور عامر کی طرف بڑھی۔ اس کالی روشنی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر نجانے عامر کو کیا ہوا کہ وہ پھرتی سے ایک جانب ہو گیا۔ وہ بجلی پیچھے کھڑی سرخ لباس والی عورت کے ساتھ موجود ایک یادی پر پڑی اور وہ ایک چیخ مار کر غائب ہوگیا۔ عامر کو یوں ٹہلتا دیکھ کر برگیز کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔ مگر اب اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ وہ بولا۔

”اوہ! میں بھول گیا تھا تم یہاں دیو یاد ہو اور دیو یاد، کانترا اسحر کو پہچان جاتے ہیں۔“ برگیز نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی حالت پر قابو پا چکا تھا۔

”مگر تم موت سے نہیں بچ سکو گے۔“

”یعنی تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔ مگر کیوں؟“ شدید دکھ اور غصے کی ملی جلی کیفیت کی وجہ سے عامر کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

”کیونکہ تم نے اس کی طاقتوں کو چھو لیا ہے۔ اب

اگر تمہیں کوئی بھی قتل کر دے تو اس کی آدھی سے زیادہ طاقت ختم ہو جائے گی۔ اپنی طاقت کو بچانے کے لئے اس کے پاس یہی حل ہے کہ یہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کرے۔“ سرخ لباس والی عورت جو کافی دیر سے چپ چاپ کھڑی تھی جیسے اس کا اس سب معاملے سے کوئی تعلق ہی نا ہو اچانک بول پڑی اور عامر کو اس کے سوال کا جواب مل گیا۔

”جسارا! تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ یہ اگر بدقسمتی کو ہرا دے تو صرف اس ایک آسان کام کی بدولت یہ دیو یاد سے شاہ یاد بن جائے گا اور چونکہ یہ ایک شاہ یاد کی طاقتوں کو ہاتھ میں لے چکا ہے تو یہ شاہ یاد بن کر بہت طاقتور ہو جائے گا۔“ شاہ یاد برگیز نے اس سرخ لباس والی سے کہا۔ اس کے لہجے میں طنز کی گہری چھاپ موجود تھی۔

”دوست تم نے سن لیا۔ تم اگر زندہ رہو گے تو مجھے ہمیشہ بے سکونی رہے گی۔ یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ کیونکہ اب میں شہنشاہ یاد کے مقابلے میں آ چکا ہوں۔ یہ میرا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے برگیز نے غیر محسوس طریقے سے اپنی انگلی کا رخ عامر کی طرف کر دیا جس کو اس نئی صورتحال نے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ برگیز کی انگلی سے اس مرتبہ سفید روشنی نکلی اور عامر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ تو جسارا بیچ میں آ گئی اور اس نے اس روشنی کو ہاتھ میں پکڑی سرخ ڈھال سے روک دیا۔ جو اسی وقت اس کے ہاتھ میں نمودار ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے چیخ کر عامر کو بھاگنے کا کہا۔

عامر کو بھی جیسے ہوش آ گیا وہ اپنی پوری رفتار سے بھاگ کھڑا ہوا، اسے یوں نکلتا دیکھ کر برگیز اس کے پیچھے لپکا مگر جسارا راستے میں آ گئی، آخر کو وہ بھی شہنشاہ یاد کی بیٹی تھی۔ برگیز نے اسے یوں راستے میں آتے دیکھ کر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ کچھ دیر تو جسارا اس کا مقابلہ کرتی رہی مگر برگیز بہت طاقتور تھا۔ جسارا نے تھوڑی دیر تو اس کا مقابلہ کیا مگر پھر پسپائی اختیار کر کے فرار ہوگئی۔ دوسری جانب اتنی دیر میں عامر بھول بھلیوں میں ہوتا کافی دور نکل گیا۔ بہت سر پٹخنے کے بعد بھی وہ عمارت سے باہر نا نکل سکا تو ایک کمرے میں گھس کر بیٹھ گیا۔

عامر کو نہیں معلوم ہو سکا کہ کتنا وقت بیت گیا، وہ اسی کمرے میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ ”اب کیا کرے؟“ کہ دھڑ سے اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے جسارا کھڑی تھی مگر اب وہ سبز لباس میں تھی۔

اسے دیکھ کر عامر تن کر کھڑا ہو گیا۔ ذہنی طور پر اس نے ہر قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے خود کو تیار کر لیا تھا۔

”بیٹھے رہو۔“ میں تم سے یہاں لڑنے نہیں آئی بلکہ تمہیں کچھ بتانے آئی ہوں۔“ اسے دفاعی انداز اپناتا دیکھ کر جسارا نے نرمی سے کہا۔

”کیا تم مجھے بیوقوف سمجھتی ہو؟ تم نے مجھے برگیز سے ضرور بچایا مگر صرف اس لئے کہ تم مجھے خود قتل کر سکو۔“ عامر نے کرختگی سے جسارا کو جواب دیا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا اگر جسارا نے تھوڑی سی بھی چالاکی دکھائی تو وہ بہت شدید ردعمل ظاہر کرے گا۔

”تمہارا کیا خیال ہے تمہیں قتل کرنا اتنا آسان ہے۔ اگر یہ کام اتنا سہل ہوتا تو میں تمہیں اسی وقت قتل کر دیتی۔ تمہیں خود بھی اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ کانترا سحر سے بچنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اور تم کوئی عام دیو یاد نہیں ہو۔ دیو یاد سے شاہ یاد بننے کے 100 انتہائی کٹھن مرحلے ہیں اور تم یوں سمجھو تم نے 99 مراحل طے کر لیے اور صرف ایک مرحلہ رہ گیا ہے۔ جو انتہائی آسان ہے۔ یعنی تم یوں سمجھو تم تقریباً ایک شاہ یاد ہو۔ تم پر حملہ کرنے کا مطلب موت ہے۔ برگیز نے بھی تم پر حملے کی جرأت اس لئے کی کہ وہ اب شہنشاہ یاد ہے۔

بس وہ میرے والد کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ جو انتہائی علیل ہیں۔ جیسے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوں گے برگیز انتہائی طاقتور شہنشاہ یاد کے روپ میں ہم پر مسلط ہو جائے گا۔“ جسارا نے وہیں کھڑے کھڑے تمام بات کہہ ڈالی۔

اس کے لہجے سے جھلکتی سچائی سے عامر متاثر نظر آنے لگا مگر پھر بھی وہ بہت محتاط تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مگر تم پر کیسے اعتبار کرلوں، ہوسکتا ہے یہ کوئی چال ہو۔" عامر کو اب بھی پورا یقین نہیں تھا۔

"تمہاری مرضی، اعتبار کرو یا نا کرو۔ میں تمہیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔ تم جتنے بھی طاقتور ہو جاؤ یہاں سے میری مدد کے بغیر نہیں نکل سکتے۔ آگے تمہاری مرضی۔"

جسارا کو عامر پر غصہ آ گیا اب کی بار اس کا لہجہ انتہائی خشک تھا۔

"ٹھیک ہے چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

اس خطرناک عمارت سے نکلنے کے خیال سے عامر کے لہجے میں نرمی در آئی تھی۔

"میرے پیچھے پیچھے آؤ۔" جسارا کے لہجے کی خشکی اب بھی برقرار تھی۔ چند لمحوں بعد وہ عمارت سے باہر تھے۔

عمارت سے باہر آ کر عامر کو بے چینی سی محسوس ہوئی اسے اس بے چینی کا سبب معلوم نہیں تھا۔ مگر پھر بھی اسے خطرے کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں جسارا کے پیچھے جا رہا تھا۔ اچانک وہ خود بخود ایک طرف ہٹ گیا۔ ایک نیلی روشنی اس کے پاس سے گزرتی چلی گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہاں وہی کالا یادی کھڑا تھا۔ جس نے اس کو گرداشیس کا نقشہ فراہم کیا تھا۔ اپنے وار کو یوں خالی جاتا دیکھ کر وہ غصے سے ہونٹ چبا رہا تھا۔ لمحوں میں اس نے دوسرا وار کیا۔ سات مختلف رنگوں کی روشنیاں عامر کی طرف بڑھیں۔ بے اختیار اس نے اپنے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ روشنیاں اس کی سمت آنے کے بجائے اس کالے یادی کی طرف مڑ گئیں اور وہ دھواں بن کر اڑ گیا۔ اتنی دیر میں جسارا واپس آ گئی جو کافی آگے نکل گئی تھی۔ اس نے صرف اس سارے واقعے کا آخری منظر دیکھا جب عامر نے ہاتھ کے ایک ہلکے جھٹکے سے اس کالے یادی کو دھواں بنا ڈالا تھا۔

"بیچارہ! غلط فہمی میں مارا گیا۔" جسارا کے لہجے میں تاسف تھا۔

"غلط فہمی..... اس نے مجھ پر حملہ کیا اور اس کا وار اسی پر الٹ گیا۔" عامر نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہاں! مارا تو وہ اپنی وجہ سے گیا مگر وہ تمہیں عام دیو یاد سمجھتا تھا۔ اصل میں جو بھی تمہیں قتل کرے گا برگیز کی آدھی طاقتوں کا حقدار وہ ٹھہرے گا۔"

جسارا نے نیا انکشاف کیا۔

اس نئی بات نے عامر کو ایک بار پھر کوفت میں مبتلا کر دیا، نجانے اور کتنے بھید تھے، جو اس سے پوشیدہ تھے۔ وہ پھنس کر رہ گیا تھا۔ صورتحال ایسی تھی کہ وہ اب کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ مگر وہ جاتا کہاں، اسے اس دنیا کے بارے میں اس کے لوگوں کے بارے میں ان کے رہن سہن کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا؟ اس کی بھلائی اسی میں نظر آئی کہ وہ جسارا کے ساتھ رہے۔

عامر جسارا سے کچھ پیچھے ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا جب اس کی سماعتوں سے جسارا کی آواز ٹکرائی۔

"تم پوچھو گے نہیں کہ میں تمہیں کہاں لے جا رہی ہوں۔ اور برگیز سے تمہاری جان کیوں بچائی؟"

"پوچھنا تو چاہتا تھا مگر موقع ہی نہیں ملا اور اس موجودہ صورتحال نے مجھے کوفت میں بھی مبتلا کر دیا ہے اس لئے پہلے اس طرف دھیان نہیں گیا۔ مگر تم بتاؤ تم مجھے کیوں بچانا چاہتی ہو۔" عامر نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"دراصل تمہاری وجہ سے ہمارا پورا نظام متاثر ہو گیا ہے۔ برگیز ایک باغی تھا۔ ہمارے نظام میں سو کے قریب شاہ یاد ہوتے ہیں۔ آپس کی باہمی چپقلش سے بچنے کے لئے یہ اصول بنایا گیا، ہر شاہ یاد باری آنے پر ہی شہنشاہ یاد بن سکے گا۔ برگیز جب شاہ یاد بنا تو اسے شہنشاہ یاد تک کا سفر بہت طویل لگا۔ اس نے سوچا ہوسکتا ہے شہنشاہ بننے تک وہ زندہ ہی نا رہے۔ اپنی بے پناہ ذہانت کو اس نے منفی انداز میں استعمال کرتے ہوئے بہت چالاکی سے اپنے سے اوپر والے شاہ یادوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ہر قتل کی منصوبہ بندی اس ذہانت سے کی جاتی کہ قتل طبعی موت لگتی۔ اس طرح اس نے 30 کے قریب شاہ یاد مار

ڈالے۔ ہر قتل سے اسے دہرا فائدہ حاصل ہوتا ایک تو اس کی طاقت بڑھتی جاتی دوسرا بہت غیر محسوس طریقے سے وہ اپنے بندے شاہ یاد بناتا چلا گیا۔"

"مگر تم تو کہتی ہو شاہ یاد کو مارنا بہت مشکل کام ہے تو پھر اتنی آسانی سے وہ کیسے اپنا کام کرتا رہا؟" عامر نے جسارا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں نے مشکل کہا تھا ناممکن نہیں کہا تھا۔ شاہ یاد کو دشمن بن کر مارنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ کام صرف شہنشاہ یاد ہی کر سکتا ہے۔ مگر دوست بن کر کسی کو قتل کرنا کیا مشکل ہے۔ برگیز نے یہی کیا، وہ ہدف کو پہلے اعتماد میں لیتا پھر قتل کر دیتا۔ اس پر شک اس وجہ سے نہیں ہوسکا کہ ہماری دنیا میں اس طرح کے واقعات رونما نہیں ہوتے۔ تیس قتل کرنے کے بعد برگیز اپنے نئے ہدف کے لئے نکلا مگر اس مرتبہ اس سے چوک ہوگئی اس نے ہدف کے لئے شاہ یاد قذاف کو چنا۔ قذاف انتہائی طاقتور اور ذہین شاہ یاد ہے۔ جب برگیز نے اس سے دوستی کی تو قذاف نے اس کے اندر کی تاریکی کو محسوس کر لیا۔ حالانکہ مختلف علوم کا سہارا لے کر برگیز نے اپنے اندر کی تاریکی کو چھپایا ہوا تھا۔"

"تاریکی؟ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟" عامر نے جسارا سے استفسار کیا۔

"ہماری دنیا میں جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے اندر تاریکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تاریکی کو صرف شاہ یاد ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہر شاہ یاد بھی نہیں بس چند مخصوص شاہ یاد، وہ بھی اپنی اس صلاحیت کو چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ اس دنیا کے باسیوں کو شرمندگی نا اٹھانی پڑے، قذاف بھی تاریکی دیکھ سکتا تھا۔ وہ محتاط ہو گیا اس نے اس سے پہلے ایسی تاریکی نہیں دیکھی تھی اور پھر شاہ یاد تو بہت مقدس ہوتے ہیں اس کے دل میں کھٹکا پیدا ہو گیا۔ مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

ایک دن برگیز نے قذاف کو بے خبر پا کر حملہ کر دیا۔ اور یہی بات اس کے لئے خطرناک ثابت ہوئی۔ برگیز کا وار ضائع گیا۔ قذاف نے اسے پکڑ لیا۔ تحقیق و تفتیش کے بعد برگیز کا جرم ثابت ہو گیا اور اسے سزائے موت ہوگئی۔ سزا پر عمل درآمد تک اسے گرداشیس میں قید رکھا گیا۔ مگر اپنے تئیں ہمنوا شاہ یادوں کی بدولت وہ فرار ہو کر تمہاری دنیا میں چلا گیا مگر اس کی طاقتیں یہیں رہ گئیں۔ پھر بہت سے لوگ اس نے یہاں بھیجے مگر سب ناکام ہوئے۔ اور آخر میں تمہیں اپنی بچی کچی تمام طاقتوں کے ساتھ یہاں بھیج دیا اور باقی کی صورتحال تمہارے سامنے ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ برگیز کو ہر حالت میں ختم کرنا ہے۔ ورنہ وہ ہماری اس دنیا میں ہر طرف تاریکی پھیلا دے گا۔ قتل و غارت ہوگی ہمارا امن تہہ و بالا ہو جائے گا۔

برگیز سے چھٹکارے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تمہیں قتل کر دیا جائے۔ مگر اس میں مجھے اس بات کا قوی یقین ہے کہ جیسے ہی تم پر حملہ کیا جائے گا تم شدید ردعمل ظاہر کرو گے۔ لڑائی میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی نقصان پہنچے گا اور تم بھی کمزور ہو جاؤ گے اور برگیز اسی موقع کی تاک میں ہے وہ تمہیں کمزور پا کر آسانی سے قتل کر دے گا۔

دوسرا حل یہ ہے کہ تم ہماری مدد کرو۔ اس کے بدلے ہم تمہیں تمہاری دنیا میں واپس بھیج دیں گے یا تم اگر یہیں رہنا چاہو تو تم شاہ یاد بن کر رہ سکو گے۔"

"ویسے بھی اب میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا۔ تم جیسا کہو گی میں ویسا ہی کروں گا۔" عامر نے لاچاری سے کہا۔ وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔

"اب ہم محل کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے وہاں سے کچھ ضروری چیزیں اٹھانی ہیں۔ برگیز بھی وہاں پہنچنے والا ہوگا۔" جسارا نے اسے پروگرام کے متعلق بتایا۔

"ہمیں اڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ یہاں صرف آنکھیں بند کر کے جگہ کا نام لینے سے وہاں پلک جھپکتے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔" عامر نے کوفت سے کہا۔

"ہاں ہم بھی اس طرح پہنچ سکتے ہیں مگر اس طرح ہم بالکل محل کے سامنے جا کھڑے ہوں گے اور اگر وہاں برگیز موجود ہوا تو بہت آسانی سے ہم اس کا شکار ہو جائیں گے۔ ویسے بھی ہم پہنچ ہی گئے، دیکھو، وہ رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محل!" جسارا نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

محل کے آس پاس کوئی ہلچل نظر نہیں آرہی تھی وہ دونوں تیزی سے محل کی طرف بڑھے۔ محل کے قریب پہنچتے ہی۔ عامر کو ایک مرتبہ پھر بے چینی ہونے لگی۔ مگر اب وہ اس بے چینی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً جسارا کو محتاط ہونے کو کہا۔ مگر اسی اثناء میں 20 کے قریب سرخ لبادوں میں ملبوس پہرے داروں نے انہیں گھیر لیا۔ اس صورتحال نے عامر میں جیسے بجلیاں بھر دیں۔ وہ سب اپنا گھیرا مکمل ہی کررہے تھے۔ کہ عامر سفید روشنی کی شکل اختیار کرگیا، وہ آگے بڑھا اور وہاں موجود تمام سرخ لباس والے جسموں کے آر پار ہو کر واپس اپنی جگہ آ کھڑا ہوا۔ یہ عمل سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مکمل ہوا تھا، باقی وہاں موجود لوگ تو ایک طرف خود عامر کو بھی سمجھ نا آیا کہ اس نے یہ سب کیسے کیا۔ وہ تمام سرخ لباس والے آن کی آن میں بیک وقت زمین پر گرے اور ان کے جسم دھواں بن گئے۔ جسارا حیرت سے بت بنی یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہی تھی۔

وہ یہ تو جانتی تھی کہ عامر بے پناہ طاقتوں کا مالک ہے مگر وہ اتنا طاقتور ہوگا، اس کے سان وگمان میں بھی نا تھا۔ تھوڑی دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی پھر یکا یک اسے ہوش آ گیا، وہ تیزی سے محل کے اندر داخل ہوئی۔ عامر نے بھی اس کی پیروی کی۔ پھر وہ دونوں محل سے نکل گئے۔

"میرا ہاتھ پکڑ لو۔ اور آنکھیں بند کر کے برخاش کہو۔" جسارا نے اپنا ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا۔

عامر نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ تھوڑی دیر بعد جب عامر نے آنکھیں کھولیں تو وہ ایک قلعے کے سامنے موجود تھے۔ پھر وہ قلعے کے اندر داخل ہوگئے۔

"سب پہنچ گئے۔" جسارا نے اندر داخل ہوتے ہی ایک لڑکی سے پوچھا۔

"جی! سب موجود ہیں اور آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔" وہ دونوں ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہوگئے۔ عامر نے دیکھا وہاں 50 کے قریب لوگ موجود ہیں۔ پانچ عورتیں اور باقی تمام مرد تھے۔ جسارا کو اندر آتے دیکھ کر وہ سب کھڑے ہوگئے۔ ساتھ ہی عامر کو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔

"خواتین وحضرات یہی وہ شخص ہے جو اس تمام صورتحال کا کسی حد تک ذمہ دار ہے۔ اور یہی ہمیں اس صورتحال سے نکال سکتا ہے۔" ان تمام لوگوں کی آنکھوں میں مچلتی حیرت کو دیکھ کر جسارا نے عامر کا تعارف کروایا۔

"یعنی یہ وہی ہے جسے مار دیا جائے تو برگیز کی آدھی طاقت ختم ہو جائے گی اور اس پر قابو پانا آسان ہو جائے گا۔" ایک جوان شخص نے کینہ توز نگاہوں سے عامر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خاموش رہو جاروب۔ اس کو مارنے کے علاوہ بھی ایک راستہ ہے اور وہ زیادہ آسان ہے۔ اس پر حملہ کرنے کی حماقت ہم نہیں کریں گے۔ تم اس کی طاقت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ ہمارے کام کے لئے تیار بھی ہے۔" جسارا نے اس جوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر اس کی وجہ سے میرا پورا خاندان تباہ ہوگیا۔ برگیز نے ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑا، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر وہ نوجوان تن کر کھڑا ہوگیا۔

اس سے پہلے کہ جسارا یا کوئی اور اسے روکتا اس نے آنکھیں بند کیں اور یکا یک اپنے ہاتھ کی انگلی سے عامر کی طرف اشارہ کیا۔ سفید روشنی اس کے ہاتھ سے نکلی اور عامر کی طرف بڑھنے لگی روشنی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر غیر اختیاری طور پر عامر نے اپنے ہاتھ کو ایسے ہلایا جیسے مکھی اڑا رہا ہو۔ پل بھر میں اس روشنی نے اپنا راستہ تبدیل کرلیا اور واپس جاروب کی طرف پلٹی۔ اگر وہ پھرتی سے ایک طرف نا ہو جاتا تو اپنے ہی وار کی زد میں آ کر ختم ہو جاتا۔

اتنے اطمینان سے وار کو پلٹا کر عامر نے وہاں موجود تمام لوگوں کو خوفزدہ کردیا۔ جاروب شاہ یاد تھا۔ اور ایک شاہ یاد کے سب سے بہترین وار کو کوئی عام دیو یاد ناکام نہیں بنا سکتا تھا۔ مگر عامر نے ایسا کر دکھایا تھا۔

"اب تمام لوگ اطمینان سے بیٹھ جائیں اور پر سکون ہو جائیں۔" جسارا نے انتہائی رعب سے کہا،

صرف جاروب اور عامر ہی کھڑے تھے پھر دونوں کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ جسارا نے انہیں تفصیل سے تمام بات سمجھائی۔

اس وقت عامر ہی وہ شخص تھا جو شہنشاہ برگیز کو ہرا سکتا تھا۔

عامر کو بدقیس سے مقابلہ کرنا تھا۔ بدقیس ایک انتہائی طاقتور جانور تھا۔ مگر اپنی تمام طاقت کے باوجود جسارا کو یقین کامل تھا کہ وہ عامر کے سامنے چند لمحوں سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے گا۔ مگر مسئلہ یہ تھا انکے حساب کے مطابق اس نے پانچ ہزار سال بعد نمودار ہونا تھا۔ اتنا انتظار وہ شاید نہ کرپاتے۔ برگیز مسلسل حملے کررہا تھا۔ عامر کو اس دنیا میں آئے ایک ہزار سال ہوگئے تھے۔ اب وہ وہاں کا مکمل رہن سہن سیکھ گیا تھا۔

جسارا سے اس کا، انسیت محبت میں بدل چکی تھی۔ جسارا بھی اسے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی۔ باہر کی دنیا میں برگیز نے تہلکہ مچا رکھا تھا سوائے اس قلعے کے اس نے ہر جگہ کو بزور بازو فتح کرلی تھی۔

اس قلعے کو وہ اس لئے فتح نہیں کر پا رہا تھا کہ یہاں اکیاون شاہ یاد موجود تھے اور عددی لحاظ سے قلعے والوں کو ایک کی برتری حاصل تھی۔ برگیز کے پاس (49) شاہ یاد تھے اس لیے وہ تمام تر طاقت کے باوجود اس سحر کا توڑ نہیں کر پا رہا تھا۔ جو قلعے کے اردگرد کیا گیا تھا۔

جسارا اور اس کے ساتھی صرف انتظار کرسکتے تھے۔ کب بدقیس باہر آئے اور عامر شاہ یاد بن جائے پھر وہ برگیز کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے۔ اسی انتظار میں ایک روز وہ ہوگیا جو انہوں نے نہیں سوچا تھا۔ شاہ یاد بلاس کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ فوت ہوگیا۔ حالانکہ اس کی عمر صرف 55 ہزار سال تھی۔ سائی یاد والوں کے نزدیک یہ کوئی اتنی عمر نہیں تھی۔

دوسرا جھٹکا اس سے بھی شدید تھا جب جسارا اور عامر کو پتہ چلا کہ دو شاہ یاد بددل ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ قلعے کا دفاع کمزور ہوگیا۔ برگیز جو کسی موقع کی تاڑ میں تھا اس نے شدید حملے شروع کردیے۔ اس کو عددی برتری بھی حاصل ہوگئی۔

اس دن بہت بھیانک لڑائی ہوئی دونوں طرف سے پورا زور لگایا گیا۔ عامر نے اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کیا۔ برگیز کو پسپا ہونا پڑا مگر جسارا کے 20 شاہ یاد کام آ گئے اور سینکڑوں دیو یاد مارے گئے۔ دوسری طرف بھی نقصان ہوا مگر ان کا نقصان کم تھا۔

برگیز کو معلوم تھا یہی نادر موقع ہے۔ قلعے والوں کی طاقت کم ہوگئی ہے اس نے اپنی تمام طاقت کو یکجا کیا۔ اور بہت بھرپور وار کردیا۔ جسارا اور اس کے ساتھی لڑتے رہے۔ عامر نے بھی اپنی صلاحیتوں کا خوب لوہا منوایا مگر آخر کب تک۔ وہ تھک کر نڈھال ہوگئے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی صرف جسارا اور عامر بچ گئے باقی ان کے تمام ساتھی کام آ گئے۔

عامر جب سے یہاں آیا تھا اسے کبھی تھکن کا احساس نہیں ہوا مگر اب وہ بھی تھک گیا تھا۔ جسارا تو بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ انہیں لڑتے لڑتے تقریباً آٹھ سو سال گزر چکے تھے۔ عامر کے لئے یہ عرصہ بہت طویل تھا۔

آخر برگیز قلعے میں داخل ہوگیا۔ اب وہ عامر کے سامنے کھڑا تھا۔ "تمہاری پھرتی قابل دید ہے بالک۔ مگر تمہیں میرے ہاتھوں مرنا ہے۔" برگیز نے عامر کی طرف دیکھ کر کہا۔

جو تیزی سے برگیز کی فوج کو ٹھکانے لگا رہا تھا۔

اس کے سپاہی اسے وہاں پا کر رک گئے عامر بھی برگیز کو دیکھ کر اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ برگیز نے عامر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا ایک تیز روشنی کی لہر نکلی اور عامر کی طرف لپکی عامر جلدی سے ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اس طرح کھڑا ہونے کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔ برگیز نے روشنی صرف توجہ ہٹانے کے لئے پھینکی تھی۔ اصل میں اس نے دوسرے ہاتھ سے ایک غیر محسوس اشارہ کیا تھا اور عامر اب زمین پر لوٹ رہا تھا۔ ایک غیر مرئی رسی نے اسے باندھے ہوئے تھا۔ برگیز نے اسے یوں لوٹنیاں لگاتے دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے وقت ضائع کرنا بالکل مناسب نا سمجھا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہادت کی انگلی عامر کی سمت کردی، پہلے سفید اور اس کے پیچھے کالی لہر نکلی اور عامر کی سمت بڑھی۔ عین اسی لمحے جسارا دہاڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی اور اس نے یہ وار اپنی سرخ ڈھال پر روکا۔ سفید روشنی کو تو اس نے اپنی ڈھال پر روک لیا مگر کالی لہر اس سے زور سے ٹکرائی اس کی ڈھال ریزہ ریزہ ہوگئی اور اس کے کپڑے چیتھڑوں میں تبدیل ہوگئے وہ اڑ کر دور جا گری۔

جسارا کی یہ حالت دیکھ کر اور برگیز کے قہقہے سن کر عامر گویا کہ پاگل ہوگیا۔ اس نے وحشیانہ طاقت سے اس غیر مرئی رسی کو توڑ ڈالا اور پوری قوت سے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ اس کے ہاتھ سے سات رنگ کی روشنیاں نکلیں اور ساکت اور حیرت زدہ برگیز کے جسم میں گھس گئیں۔ برگیز جھکتا چلا گیا۔ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

مگر اگلے ہی لمحے عامر کی تمام امیدوں پر اوس پھر گئی برگیز مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"بالک! تم نے تو مار ہی ڈالا تھا مجھے اگر آج میں اپنی حفاظت کا ناقابل تسخیر انتظام کر کے نہ آتا تو کیا سمجھتا ہے تو مجھے مار دے گا۔ ارے نادان تو جو کچھ ہے مری وجہ سے ہے۔" برگیز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ کی چبھن عامر کو اپنے سینے میں چبھتی محسوس ہو رہی تھی۔

ان باتوں کے دوران برگیز کی توجہ جسارا سے ہٹ گئی۔ جو دیوار کے سہارے بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی مگر عامر پوری طرح چوکنا تھا۔ اچانک جسارا نے ہاتھ سے اشارہ کیا، سرخ روشنی تیزی سے برگیز کی جانب بڑھی۔ عامر مسکرا اٹھا۔ اس کی مسکراہٹ سے برگیز چوکنا ہوگیا۔ اس سے پہلے برگیز کچھ کرتا عامر تیزی سے آگے بڑھا اور روشنی اس کے سینے کے آر پار ہوگئی درد کی ایک تیز لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔

جسارا نے ایک دردناک چیخ ماری۔ اور اتنے ہی زور سے برگیز چلایا۔ اور زمین پر گر گیا۔

عامر نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے صرف یہی دیکھا کہ برگیز کے جسم سے روشنیاں تیزی سے نکل رہیں تھیں اور وہ کرب سے چیخ رہا تھا۔

جسارا بھاگتی ہوئی آئی۔ "یہ کیا کر دیا؟ یہ وار تو میں نے برگیز پر کیا تھا۔ تم کیوں سامنے آ گئے۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟" وہ اس کا سر اپنی گود میں رکھے چلا رہی تھی۔

"برگیز سے تمہاری دنیا کو چھٹکارا دلانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ مرنا تو ہے ہی تو کیوں نا تمہارے ہاتھوں مروں۔ بس جو ہونا تھا ہو گیا اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اپنی دنیا کو خوشحالی کی طرف لے کر جاؤ۔" عامر نے درد کی شدت سے اٹکتے یہ الفاظ بولے اور جسارا سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہوگیا۔ اس کا جسم دھواں بن کر اڑنے لگا۔

☆.....☆.....☆

تکلیف کی شدت سے عامر کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے دیکھا، وہ جھونپڑی میں لیٹا ہوا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے قریب ہی سادھو لیٹا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ وہ نزع کی حالت میں لگ رہا تھا۔ پھر اچانک اس کے پورے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ بے سدھ ہوگیا۔ وہ مر چکا تھا۔ عامر نے اپنے بدن کو ٹٹولا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا، باہر ہر طرف تاریکی کا راج تھا اسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ وہ جھونپڑی سے باہر نکلا اور گھر کی سمت چل پڑا، گھر کے دروازے پر پہنچ کر دبے قدموں سے گھر میں داخل ہوگیا۔ سب کچھ جوں کا توں موجود تھا حتیٰ کہ وہ پانی کا گلاس بھی وہیں پڑا تھا جہاں کہ وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو ساڑھے تین بج رہے تھے۔ یعنی سائی یاد میں گزرے دو ہزار سال صرف دو گھنٹے تھے۔

وہ سب ایک خواب کی مانند گزر گیا حالانکہ وہ خواب نہیں تھا۔ مگر ان تمام حالات میں اسے کیا فائدہ ہوا، اس کی تمام جدوجہد لاحاصل ہی رہی۔ وہ بستر پر دراز ہوگیا۔ زندگی بھر اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ خواب تھا یا حقیقت!

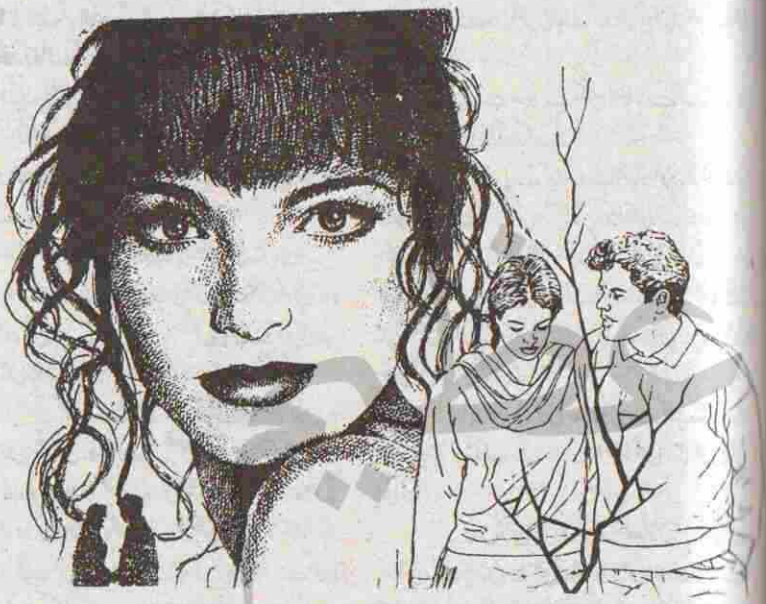

غلطی

عروفیہ ملک- گجرات

محبوب کی موت کا سنتے ہی جس کی سانس کے ساتھ اس کا دل دھڑکتا تھا وہ نہ رہی تھی، اس کی سانس تھم گئی تھی تو بھلا اس کا دل کیوں کر دھڑک سکتا تھا، اور پھر اس کی روح آسمان کی وسعتوں میں گم ہوگئی۔

دانستہ غلطی انسان کو موت سے بھی ہمکنار کر دیتی ہے، جس کا ثبوت کہانی میں موجود ہے

دھڑام کی آواز سے دروازہ کھلا اور وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے آفس کا چپراسی بھی ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔

"صاحب یہ..... یہ بی بی میرے روکنے کے باوجود اندر آ گئیں، صاحب میں نے بہت روکا تھا" چپراسی بے چارہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"تم جاؤ" اس نے سنجیدہ انداز میں کہا اور سامنے کھڑی لڑکی کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھنے لگا اس کی آنکھیں اور چہرہ بالکل سپاٹ تھے۔

"پلیز! تم مجھے معاف کر دو۔ میں بہت شرمندہ ہوں"

وہ التجائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

"خدا کے لئے معاف کر دو، میرا ضمیر مجھے کچو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لگاتا ہے۔ تم جو کہو گے میں کرنے کے لئے تیار ہوں بس مجھے معاف کردو۔ معاف کردو" وہ اس کے پاؤں کے نزدیک بیٹھ کر گڑگڑا کر رو دی تھی۔

لیکن شاید وہ پتھر کا ہو چکا تھا۔ جو اس کی خوبصورت آنکھوں میں موتیوں جیسے آنسو دیکھ کر بھی اس کے دل کو کچھ ہوا نہ تھا۔

"کیا کرسکتی ہو تم" وہ زہر خندہ لہجے میں بولا۔

"میں..... میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں" وہ آنسو اور ہچکیوں کے درمیان بامشکل بولی۔ تو وہ عجیب انداز میں ہنسنے لگا۔

"تم سمجھ رہے ہو کہ میں مذاق کر رہی ہوں۔ نہیں میں سیریس ہوں اب کل تمہیں میری لاش ہی ملے گی۔" وہ بولی اور دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

ایک پل کو وہ اس کے فیصلہ کن انداز سے گھبرا گیا پھر فوراً سنبھل گیا۔

"ہونہہ! کسی کا دل توڑنا، اسے اندر سے مار دینا بہت آسان ہے مگر خود اپنی جان لینا بہت مشکل ہے، بہت مشکل مس ناز چوہدری۔" وہ اذیت سے سوچ کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

"اچھا اتنا بھروسہ ہے تمہیں اپنے آپ پر" حنا طنزیہ انداز میں بولی۔

"کیوں کوئی شک ہے؟" اس نے حنا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل ہے" حنا بھی کب ہار ماننے والی تھی۔

"اچھا تو کیسے میں اپنے آپ کو تم پر ثابت کرسکتی ہوں؟" وہ مطمئن انداز میں بولی۔

"میں تمہیں ایک ٹاسک دوں گی، بس اسے پورا کردو تو تمہیں مانیں۔" حنا پراسرار انداز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں واضح چمک تھی۔

"یار پلیز! کیا بحث شروع کردی ہے تم لوگوں نے اور حنا پلیز! تم ہمیشہ ہر کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟ اور آج تو تم نے حد ہی کردی۔ ناز سے اس طرح بات کر رہی ہو آخر ہم تمہاری دوست ہیں۔

کب سے ضبط کیے بیٹھی اسماء سے اب صبر نہ ہوسکا۔ تو حنا کو لتاڑ کر رکھ دیا۔

"بھئی میں نے کیا کہا ہے؟ یہ تو خود ناز ہی ہے جسے اپنے حسن اور عقل و شعور پر بڑا بھروسہ ہے اور ہر وقت یہ ہی راگ الاپتی رہتی ہے" آج حنا کے اندر موجود سارا زہر باہر نکل رہا تھا۔ اسماء اور ناز تو گویا سکتے میں آگئیں ان کی پیاری سہیلی یہ سب سوچتی ہے یہ تو وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں۔

"حنا مذاق کی کوئی حد ہوتی ہے کب ناز نے غرور کیا؟" شاک کے مارے اسماء بس اتنا ہی بول پائی۔

"یہ کیوں نہیں کہتی کہ شرط منظور نہیں تم کچھ نہیں کرسکتی، بس باتیں بنا سکتی ہو" وہ براہ راست ناز سے مخاطب ہوئی۔ ناز کے اندر غصے کی شدید لہر اٹھی لیکن وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے اسے دبا گئی۔

"بولو کیا شرط ہے؟" ناز نے کہا۔

"اس کا مطلب! تمہیں شرط منظور ہے؟" حنا نے نہایت جوش کے عالم میں کہا۔

"ہاں" ناز نے اسماء کی آنکھوں کی تنبیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے آخر کار ہاں کہہ ہی دیا۔

اور اسماء سر پکڑ کر رہ گئی کیونکہ وہ ان دونوں کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

حنا کی عادت تھی ہر ایک کو ستانا اور پھر اس سے شرط لگانا وہ خاصی عجیب و غریب شرائط رکھتی تھی۔ اور کوئی ایک وہ ہی شرط پوری کر پاتے تھے۔ اور اسے معلوم تھا کہ آج بھی حنا خاصی مشکل شرط رکھنے والی ہے۔

اور رہی بات ناز کی تو وہ جو بات ایک بار کہہ دیتی تو وہ گویا پتھر پر لکیر ہوتی اور اسے پورا کرنا گویا ناز کا فرض اولین ہوتا۔ وہ تھی بھی اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی اور ہوتی بھی کیوں نہ پورے دس سال بعد بہت منتوں مرادوں کے بعد وہ پیدا ہوئی تھی اور اس قدر

حسین کے چاند بھی شرما جائے۔ اس کے والدین شکر کے ساتھ ساتھ فخر و ناز بھی خوب کر رہے تھے اسی بنا پر اس کا نام "ناز" رکھا تھا۔

"اگلے مہینے کالج میں فیئر ویل پارٹی ہے اور طلحہ بخاری تمہیں پورے کالج کے سامنے پرپوز کرے۔" حنا نے ناز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ایک پل کو ناز حیران و پریشان رہ گئی۔ طلحہ کالج کا سب سے مغرور لڑکا تھا۔ اور تھا بھی ایسا کہ کالج میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر سرد آہیں بھرتی تھیں۔ مگر اس نے کبھی کسی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکوں میں بھی اس کا صرف ایک دوست سعد تھا۔ امیر باپ کا اکلوتا چشم و چراغ تھا اسے خدا نے حسن و دولت سے مالا مال کیا تھا پھر وہ مغرور نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

یہ تمام سوچیں ناز کو صرف ایک پل میں آئیں اور دوسرے پل اس نے تمام سوچوں کو دماغ سے جھٹک کر حامی بھر لی۔ آخر اس نے شرط کے لئے "ہاں" کردی تھی اب اپنی زبان سے پلٹنا اس کے لئے ناممکن تھا۔

"ٹھیک ہے"

"او کے تو پھر چلو، مسز نوازش کا پریڈ ہے صرف دس منٹ باقی ہیں۔" اب حنا ایسے ری ایکٹ کر رہی تھی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ان کے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

خاموشی سے دونوں کلاس روم کی طرف چل دیں۔

"ناز تم نے اچھا نہیں کیا۔ یہ بہت مشکل ہے، طلحہ جیسا لڑکا کبھی ایسا نہیں کرے گا" اسماء اپنی جگہ پریشان تھی۔ مگر اب ناز نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ بھی خاموش ہوگئی۔

گھر پہنچ کر بھی ناز پریشان سی تھی امی کے پوچھنے پر سر درد کا بہانہ بنا کر کمرے میں چلی گئی۔ پھر رات بارہ بجے تک اس نے ڈھیروں رومانی ناول پڑھ ڈالے۔ اسے بس ایک بات مشترک لگی ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات ضرور کسی ٹکراؤ میں ہوتی تھی۔ اگلے دن کی پلاننگ کرکے وہ سکون سے سوگئی۔

اگلی صبح خاصی روشن تھی۔ وہ ناشتہ کرکے کالج کے لیے نکل گئی۔ شروع میں ابو نے اسے ڈرائیور رکھ کے دیا تھا پر جب سے اس نے ڈرائیونگ سیکھی تھی تب سے وہ خود گاڑی ڈرائیو کرتی تھی۔ کالج جاتے ہی وہ حنا اور اسماء سے ملی اور پھر کلاس روم کی طرف چلی گئی۔ پہلے دو پیریڈ کے بعد تین پیریڈ فری تھے یہ اس کے لئے خاصہ سود مند تھا۔

وہ پیریڈ سے فارغ ہو کر جیسے ہی کلاس سے نکلی اس نے دور سے طلحہ کو لائبریری کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

وہ تقریباً بیس منٹ طلحہ کا باہر ویٹ کرتی رہی پھر اس نے طلحہ کو باہر آتے ہوئے دیکھا۔

وہ تیزی سے آنکھیں جھکائے طلحہ کی طرف بڑھ گئی اور زور سے اس سے ٹکرائی۔ طلحہ تو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا، پر ناز کتابوں سمیت ڈھیر ہو چکی تھی۔

"کیا بدتمیزی ہے نظر نہیں آتا تو چشمہ لگاؤ نان سنس" وہ اسے سناتا ہوا چلا گیا۔

اور ناز جہاں کی تہاں رہ گئی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ طلحہ ایسا کرے گا، ایسی سچویشن میں تو ہیرو ہمیشہ سوری کہتا ہے اور کتابیں اٹھا کر ہیروئن کے حوالے کرتا ہے۔

"آئی نو طلحہ بخاری تم ٹیڑھی کھیر ہو پر میرا نام بھی ناز چوہدری ہے۔" ناز دل ہی دل میں کہتی گھر آ گئی۔

اگلے دن کالج سے واپسی پر ناز نے طلحہ کی گاڑی کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا۔ ایک دم سے اس کے دماغ میں آئیڈیا آیا اس نے فوراً گاڑی کو تھوڑا سا سائیڈ پر کرکے روک لیا۔ اور اپنا بیگ اور موبائل لے کر باہر نکل آئی۔ کچھ دیر بعد سڑک پر طلحہ کی گاڑی آتی ہوئی دیکھائی دی۔ وہ ہاتھ سے گاڑی روکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔

طلحہ گاڑی کا شیشہ نیچے کرکے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"وہ میری گاڑی خراب ہوگئی ہے"

"تو؟" طلحہ ابھی تک سوالیہ انداز میں اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف دیکھ رہا تھا۔

ناز کا دل کیا کہ اس کا سر پھاڑ کر رکھ دے مگر وہ ضبط کر گئی۔

"مجھے لفٹ چاہیے اف یو ڈونٹ مائنڈ"

"اوکے" وہ بولا تو ناز کو کتنے پل لگا جیسے یہ اس کا خواب ہے پھر جب یقین آیا تو فوراً اس کے ساتھ فرنٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اب اس کا دماغ تیزی سے آگے پلاننگ کر رہا تھا۔

"بہت اچھا ٹیسٹ ہے آپ کا، یہ سب میرے فیورٹ سینگرز ہیں" ناز سامنے ڈش بورڈ پر موجود کیسٹ کو دیکھ کر بولی۔

طلحہ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اس کے ساتھ اس کی امی کے علاوہ کوئی لڑکی نہ بیٹھی تھی۔ ناز کے کپڑوں سے پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو اسے مسحور کر رہی تھی۔ وہ عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اور اس خوشی کو محسوس کر کے وہ حیران بھی ہو رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سفر یوں ہی چلتا رہے اور وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھے محو سفر رہیں۔

"جی بس یہ ہی میرا گھر ہے" ناز نے کہا تو نا چاہتے ہوئے اس نے گاڑی روک دی۔

"آئندہ میری ضرورت پڑے تو ضرور کہیئے گا، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا" طلحہ نے مسکرا کر کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

ناز تو سن سی ہو گئی۔ اس نے پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ اوپر سے اس کا جملہ وہ تو گویا سکتے میں آ گئی تھی۔ وہ اتنی جلدی طلحہ کو اپنی طرف متوجہ کر لے گی، یہ تو اس نے سوچا تک نہ تھا۔

اور پھر تو جیسے سب کچھ آسان ہو گیا تھا، طلحہ خود بخود ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اب وہ روز ملتے ڈھیروں باتیں کرتے۔ آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کے کافی قریب آ چکے تھے۔

"ناز وہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" طلحہ کچھ کنفیوژ سا تھا۔ ناز نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بولو" وہ دوبارہ اسائنمنٹ پر جھک گئی۔

"ارے پہلے اسے چھوڑو" اس نے ناز کے آگے سے اسائنمنٹ والی فائل اٹھالی اور اپنے ساتھ بینچ پر رکھ دی۔ ناز سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وہ..... وہ مجھے کہنا تھا کہ" وہ جیسے کہیں ان کہی میں الجھا ہوا تھا۔

"اب بول بھی دو" ناز نے طلحہ کے مضبوط ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ہولے سے دبایا۔

"ناز آئی لو یو" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

ناز پہلے تو حیران ہوئی پھر بے انتہا خوش ہو گئی۔

پارٹی میں صرف پانچ دن بچے تھے۔ اور وہ کب سے اس انتظار میں تھی کہ طلحہ اس بارے میں بات کرے اور آج آخر کار وہ دن آ ہی گیا تھا۔ لیکن وہ اپنی خوشی کو اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"طلحہ ہمیں ملے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو تم اتنے یقین سے کہہ رہے ہو؟" ناز سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"ناز یہ محبت بہت عجیب شے ہوتی ہے۔ کبھی دو لوگ ساری زندگی ساتھ بتا دیتے ہیں مگر محبت جیسے جذبے سے محروم رہتے ہیں اور کبھی صرف ایک پل میں محبت انسان کو بے بس کر دیتی ہے" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولتا جا رہا تھا۔ اور ناز جیسے اس کے الفاظ کے جادو میں قید ہوتی جا رہی تھی۔

"تمہیں یاد ہے ناز جب تم میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی میں نے پہلی بار کسی اجنبی لڑکی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا، بس وہی ایک لمحہ تھا جب تم نے اس چھ فٹ کے بندے کا دل جیت لیا تھا۔" آخر میں وہ کچھ شوخ سا ہو گیا۔

"ہو سکتا ہے وہ ایک وقتی جذبہ ہو۔" ناز نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور چوٹ لگائی۔

"نہیں ناز میرا جذبہ سچا ہے، پہلے میں نے بھی

ایسا ہی سوچا تھا۔ لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو پرکھا۔ اپنے دل میں جھانکا تو میرے دل میں تمہارے سوا کوئی بھی نہیں" چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے اس کی آنکھوں سے اس کی باتوں کی تصدیق کرنی پڑی۔

"طلحہ کیا تم یہ سب پورے کالج کے سامنے بول سکتے ہو؟"

"کالج! ارے یہ تو بہت چھوٹی بات ہے، میں تو پوری دنیا کے سامنے بول سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر تم پارٹی میں سب کے سامنے بولنا اوکے"

"اوکے جناب آپ کا حکم سر آنکھوں پر"

"اچھا اب میں جا رہی ہوں بہت دیر ہو گئی ہے"

"خدا حافظ" طلحہ نے کہا اور دونوں اپنی اپنی جگہ خوشی سے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

پھر آخر کار فیئر ویل پارٹی کا دن آن پہنچا۔ ہر طرف خوشبوؤں کا بسیرا تھا رنگین آنچل یہاں سے وہاں اڑے پھر رہے تھے۔ لڑکے لڑکیوں کی تیاریں عروج پر تھیں۔

ناز بھی آج روز کے مقابلے میں زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ گلابی فراک جس پر جامنی کلر کا خوبصورت کام کیا ہوا تھا، ہم رنگ چوڑی دار پاجامے اور ڈوپٹے میں وہ خوب جچ رہی تھی۔ طلحہ نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ خود بھی آج پورا پرنس لگ رہا تھا۔

پھر وہ گھڑی آ گئی جس کا ان کو بے صبری سے انتظار تھا۔ پارٹی ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے طلحہ اسٹیج پر گیا اور پورے کالج کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔

کالج کے لئے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ طلحہ بخاری اور پیار!! دونوں دریا کے الگ الگ کنارے تھے۔

یہ سب کا خیال تھا۔ مگر آج یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ لڑکیاں رشک سے ناز کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"یار ناز کمال کر دیا تم نے میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی، تم یہ شرط اتنی آسانی سے جیت جاؤ

گزارش

قارئین کرام! مہنگائی کے اس ہوش ربا دور نے ہر کسی کو ہلکان کر کے رکھ دیا ہے۔ کھانے پینے کی اشیا سے لے کر ضروریات زندگی کی کوئی ایسی چیز باقی نہیں بچی جو کہ مہنگائی سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ فلم، کاغذ، پرنٹنگ، ڈیزائن، بائنڈنگ اور پوسٹ آفس کے اخراجات نے بھی دماغ کو متزلزل کر کے رکھ دیا ہے جو کہ ادارہ ڈر ڈائجسٹ کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔

لہٰذا ادارہ نے بہ حالت مجبوری فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ماہ یعنی مارچ کا ڈر ڈائجسٹ =/55 روپے کا ہو گا۔ امید ہے قارئین کرام ہماری مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈر ڈائجسٹ کی قیمت کا یہ معمولی اضافہ بخوشی قبول کر لیں گے۔

شکریہ

ادارہ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گی" حنا نے کہا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ طلحہ ان کی طرف ہی آ رہا ہے۔ اور طلحہ اسے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔

"ہاں! مجھے بھی یقین نہیں تھا۔" اسماء واقعی خوشی محسوس کر رہی تھی۔

"ناز تم ہو بڑی شاطر! آخر پھانس ہی لیا اسے اور وہ طلحہ! پورا ایڈیٹ ہے، میں تو سمجھی خاصا اکڑو ہے، پر وہ بھی عام لڑکوں کی طرح فوراً میلٹ ہوگیا" حنا تاک تاک کر نشانے لگا رہی تھی۔

طلحہ سے اپنی تذلیل برداشت نہ ہوئی' ناز نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ اس کی پہلی معصوم پاکیزہ محبت کی توہین کی تھی۔ اس نے تو زندگی میں پہلی دفعہ کسی لڑکی کو اپنے دل کے شفاف شیشے میں سجایا تھا۔ اور اس نے ایک ہی پل میں اس شیشے کو کرچی کرچی کر دیا تھا۔ اب کچھ اور سننے کی اس میں سکت نہ بچی تھی۔ وہ فوراً پلٹا اور گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوگیا مگر کاش! وہ دو پل اور رک جاتا اور ناز کا جواب سن لیتا۔

"حنا پلیز! شرط اور مذاق اپنی جگہ مگر طلحہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔ اور میں بھی اس کی محبت کی تپش سے بچی نہیں ہوں۔ مجھے بھی اس سے گہرا لگاؤ ہوگیا ہے۔ اور ویسے بھی مجھے بہت گلٹی فیل ہو رہا ہے اگر طلحہ کو یہ سب پتہ چلا تو وہ کیا سوچے گا۔ اس لیے پلیز! یہ سب طلحہ کو نہ بتانا اوکے" ناز نے کہا تو حنا کو نہ جانے کیوں کمینی سی خوشی محسوس ہوئی وہ ہمیشہ سے ناز سے جیلسی فیل کرتی تھی اور آج اسے تکلیف پہنچا کر مزہ آ رہا تھا۔

"ناز تم فکر نہ کرو یہ بات صرف ہم تینوں میں ہی رہے گی" اسماء نے اسے یقین دلایا۔

"اوکے تھینکس! میں اب چلتی ہوں" وہ کہتے ہوئے گھر گئی۔ عجیب سی بے چینی اسے محسوس ہو رہی تھی جسے وہ کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔

☆.....☆.....☆

پھر اگلے پورے ہفتے طلحہ کالج نہیں آیا تھا۔ وہ کتنی مرتبہ اس کا نمبر ڈائل کر چکی تھی مگر موبائل لگاتار سوئچ آف بتا رہا تھا۔ پھر ستم یہ کہ طلحہ کا دوست سعد بھی کالج نہیں آ رہا تھا۔

پھر ایک دن اسے سعد نظر آ ہی گیا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس پہنچی۔

"ایکسکیوزمی سعد مجھے آپ سے بات کرنی ہے"

"جی ضرور! کیا بات کرنی ہے آپ نے"

"طلحہ کو ہفتہ ہوگیا کالج آئے، کیا طبیعت خراب ہے اس کی یا کہیں گیا ہوا ہے فون بھی آف ہے؟" وہ پریشانی سے لگاتار بولتی گئی۔

"اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے" سعد نے دکھ سے بتایا۔ ناز کو لگا ساتوں آسمان اس کے سر پر گر گئے ہوں۔ وہ سعد سے ہاسپٹل کا نام پوچھ کر فوراً روانہ ہوگئی۔

اس روز پارٹی سے واپسی پر طلحہ بہت اپ سیٹ تھا وہ اس قدر دل برداشتہ تھا کہ سامنے سے آتا ٹرک بھی اسے دکھائی نہ دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ اور اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہوگیا تھا۔

طلحہ کے لئے یہ انکشاف روح فرسا تھا کہ وہ اپاہج ہوگیا ہے۔ وہ ان سب کا ذمہ دار صرف اور صرف ناز کو گردان رہا تھا۔

جس وقت ناز ہاسپٹل میں طلحہ کے پاس پہنچی اس وقت طلحہ کے پاس کوئی نہ تھا۔ اس کی والدہ پورے ہفتے سے اس کے ساتھ تھیں مگر آج اس کے والد کے اصرار پر گھر چلی گئی تھیں۔ اور مسٹر بخاری طلحہ کی کچھ دوائیاں لینے گئے ہوئے تھے۔

روم میں ناز داخل ہوئی تو اس نے طلحہ کو آنکھیں بند کیے ہوئے نیم دراز دیکھا۔

"السلام وعلیکم! طلحہ کیسے ہو؟" وہ بولی تو طلحہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں پھر اس کی آنکھوں میں نفرت بھرتی چلی گئی۔

"کیوں اب کیا لینے آئی ہو میرے پاس؟ شرط تو ہوگئی نا پوری اب کوئی اور شرط لگائی ہے کیا؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔

"نہیں..... نہیں طلحہ یہ سب جھوٹ ہے، تمہیں یہ کس نے بولا"

"واہ کیا معصومیت ہے، شاید اگر کوئی اور بولتا تو میں نہ مانتا مگر میں نے اپنے کانوں سے خود سنا ہے۔" وہ پھر دہاڑا۔

"طلحہ دیکھو میرا یقین کرو، ہاں وہ میری غلطی تھی مگر سچ مانو، میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں" ناز کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ طلحہ کو کیا کہے، کیسے اسے یقین دلائے۔

"مس ناز چوہدری اس وہم کو تو آپ دل سے نکال ہی دیں تو اچھا ہے، آدمی ایک بار دھوکا کھا سکتا ہے بار بار نہیں۔"

"طلحہ پلیز! میرا یقین کرو، میں جھوٹ نہیں بول رہی" ناز کو اس کی بدگمانی پر رونا آ رہا تھا۔

"چلی جاؤ، خدا کے لئے چلی جاؤ یہاں سے، تم نے میرا دل توڑا، میری ٹانگ چھین لی مجھے اپاہج کر دیا، اب اور کیا کرنا چاہتی ہو، تم دفعان ہو جاؤ، نکل جاؤ میری زندگی سے۔" طلحہ نے چلانا شروع کر دیا۔

شور کی آواز سن کر ڈاکٹر اور نرس کمرے میں آئے۔

"میڈم آپ کو نظر نہیں رہا پیشنٹ کی حالت خراب ہے آپ پلیز انہیں اکیلا چھوڑ دیں۔" ڈاکٹر نے کہا تو ناز روتی ہوئی گھر آ گئی۔

ناز کو بہت دکھ اور اذیت محسوس ہو رہی تھی۔ طلحہ اس سے کتنا بدگمان تھا۔ ہاں وہ جانتی تھی اس نے غلط کیا مگر وہ اس سے سچی محبت کرتی تھی۔ اسے ہر وقت بے چینی محسوس ہوتی۔ کالج ختم ہو چکا تھا مگر طلحہ اسے معاف کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے اس سے بات کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ہر بار اسے باہر سے ہی واپس بھیج دیتا۔ مگر آج وہ اس کے آفس کے اندر گھس گئی۔ مگر آج بھی وہ ناکام لوٹی تھی۔

"اس زندگی سے تو موت بہتر ہے، جس میں خود انسان اپنا مجرم لگے اور پھر انسان اپنے آپ سے بھی نظر ملانے کے قابل نہ ہو" اور پھر ایک ہی پل میں اس نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر دیا۔

اور سلیپنگ پلز کی ساری شیشی پانی کے ساتھ نگل گئی۔ آہستہ آہستہ اسے اپنا جسم بے جان ہوتا محسوس ہوا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ بستر پر بے سدھ ہو کر پڑ گئی۔

اگلی صبح جب ناز نو بجے تک کمرے سے باہر نہ نکلی تو اس کی ماما کو تشویش نے آن گھیرا۔ انہوں نے دروازے کو دھڑا دھڑ بجایا مگر دروازے نے نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ انہوں نے گھبرا کر ناز کے پاپا کو بلایا۔ دروازہ توڑا گیا۔ کمرے کا منظر انہیں چکرا دینے کے لئے کافی تھا۔ ناز بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اسے فوراً ہاسپٹل لے جایا گیا مگر دیر ہو چکی تھی۔ یہ خبر کوئی عام خبر نہ تھی۔

چوہدری خاندان کی اکلوتی چشم و چراغ کی موت بلکہ "خودکشی" ایک دھماکہ خیز خبر تھی۔ ہر اخبار کی ہیڈ لائن ایک ہی تھی۔

"چوہدری خاندان کی اکلوتی چشم و چراغ "ناز چوہدری" کی خودکشی"

طلحہ نے جیسے ہی یہ خبر سنی وہ دھماکوں کی زد میں آ گیا اس کے اعصاب پہلے ہی بہت کمزور تھے یہ خبر اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ چاہے جو بھی تھا وہ بھی ناز سے پیار کرتا تھا۔ وہ چاہے اپنے آپ کو جتنا باور کرواتا کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے مگر ایسا تھا نہیں وہ چاہ کر بھی اسے دل سے نکال نہیں سکتا تھا۔ اور پھر آج اس کے دل کی مالک جس کی سانس کے ساتھ اس کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ نہ رہی تھی۔ اس کی سانس تھم گئی تھی۔ تو بھلا اس کا دل کیونکر دھڑک سکتا تھا۔ اس کو شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

تمام بدگمانیوں، رنجشوں اور نفرتوں کو بھلائے اپنے پیار کو ملنے آسمان کی وسعتوں میں اس کی روح گم ہوگئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

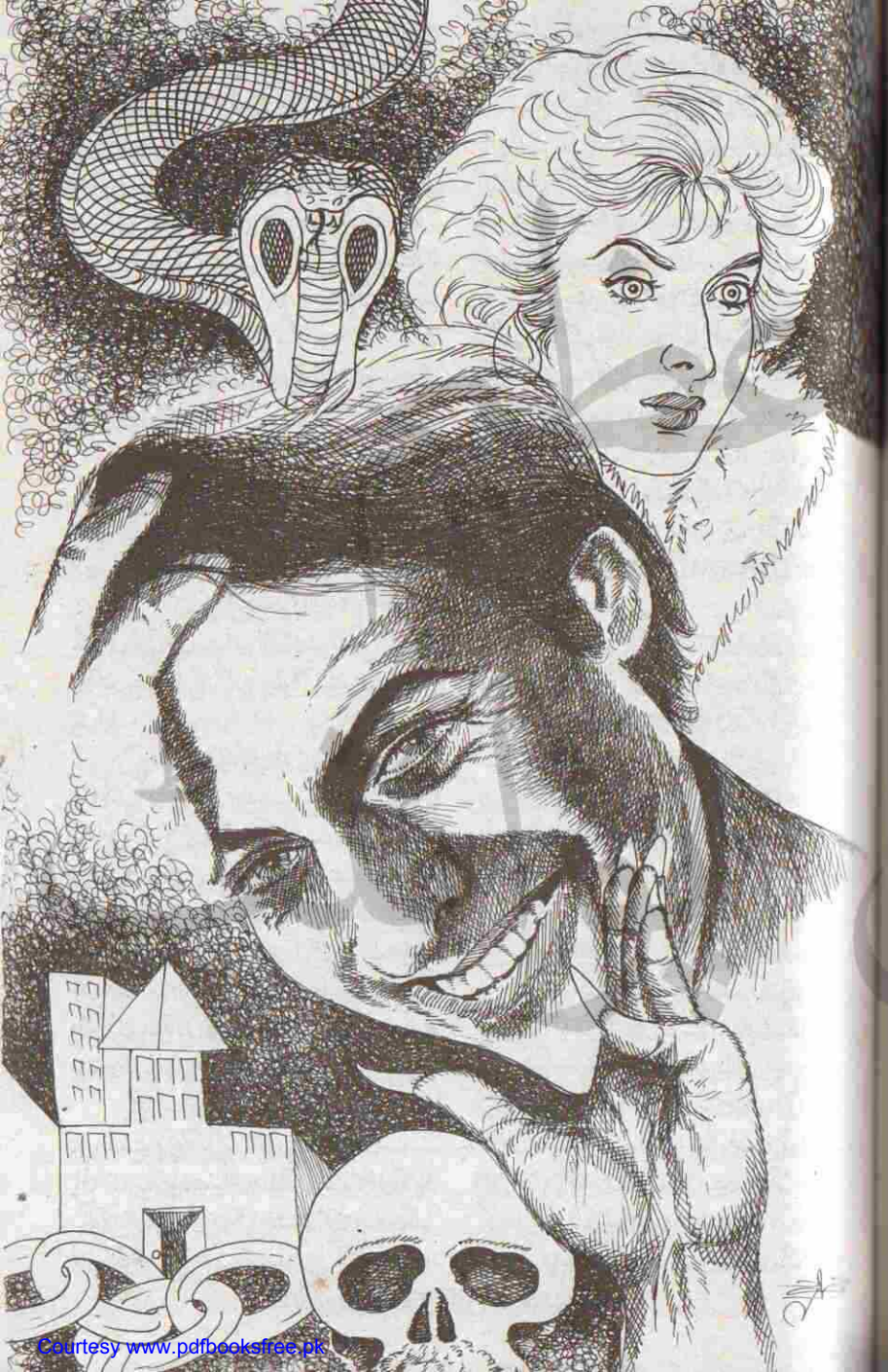

عفریت یا موت

نظارت نصر۔ فیصل آباد

سانپ نے ایک مرتبہ پھر نوجوان کو اندر کی طرف دھکیلا اور پھر نوجوان کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی کڑکڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور تاریک ہوتی فضا اس کی بھیانک اور فلک شگاف چیخوں سے گونج اٹھی۔ اب نوجوان کا غار کے اندر سر بھی چلا گیا تھا۔

زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا چاہئے اور جو اس سے انحراف کرتے ہیں وہ پچھتاتے ہیں

مجید علی کی گھوڑی اب تھکنے لگی تھی۔ ”بابا اگر آپ کی گھوڑی تھک گئی ہے تو تھوڑی دیر کہیں رک جاتے ہیں۔ یہ آرام کرلے گی اور ہم بھی ذرا ستالیں گے۔“ نوید نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں تو کافی آگے نکل جانے والا گھوڑا آرام سے چلنے لگا اور وہ گردن موڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا جس کی گھوڑی اب بھی تھکے تھکے قدموں سے چلتی آرہی تھی۔

”نوید میرا خیال ہے کہ واقعی ہمیں اب یہاں رک جانا چاہئے۔ کیونکہ میری گھوڑی اب تھک گئی ہے اور مجھے خود بھی بھوک لگ رہی ہے۔“ مجید علی کے کہتے ہی نوید اچک کر گھوڑے سے اتر گیا۔ مجید نے بھی گھوڑی سے چھلانگ لگادی۔ دونوں گھوڑوں کو ایک درخت کے تنے سے باندھ کر وہ دونوں ایک قریبی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مجید نے کھانا نکالا اتنی دیر میں نوید کچھ دور سے گزرتے قدرتی نالے سے پانی ایک بڑے ڈول میں بھر لایا۔ دونوں باپ بیٹے نے ہاتھ دھوئے اور کھانا کھانے لگے۔ ”بابا پرانے راستے سے ہمیں گھر جانے کے لئے بہت لمبا راستہ طے کرنا پڑے گا۔ اگر ہم کنوئیں والے راستے سے جائیں گے تو شام سے پہلے گھر پہنچا جاسکتا ہے۔“

اگرچہ مجید اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا تھا مگر نوید ہمیشہ بات کرتے ہوئے محتاط ہی رہتا تھا کہ کہیں کوئی بات باپ کو بری نہ لگ جائے۔ مجید نے سرد نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ ”بیٹا میں پہلے بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ راستہ خطرناک ہے اور اب ادھر سے کوئی نہیں گزرتا ہم اپنے راستے سے ہی جائیں گے۔“

نوید کو خاموش ہونا پڑا۔ تھوڑی دیر آرام کر چکنے کے بعد دونوں باپ بیٹے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوگئے۔ اس علاقے کے جنگل میں کوئی بڑا درندہ نہیں تھا۔ اس لئے دونوں کی کلاشکوفیں ان کے پہلوؤں میں جھول رہی تھی۔ جنگل بہت ہرا بھرا تھا۔ اس میں کثرت سے چھوٹے جانور تھے۔ ارد گرد کے قصبوں اور گاؤں سے لوگ ہرن۔ خرگوش اور اکادکا پائی جانے والی نیل گایوں کے شکار کے لئے اس جنگل میں اکثر آتے رہتے تھے۔ مجید بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اسی غرض سے اس جنگل میں آیا ہوا تھا۔ انہوں نے دس بارہ خرگوش اور کچھ تیتر شکار کئے تھے۔ ہرن انہیں آج دکھائی ہی نہ دیا۔ پھر بھی وہ ہفتے بھر کا گوشت جمع کر لینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

شام ڈھلنے سے قبل ہی انہوں نے جنگل سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپسی کا سفر اختیار کیا۔ راستہ کشادہ تھا گھوڑے آرام سے سفر کر رہے تھے۔ مجید نے قدرے بلند آواز سے ایک دیہاتی گیت گانا شروع کر دیا۔ نوید خاموشی سے محو سفر تھا۔ اسے شاید باپ کا طویل راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ جوان خون تھا مہم جوئی کا شوق اسے اس خطرناک راستے پر سفر کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ ہر بار جب بھی اس جنگل میں شکار کھیلنے کے لئے آتا تو لازمی ایک مرتبہ باپ سے اس راستے پر سفر کرنے کے لئے کہتا اسے ہر بار انکار سننا پڑتا مگر اسے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ اپنے باپ کو راضی کر لینے میں کامیاب ہو ہی جائے گا۔

☆.....☆.....☆

"یار نوید! بس تو جلدی سے تیاری پکڑ لے ہم مقابلے میں تیرا بھی نام لکھوا آئے ہیں" اسماعیل نے نوید کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر تمہیں کیا ضرورت تھی میرا نام لکھوانے کی مجھے کوئی شوق نہیں ہے اس طرح کے مقابلوں میں اپنی طاقت کے اظہار کا۔" نوید نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"یار مقابلہ ایک نہیں دو ہیں ۔ ہم نے نشانہ بازی میں بھی تیرا نام لکھوا دیا ہے۔ ساتھ والے گاؤں کے لوگ بھی آئیں گے، دیکھ پورے پنڈ کی عزت کا سوال ہے۔ تجھے یہ مقابلہ تو جیتنا ہی ہے۔" رفیق نے اسے منانے کے لئے فوراً گاؤں کی عزت کا مسئلہ اٹھایا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ نوید گاؤں کی عزت کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ اسے کبھی یہ گوارا نہ ہوتا کہ کوئی دوسرا اس کے گاؤں کا مذاق اڑائے اس لئے بھلا کچھ ہو جاتا وہ مقابلے میں حصہ ضرور لیتا۔"

تم لوگ خود ہی سب کچھ کرتے رہتے ہو، کسی بندے سے پوچھ تو لیا کرو۔ میں نے تو اس دن کے لئے پانی کسی سے لیا ہے۔ اس روز تو میرے کھیتوں کو پانی لگے گا، میں پانی لگاؤں گا یا مقابلے میں حصہ لوں گا۔" نوید نے قدرے نرم پڑتے ہوئے گھڑکنے والے انداز میں کہا۔ تو رفیق اور اسماعیل مسکرا دیئے، وہ جانتے تھے کہ یہ ایک طرح کا اظہار رضامندی تھا۔

"تو فکر نہ کر..... تیرے یار کس مرض کی دوا ہیں تیرا پانی ہم باری باری خود لگائیں گے۔ اور چاچا مجید کو بھی خود ہی راضی کریں گے، بس اب 37 والوں کو پتہ لگ جانا چاہیے کہ انہوں نے مقابلے کے لئے کس کو للکارا ہے" رفیق نے جوش سے کہا۔

نوید نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا ۔"کس نے ہمیں للکارا ہے" اسکا سفید چہرہ سرخی مائل ہو گیا۔ گاؤں کے عام نوجوانوں کی طرح اسے بھی یہ بات انتہائی ہتک آمیز لگتی تھی کہ کوئی دوسرا انہیں للکارے۔

"37 کے چوہدری کا چھوٹا بھائی آیا تھا۔ اس نے کہا ہے" میلے میں مقابلے ہیں، دیکھیں گے کہ تمہارے گاؤں کا کون سورما ہمارے گاؤں کو ہراتا ہے۔"

"تو ہم نے کہا کہ تم بڑھکیں نہ مارو دیکھ لینا دونوں مقابلے ہم ہی جیتیں گے۔ اب اگر ہم جیت نہ سکے تو پورے گاؤں کی بے عزتی ہوگی۔" اسماعیل نے اسے تفصیل بتائی۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں تم فکر نہ کرو..... اللہ نے چاہا تو ہمارا ہی گاؤں جیتے گا۔" نوید نے ایک عزم سے کہا۔

☆.....☆.....☆

اور پھر مقابلے والا دن بھی آ گیا۔

وسیع میدان میں ہر طرف رنگ برنگے شامیانے، مختلف چیزوں کے ٹھیلے اور دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ اردگرد کے سارے گاؤں والے اس میدان میں جمع ہو گئے تھے۔ سب خوشی خوشی ثقافتی اور روایتی کھیل تماشوں کو دیکھنے میں مگن تھے۔ ایک طرف زور زور سے ڈھول بج رہا تھا۔ لوگوں کی اکثریت وہاں جمع ہو رہی تھی۔ ایک طرف ایک بڑی بوری میں ریت بھر کر کھڑی کی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر نشانہ بازی کے لئے نشان

بنے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہاں مقابلہ ہونے والا تھا۔ مقابلے میں کل پانچ نوجوان شریک تھے۔ مقابلہ ناک آؤٹ تھا جس کا ایک بھی نشانہ غلط ہوتا اسے مقابلے سے باہر نکال دیا جاتا۔

نوید کا نمبر تیسرا تھا۔ اس نے اپنی گن سیدھی کی ایک لمحے کے لئے نشان کی طرف دیکھا۔ ریت بھری ہوئی بوری کے عین وسط میں ایک پتہ بنا ہوا تھا اسے ہٹ کرنا تھا۔ رفیق اور اسماعیل نے زوردار نعرے اور جوشیلی آوازیں نکال کر اس کی حوصلہ افزائی کی نوید نے اپنے نشانے پر بھروسہ کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے پتے کے وسط میں سوراخ ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے دونوں نشانہ بازوں کی گولی نشان کو لگی ضرور تھی مگر عین وسط میں نہیں۔ نوید کے بعد باقی دو امیدواروں نے بھی نشانہ لگایا مگر دونوں ہی نشان کو ہٹ نہ کر سکے۔ اگلے راؤنڈ کے لئے تین امیدوار بچے تھے۔ اس بار نوید کا نمبر آخری تھا۔ اس بار صرف نوید اور چوہدری کے بھائی ہی نشانہ لگا سکے۔ تیسرا آدمی بھی آؤٹ ہو گیا۔

چوہدری کے بھائی نے چیلنج کرتی ہوئی نظروں سے نوید کی طرف دیکھا۔ "دیکھیں گے ہیرو..... چک 42 والوں میں کتنا دم ہے"

نوید کو بہت برا لگا "جیتے گا تو انشاء اللہ 42 ہی ..... مگر تمہیں ہرا کر" چوہدری کا بھائی تلملا کر رہ گیا۔

منصف نے پندرہ منٹ کے وقفے کا اعلان کر دیا۔ شاید وہ لوگوں کے شوق کو مزید ہوا دینا چاہتا تھا۔ رفیق اور اسماعیل شور مچاتے ہوئے اسکے قریب آ گئے۔ انہوں نے نوید کو اچھی طرح گلے لگا کر بھینچا اس کی پشت تھپکی "او یار تو تو شہزادہ ہے۔ بس ایک آخری بار ہے۔ پھر ہم تجھے کندھے پر اٹھا کر لے جائیں گے۔ یار ہمارے گاؤں کا نام اونچا ہو جائے گا۔ تو ہمارے گاؤں کا جھومر بن جائے گا۔" نوید مسکراتا رہا۔

پندرہ منٹ کے بعد پھر مقابلے کے لئے پکارا گیا، دونوں گاؤں والے اپنے اپنے امیدوار کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ایک شور برپا تھا۔ پہلے چوہدری کے بھائی کی باری تھی۔ اس کا نشانہ بہت پختہ تھا۔ اس نے نشان کو ہٹ کر لیا۔ نوید کا نشانہ بھی ٹھیک نشان پر لگا۔ منصف نے فیصلہ کیا کہ اس وقت تک دونوں نشانہ باز نشانہ لگاتے رہیں گے جب تک کہ ان میں سے کسی ایک کا نشانہ چوک نہ جائے۔ نشانہ بازی پھر شروع ہوئی ۔ نوید کے دوست سب سے زیادہ شور کر رہے تھے۔ باری باری دونوں نشانہ لگا رہے تھے۔ ہر بار نشانہ بالکل درست ہو رہا تھا۔

تیسری بار چوہدری کے بھائی کا نشانہ پتے کے کنارے پر لگا۔ وہ دباؤ میں آ رہا تھا۔ نوید کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اس کا ایک بھی نشانہ اپنی جگہ سے چوکا نہیں تھا۔

منتظم نے نشان بدلا۔ نئے نشان پر پہلا نشانہ چوہدری کے بھائی کو لگانا تھا۔ لوگوں کے شور اور دباؤ کی وجہ سے اس کا نشانہ چوک گیا اور گولی نشان کی بجائے بوری میں جا گھسی، نوید کے گاؤں والوں نے شور مچا دیا تو چوہدری کا گاؤں خاموش ہو گیا۔ اب نوید فاتح تھا مگر پھر بھی اس نے اگلے نشان پر گولی چلائی اس بار بھی نشانہ ٹھیک اپنی جگہ پر لگا۔ گاؤں والوں نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ رفیق بھاگا ہوا چوہدری کے بھائی کے پاس گیا۔ نوید نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ جوش میں بھرا ہوا چلا گیا۔ گاؤں والے نوید کے حق میں نعرے لگا رہے تھے کچھ نوجوانوں نے بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔ ڈھول والا بھی پورے جوش سے انکا ساتھ دے رہا تھا۔ نوید کا پورا گاؤں یوں شادماں تھا جیسے انہیں بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔

"دیکھا..... میں نے چوہدری کے بھائی کی کتنی مٹی پلید کی" رفیق تھوڑی دیر بعد انکے پاس آ گیا سب کے چہرے جیت کی خوشی میں گلنار ہو رہے تھے۔

"اوئے تم دونوں تو یہاں ہو، وہاں میرا پانی کون لگا رہا ہے۔" نوید کو اچانک فکر لاحق ہوئی۔

"یار تو فکر نہ کر ہم نے ایک بندہ اجرت پر اس کام کے لئے بلایا ہوا ہے۔ یہ لے تو منہ میٹھا کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اسماعیل نے مٹھائی نوید کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب کل گھڑ سواری کا مقابلہ ہے ابھی تو چل کر گھر آرام کر یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ اس علاقے کا سب سے بڑا گھڑ سوار کون ہے۔ کل لالے کا بھی امتحان ہے دو ہفتوں سے اس کی اتنی خدمت کرتے رہے ہیں اب دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے۔" رفیق نے اسے لوگوں کے کندھوں سے اترنے میں مدد دیتے ہوئے کہا۔

جونہی نوید زمین پر کھڑا ہوا سامنے سے مجید علی آ گیا، خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور جوش کی زیادتی کی وجہ سے اس کے بوڑھے چہرے کے اعضاء پھڑک رہے تھے۔ "او میرا شیر جوان پتر...... تو نے تو میرا سر بلند کر دیا ہے۔ آ جا میرے سینے میں ٹھنڈ ڈال دے۔" مجید علی نے بانہیں وا کر کے جوش سے مغلوب آواز میں کہا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی، نوید بھاگ کر باپ سے لپٹ گیا۔ اگرچہ ساٹھ باسٹھ سال کی عمر میں بھی مجید علی کی صحت قابل رشک تھی ابھی تک وہ پچاس کا لگتا تھا۔ گٹھا ہوا کسرتی بدن تھا۔ قد بھی کافی اونچا تھا مگر نوید کی بانہوں میں وہ دھان پان سا لگ رہا تھا۔

نوید علی سوا چھ فٹ قد اور چوڑی چھاتی کا مالک تھا اس کے بھرے بھرے بازو باپ کو سمیٹے ہوئے تھے۔ مجید علی نے نوید سے گلے ملنے کے بعد ایک فخریہ نظر سارے مجمع پر ڈالی۔ "ہے کوئی اس مجمع میں ایسا جس کا ایسا شیر جیسا پتر ہو۔"

مجید کا نوید اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی پچیس ایکڑ زمین تھی۔ گھر میں بھی بہت مال مویشی تھے مجید علی نے ہمیشہ اپنی اور اپنے بیٹے کی خوراک کا خیال رکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ابھی تک صحتمند تھا اور اس کا بیٹا ایسا خوبصورت جوان تھا کہ پورے علاقے میں سے چند ایک جوان ہی اسکے مقابلے کے لئے نکل سکتے تھے۔ مجید علی بڑے فخر [illegible] کر بیٹے کے ساتھ چل رہا تھا۔ راستے میں [illegible] مبارکباد دے رہے تھے۔ ہر مبارک باد [illegible] کا اظہار بھی کرتا کہ کل کا [illegible] کل کا مقابلہ

جیتنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے لالے پر بھروسہ تھا۔ وہ بہترین نسل کا ایک سرخ گھوڑا تھا۔ اسی وجہ سے نوید نے اس کا نام لالے رکھا تھا۔ اس کا گھوڑا اپنے گھاؤں میں سب سے زیادہ طاقتور اور تیز رفتار تھا۔ مگر اب یہ دیکھنا تھا کہ کل کے مقابلے میں وہ دوسرے گاؤں کے گھوڑوں کو کیسے ہراتا ہے۔

دوسرے دن ایک قطار میں گھوڑے کھڑے تھے۔ اردگرد کے گاؤں میں سے دو دو تین تین جوانوں نے مقابلے میں حصہ لیا تھا نوید کے گاؤں میں سے صرف نوید ہی مقابلے میں شریک تھا۔ اس کے گھوڑے کا خوبصورت بدن دھوپ میں چمک رہا تھا۔ رفیق نے سرخ اور سبز اون سے بنے ہوئے پھندنے اس کی گردن اور پاؤں میں باندھے تھے۔ وہ یوں سجا ہوا تھا جیسے رقص والے گھوڑے کو سجایا جاتا ہے۔

دوڑ کے تین حصے تھے۔ پہلے حصے میں صرف گھوڑوں کی رفتار دیکھی جاتی تھی اس حصے میں سب گھوڑوں کو ایک مقررہ نشان سے فتح کے نشان تک کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس دوڑ میں گھوڑے کو مالک کے بغیر دوڑنا تھا۔ اگلے مقابلے میں مالک سمیت فتح کے نشان تک دوڑ لگانی تھی اور تیسرے مرحلے میں راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں جنہیں سوار اور گھوڑے کو اپنی مہارت سے عبور کر کے فتح کے نشان تک جانا تھا۔ ڈھول بج رہا تھا۔ آج کل سے بھی بڑا مجمع تھا۔ لوگ اپنی پسند کے شہسواروں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ منصف اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے تو گھوڑوں کو دوڑانے کا اشارہ کیا گیا۔ سب گھوڑے اپنے مالکوں کا اشارہ پا کر سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔

نوید کا گھوڑا ساتویں نمبر پر تھا۔ پہلا جھنڈا عبور کرتے ہوئے وہ پانچویں نمبر پر آ گیا۔ پھر تیسرے نمبر تک پہنچ گیا اب دو گھوڑے اس سے آگے دوڑ رہے تھے مگر دوسرا جھنڈا عبور کرتے ہوئے وہ پھر پانچویں نمبر پر آ گیا تھا۔ اب صرف ایک جھنڈے کا فاصلہ تھا اور گھوڑے کی پوزیشن خراب ہو گئی تھی۔ نوید کو پریشانی لا

حق ہو رہی تھی۔ اس کا بجلی کی رفتار والا گھوڑا اب بھی پانچ گھوڑوں سے پیچھے اور چھٹے نمبر پر تھا۔ جبکہ چوہدری کے بھائی کا گھوڑا پہلے نمبر پر تھا۔ اسماعیل اور رفیق کے چہروں پر بھی فکرمندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس وقت وہ صرف شکست ہی نہیں چوہدری کے بھائی کے طعنوں کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ مگر اگلے لمحے انہیں لالے پر بہت پیار آیا کیونکہ اب وہ اپنی پوری طاقت سے سب سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فتح کا نشان صرف پچاس گز دور تھا اور لالے چوتھے نمبر پر تھا۔ لوگوں کا شور مزید بلند ہوا۔ ڈھول کی تھاپ بھی تیز ہو گئی۔ فتح کا نشان اب بیالیس گز دور رہ گیا تھا اور لالا ایک اور گھوڑے کو پیچھے چھوڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ فاصلہ تیزی سے سمٹ رہا تھا اب جھنڈا صرف بائیس گز دور رہ گیا تھا۔ سب اپنے گھوڑوں کو جوش دلا رہے تھے۔

نوید نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت صرف کر کے نعرہ لگایا آواز لالے تک پہنچ گئی تھی کیونکہ اس نے ایک لمبی زقند میں دونوں گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ پہلے نمبر پر تھا۔ فاصلہ صرف دس گز تھا۔ اس وقت نوید اور اس کے گاؤں والوں کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح لالا اس فاصلے کو بھی جلدی سے طے کر لے جبکہ چوہدری کا بھائی مسلسل اپنے گھوڑے کے لئے نعرے لگا رہا تھا۔ اس نے دوڑ کے راستے میں جگہ جگہ اپنے آدمی کھڑے کئے ہوئے تھے جو اس کے گھوڑے کو ایک مخصوص نعرہ لگا کر جوش دلا رہے تھے۔ جیسے ہی گھوڑا دوڑتا ہوا انکے سامنے سے گزرتا وہ زور دار آواز میں نعرہ لگاتے تو گھوڑے کی رفتار پہلے سے بھی تیز ہو جاتی۔ ان کی پوری کوشش کے باوجود انکا گھوڑا دوسرے نمبر پر تھا۔ بالآخر لالا فتح کے نشان سے گزر گیا۔ نوید کا مان بڑھ گیا، گاؤں والوں نے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ دوڑ کا پہلا مرحلہ نوید جیتنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ رفیق اور اسماعیل جلدی سے اس کے گلے لگے اور لالے کو لینے چلے گئے۔

لالے نے نوید کو دیکھ کر ایک بھرپور آواز نکالی۔ نوید نے لالے کے پسینے سے بھیگے ہوئے جسم پر ہاتھ پھیرا اور اپنے رومال سے اس کا ماتھا اور منہ صاف کیا۔ لالے کو اول آنے پر انعام ملا تھا۔ اگلا مقابلہ دو گھنٹے کے بعد تھا۔ سب مالک اپنے اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے، دانہ کھلانے اور ان کی مالش کرنے میں مصروف تھے۔

دو گھنٹے بعد نوید گھوڑے پر زین کس کر میدان میں آ گیا۔ چونکہ یہ میلے میں ہونے والا مقابلہ تھا۔ اس لئے اس میں ٹریک کی بجائے چار جھنڈے لگائے گئے تھے۔ ہر جھنڈے کے متوازی چونے سے ایک لکیر کھینچی گئی تھی۔ اس طرح کہ اگر سب گھوڑے لائن پر کھڑے ہوں تو جھنڈا ان کی داہنی طرف ہوتا تھا۔ ایک جھنڈا آغاز کی لائن پر اور ایک اختتام کی لائن پر لگا ہوا تھا۔ ان چار جھنڈوں کے درمیان کا علاقہ تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا تاکہ پتہ چل سکے کہ کتنے فاصلے تک کون سوار سب سے آگے تھا۔

منصفوں کے آنے کے بعد جھنڈی لہرائی گئی اور دوڑ کا آغاز ہو گیا۔ اب تو نوید خود لالے پر موجود تھا۔ اس نے ایڑ لگائی۔ لالا بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح آگے بڑھا پہلا جھنڈا آنے تک نوید سب سے آگے والے تین سواروں کی لائن میں آ گیا تھا۔ مقابلے سے قبل ہی منصفوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ایک سے زائد سوار ایک ساتھ فتح کی لائن عبور کریں گے تو ان کی دوڑ دوبارہ لگوائی جائے گی۔ دوسرے جھنڈے تک تو تین گھوڑے برابر دوڑتے رہے۔ مگر آخری مرحلے میں لالا آگے ہو گیا۔ اگرچہ اس کے اور دوسرے گھوڑوں کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ تھا۔ تاہم لالے کو پہلی پوزیشن حاصل ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ تو ایک سوار اس کے برابر بھی آ گیا تھا مگر لائن سب سے پہلے لالے نے ہی عبور کی جہاں یہ لالے کی تیز رفتاری تھی وہیں نوید کی شہ سواری بھی تھی کیونکہ اگر تیز رفتار گھوڑے کو بھی اناڑی شخص استعمال کرے تو وہ گھوڑے کی رفتار سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ دوسرا مقابلہ بھی نوید کا گاؤں جیت گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیسرا مقابلہ شام کو تھا تاکہ گھوڑوں کو آرام دیا جاسکے۔ یہ مقابلہ سب سے سخت تھا۔ ایک تو گھوڑوں کو رکاوٹیں عبور کر کے مقابلہ جیتنا تھا دوسرے باقی گاؤں والوں نے یہ مقابلہ جیتنے کے لئے اپنی پوری کوشش کرنی تھی۔ کیونکہ یہ بہت شرمندگی کی بات تھی کہ تینوں مقابلے ایک ہی گاؤں کا گھڑ سوار جیت جائے۔ اس طرح پھر لڑائی چھڑ جانے کا اندیشہ تھا کیونکہ دوسرے گاؤں والے اسے جنگ سمجھتے، پہلے بھی ایک مرتبہ اس طرح کی لڑائی ہو چکی تھی۔ اسی کی وجہ سے یہ میلہ جو پہلے ہر سال لگا کرتا تھا اب کی بار پانچ سال کے بعد لگا تھا۔ اس میلے کے مقابلے نوید کے لئے اگرچہ نئے نہیں تھے مگر وہ خود ان میں پہلی مرتبہ حصہ لے رہا تھا۔ اور خدا نے پہلی مرتبہ ہی اسے شاندار فتح نصیب کی تھی۔ سارے مالک ایک بار پھر اپنے اپنے گھوڑوں کو آرام دینے اور ان کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف تھے تماشائی اب دوسرے تماشوں کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ ایک طرف بندر اور ریچھ والے اپنے کرتب دکھا رہے تھے ایک طرف مرغوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ صبح سے اکا دکا ٹکڑیوں کی صورت بھرنے والے بادل یک دم جمع ہونے لگے کچھ ہی دیر بعد کالے سیاہ بادلوں نے سورج کو چھپا لیا۔ شام سے پہلے شام ہو گئی۔ آج ویسے بھی میلے کا آخری دن تھا۔

سب ٹھیلے والے اپنے سامان اور شامیانے سمیٹنے لگے۔ شمال کی طرف سے آندھی اٹھی اور آن کی آن میں طوفان بادو باراں کی شکل اختیار کر لی۔ اب تیسرا مقابلہ ناممکن تھا۔ کیونکہ وسیع میدان میں ہر طرف پانی اور کیچڑ تھا۔ لوگ بارش میں بھیگتے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ اسماعیل اور رفیق نے فیصلہ کیا تھا کہ اور لڑکوں کے ساتھ مل کر ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالتے ہوئے وہ نوید کی فتح کا جشن مناتے ہوئے گاؤں کی طرف روانہ ہونگے مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔ اگرچہ میلے کا اختتام اچھا نہیں ہو سکا تھا۔ پھر بھی وہ سب بہت خوش تھے پہلی مرتبہ ان کے گاؤں نے دو انعام حاصل کئے تھے۔ اردگرد کے گاؤں میں ان کے گاؤں کا نام روشن سے لیا جا رہا تھا۔ ساتھ والے کئی گاؤں کے چوہدریوں نے نوید کو دعوت پر بلایا تھا۔ گاؤں میں ایک نیا محاورہ تخلیق ہوا تھا کہ "بیٹا پالنا ہے تو مجید علی سے سیکھو"

نوید پہلے بھی گاؤں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، پہلے بھی اس کی خوبصورتی اور شرافت کی وجہ سے بہت سے گھرانے اسے داماد بنانے کے خواہشمند تھے اب تو بات ہی دوسری تھی اسے اندازہ تھا کہ جن چوہدریوں نے اسے اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہے وہ سب بھی کسی نہ کسی حوالے سے ایسی ہی خواہش کا اظہار ضرور کریں گے۔

"تو نے سنا کچھ۔" رفیق نے درخت تلے بیٹھے نوید سے آتے ہی کہا، وہ اپنی کلاشنکوف صاف کر رہا تھا۔ "او بیٹھ جا آرام سے اور پھر بتا کہ کیا خاص بات ہے" نوید بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ رفیق اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "یار وہ..... پرانا مندر ہے ناں کچی کھوٹی کے پاس۔" رفیق سسپنس پھیلانے کے لئے ذرا دیر کے لئے رکا، نوید اپنی صفائی روک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کیونکہ کچی کھوٹی اور وہ پرانا مندر اب ایک متروک علاقہ تھا۔ لوگوں نے وہاں سے کئی قسم کی پراسرار داستانیں منسوب کی ہوئی تھیں۔ یوں بھی مندر کی عمارت بہت خستہ ہو چکی تھی عرصہ سے اس طرف کوئی آتا جاتا نہیں۔ کیونکہ اس علاقے کے ہندو کچھ سال قبل ہی جب پاکستان بنا تھا تو وہاں سے چلے گئے تھے۔ ان کے بعد کوئی مندر کی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا، قدیم مندر دیکھ بھال نہ ہونے سے چند سال میں ہی نیم کھنڈر بن چکا تھا۔ کچی کھوٹی جو کبھی علاقے کے ہندوؤں کے لئے انتہائی متبرک تھی اب کائی جمے پانی کے ساتھ ویران پڑی تھی۔

علاقے کے مسلمانوں کو ایک دو مرتبہ وہاں سے گزرتے ہوئے اتفاقی طور پر حادثہ پیش آیا تو انہوں نے وہ راستہ ہی ترک کر دیا، یوں مندر جو پہلے ہی ویرانے میں تھا اور بھی خطرناک مشہور ہو گیا۔ اب

عرصے سے کوئی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ نوید خاموشی سے وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"یار کل گجروں کے آدمی شام کے وقت وہاں قریب والے راستے سے گزر کر گاؤں کی طرف آ رہے تھے تو انہوں نے مندر میں کئی لوگوں کو پھرتے دیکھا اور ایک کمرے میں روشنی بھی ہو رہی تھی جیسے آگ کا الاؤ روشن ہو، وہ دونوں اتنے خوفزدہ ہوئے کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے، گاؤں میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ وہ یا تو جن وغیرہ ہیں یا پھر ہندوؤں کی بدروحیں ہیں۔" رفیق نے بڑے سنسنی خیز لہجے میں یہ بات بتائی۔

"تو؟" نوید نے بھنویں سکوڑ کر پوچھا۔ وہ دوبارہ اپنی کلاشنکوف کی صفائی میں مصروف ہو گیا۔

رفیق چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا "میں چاہتا ہوں کہ ہم جا کر دیکھیں کہ آخر کون اب اس ویران کھنڈر میں موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہاں کوئی بدروح وغیرہ نہیں ہے ضرور ڈاکوؤں کے کسی گروہ نے وہاں اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا ہے" اس کی آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔

"پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو" نوید نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ اب وہ اپنی کلاشنکوف میں گولیاں بھر رہا تھا۔

"یار تو سمجھتا کیوں نہیں، میں تجھے اور اسماعیل کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ اس طرح اگر ہم ڈاکو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو نہ صرف ہماری واہ واہ ہو گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کوئی خفیہ خزانہ وغیرہ بھی مل جائے راتوں رات پھیر جائیں گے۔"

نوید نے اپنا کام ختم کر کے کلاشنکوف کو چارپائی پر رکھ دیا۔ "مجھے تو کسی خفیہ خزانے کی ضرورت یا لالچ نہیں ہے۔ میرے پاس خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ جہاں تک بات ہے تمہارا ساتھ دینے کی تو وہ میں صرف دوستی کے ناطے دینے کے لئے تیار ہوں مگر ابھی نہیں دو دن بعد آج مجھے ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کے گھر دعوت پر جانا ہے۔ وہاں سے میں کل یا شاید پرسوں واپس آ سکوں گا۔ کیونکہ چوہدری کے بیٹے کی منگنی بھی ہے۔"

رفیق نے فوراً اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ٹھیک ہے میں دو دن تک تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔"

رفیق کو معلوم تھا کہ مقابلے جیتنے پر اردگرد کے کئی گاؤں کے چوہدریوں نے نوید کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا ہوا تھا۔ اگرچہ مہینہ بھر ہو گیا تھا مگر ابھی تک یہ دعوتیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ حسب توقع نوید کو تقریباً ہر جگہ سے ڈھکے چھپے انداز میں رشتے کی پیش کش کی گئی تھی۔ سب ہی رشتے اچھے تھے مگر انہوں نے ابھی تک کسی بھی رشتے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ خود نوید کا کسی کی طرف جھکاؤ نہیں تھا اس لئے حتمی فیصلہ ماں باپ ہی کو کرنا تھا۔

مجید علی بیٹے کی "قسمت" اور فرمانبرداری سے بہت خوش تھا۔ چوہدری رب نواز اردگرد کے سب چوہدریوں سے زیادہ طاقتور اور امیر تھا۔ اس کی وسیع زرعی زمینیں تھیں۔ جن کی آمدنی سے اس نے شہر میں چینی کے کارخانے بھی لگا رکھے تھے۔ تقریباً سب گاؤں کا گنا چوہدری کی ملوں میں ہی جاتا تھا۔ اس کے پھلوں کے بھی کئی باغات تھے۔ اس وقت بھی مجید علی اور نوید دونوں اس کے آم کے وسیع باغات میں سے گزر رہے تھے۔ چوہدری کی شاندار حویلی سے کافی پہلے ہی اس کے نوکروں نے نوید اور مجید علی کا استقبال کیا اور ان کے گھوڑے لے لئے۔ پھر وہ بڑے عزت و احترام سے انہیں سجے سجائے مردانے میں لے آئے۔

چوہدری رب نواز پہلے ہی وہاں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے نوید کو سینے سے لگایا۔ مجید علی اگرچہ خود بھی زمیندار تھا مگر چوہدری کی امارت سے کافی مرعوب ہو رہا تھا۔ رب نواز نے اسے بھی محبت اور عزت سے گلے لگایا تو اسے قدرے حوصلہ ہوا۔ رب نواز کا انداز واضح طور پر دوستانہ تھا۔ اس نے جلد ہی اپنے دوسرے مہمانوں کو رخصت کر دیا۔ اب نواز کے ایک نوکروں نے اسے جائے لگ جانے کی خبر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی تو وہ مجید علی اور نوید کو ساتھ لئے مردانے کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ دروازہ ایک چھوٹی سی راہ داری میں کھلا۔ اب نواز انہیں لئے ہوئے پہلے کمرے میں داخل ہوگیا۔ نوید اور مجید علی کی آنکھیں حیرت سے کمرے کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ قیمتی پردوں، فانوس سے سجے اس بڑے کمرے میں داخل ہوگیا۔ نوید اور مجید علی کی آنکھیں حیرت سے کمرے کا منظر دیکھ رہی تھیں ۔قیمتی پردوں، فانوس سے سجے اس بڑے کمرے کے وسط میں ایک بہت بڑی چیز تھی جسکے گرد اونچی پشت کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، میز پر بے شمار برتن پڑے تھے جن میں مختلف کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں نوید اور مجید علی جھجکتے ہوئے بیٹھ گئے۔ چوہدری کے نوکروں نے انہیں چیزیں اٹھا اٹھا کر پیش کرنا شروع کردیں۔

اگر چہ دوسرے سب چوہدریوں نے بھی نوید اور اس کے باپ کی بہت اچھی خاطر تواضع کی تھی مگر اس طرح کے حالات انہیں پہلے پیش نہیں آئے تھے۔ کسی بھی چوہدری نے انہیں کھانے کے علیحدہ کمرے میں بلا کر کھانا نہیں کھلایا تھا۔ اگر چہ انہوں نے دعوت کا بھرپور انتظام کیا تھا مگر چوہدری رب نواز کی طرح شہری انداز سے کھانا نہیں کھلایا تھا۔

پاکستان بنے ابھی آٹھ دس سال ہی ہوئے تھے اور گاؤں والے اس طرح کے انداز زندگی سے واقف نہیں تھے۔ نوید سے رب نواز چھوٹے چھوٹے سوالات پوچھتا رہا۔ باتوں میں ہی اس نے اپنی بیٹی کا بھی ذکر کیا جو گاؤں کی لڑکی ہونے کے باوجود میٹرک پاس تھی۔ خود نوید بھی گاؤں سے تعلق رکھنے کے باوجود میٹرک پاس تھا ۔رب نواز نے کہا کہ وہ ان دنوں اپنی بیٹی کے لئے رشتہ تلاش کررہا ہے اور وہ ایسے لڑکے کو ترجیح دیگا جو سلجھا ہوا ہو چاہے اس کے خاندان سے باہر ہو۔ ساتھ ہی اس نے نوید کے سلجھے ہوئے انداز و اطوار کی تعریف کرنا شروع کردی، ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ چوہدری کی طرف سے رشتے کی پیشکش تھی۔

مجید علی تو اتنی عزت ملنے پر پھولا نہ سما رہا تھا۔ اس نے رسمی طور پر بھی سوچنے کی زحمت گوارانہ کی" جناب نوید آپ کا ہی بیٹا ہے۔" چوہدری رب نواز کے چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے۔ "ابھی تو میں اپ[ـنے] بیٹے کی منگنی کررہا ہوں آپ لوگ بھی اس میں شرکت کریں۔ پھر نوید بیٹے کے بارے میں بھی کچھ سوچ[ـتے] ہیں۔" ایک لحاظ سے نوید کا رشتہ طے ہوگیا تھا۔ وہ خو[د] اس صورتحال پر ہکا بکا بیٹھا تھا۔ جبکہ مجید علی سے اپنی خوشی چھپائی نہ جارہی تھی۔ اسے بیٹے کا رشتہ غیر اعلانیہ ہی کہا اتنی اچھی جگہ طے ہو جانے پر بہت خوشی ہورہی تھی اسنے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ علاقے کے اتنے بڑے اور امیر زمیندار کا سمدھی بن جائے گا۔

رب نواز کی دعوت سے واپسی پر دوسرے دن تینوں دوست گھوڑوں پر سوار کچی کھوٹی والے مندر کو جاتی پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ جارہے تھے اس راستے میں کئی جگہ اتنی گھنی خاردار جھاڑیاں تھیں کہ انہیں اپ[ـنے] گھوڑے ایک لائن میں گزارنے پڑتے جہاں راستہ قدرے چوڑا تھا وہ سب اک دوسرے کے برابر سفر جاری رکھے ہوئے تھے اگر چہ ان کے پاس سائیکلیں تھیں مگر اس طرف آنے کے لئے انہوں نے گھوڑوں کا انتخاب کیا تھا۔ کیونکہ اگر خدانخواستہ انہیں کسی خطرناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا تو بھاگنے کے لئے سائیکل کی نسبت گھوڑے زیادہ بہتر تھے۔ کسی بھی ناگہانی صورتحال سے نمٹنے کے لئے وہ تینوں بندوقوں سے [لیس] تھے۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ مندر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ انہیں درختوں میں سے جھانکتی سیاہ کھنڈر ہوتی عمارت نظر آرہی تھی۔ راستہ بہت دشوار تھا۔ کہیں کسی جگہ کانٹے دار جھاڑیوں نے ایک دوسرے میں اپنی شاخیں پھنسا کر راستہ اس طرح بند کیا ہوا تھا کہ انہیں کرایک آدھ جھاڑی کاٹنا پڑتی تو آگے گزرنے کا سارا راستہ بن جاتا تھا۔ یہ علاقہ گزشتہ دس بارہ سال سے ویران پڑا تھا۔ اس علاقے کے لوگ اس طرف نہیں گزرتے تھے۔

مندر پہلے بھی گاؤں سے ہٹ کر ویرانے میں

بنایا گیا تھا۔ اب آمدورفت بالکل نہ ہونے کی وجہ سے تنگ راستے کے گرد اگی ہوئی خاردار جھاڑیاں پھیل کر کہیں سے راستہ تنگ اور کہیں سے مکمل طور پر بند کر چکی تھیں ۔ اس سارے علاقے میں جنگلی جڑی بوٹیاں، درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ دور سے دیکھنے سے یہ علاقہ ایک چھوٹا موٹا جنگل نظر آتا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ جنگل میں درخت زیادہ ہوتے ہیں اس علاقے میں جھاڑیاں اور سرکنڈے زیادہ تھے جو اتنے بلند ضرور تھے کہ آدمی گھوڑے پر سوار بھی ہو تو جھاڑی کے اوپر سے نظر نہیں آتا تھا۔ نوید نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ "کیا ہوا رک کیوں گئے؟" اسماعیل نے حیرت سے پوچھا۔

اب دن کافی حد تک نکل آیا تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر صبح ہی صبح یہاں آنے کے لئے چنا تھا۔ کیونکہ انکا خیال تھا کہ اس مندر میں چور ڈاکو وغیرہ ٹھہرے ہوئے ہیں ۔ رات بھر واردات کرکے وہ یقیناً تھکے ماندے اس وقت مندر میں سورہے ہونگے تو وہ لوگ چپکے سے انکے سر پر پہنچ جائیں گے ۔ "آگے جانے سے پہلے چند باتیں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ اب ہم مندر کے بالکل نزدیک پہنچ چکے ہیں ۔ اور اس طرح منہ اٹھا کر سیدھے چلتے جانے سے ہم کسی خطرے سے بھی دوچار ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ ڈاکو لوگ اکثر سوتے وقت بھی پہرے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس لیے، بہتر یہ ہے کہ ہم میں سے ایک یہیں جنگلی جھاڑیوں میں چھپا رہے۔ دوسرا ساتھی مندر کے پیچھے سے اور ایک سامنے سے اندر داخل ہو۔ اس طرح اگر مندر میں داخل ہونے والوں میں سے کسی ایک کو مسئلہ پیش آئے گا تو دوسرا اس کی مدد کر سکے گا۔ اور اگر خدانخواستہ دونوں ساتھی ہی کسی مشکل میں پھنس جائیں تو تیسرا ساتھی بھاگ کر گاؤں والوں کو بلا لائے گا" دونوں نے نوید کی بات سے اتفاق کیا۔ طے یہ پایا کہ اسماعیل اور نوید دونوں مندر میں داخل ہوں گے جبکہ رفیق اسی جگہ چھپ کر ان لوگوں کا انتظار کرے گا۔ اگر یہ لوگ ایک گھنٹے تک واپس نہ آئیں یا مندر کی طرف سے گولیاں چلنے کی آواز آئے تو وہ گاؤں والوں کو مدد کے لئے بلا لائے گا ۔نوید نے اسماعیل کو مندر کے پیچھے سے داخل ہونے کا کہا اور خود سامنے کی طرف سے داخل ہونے کے لئے بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ ابھی تک اسے کسی قسم کی حرکت نظر نہیں آئی تھی۔

ہر طرف ایک پراسراری خاموشی چھائی ہوئی۔ جبکہ پرندے بھی خاموش تھے۔ بس کبھی کبھی ایک درخت سے اڑ کر دوسرے پر جا بیٹھتے۔ نوید کا گھوڑا اسکون سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار بھی کم تھی ۔ اب مندر بالکل سامنے نظر آرہا تھا۔ خود نوید ابھی تک جھاڑیوں کی روٹ میں تھا اگر مندر کی طرف سے کوئی اسے دیکھتا تو بہت مشکل تھا کہ نوید اسے نظر آتا اس نے گھوڑا روک دیا ۔ چند لمحے وہ غور سے مندر کا جائزہ لیتا رہا۔ وہاں سے مندر کا آدھا ٹوٹا ہوا داخلی دروازہ، اور سامنے والا دالان نظر آرہا تھا۔ اگر مندر کے دالان میں ایک بڑی سی جھاڑی نہ اگی ہوتی تو شاید اسے کچھ آگے تک بھی نظر آجاتا۔ اس نے مندر میں کسی قسم کی نقل و حرکت نہ پاکر اس میں داخل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ جتنی دیر تک وہ یہاں رکا تھا اس کا اندازہ تھا کہ ذرا سا چکر کاٹ کر اسماعیل مندر کے عقب میں پہنچ گیا ہوگا ۔ اس نے اپنا گھوڑا وہیں ایک جھاڑی کی موٹی شاخ سے باندھا اور احتیاط سے مندر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

مندر کے دروازے پر پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکا پھر اللہ کا نام لے کر اندر داخل ہوگیا۔ مندر کے درو دیوار سے جالے لٹک رہے تھے ۔ تاریک گوشوں میں چمگادڑ الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ فرش ہر جا بجا کائی اور گھاس اگی ہوئی تھی ۔ جہاں کہیں سے فرش سلامت تھا وہاں بھی خشک ٹہنیاں اور پتے فرش کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ نوید احتیاط سے بغیر کوئی آواز پیدا کئے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ سامنے کا دالان عبور کر کے آگے ایک راہداری تھی جس کے دونوں جانب کمرے تھے۔ کمروں کی بیرونی حالت تو باقی مندر سے قدرے بہتر تھی۔ اندر ابھی تک وہ گیا نہیں تھا، پہلے کمرے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داخل ہونے سے پہلے وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کی نظر دروازے کے قریب زمین پر پڑے ہوئے ایک سگریٹ کے ٹکڑے پر تھی۔ یہ ٹکڑا بتا رہا تھا کہ انکا اندازہ درست تھا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر کلاشنکوف کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب وہ پوری طرح چوکنا اور محتاط تھا۔ وہ اوٹ میں ہو کر کمرے میں جھانکا اندر نیم تاریکی میں خاموشی طاری تھی۔ وہ احتیاط سے کمرے میں داخل ہو کر چاروں طرف گھوم گیا۔ مگر کمرہ بالکل خالی تھا۔

یہاں ایک کونے نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ اس کونے میں اس طرح لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں جیسے جلتے جلتے ان پر پانی ڈال کر انہیں بجھا دیا ہو۔ اگر سگریٹ کے ٹکڑے کو وہ نظر انداز کر بھی دیتا تو بھی ان ادھ جلی ہوئی لکڑیوں کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ابھی تک اسے کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ جبکہ اسماعیل کی موجودگی کا بھی کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ مندر کے پانچوں کمرے اور پوجا کا بڑا کمرہ بھی دیکھ چکا تھا جس میں سے قیمتی مورتیاں اکھاڑ کر لے جائی جا چکی تھیں جبکہ کم قیمتی مورتیاں اب بھی وہاں ایستادہ تھیں اور بتدریج شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ڈاکو صرف ایک دن یا شاید ایک رات کے لئے اس مندر میں رکے تھے کیونکہ ایک کمرے میں ایسے آثار تھے جیسے وہاں کچھ آدمی رہے ہوں دو ایک گولیوں کے خالی خول بھی وہاں پڑے ہوئے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ٹھہرنے والے لوگ عام لوگ نہیں تھے۔ اسے ابھی تک اسماعیل نظر نہیں آیا تھا۔

نوید نے احتیاط سے درختوں پر بھی نظر ڈال لی کہ کہیں کوئی آدمی درختوں پر تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ مندر اب بھی ڈاکوؤں کا ٹھکانہ ہوتا تو اس وقت انہیں یہاں ہونا چاہیے تھا یا پھر ان کے سامان کو، مگر یہاں سے [illegible] سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ کل رات ہی یہ مندر چھوڑ کر نکل گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بھی گجروں کے ان دو آدمیوں کو دیکھ لیا ہو جو اس مندر میں روشنی اور مردوں کے سائے دیکھ کر بھاگ اٹھے تھے اور مخبری کے خوف سے انہوں نے اس ٹھکانے کو فوراً چھوڑ دیا ہو۔

چونکہ نوید سارے مندر کی تلاشی لے چکا تھا اس لئے اب پر سکون ہو کر وہ مندر کے پیچھے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے لگا کوئی تیزی سے ٹوٹے دروازے کی اوٹ میں ہوا ہے، غیر ارادی طور پر اس نے اپنی بندوق سیدھی کر لی مگر ایک لمحے کے بعد ہی اس کے منہ سے ہنسی نکل گئی۔ ”او آ جا تو ابھی تک یہیں چھپا بیٹھا ہے میں ساری تلاشی لے آیا ہوں، اندر تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ نوید نے بلند آواز سے کہا تو اسماعیل ٹوٹے دروازے کے پیچھے سے نکل آیا۔ ”یار بس تو احتیاط سے مندر کا جائزہ لے رہا تھا اور تو اندر سے ہو بھی آیا۔ تجھے اندر جاتے ہوئے کسی انجانی گولی سے ڈر نہیں لگا۔“ اسماعیل نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

”نہیں...... میں بھی احتیاط سے ہی اندر داخل ہوا تھا۔ مگر تم اتنی دیر سے کیوں پہنچے“ نوید سمجھ گیا تھا کہ اسماعیل مندر تک پہنچنے میں لیٹ ہو گیا ہے ورنہ وہ بندہ بھی بڑا جی دار تھا۔ ”دراصل راستے میں مجھے کچھ جھاڑیوں میں حرکت نظر آئی تھی اس لئے میں انہیں دیکھنے کے لئے رک گیا تھا۔“

دونوں اب ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ”کیا تھا جھاڑیوں میں“ نوید نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ایک چھوٹا گیدڑ تھا شاید خرگوش پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اسے دیکھنے کے لئے مجھے کافی وقت ضائع کرنا پڑا۔“ اسماعیل نے اس کے ساتھ مندر کی اندرونی راہداری میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہیں تلاشی لینے کی ضرورت نہیں میں سب کچھ چیک کر چکا ہوں کچھ ڈاکو جنکی تعداد میرے اندازے کے مطابق پانچ ہو سکتی ہے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے مگر اب وہ اپنا سامان سمیٹ کر یہاں سے جا چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل رات یا پھر اس سے بھی پہلے ہی۔ تم تیزی سے کمرے دیکھ لو میں اتنی دیر میں رفیق کو بلواتا ہوں۔ وہ پریشان ہو رہا ہوگا۔“

اسماعیل سر ہلاتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور نوید رفیق کو بلانے چل دیا کچھ دیر بعد وہ تینوں اسی طرح گھوڑوں پر سوار واپس جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

مجید علی کی گھوڑی آگے تھی جبکہ نوید کا گھوڑا چہل قدمی کے انداز میں قدرے پیچھے آ رہا تھا۔ آج پھر دونوں باپ بیٹا شکار کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کھیتی باڑی کے معمول کے کام میں یہ انکی واحد تفریح تھی۔ دونوں ہی شکار کے بے حد شوقین تھے اس لئے ہر دو تین ماہ کے بعد اس جنگل کا رخ کر لیتے تھے۔ جب نوید چھوٹا ہوتا تھا تب بھی وہ کئی مرتبہ باپ کے ساتھ اس جنگل میں آ چکا تھا۔ تب یہاں آنے جانے کے لئے دوسرا راستہ استعمال ہوتا تھا۔ پھر تقریباً دو تین سال قبل اس راستے پر ایک بڑے سانپ نے قبضہ کر لیا۔ وہ راستے میں آنے والی ایک چھوٹی سی پہاڑی میں رہتا تھا اور ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا۔

سانپ بہت بڑا تھا۔ اس لئے لوگوں نے مارے خوف کے راستہ ہی چھوڑ دیا کیونکہ راستہ بالکل پہاڑی کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ جہاں اس خطرناک سانپ کا بسیرا تھا۔

آج کا دن باپ بیٹے کے لئے کوئی خاص نہیں رہا تھا۔ اب تک انہیں کوئی اچھا شکار نہ مل سکا تھا۔ اب دوپہر ڈھل رہی تھی۔ انہیں ایک دو گھنٹوں کے بعد لازماً واپسی کا سفر اختیار کرنا تھا۔ کیونکہ دوسرا راستہ کافی طویل تھا۔ اور گھر پہنچتے پہنچتے انہیں رات ہو جانی تھی۔ دفعتاً ایک چھوٹا ہرن سامنے کے جھنڈ سے نکلا اور نوید کے سامنے سے دوڑتا ہوا اس کے دائیں طرف موجود جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ نوید نے ایک لمحے میں اس پر فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ بہت پختہ تھا۔ گولی ہرن کی پچھلی ٹانگوں کے قریب لگی تھی، نوید نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ ہرن زخمی ضرور تھا مگر ابھی بھی بھاگ رہا تھا۔ چند گز آگے جا کر وہ بے بس ہو کر گر پڑا اس کے زخم سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ نوید کود کر اپنے گھوڑے سے نیچے اترا اور ہرن کی طرف بھاگا۔ ہرن اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر پھر ہمت کر کے اٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا، شدید زخمی ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ نوید اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔

مجید علی اپنی گھوڑی پر اس کے پیچھے آ رہا تھا اس نے اپنی گھوڑی کی رفتار بڑھائی کہ ہرن کو سامنے سے جا کر گھیر لے مگر نوید نے منع کر دیا۔ ”نہیں بابا...... میں اکیلا ہی کافی ہوں۔“

مجید علی نے گھوڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ لالا خود بخود ہی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ نوید نے ہرن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کچھ آگے جا کر ہرن نقاہت کی وجہ سے گر پڑا تو نوید اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ہرن کی بڑی بڑی آنکھوں میں رحم کی درخواست تھی۔ وہ انتہائی دردمندانہ انداز میں نوید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ نوید نے اسے دبوچ لیا۔ ہرن نے آخری کوشش کے طور پر خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر نوید کی گرفت میں مچل کر رہ گیا۔ مجید علی بھی گھوڑی سے اتر کر اس کے پاس آ گیا۔ اس نے گھوڑی کی زین سے بندھے ایک بڑے تھیلے میں سے ایک بڑی اور تیز دھار چھری نکالی اور قریب آ گیا۔ نوید نے ہرن کو پکڑے رکھا اور مجید علی نے اسے ذبح کر دیا۔ ہرن کی اذیت سے جان چھوٹ گئی اور وہ خود ہرن کے مر جانے کے خوف سے محفوظ ہو گئے تھے۔

نوید نے ہرن کو ایک تھیلے میں ڈال کر اپنے گھوڑے کی پشت پر باندھ دیا۔ باپ بیٹے خوش تھے کہ انہیں دس پندرہ کلو گوشت مل گیا تھا وہ بھی ہرن کا۔ مجید علی نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ ”اب واپس چلتے ہیں۔ راستے میں اگر کچھ اور خرگوش یا بٹیر مل گئے تو شکار کر لیں گے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نوید نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔ دونوں واپسی کے لئے مڑے۔ سامنے سے خرگوش کا جوڑا گزرا دونوں نے فائر داغ دیئے۔ دونوں خرگوش گر کر تڑپنے لگے۔ نوید علی نے جلدی سے انہیں زبح کر دیا۔ پھر تو جیسے شکار کی بھر مار ہوگئی۔ ذرا سی دیر میں وہ کافی تعداد میں تیتر اور خرگوش شکار کر چکے تھے۔ اب گولیاں بھی کم رہ گئی تھیں۔

نوید ابھی کچھ دیر اور وہاں ٹھہرنا چاہتا تھا مگر مجید علی نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ انہیں جنگل میں ہی کافی وقت گزر گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں سورج ڈوبنے والا تھا۔ نوید کو باپ کی بات ماننی پڑی۔ دونوں گھوڑے آگے پیچھے مناسب رفتار سے چلتے ہوئے جنگل سے باہر جانے والے راستے پر گامزن تھے۔ اب جنگل خاتمے کے قریب تھا یہاں سے راستہ دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ ایک راستہ وہ تھا جو سرسبز اور خوبصورت علاقے سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ نسبتاً چھوٹا راستہ تھا۔ جبکہ دوسرا راستہ ویران اور کافی طویل تھا۔ نوید کو وہ مختصر اراستہ بہت پسند تھا، وہ بہت مرتبہ اس راستے سے گزر کر شکار کرنے آتا جاتا رہا تھا۔

"بابا....." اس نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا۔ مجید علی نے بھی اپنی گھوڑی روک لی۔ "میں چاہتا ہوں کہ آج ہم اسی پرانے راستے سے واپس جائیں، ہم جلدی پہنچ جائیں گے۔"

مجید علی نے غور سے بیٹے کو دیکھا۔ "بیٹا تو جانتا ہے کہ اس راستے پر ایک خطرناک سانپ نے قبضہ کر لیا ہے وہ کسی کو وہاں سے گزرنے نہیں دیتا۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ ہمیں واپسی میں واقعی دیر ہوگئی ہے۔ پھر بھی ہم رات کے ابتدائی حصے میں اپنے گھر تک پہنچ جائیں گے۔" مجید علی نے اگرچہ لفظاً اسے منع کیا تھا مگر اس کے لہجے میں وہ ہمیشہ والی قطعی بات نہ تھی۔ جس کے بعد نوید کو دوبارہ بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

"بابا.....ہم دو ہیں ہمارے پاس کلاشنکوف ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میرا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ اگر سانپ سے ہمارا آمنا سامنا ہو بھی گیا تو ہم لاٹھی سے مار نے یا بھاگنے کی بجائے اسے فائر کر کے مار ڈالیں گے اس طرح خلق خدا کا بھلا ہو جائیگا اور یہ اتنا اچھا اور سرسبز راستہ دوبارہ استعمال ہونے لگے گا۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے مگر جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا میں جانتا ہوں کہ تیرا نشانہ بہت پختہ ہے۔ یا ویسے بھی ہم دونوں باپ بیٹا اتنی طاقت ضرور رکھتے ہیں کہ کسی بڑے سانپ کو بھی لاٹھی سے مار سکیں مگر میں نہیں چاہتا کہ ہم اس راستے سے جا کر اس خطرے میں پڑیں۔" مجید علی کی آواز مدھم تھی۔

"بابا یہ سب بے کار کے اندیشے ہیں۔ ہم دونوں سانپ پر بھاری پڑیں گے۔ آپ ہمت پکڑیں آج ہم اسی راستے سے جائیں گے میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اگر سانپ ہمیں نظر نہ آیا تو ہم آرام سے گزر جائیں گے۔ لیکن اگر اس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تو ہم اس کا کانٹا نکال دیں گے۔" نوید نے ایک عزم سے کہا اور گھوڑا اس مختصر راستے پر ڈال دیا مجید علی بھی اس کے پیچھے ہولیا۔

دونوں راستے کچھ دور تک ذرا فاصلے سے ایک دوسرے کے متوازی چلتے تھے پھر ایک موڑ سے دونوں راستوں کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا تھا اور راستے بالکل الگ ہو جاتے تھے۔ مجید علی اور نوید ابھی اس موڑ سے پیچھے ہی تھے کہ دوسرے راستے پر سے کسی نے انہیں پکارا۔ "مسافرو.....میری بات سنو" دونوں نے گھوڑے روک لئے۔ "کیا بات ہے" مجید علی کے کہنے پر نوید نے گلا پھاڑ کر پوچھا۔ کیونکہ راستے ایک دوسرے کے متوازی ہونے کے باوجود درمیان میں کافی فاصلہ تھا۔ اپنی بات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے دونوں کو پوری آواز کے ساتھ بولنا پڑ رہا تھا۔

"اس راستے پر آگے سانپ نے قبضہ کر رکھا ہے.....اس پر نہ جاؤ.....وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑتا.....اس نے اب تک کسی کو اس راستے سے گزرنے نہیں دیا۔" اجنبی نے اپنے سر پر رکھے خشک لکڑیوں کے گٹھر کو زمین پر گرا دیا تھا جسے وہ جنگل سے اپنے گھر لے جا رہا

تھا۔ وہ نوید اور مجید علی سے واقف نہیں تھا اور انہیں اس علاقے میں نئے لوگ سمجھ کر خطرناک سانپ سے آگاہ کر رہا تھا۔ آواز کو ان تک پہنچانے کے لئے وہ بھی پوری طاقت سے بول رہا تھا۔

"ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں.....بھائی تمہارا شکریہ کہ تم نے ہمیں آگاہ کیا.....لیکن ہم سفر اسی راستے سے کرنا چاہتے ہیں۔" اب کی بار مجید علی نے جواب دیا۔

"او بھائی.....تمہارے ساتھ جوان بیٹا ہے۔ اپنی نہ سہی اس کی زندگی اور جوانی کی فکر کرو اور اس راستے پر نہ جاؤ۔ سانپ بہت ظالم ہے۔" دیہاتی کو نوید کی بھری جوانی پر رحم آ رہا تھا۔

مجید علی نے خیر سگالی کے طور پر ہاتھ لہرایا اور اپنی گھوڑی کو آگے بڑھا دیا۔ وہ اپنے بیٹے کے سامنے خود کو بزدل ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اجنبی دیہاتی افسوس سے سر ہلاتے ہوئے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

موڑ پر جا کر مڑنے سے پہلے نوید نے مڑ کر دیکھا وہ اجنبی اب اپنا گٹھر اٹھا کر اپنے راستے پر چل پڑا تھا۔ نوید مسکرا دیا۔ اسے اس سادہ لوح دیہاتی پر بہت پیار آیا تھا جس نے صرف ان کی جان بچانے کے لئے اپنا بھاری گٹھر پہلے گرایا اور پھر خود ہی مشکل سے اٹھایا تھا۔

دونوں باپ بیٹا باتیں کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ راستہ کشادہ اور ہموار تھا۔ اس لیے گھوڑے خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ دونوں راستے میں آنے والے ایک قدیم کنویں پر رک گئے۔ اب تو شاید کئی سالوں سے کسی نے اس میں سے پانی نہیں نکالا تھا۔ نوید نے لمبی رسی کو ڈول سے باندھ کر پانی نکالا اس پر کائی جم رہی تھی۔ پانی کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی مگر مجبوراً انہیں اسی میں سے پینا پڑا کیونکہ یہاں قریب پانی کا اور کوئی ذخیرہ موجود نہیں تھا۔ پانی انہوں نے گھوڑوں کو بھی پلایا تھا۔ مگر گھوڑوں نے بھی اسے پسند نہیں کیا۔

دونوں ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھے اب کی بار نوید کا گھوڑا آگے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں سامنے اس پہاڑی کی چوٹی نظر آنے لگی جس کے اندر ایک بڑے عفریت نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ نوید کی دھڑکن کچھ تیز ہوگئی۔ اس نے گھوڑے کی رفتار کچھ تیز کر دی۔

شاید وہ جلد از جلد سانپ تک پہنچ جانا چاہتا تھا یا پھر سانپ کی نظروں سے بچ کر گزر جانا چاہتا تھا۔ مجید علی کی گھوڑی بھی قدرے تیز ہوگئی۔ اب مکمل پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ یہ پہاڑی بلندی میں کم تھی مگر اس کا گھیراؤ کافی تھا۔ پہاڑی کے قریب زمین بالکل کچی اور مٹی گرد کی صورت میں تھی۔ سبزہ پہاڑی سے کافی پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔ بس اکا دکا درخت پہاڑی کے نزدیک بھی موجود تھے۔ اتنے سرسبز علاقے میں پہاڑی بالکل بنجر تھی اس پر گھاس بھی کہیں کہیں ہی تھی باقی پہاڑی سرخی مائل مٹیالے پتھروں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

گھوڑے رکنے لگے انکے انداز میں خوف تھا۔ لالے نے اپنے اگلے پاؤں سے زمین کھرچی۔ نوید جانتا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے مگر اس نے گھوڑے کو تھپکی دی۔ "لالے آگے چل.....یہاں رکنا نہیں ہے" لالا آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا مگر مالک کے حکم کے سامنے مجبور تھا۔ اس نے آگے بڑھنا شروع تو کر دیا مگر اس کے انداز میں واضح خوف تھا۔

یہاں اتنا پراسرار ماحول تھا کہ وہ دونوں خود بھی بالکل خاموش تھے۔ ہر طرف موت کی خاموشی طاری تھی ایسے میں واحد آواز گھوڑوں کے چلنے سے پیدا ہو رہی تھی اور اس سکوت میں اور بھی خوفناک محسوس ہو رہی تھی۔

مجید علی کا دل ڈوبنے لگا اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ اب اسے دیہاتی کی بات بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ اسے اپنے اکلوتے جوان بیٹے کو لے کر اس راستے پر نہیں آنا چاہیے تھا۔

اس نے آج سے پہلے وہ خطرناک سانپ نہیں دیکھا تھا جس نے یہ راستہ روک رکھا تھا۔ انہیں پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی کہ اس راستے پر کہیں سے ایک بڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سانپ نے آ کر قبضہ کرلیا ہے۔ اس لئے لوگ اس راستے سے نہیں گزرتے تھے۔ آج وہ نوید کے کہنے میں آ کر ایک فاش غلطی کر چکا تھا۔ ابھی سانپ نظر نہیں آیا تھا مگر اس کی دہشت اس پر طاری ہونے لگی تھی۔

راستہ پہاڑی کے بالکل نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ گھوڑوں کی رفتار میں واضح کمی اور انداز میں حد درجہ خوف آ گیا تھا۔ نوید نے اپنی کلاشنکوف کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑلی۔ اس کے دل میں بھی اندیشے سر اٹھانے لگے تھے۔ اس کے پاس صرف پانچ گولیاں تھیں۔ اگرچہ اس کا نشانہ بہت پختہ تھا مگر پھر خطا ہو جانے کی صورت میں اس کے پاس صرف چار مواقع اور تھے۔ اور ہو سکتا تھا کہ سانپ اسے خود پر دوسرا وار کرنے کا موقع نہ دے۔

بالآخر گھوڑے بدک کر رک گئے مگر دونوں نے ان پر قابو پالیا اور انہیں پلٹ کر بھاگنے نہیں دیا انہیں گھوڑوں کے بدکنے کی وجہ سامنے نظر آ گئی تھی۔

مجید علی کا دل لرز سا گیا۔ سامنے پہاڑی کے دامن میں ایک دیو ہیکل سانپ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا دھڑ کافی اونچا تھا۔ یقیناً وہ پینتیس چالیس فٹ لمبا ہوگا۔ اس کی موٹائی بھی کافی تھی۔ وہ اپنے بل نما غار کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بل یقیناً ایک قدرتی اور چھوٹا سا غار تھا۔ اس کا پتھریلا دہانہ بہت چھوٹا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی سانپ نے اپنا سر اٹھالیا۔ اگرچہ اس کے سیاہی مائل بھورے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تھی تاہم اس کی تیز چمکیلی ترچھی آنکھیں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔

مجید علی کو خوف اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ نوید کی حالات اس سے قدرے بہتر تھی اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ دیہاتی نے کیوں اتنی مشقت اٹھا کر انہیں اس راستے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اب مزار کا کوئی راستہ نہ تھا۔

سانپ کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ان پر کسی بھی لمحے حملہ کردے گا۔

نوید نے خدا کا نام لے کر اس پر فائر کردیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، نشانہ چوک گیا تھا۔ نوید کے بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔ سانپ کا سر کچھ اور اونچا ہو گیا تھا مگر اس نے ابھی تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔

دفعتاً سانپ نے منہ کھولا تو نوید نے گھبراہٹ میں یکے بعد دیگرے چاروں فائر جھونک دیئے۔ کوئی بھی گولی نشانے پر نہ لگ سکی۔

سکہ فضا میں اچھال کر نشانہ بنا لینے والا نوید سانپ کو نشانہ نہیں بنا سکا تھا۔ سب گولیاں سانپ کے دائیں بائیں پتھروں پر لگی تھیں۔ کچھ پتھروں کے ٹکڑے اڑا کر سانپ کے جسم سے بھی ٹکرائے تھے۔ اپنا آخری فائر خطا ہوتے دیکھ کر نوید نے کلاشنکوف پھینک دی اور گھوڑا موڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مجید علی کی گھوڑی بھی سر پٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔

سانپ کی خوفناک اور دل دہلا دینے والی پھنکار سنائی دی، اور وہ اٹھ کر انکے پیچھے دوڑا۔ خوفزدہ گھوڑے اپنی سکت سے بھی زیادہ تیز دوڑ رہے تھے مگر سانپ کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔

نوید نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے سر موڑ کر دیکھا سانپ چند گز پیچھے تھا، نوید نے گھوڑے کو مخصوص تھپکی دی۔ لالے نے دونوں پچھلے پاؤں سے خوب مٹی اڑا دی۔ مٹی سانپ کی آنکھوں میں پڑی تو وہ رک گیا، گھوڑوں نے اتنی دیر میں کافی فاصلہ طے کرلیا تھا۔ گرد ذرا کم ہوئی تو سانپ پھر ان کے پیچھے دوڑنے لگا۔ نوید نے گھوڑے کو پہاڑی کے گرد دوڑانا شروع کردیا۔ کیونکہ سیدھے راستے پر بھاگنے سے سانپ بہت جلد ان تک پہنچ سکتا تھا۔ گھوڑے پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ مگر سانپ سر پر پہنچا جا رہا تھا۔ نوید نے اپنے گھوڑے پر لدا ہوا ہرن کا تھیلا بھی وزن کم کرنے کے لئے نیچے گرادیا۔

سانپ ایک لمحے کے لئے رکا۔ اڑتی گرد میں وہ شاید یہ سمجھا تھا کہ سوار گھوڑے سے نیچے گر گیا ہے۔ لیکن جب اسے تھیلا پڑا نظر آیا تو وہ ایک بار پھر

گھوڑے کے پیچھے دوڑنے لگا۔ لالا اپنی بساط سے بڑھ کر دوڑ رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کے مالک کی زندگی خطرے میں ہے۔

مجید علی کی گھوڑی کمزور تھی وہ تھکنے لگی تھی۔ اور نوید کے گھوڑے کی سی تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ لالے سے کافی پیچھے رہ گئی۔ سانپ اس کے نزدیک آیا۔ اس نے ایک بار مجید علی کے قریب ہو کر دیکھا۔ گرد کی وجہ سے اسے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر جب اسے نظر آیا کہ گھوڑے پر اس کا ہدف نہیں ہے تو وہ مجید علی کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ مجید علی کے منہ سے درد بھری آواز نکل گئی۔ اسے ادراک ہو گیا تھا کہ سانپ ہر صورت نوید کی جان لینا چاہتا ہے۔ اگر وہ ان دونوں کو یکساں دشمن سمجھتا تو کبھی اس طرح اس کو چھوڑ کر نوید کے تعاقب میں نہ جاتا۔

مجید علی کو اپنے بیٹے کی زندگی اپنے سامنے ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ ان کے پاس اب کوئی اسلحہ یا ہتھیار نہیں ہے۔ گھوڑے کتنی دیر تک اس کے سامنے دوڑ سکتے ہیں، آخر وہ تھک کر رک جائیں گے۔ تو سانپ کو کون روکے گا۔ یہاں کسی کو مدد کے لئے بلایا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ آبادی یہاں سے بہت دور تھی اور یہ راستہ متروک اور ویران تھا۔

لوگ پچھلے کئی سال سے اس راستے سے کترا کر گزرتے تھے۔ نوید کا گھوڑا پہاڑی کا چکر کاٹ کر پھر مجید علی کے پاس آ گیا۔ مجید علی نے غور سے نوید کی طرف دیکھا، نوید کی آنکھوں میں التجا تھی کہ کسی طرح باپ اس سانپ سے پیچھا چھڑانے کا کوئی حل تلاش کرلے، مجید علی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

سانپ کو آتے دیکھ کر گھوڑی پھر دوڑنے لگی۔ لالا اب بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ نوید کو خود بھی احساس تھا کہ اب کوئی لمحہ جاتا ہے کہ لالا تھکن کے مارے گر جائے گا۔ اسے خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ سانپ اس کے باپ کی نہیں صرف اس کی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔

اسے رہ رہ کر اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

لالے کی رفتار کم ہو رہی تھی اور سانپ اس کے سر پر پہنچ رہا تھا۔ نوید نے چیخ کر لالے کو تیز دوڑنے کے لئے کہا۔ خوف کے باعث اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔

سورج بھی ڈوبنے کے قریب تھا۔ گرد اور کم ہوتی روشنی کی وجہ سے لالے کو نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ وفادار جانور اپنے مالک کی جان بچانے کی اپنی سی پوری کوشش کر رہا تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے زمین سے گرد بھی اڑا رہا تھا۔ تاکہ سانپ کچھ دیر گرد بیٹھ جانے کا انتظار کرے تو وہ کچھ فاصلہ طے کر سکے۔ انسان بھاگ سکتا ہے مگر اپنی تقدیر سے نہیں۔

دوڑتے دوڑتے مجید علی کی گھوڑی ایک مرتبہ پھر نوید علی کے گھوڑے سے پیچھے رہ گئی۔ سانپ نے اب کی بار اسے دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی وہ نوید کے پیچھے بھاگتا رہا۔ لالا اپنی طاقت سے بڑھ کر دوڑ رہا تھا۔ وہ کافی تھکا ہوا بھی تھا۔ اس کی رفتار کم ہو گئی تھی۔

سانپ گھوڑے کے برابر آ گیا تھا۔ ”لالے بھاگ میرے یار“ نوید کی گھٹی ہوئی آواز بھی لالے کو بھاگنے پر مجبور نہیں کر سکی۔

سانپ زمین سے کئی فٹ اوپر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک لمحے کے اندر چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو نوید کی مضبوط کمر کے گرد لپیٹ لیا۔

مجید علی کی دھاڑیں نکل گئیں۔ سانپ نے اپنا منہ نوید کے منہ کے بالکل سامنے لا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا، اس کا انداز فاتحانہ تھا۔ نوید کی آنکھوں سے بے بسی اور خوف چھلکا پڑ رہا تھا۔

سانپ نے نوید کو گھوڑے کی پشت سے نیچے گھسیٹ لیا، اور اسے لے کر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ مجید علی اپنی گھوڑی پر اس کے پیچھے آنے لگا۔ اس کی عمر بھر کی کمائی اس کا شیر پتر سانپ کے شکنجے میں کسا اس کے سامنے زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا۔

مجید علی نے روتے ہوئے سانپ سے اپنے بیٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو چھوڑ دینے کی درخواست کی، جس جگہ سانپ نے نوید کو گھوڑے پر سے گھسیٹا تھا وہ اس جگہ سے کچھ ہی فاصلے پر تھی جہاں کھڑے ہو کر نوید نے اس پر گولیاں برسائی تھیں۔ اور اب سانپ نوید کو جکڑے ہوئے اس جگہ کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔

مجید علی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گر رہے تھے۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ سانپ اس کے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑے گا مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اسے کس طرح سے مارے گا۔ سانپ اپنے بل کے پاس جا کر رک گیا۔ اب تک نوید نے منہ سے ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ بس وہ التجا بھری نظروں سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

سانپ نے اپنا بل ڈھیلا کیا اور پھر نوید کی ٹانگیں اپنے بل میں داخل کر دیں، نوید کو اپنا بھیانک انجام نظر آ گیا، بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو گرے۔

مجید علی موت سے بے پرواہ ہو کر چلاتا ہوا گھوڑی سے اتر کر نوید کی طرف بھاگا۔ سانپ نے نوید کو نیچے کی طرف دھکیل دیا۔

"بابا" نوید کے منہ سے بلکتی ہوئی آواز نکلی۔

مجید علی ابھی اس سے کئی گز دور تھا۔ سانپ نے اس بار کافی طاقت سے اسے اندر کی طرف دھکیلا، کڑک ..... کڑک، نوید کی کئی ہڈیاں زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹ گئیں کیونکہ غار کا منہ تنگ تھا اور نوید اس میں سے گزر نہیں سکتا تھا۔ نوید کے منہ سے دردانگیز چیخ نکلی تو مجید علی کی آنکھیں صدمے اور حیرت سے پھیل گئیں۔ مجید علی اپنے قدموں پر کھڑا رہنے کے قابل نہ رہا۔

سانپ نے ایک بار پھر نوید کو اندر کی طرف دھکیلا ایک بار پھر نوید کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کڑکڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور تاریک ہوتی فضا اس کی بھیانک چیخوں سے گونج اٹھی۔ اب نوید کا صرف سر غار سے باہر رہ گیا تھا۔

"بابا..... مجھے بچالو" نوید نے بلک کر کہا۔

مجید علی نیچے گر گیا مگر اس کی نگاہیں اب بھی بیٹے کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

سانپ نے نوید کا سر بھی غار میں دھکیل دیا اور خود بھی غار میں جانے لگا، اس نے مجید کو نظر انداز کر دیا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ مجید علی کے دیکھتے ہی دیکھتے سانپ اس کے کڑیل جوان بیٹے کو لے کر غار میں سما گیا تھا۔

مجید علی کی کھلی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی طرح گر کر اس کی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ اردگرد پہلے جیسی خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ لالا اور مجید علی کی گھوڑی ذرا فاصلے پر کھڑے ہانپ رہے تھے۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ مجید علی اپنی دنیا لٹا چکا تھا۔ اسے اجنبی دیہاتی کی پکار بڑی شدت سے یاد آئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

بڑی دیر کے بعد وہ خود کو سنبھالنے کے قابل ہوا اور زمین سے اٹھ کھڑا ہوا مگر اب وہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی کمر جھک گئی تھی۔ بمشکل خود کو گھسیٹ کر وہ اپنی گھوڑی تک پہنچا اور بڑی دقت سے اس پر سوار ہو گیا۔ گھوڑی پر سوار ہو کر جب اس نے لالے کی لگام تھامی تو ایک بار پھر دھاڑیں مار مار کر رو دیا، اب وہ خالی گھوڑے کو گھر لے جا رہا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک بار پھر مڑ کر غار کی طرف دیکھا جس میں اس کا اکلوتا بیٹا زندہ دفن ہو گیا تھا۔

گہرے ہوتے اندھیرے میں غار کا دہانہ بمشکل نظر آ رہا تھا۔ مجید علی برستی آنکھوں کے ساتھ اپنے گاؤں کی طرف بڑھنے لگا، اسے اپنے جوان بیٹے کی موت کا اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ "کیا وہ واقعی سانپ تھا یا کوئی عفریت؟ کہ بہترین نشانے باز کا کوئی فائر نشانے پر نہیں لگا تھا۔"

مجید علی نے دھندلائی نظروں سے ایک بار پھر پلٹ کر اندھیرے میں غائب ہوتی پہاڑ کی طرف دیکھا اور آگے بڑھنے لگا۔

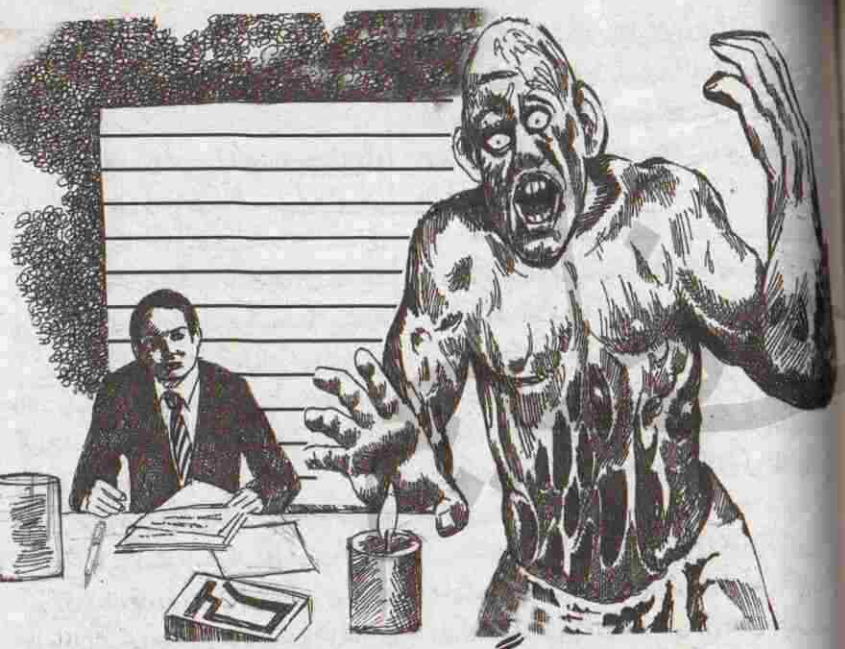

حیرت انگیز

اقصیٰ رباب-اوکاڑہ

اچانک حادثاتی طور پر نوجوان کی شادی ہوگئی ایک خوبصورت محل کے ایک سجے سجائے حجلہ عروسی میں کھویا رہا صبح کے وقت وہ محل سے باہر نکلا تاکہ اپنے دوست احباب کو اپنی خوش قسمتی کا احوال سناسکے مگر جب وہ.....

دل ودماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش کہانی

گردش دوراں بعض اوقات عجب رنگ دکھاتی ہے اور انسان فیصلہ نہیں کر پاتا کہ جو اس کے ساتھ ہوا وہ اچھا تھا یا برا۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ جس کے بارے میں آج تک میں فیصلہ نہیں کر پایا کہ آغاز اچھا تھا یا انجام۔

میرے دوست کو ایک مشہور بزرگ کے مزار پر جانا تھا، اس نے اصرار کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں شروع میں تو میں نے انکار کیا مگر جب اس کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو میں اس کی محبت میں ساتھ چل پڑا۔

انسان بھی عجیب ہے کہ خالق سے زیادہ مخلوق کو اہمیت دیتا ہے۔ پروردگار کا احکامات اور خوشنودی کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر دوسروں کی خوشی کی خاطر اپنی مرضی کے خلاف بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۔جس کی ناراضگی سے ڈرنا چاہئے اس سے ہم ڈرتے نہیں، اور دوسروں کو خوش رکھنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔

اس وقت بھی میں نے اپنے دوست کی خوشی کے لئے اپنی ماں کی بیماری کو نظر انداز کردیا۔ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور اصولاً مجھے اپنی بیمار ماں کے ساتھ رہنا چاہئے تھا۔ میری ماں نے ایک بار کہا بھی کہ "میرا بخار ذرا ہلکا ہو جانے دو پھر چلے جانا" مگر میں ٹھہرا شروع سے ہی ضدی اور من مانی کرنے والا۔ بیگ میں دو سوٹ رکھے اور اپنے دوست کے گھر چل پڑا۔ وہ بھی تیار تھا۔ اس علاقے میں اس کا کوئی دوست نہ تھا۔

مزار ایک پہاڑی پر تھا۔ ہمیں اس دوست کے گھر رکنا تھا۔ آدھے راستے میں پہنچ کر میں نے بتایا کہ "امی کو بخار تھا، وہ کہہ رہی تھیں کہ میں کسی اور دن چلا جاؤں مگر میں تمہاری بات ٹال نہیں سکتا تھا، اس لئے چلا آیا۔" یہ بول کر میں فخریہ انداز سے اپنے دوست کی طرف دیکھا کہ وہ مجھ پر رشک کرے گا کہ اس کی دوستی میں ماں کی بیماری کو میں نے نظر انداز کردیا۔ مگر اس کی آنکھوں میں مجھے ملامت نظر آئی۔

اس نے تشویش سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "کاش! ایک بار تم چلنے سے پہلے مجھے ماں کی بیماری کا بتا دیتے۔ ہم کچھ دن بعد چلے آتے۔ یہاں آنے سے زیادہ ضروری اس وقت ان کا خیال رکھنا تھا۔"

میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ ہم کافی فاصلہ طے کر چکے تھے۔ دو گھنٹے بعد ہم زاہد کے گھر پہنچ گئے۔ اس نے ہمارا گرمجوشی سے استقبال کیا اور پر تکلف کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد ہم نے مزیدار چائے پی اور پہاڑی کی طرف چلے جہاں مزار تھا۔ زاہد اور عمار بڑے تازہ دم لگ رہے تھے۔ اور مجھے سفر نے اچھا خاصا تھکا دیا تھا۔ وہ دونوں آگے آگے چل رہے تھے اور میں پیچھے پیچھے، وہ دونوں باتوں میں مگن تھے، انہیں خیال نہیں رہا کہ میں ان سے کافی پیچھے رہ گیا ہوں۔ رش بہت زیادہ تھا۔ اب تو مجھے وہ دونوں نظر بھی نہیں آرہے تھے۔ میں نے سوچا مزید اوپر جانے کی بجائے بہتر ہے کہ میں نیچے بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کروں۔

میں سیڑھیوں کے قریب پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی میرے پاس آئے، مصافحہ کیا اور بولے۔ "ہم اپنی بہن کی شادی کے لئے لڑکا ڈھونڈ رہے تھے، ہمیں آپ پسند آئے ہیں، آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ یہیں پاس ہی ہمارا گھر ہے، آپ ہماری بہن کو دیکھ لیں، اگر آپ کو وہ پسند آجائے تو ہم آپ دونوں کی شادی کردیں گے۔"

میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ تھوڑی دیر تو میں سوچتا رہا کہ ساتھ چلوں یا نہیں، انہیں منع کردوں، کبھی دل کہتا ساتھ چل پڑوں، بہر حال دل دماغ آپس میں الجھے رہے کہ میری اس الجھن کو دیکھتے ہوئے نوجوان مسکرایا اور بولا "سوچیں گہری ہو جائیں تو فیصلے کمزور پڑ جاتے ہیں، ہمارے ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں۔ شادی کرنا یا نا کرنا تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔"

یہ سن کر میں ساتھ چل پڑا، میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میرے دوست مجھے نا پا کر پریشان ہو جائیں گے اور پھر دل میں یہ خیال آیا کہ چلو ایک شغل سہی، اسی بہانے کھانے پینے کے علاوہ لڑکی تو دیکھ سکوں گا۔ یہی سب سوچ کر میں ان کے ساتھ چل پڑا۔

تھوڑے فاصلے پر انکا گھر تھا۔ گھر کیا تھا پورا محل تھا۔ بیرونی دیوار بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ لکڑی کا بہت خوبصورت اور نفیس گیٹ تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دونوں سائیڈز پر خوبصورت لان تھے۔ تقریباً ہر قسم کے پھول اور پودے وہاں موجود تھے۔ راہداری جہاں ختم ہوتی تھی وہاں ایک بڑا سا لکڑی کا دروازہ تھا، ٹائلز آسمانی اور سفید کلر کی آمیزش سے بنی ہوئی

فرش پر لگائی گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا آسمان اپنے بادلوں سمیت زمین پر اتر آیا ہو۔ دیواروں پر سفید پینٹ تھا۔ اور چھتوں پر گرین، نہایت نفیس صوفے براؤن کلر کے پردے تھے باقی ہر چیز براؤن اور گرین کلر کی تھی، مجھے لگ رہا تھا جیسے کسی بادشاہ کے محفل میں آ گیا ہوں۔ ہر چیز سے قرینہ اور سلیقہ ٹپک رہا تھا۔ اتنے شاندار گھر میں مجھے اپنا وجود حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ نجانے ان لوگوں کو مجھ میں کیا نظر آیا تھا جو مجھے لے آئے۔ میرے دل میں آئی "شاید لڑکی میں کوئی جسمانی نقص ہوگا۔"

مجھے جلدی تھی کہ لڑکی کو دیکھوں، انکار کروں اور واپس جاؤں مگر وہ لوگ طرح طرح کے لوازمات میرے سامنے رکھتے جا رہے تھے۔ بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ شاید اتنا لذیز کھانا آج تک میں نے کھایا ہی نہ تھا۔ پھر چائے آ گئی۔ اتنی مزیدار کے مجھے دو کپ پی کر بھی تسلی نہ ہوئی۔ اس چائے کی بات ہی الگ تھی۔

مجھے لگ رہا تھا اس گھر میں بہت سارے ملازم ہیں۔ اتنے کم وقت میں اتنی ڈشز تیار کرنا ایک باورچی کا کام نہیں ہوسکتا۔

تھوڑی دیر بعد جس لڑکی کو میرے سامنے لایا گیا، وہ تو شہزادی تھی۔ میری نظریں اس پر پڑیں تو جیسے جم کر رہ گئیں، اس کا معصوم اور خوبصورت چہرہ، غزالی آنکھیں، گالوں پر شفق کی لالی، مجھے بے ساختہ وہ شعر یاد آ گیا۔

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

اس کے حسن کے آگے تو ساری شاعری ماند تھی۔ میں تو اس کے حسن میں یوں کھویا کہ ارد گرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ کافی دیر بعد میں خود کو سنبھال پایا۔ کون کمبخت شادی سے انکار کرسکتا تھا۔ مجھے تو اپنی قسمت پر ناز ہو رہا تھا۔ میرے حامی بھرنے کی دیر تھی۔

ان لوگوں نے اسی وقت شادی کا بندوبست کردیا۔ ایک مولوی کو لائے۔ اور اسی وقت ہمارا نکاح پڑھا دیا گیا۔ اسی محل کے ایک خوبصورت کمرے میں حجلہ عروسی کو سجایا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا ہر کام پہلے سے ہی مکمل کرلیا گیا ہے۔ وہ رات میری زندگی کی سب سے سہانی اور حسین رات تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ وقت یہیں تھم جائے۔ مگر وقت رکتا کب ہے۔

صبح ہوگئی۔ مجھے اپنے دوستوں کو بھی یہ واقعہ بڑھا چڑھا کر سنانا تھا۔ میں تصور میں سوچ رہا تھا جب ان دونوں کو یہ سب بتاؤں گا تو ان دونوں کے تاثرات کیا ہوں گے۔ وہ تو میری قسمت پر رشک کریں گے۔ میں ناشتے کے بعد ان لوگوں سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آیا۔

اپنے دوست کے گھر پہنچا، وہ دونوں حسب توقع کافی پریشان تھے میری گمشدگی کے باعث، مجھے دیکھ کر گلیوں سے میری عزت افزائی کی۔ خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ میں نے ان دونوں سے معافی مانگی اور ساری بات بتادی کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟ وہ دونوں حیران رہ گئے۔ انہیں یہ سب جھوٹ لگ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔ "چلو تمہیں وہاں لے چلتا ہوں، اپنی بیوی سے ملواتا ہوں تاکہ تم لوگوں کو یقین آجائے۔"

امید

ایک گدھا دوسرے گدھے سے: "یار میرا مالک مجھے بہت بھگاتا ہے۔"

دوسرا گدھا: "تو بھاگ کیوں نہیں جاتا؟"

پہلا گدھا: بھاگ تو میں جاؤں لیکن مالک کی خوب صورت بیٹی جب کوئی شرارت کرتی ہے تو وہ اسے کہتا ہے کہ تیری شادی اس گدھے سے کرادوں گا۔ بس اسی امید پر رکا ہوا ہوں۔

(ساجد-نوابشاہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم تینوں گھر سے نکلے، اور اس جگہ پہنچ گئے جس جگہ گھر تھا، وہاں اب گھر موجود نہیں تھا۔ وہاں تو اجاڑ زمین تھی۔ گھر نجانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔

وہ دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ میرے پاس اپنی بات کی سچائی کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ دونوں مجھے باتیں سنا رہے تھے کہ ''کہانی بڑی اچھی بنائی ہے۔ تمہیں تو کوئی فلم بنانی چاہئے۔ تم تو بڑے اچھے رائٹر ہو۔''

میں نادم ہوکر ان کی باتیں سنتا رہا۔

اگلے دن ہماری واپسی تھی۔ میں جانے سے پہلے پھر وہاں گیا مگر وہاں وہی اجاڑ اور ویران زمین تھی۔ میں مایوس ہوکر وہاں سے لوٹ آیا۔ پھر ہم واپس آگئے۔ گھر آیا تو اماں کو ابھی تک بخار تھا۔ انہیں لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ایک دوا دو کام کئے۔

رات ہوگئی۔ میں نے چھت پر جا کر چارپائی پر اپنا بستر لگایا اور لیٹ گیا۔ رات بارہ بجے کا وقت ہوگا جب مجھے محسوس ہوا کہ میں اکیلا نہیں میرے ساتھ اور بھی کوئی ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہی شہزادی میرے قریب تھی۔

میں ایک دم ڈر گیا کہ یہ یہاں کیسے آگئی؟ میں نے اس سے پوچھا کہ ''تمہارا گھر وہاں سے غائب تھا، میں نے کئی چکر لگائے۔''

اس نے مجھے بتایا۔ ''میں کوئی انسان نہیں بلکہ ہمارا تعلق قوم جنات میں سے ہے اور اب میں تمہاری بیوی ہوں، اس لئے میں ساری عمر تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

اس کی باتیں سن کر میں بہت زیادہ ڈر گیا۔ میری کیفیت ہی اور تھی۔ وہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کررہی تھی اور میری نفرت بڑھتی جارہی تھی۔ پھر یہی سلسلہ چل نکلا۔ وہ ہر روز بارہ بجے کے بعد رات میں میرے ساتھ ہوتی۔ میں اداس اور پریشان رہنے لگا۔ سب مجھ سے پوچھتے مگر میں کسی کو کیا بتاتا؟

میں ملازمت کے سلسلے میں بہت پریشان تھا گریجویشن کیا تھا مگر کہیں کام نہیں بن رہا تھا۔ رات کو وہ آئی تو میں نے اس سے بات کی۔ وہ بڑی محبت سے بولی۔ ''میرے ہوتے ہوئے تمہیں کام کی کیا ضرورت؟ روز صبح اپنا تکیہ اٹھانا نیچے سے ہزار کا نوٹ ملے گا۔''

صبح جب میں نے تکیہ اٹھایا، سچ میں نیچے ہزار کا نوٹ پڑا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا، تب میرے گھر والوں کو مجھ پر شک ہوا کہ بغیر ملازمت کے سب خرچ ٹھیک کیسے چل رہا ہے؟

میری والدہ کو شک ہوا کہ میں کوئی غیر قانونی کام تو نہیں کرتا؟ میں نے بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ میں کوئی غلط کام نہیں کرتا۔

ایک رات میں نے اس سے کہا کہ۔ ''مجھے اس طرح فارغ بیٹھے رقم نہیں چاہئے، سب مجھ پر شک کرتے ہیں مجھے کوئی ملازمت دلادو۔''

اس نے کہا۔ ''صبح فلاں کمپنی چلے جانا ملازمت مل جائے گی۔''

میں صبح تیار ہوکر اس کمپنی میں پہنچ گیا۔ کمپنی والوں نے بغیر کسی انٹرویو کے مجھے ملازمت دے دی۔ ملازمت ملی تو میرے گھر والوں کو میری شادی کی فکر ہوئی۔ میری والدہ نے بھی کہا کہ۔ ''اب مجھ سے کام نہیں ہوتا۔''

میں خاموش رہا ان لوگوں نے خود ہی لڑکی پسند کی، منگنی ہوئی اور شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ جب ہم لوگ بارات لے کر لڑکی والوں کے گھر پہنچے تو میری جنات بیوی اپنے بھائیوں اور رشتے داروں کو اکٹھا کرکے لے آئی، ان کے ہاتھ میں پہاڑ سائز کے ڈنڈے تھے اور وہ تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے میں چیخ رہا تھا۔ ''مجھے بچاؤ، یہ لوگ مجھے مار دیں گے، مجھے بچاؤ'' میری حالت پاگلوں کی طرح ہورہی تھی وہ کسی کو نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ سب لوگ مجھے پاگل سمجھ رہے تھے۔

میں بھاگ کر کبھی کسی کے پیچھے چھپتا، کبھی

بھاگ کر کسی کے پیچھے، میں چیخ رہا تھا ''مجھے بچاؤ ان سے، کوئی تو بچاؤ'' وہاں موجود لوگ، کچھ تو میری حالت پر حیران ہورہے تھے، کچھ مجھے پاگل سمجھ کر ہنس رہے تھے۔ اور مجھے اس وقت صرف اپنی جان کی فکر تھی۔ لوگ جو مرضی سمجھیں، جتنا وہ لوگ میرے قریب آرہے تھے اتنی ہی میری چیخیں بڑھ رہی تھیں۔

میری چیخیں سن کر ایک اللہ والے بزرگ سامنے آگئے۔ انہوں نے لوگوں سے کہا۔ ''جو اس نوجوان کو نظر آرہا ہے مجھے بھی نظر آرہا ہے، یہ سچ کہہ رہا ہے۔'' بزرگ کی باتیں سنتے ہی کئی لوگ ان کے قریب آگئے۔ ''شاہ صاحب کیا بات ہے؟ اور اس نوجوان کی ذات سے منسلک کیسی باتیں آپ بتارہے ہیں؟'' ایک شخص نے پوچھا۔

شاہ صاحب نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر سامنے کی طرف پھونک ماری۔ میں شاہ صاحب کے بہت قریب سہما ہوا کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کے منہ سے نکلی ہوئی پھونک زرد رنگ میں تبدیل ہوکر ان کی طرف بڑھی۔ وہ کل چار تھے، تین مرد اور ایک میری بیوی جو کہ جنات نسل سے تھی۔ وہ چاروں اپنی جگہ جیسے سکتے میں آگئے تھے، ان چاروں کے آگے ایک زرد رنگ کی دیوار کھڑی ہوگئی تھی، ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ اپنی جگہ جیسے منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔ پھر شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر اپنی شہادت کی انگلی پر پھونک ماری اور انگلی ان کی طرف کرکے اشارہ کیا تو وہ چاروں فوراً ہی اس جگہ سے غائب ہوگئے۔

چند منٹ بعد شاہ صاحب مجھ سے بولے۔ ''بیٹا اب کوئی خطرہ نہیں، میں نے عارضی طور پر انہیں بھگا دیا ہے مگر ان کا مستقل علاج کرنا پڑے گا، نہیں تو اب تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ اپنے والد کے ساتھ کل صبح میرے پاس آنا، وہیں تفصیل سے بات ہوگی۔''

شاہ صاحب نے بلند آواز سے چند لوگوں سے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں آپ لوگ بے فکر ہوکر اپنا اپنا کام کریں اور خوشی خوشی کھانا کھائیں۔

بہر حال خیر و عافیت سے میری شادی ہوگئی۔ کئی لوگوں نے مجھے کریدنے کی کوشش کی مگر میں نے انہیں ٹال دیا۔ نکاح کے بعد کھانا کھول دیا گیا، اور پھر ایک تین گھنٹے بعد رخصتی ہوگئی۔ میں اپنے اہل خانہ اور باراتیوں کے ساتھ گھر آگیا۔ رات خیر خیریت سے گزر گئی۔ میرے ذہن پر خوف مسلسل سوار تھا۔

صبح گیارہ بجے میں اپنے والد کے ساتھ شاہ صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ شاہ صاحب نے بہت ہی مشفقانہ لہجے میں بات کی۔ ساری باتیں میرے ابا کے گوش گزار کردی اور پھر بتایا۔ ''وہ لوگ بہت بپھرے ہوئے ہیں اور خاص طور پر تمہاری جنات بیوی کسی صورت تمہاری جان بخشنے پر تیار نہیں۔ تمہاری جان کو بہت خطرہ ہے۔ اس لئے تمہیں بچانا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ دو گھنٹے تک ایک کالے بکرے کا انتظام کردو، یہ بہت ضروری ہے، بکرا ذبح کرکے آبادی سے تھوڑی دور جھاڑیوں میں پھینک آنا۔

اس کے علاوہ ان لوگوں کو بوتل میں قید کرکے میں تمہیں وہ بوتل دوں گا جسے لے جاکر سمندر میں پھینک آنا، اس طرح تمہاری جان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچ جائے گی۔''

بہر حال شاہ صاحب کے کہنے کے مطابق میں نے اور میرے والد صاحب نے فوراً قدم اٹھائے، شاہ صاحب نے بکرا ذبح کرکے بولا ''اسے جھاڑیوں میں پھینک آؤ۔'' پھر انہوں نے ایک بڑی بوتل دی جسے لے جاکر میں نے سمندر کے سپرد کردیا۔

آج اس واقعہ کو برسوں ہوگئے ہیں۔ میں اپنی بیوی اور تین بچوں کے ہمراہ خوشحال زندگی گزار رہا ہوں۔ شاہ صاحب دنیا سے کوچ کرچکے ہیں۔ میں ہر روز شاہ صاحب کے حق میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے کہ شاہ صاحب کی بدولت آج میں زندہ ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

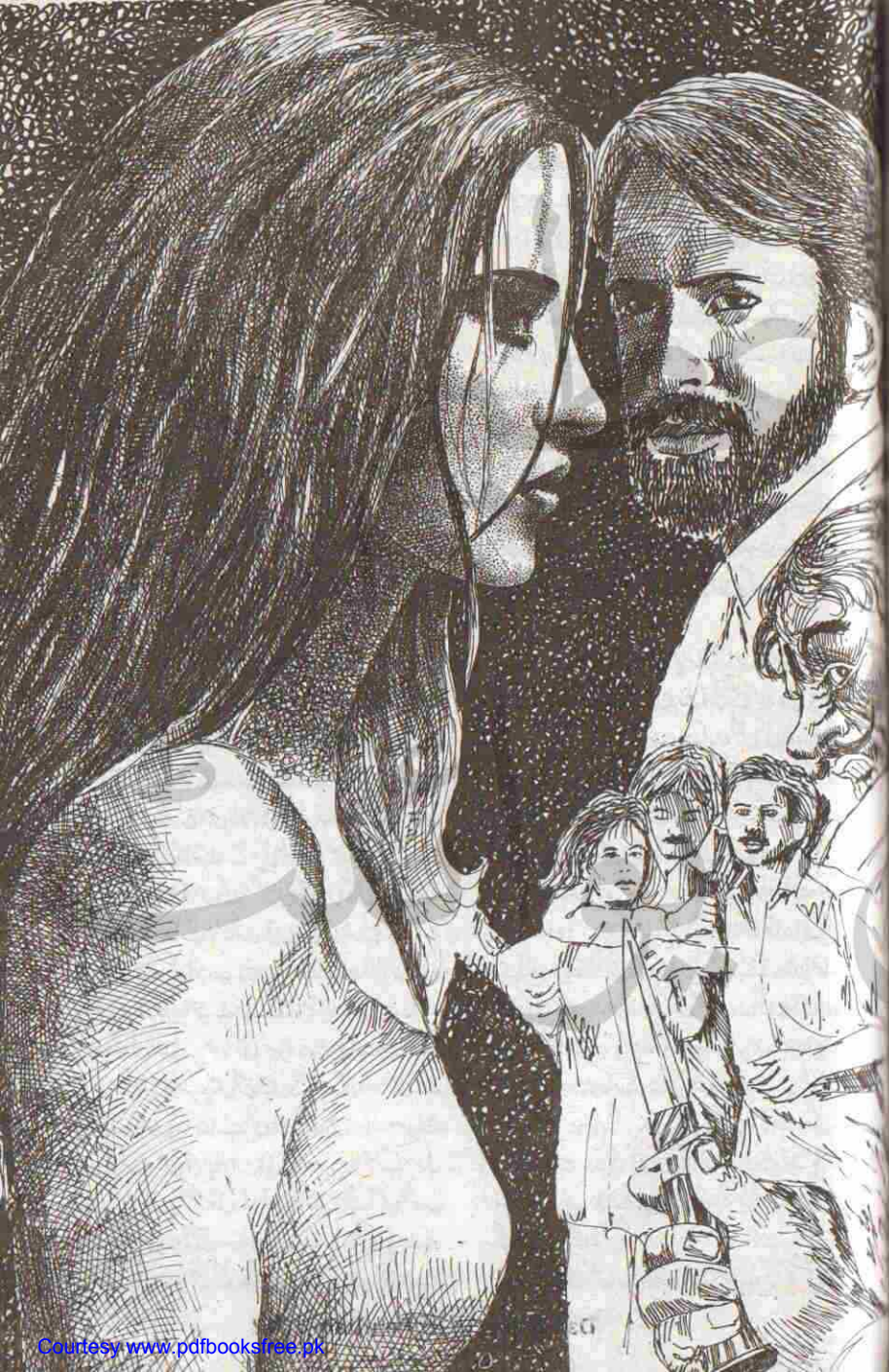

چندرا دیوی

ایم الیاس

گیارہویں قسط

خوف و ہراس پھیلاتی، ذہن پر سکتہ طاری کرتی، حیرت انگیزی کی دھوم مچاتی، جور و ستم کی بجلی گراتی، کالی شکتیوں میں تھلکہ مچاتی، لھولھان وادی کی پگڈنڈیوں پر دوڑتی بھاگتی، جادوئی کرشمہ سازیاں دکھلاتی، دل و دماغ پر ڈر کا سکہ بٹھاتی، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چنگھاڑتی، ہر پل ہر سو ہیبت ڈھاتی، اپنی نوعیت کی انوکھی کھانی۔

پرتحیر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ذہن سے محو نہ ہونے والی ایک اچھوتی کہانی

"سمندر" میں غرق ہونے کے بعد کیا پرکاش مہرہ اس دنیا سے پدھار مار گیا.....؟" چندرا دیوی نے سریش کمار سے کہا۔ "کھیل ختم..... پیسہ ہضم۔"

"نہیں..... کہانی تو اب شروع ہوتی ہے۔" سریش کمار نے جواب دیا۔ "یہ پہلا حصہ تھا جو میں نے سنایا..... اب اس کا دوسرا حصہ نہ صرف سنسنی خیز، حیرت انگیز بلکہ خوف ناک اور محیر العقول واقعات پر مشتمل ہے..... یہ تو خونی مجسمہ نے اپنی طاقت، پراسراریت اور دوسرے جنم کا آغاز اس طرح سے کیا ہے۔"

"کہانی واقعی بڑی دلچسپ، عجیب و غریب اور ناقابل یقین سی لگتی ہے۔" چندرا دیوی نے کہا۔ "لیکن دنیا میں کوئی بات یا واقعہ ناقابل نہیں رہا..... ایک منٹ، نہیں دس منٹ توقف کرو۔ میں کافی بنا لاتی ہوں۔"

تھوڑی دیر میں چندرا دیوی سینڈوچز اور کافی بنا لائی۔ پھر وہ کہنے لگی۔ "اب گرما گرم کہانی سنانا شروع کرو۔"

جب پرکاش مہرہ کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی مسہری کے بستر پر پایا..... بستر بڑا نرم و گداز، صاف ستھرا اور بے حد آرام دہ تھا۔ ایسی مسہری اور ایسا بستر اس نے اپنی زندگی میں کیا خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ جو واقعہ گزرا تھا وہ اس کے ذہن میں نہیں تھا..... جب وہ واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہوا تو اسے لگا کہ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود ہے..... لیکن دوسرے لمحے وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ یہ تو اس کا کمرا نہیں تھا اور نہ ہی بستر تھا..... ایسا خوب صورت، آراستہ و پیراستہ کمرا جو کسی شاہی محل کی خلوت کی طرح اس کا بیڈ روم نہیں تھا۔ حالاں کہ اس نے اپنی خواب گاہ کو آراستہ کرنے پر لاکھوں روپے خرچ کئے ہوئے تھے لیکن وہ اس کمرے کے مقابلے میں عام قسم کا ملول سا لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا جس پر بیش قیمت پردے پڑے تھے۔ ایک کھڑکی پر سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ باہر پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے..... اسے خیال آیا کہ کہیں وہ بحری جہاز میں تو موجود نہیں ہے.....! لیکن یہ بحری جہاز معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ کمرا پانیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ گویا سمندر میں کوئی گھر ہے جس کے کمرے میں وہ موجود ہے۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے.....؟" اس نے حیرت سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وچا۔ ”نہیں..... یہ خواب ہے۔“ وہ خواب کی دنیا میں ہے۔ اس نے اپنا لباس دیکھا۔ وہ بالکل خشک تھا۔ وہ سمندر میں گرا تھا اور اس کی تہہ میں جا رہا تھا تو وہ بھیگ گیا تھا۔ بستر بھی خشک تھا۔ اگر اسے سمندر سے نکال کر بستر پر ڈال دیا گیا ہوتا تو بستر کی چادر گیلی ہوتی..... اگر وہ زیادہ دیر تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا تب بھی اس کا لباس اور بستر کی چادر خشک ہونے سے رہی۔ یہ اسرار اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

پھر اس نے دیکھا کہ چھوٹی بڑی اور ہر قسم کی مچھلیاں تیرتی ہوئی اوپر کی سطح اور تہہ کی طرف جا رہی ہیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سمندر کی تہہ میں بنے ہوئے مکان میں مقید ہے۔ اس کے علم میں کیا..... ساری دنیا جانتی تھی سمندر کی تہہ میں کوئی مکان نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسا جہاز جو کبھی غرق ہو گیا ہو..... اگر وہ کسی غرق شدہ جہاز کے کسی کمرے میں مقید تھا تو کسی جہاز کا ایسا کمرا نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ حیرت اور خواب کی سی حالت میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ معاً اس کی نگاہ ایک بہت بڑی آبنوسی الماری پر پڑی جس میں صرف نوادرات اور چھوٹے بڑے مجسمے بھرے تھے۔ لمحے کے لئے وہ اپنے آپ کو بھول گیا اس طرح اس الماری کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے اسے کسی نادیدہ طاقت نے اپنی طرف کھینچا ہو۔ جب وہ سامنے پہنچ کر رکا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ نوادرات اور مجسمے قیدیوں کی طرح جھانک رہے اور جیسے مسکرا رہے تھے۔ اس کے تین خانوں میں ہر قسم کے اور ہر سائز کے ہیرے جواہرات بھرے تھے۔ ایسے انمول، نایاب اور قیمتی ہیرے جواہرات اس نے اپنی زندگی کیا خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ نہ اس کے وہم و گمان میں تھا کہ ایسے بھی ہو سکتے ہیں..... دوسرے تین خانوں میں آب دار، نایاب اور ہر سائز کے موتی تھے۔ یہ موتی سینکڑوں کی تعداد میں تھے جس طرح ہیرے جواہرات تھے..... تیسرے خانے میں ایک سے لے کر دو فٹ سائز کے خالص سونے کے بنے ہوئے مجسمے تھے۔ یہ کل بارہ عدد تھے۔ ان کی آنکھوں میں ہیرے تھے۔ جو چمک دمک رہے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ مجسمے دس سے لے کر بیس کلو کے درمیان تھے۔ یہ تمام مجسمے مہاراجاؤں اور راج کماروں کے معلوم ہوتے تھے۔

اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ اس نے سوچا کہ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیوں نہ وہ ان ہیروں سے اپنی جیبیں بھر لے۔ کچھ موتی بھی اٹھا لے..... اگر موقع ملا تو دو ایک مجسمے بھی اٹھا کر لے جائے۔ اس نے دیکھا الماری مقفل ہے۔ اس نے اوپر سے نیچے تک دیکھا الماری کھولنے کی جگہ نظر نہیں آئی۔ وہ مخمصے میں پڑ گیا کہ الماری کیسے کھولے۔ پھر اس نے دیکھا کہ الماری کے شیشے بڑے نازک، صاف و شفاف اور کاغذ کی طرح ہیں۔ صرف ایک مکے کی ضرورت ہے۔ وہ ہلکی سی ضرب کی بھی تاب نہ لا سکیں گے۔ چکنا چور ہو جائیں گے۔

اس نے جیسے ہی شیشے پر مکا مارا اسے ایسا لگا کہ یہ آہنی شیشہ ہے۔ ایسی کڑی چوٹ آئی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر رہ گیا اور اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ درد کی شدت نے بلبلا دیا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ شیشے پر لگا تھا مقفل دروازہ کھل گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ شیشے پر ہاتھ رکھنے کی دیر ہوتی وہ کھل جا سم سم کی طرح ہوتا ہے۔

اب اس کی نظروں کے سامنے نوادرات اور مجسمے تھے۔ وہ جس چیز کو چاہے ہاتھ لگا سکتا تھا۔ اس کی دسترس میں تھے۔ انہیں چھونا اس کے لئے آسان تھا۔ راہ میں کوئی رکاوٹ اور دیوار نہیں تھی۔ اس کی چوری اور حرکات و سکنات کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ بڑے ہیروں کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے دروازے کی طرف دیکھا۔ اطمینان کیا۔ کمرے کے باہر کوئی آہٹ نہ تھی۔ پھر اس نے سونے کی اس منقش ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا جس میں بڑے ہیرے بڑے سلیقے سے سجا کر رکھے ہوئے تھے۔

جیسے ہی اس نے ایک ہیرا اٹھانے کی کوشش کی

اس کا ہاتھ بری طرح جھلس گیا۔ وہ ہیرا کسی انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ بائیں ہاتھ سے دایاں ہاتھ پکڑ کے جلن اور تکلیف سے اچھلنے اور تڑپنے لگا۔ پھر اس نے اس سے تمسخرانہ انداز سے ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں سنیں۔ جیسے اس پر ہنسا جا رہا تھا۔ بہت سارے جیسے اس پر ہنس رہے تھے۔ اس نے حیران اور خوف زدہ ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ معاً اس کی نظر مجسموں پر پڑی تو وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ ان مجسموں میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ وہ انسانوں کی طرح دیکھ رہے، ہنس رہے اور قہقہے لگا رہے تھے۔

ان میں سے ایک مجسمہ جوان مجسموں میں سے بڑا تھا۔ اس نے اپنی ہنسی روک کر کہا۔

”لالچی..... خود غرض اور مورکھ انسان..... تو نے کیوں کہ چوری کی نیت سے ہاتھ لگایا اس لئے تیرا ہاتھ جھلس گیا۔“

وہ مجسمے کو بولتے دیکھ کر بھونچکا سا ہو گیا۔ لمحے کے لئے اپنی تکلیف بھول گیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”تو ان ہیروں کو دیکھنے کی نیت سے ہاتھ لگاتا، اٹھاتا اور پرکھتا تو تیرا ہاتھ جھلستا نہیں.....“ دوسرا مجسمہ بولا۔ ”ہم اور یہ نوادرات پانچ ہزار برس سے موجود ہیں۔ یہ دنیا ختم ہونے تک رہیں گے۔ کوئی یہاں سے ایک چیز بھی لے جا نہیں سکتا۔“

”مجھے شما کر دو.....“ پرکاش مہرہ گڑگڑایا۔ وہ دل میں حیران تھا کہ مجسمے کو کیسے اس کی نیت کا پتا چل گیا۔

”ہماری دنیا میں چوں کہ ایسے قیمتی، انمول اور نایاب نوادرات موجود نہیں ہیں اس لئے میرے دل میں فتور پیدا ہو گیا تھا.....“

”تیرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے پھر بھی تیرے دل میں دولت کی ہوس موجود ہے.....؟“ تیسرے مجسمے نے کہا۔ ”اتنی دولت سے بھی تیرا دل بھرا نہیں ہے..... تو..... دولت کا بھوکا ہے۔ تو اتنی دولت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ دنیا میں تیرے سوا کسی اور کے پاس اتنی دولت نہ ہو..... تو بے پناہ دولت کا کیا کرے گا.....؟ جب کہ تو ایک دن مر جائے گا۔ دنیا سے یہ دولت لے کر جائے گا کیا.....؟ تجھے کیا یہ دولت دنیا میں چھوڑ کر جانا نہیں ہوگا.....؟“

پرکاش مہرہ ان مجسموں کو بولتا اس کے دل کا حال بیان کرتے دیکھ کر شششدر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سونے کے مجسمے انسانوں کی طرح فلسفیانہ انداز سے بولتے جا رہے تھے۔

”اگر انسان یہ بات سوچ لے اور سمجھ لے تو پھر دولت کی ہوس نہیں کرے گا۔“ چوتھے مجسمے نے کہا۔ ”یہ جو ہم سب یہاں مجسموں کی صورت میں موجود ہیں آج سے پانچ ہزار برس قبل راجا، مہاراجہ، اور راج کمار تھے۔ یہ جو تم نوادرات دیکھ رہے ہو ہماری اپنی ملکیت تھے۔ اس کے حصول کے لئے ہمارے درمیان بڑی خون ریزی ہوئی۔ لیکن یہ سارا خزانہ دنیا میں رہ گیا..... ایک دیوتا نے ہم سب کو اس سونے میں مجسمہ بنا دیا جو خزانے میں تھا۔ ہم ایک ایک مجسمے کا وزن دو من سے کم نہیں ہے۔ دیکھنے میں ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ یہ نوادرات کتنے قیمتی ہیں شاید تمہیں اندازہ ہو..... ایک ہیرا..... ایک موتی..... آج کے دور میں لاکھوں سے بھی بڑھ کر ہوگا..... ہم پانچ ہزار برسوں سے مجسموں کی شکلوں میں ہیں لیکن ہماری آتمائیں آزاد ہیں۔ صرف آتمائیں اس محل سے باہر جا سکتی ہیں..... ہمیں جنم لینے سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ بے بس، مجبور اور قیدی ہیں۔ بھگوان اور دیوتا ہمارے پاپ معاف کر کے جنم لینے دینا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ ہم نے دولت اور خزانے کے حصول کے لئے ایسے ایسے پاپ کئے ہیں کہ وہ ناقابل معافی جرم ہیں..... ہم نے کیا کچھ نہیں کیا.....“

لیکن تمہاری دنیا ہم سب سے بھی زیادہ پاپی اور خراب ہے۔“ ایک اور مجسمے نے کہا۔ ”ہم جنم لے کر اس دنیا میں جانا نہیں چاہتے ہیں۔ یہاں ہم بڑے سکون اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اطمینان سے ہیں۔ ہم اپنے ماضی کو یاد کرتے اور باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"مجھ پر ایک دیا کرو......" پرکاش مہرہ نے درد اور تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔ "جھلسا ہوا ہاتھ کیسے ٹھیک ہوگا؟ میری جان نکلی جارہی ہے...... جلن ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے۔"

"ایسا کرو...... اپنا متاثرہ ہاتھ ہم میں سے کسی ایک کے بدن پر لگادو۔ تمہارا ہاتھ سابقہ حالت میں آجائے گا۔ جلن اور تکلیف ختم ہوجائے گی۔" ایک مجسمہ نے کہا۔ "اگر تم نے پھر یہ حرکت کی تو تم جل کر خاک ہوجاؤ گے۔"

"نہیں...... نہیں...... اب میں ایسی حرکت نہیں کروں گا؟" پرکاش مہرہ نے انکساری سے کہا۔

پھر اس نے اپنا ہاتھ ایک مجسمہ کے بدن پر پھیرا تو اس کا ہاتھ نہ صرف ٹھیک ہوگیا بلکہ جلن اور تکلیف بھی دور ہوگئی۔ اس نے اپنے سارے بدن میں ایک عجیب طرح کی فرحت سی محسوس کی۔ بڑا سکون ملا۔ اس نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ وہ جھلسا ہوا دکھائی نہیں دیا۔

"اچھا ایک بات تو بتائیں...... یہ کون سی جگہ ہے......؟" پرکاش مہرہ نے پوچھا۔

"یہ مجسموں کا محل ہے جو سمندر میں ہے۔" ایک مجسمہ نے بتایا۔ "تمہارے شہر اور دیش سے دس ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ تم اس محل کے ایک کمرے میں مقید ہو...... تم قیدی ہو ہمارے مہاراجا کے...... یہ مجسموں کا مہاراجا ہے...... یہاں حسین، جوان ناریاں ہیں، یہ پانچ ہزار برس پہلے کی ہیں...... یہ بڑی پاپی تھیں...... یہ بھی سزا بھگت رہی ہیں اپنے کئے کی...... یہ گو کہ راج کماریاں اور مہارانیاں تھیں اس کے باوجود بدچلن تھیں...... لہٰذا انہیں بھی ان کے مرنے کے بعد ان کی آتمائیں مقید ہیں۔"

"کیا انہیں بھی مورتیاں بنا کر کسی کمرے میں قید کیا ہوا ہے؟" پرکاش مہرہ نے پوچھا۔

"نہیں......" مجسمہ نے جواب دیا۔ "انہیں ان کی اصلی حالت میں سمندر میں چھوڑا ہوا ہے اور ایک بڑے کمرے میں رہتی ہیں اور انہیں سمندر میں تیرنے، نہانے اور گھومنے کی آزادی ہے، لیکن وہ ساحل پر اور سمندر سے نکل کر باہر کی دنیا میں جا نہیں سکتی ہیں...... ایسا کرنے کی صورت میں ایک آگ ان کی طرف لپکتی ہے جو ان کی شکتی چھین لیتی ہے۔ ان کی آتمائیں بھی مقید ہیں۔ اگر تم انہیں دیکھنا چاہتے ہو تو کھڑکی کے پاس جا کر سمندر میں جھانکو...... وہ تمہیں شاید اس سے مچھلیوں کی طرح تیرتی دکھائی دیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا مہاراجا کون ہے......؟" پرکاش مہرہ نے پوچھا۔

"وہی مجسمہ جو سری لنکا کے ایک شہر میں دو ہزار برس سے مدفن تھا۔" ایک مجسمہ بولا۔ "اسے سادھی سے نکال کر تم لوگوں نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری...... اس کے باہر آتے ہی اس کی آتما نے کالی ماتا سے زندگی اور شکتی مانگ لی۔ وہ مجسمہ اب خونی مجسمہ بن گیا ہے...... انسان کے کیا کسی بھی روپ میں آسکتا ہے...... اس نے تمہیں اٹھا کر گیند کی طرح سمندر میں پھینکا اور اس کمرے میں قید کردیا...... اب تم اس کے قیدی ہو۔"

"یہ تمام باتیں کس نے بتائی ہیں......؟" اس نے حیرت آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

"ہماری آتماؤں نے......" اس نے جواب دیا۔ "جب کبھی کوئی عجیب وغریب، پراسرار یا انوکھا واقعہ پیش آتا ہے تو ہماری آتمائیں اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہیں...... اس طرح ہم صدیوں سے باہر کے حالات سے واقف ہوتے آرہے ہیں۔"

"تمہارا مہاراجا کیسے ہوگیا......! جب کہ تم پانچ ہزار برسوں سے ہو۔ یہ دو ہزار برسوں سے سادھی میں مدفن تھا۔" پرکاش مہرہ بولا۔ "اس نے کس طرح اور کیسے اس محل پر قبضہ کرلیا۔ اسے اپنی ملکیت بنالیا؟"

"اس محل میں جو مہاراجا تھا اسے اس کے ایک دشمن نے ختم کرکے اس کی آتما کو پرلوک میں بند کردیا۔ دیوتا اس مہاراجا سے بہت ناراض تھے۔ تنگا رام کی آتما دو ہزار برس سے دیوتا کی پرارتھنا کررہی تھی کہ تنگا رام کو نئی زندگی...... نیا جنم دیا جائے تاکہ وہ اپنے دشمن سے انتقال لے سکے۔ جب سادھی کی کھدائی ہورہی تھی تب دیوتا نے تنگا رام کی آتما کی پرارتھنا قبول کرکے دو ہزار برس بعد اس کا جنم دے دیا...... اور پراسرار علوم اور غیر معمولی شکتی کا مالک بھی بنادیا...... یہ محل کسی مہاراجا کے بغیر رہا تھا یہاں تنگا رام آگیا۔ اب یہ محل اس کی ملکیت ہے۔ اسے جس کسی سے انتقام لینا ہو...... سزا دینا ہو تو اس محل میں لے آتا ہے...... جنہیں خوش کرنا ہو وہ ان لڑکیوں اور عورتوں کو ان کے تابع کردیتا ہے...... وہ جس لڑکی یا عورت سے جب تک دل کرے جی بہلاتا رہے...... یہ لڑکیاں اور عورتیں سمندر کے اندر تیرنے اور سیر کرنے کے بعد اپنے کمروں میں آرام کرنے چلی جاتی ہیں...... یہ بڑی خوشی سے مہمان مردوں کا دل بہلایا کرتی ہیں۔ چوں کہ ماضی میں یہ بدکردار رہی ہیں اس لئے انہیں مردوں کو ہر طرح سے خوش کرنے کا فن آتا ہے۔"

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ مہاراجا میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا......؟" پرکاش مہرہ نے سوال کیا۔

"نہیں......" ایک مجسمہ نے جواب دیا۔ "مہاراجا کے دل میں کیا ہے۔ یہ کچھ کہا نہیں جاسکتا...... شاید بہتر سلوک ہی کرے۔ کیوں کہ تم زندہ حالت میں موجود ہو۔ اگر اسے کوئی سزا دینا ہوتی تو شاید وہ تمہیں اب تک مچھلیوں کا چارہ بنادیتا۔"

"اس محل میں کتنی لڑکیاں اور عورتیں مقید ہیں......؟" پرکاش مہرہ نے پوچھا۔

"بیس......" ایک مجسمہ نے بتایا۔

پرکاش مہرہ کے لئے یہ باتیں اور داستان بڑی دلچسپ، انوکھی اور سنسنی خیز تھی۔ وہ چوں کہ ایک حقیقت پسند شخص تھا اس لئے اسے کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ نہ ہی یقین کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے...... یہ ایک سپنا ہے۔ سپنا ایسا ہی ہوتا ہے۔ محیر العقول...... پھر اس نے اپنے بدن میں ایک نہیں تین مرتبہ زوردار چٹکی لی...... اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یہ سپنا نہیں حقیقت ہے۔ وہ سپنا نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ کسی طلسماتی محل میں موجود ہے۔

"کیا تمہیں ہماری کسی بات کا یقین نہیں آیا ہے......؟" سب سے بڑے مجسمے نے دریافت کیا۔

"ہاں......" پرکاش مہرہ نے جواب دیا۔ "مجھے یہ سب کچھ کسی سپنے کی طرح لگ رہا ہے۔"

"وہ کس لئے؟"

"اس لئے کہ یہ ہیرے جواہرات، موتی جو انگاروں کی طرح دہک رہے ہیں...... پھر تم مجسموں کی بات کرنا...... عجیب وغریب داستان جو اس محل اور پانچ ہزار برس کی لڑکیوں اور عورتوں کے بارے میں سن کر جو آج بھی ماضی کی طرح حسین اور جوان...... تنگا رام کے بارے میں جان کر...... آج کی سائنس اتنی ترقی کرچکی ہے کہ ان باتوں کا یقین نہیں کیا جاسکتا...... کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔"

"ہم بے جان مجسمے ہیں لیکن جو انسانوں کی طرح بات کررہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دیوتا نے اس کی طاقت دی ہے...... اس حقیقت اور سچائی کا تمہیں بہت جلد اندازہ ہوجائے گا...... وہ دیکھو...... لڑکیاں اور عورتیں تیرتی نظر آرہی ہیں۔"

اس مجسمے نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پرکاش مہرہ نے دیکھا اور کھڑکی کے پاس جا کر جھانکا۔ لڑکیوں اور عورتوں کا ایک جتھا تھا مچھلیوں کی طرح تیرتا جارہا تھا۔ وہ مچھلیوں کی حالت میں تھیں۔

اس کے سارے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ ان کے حصول کے لئے اس کے ارمان مچلنے لگے۔ وہ مختلف انداز اور زاویوں سے تیرتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئیں لیکن دل سے نہیں...... وہ دل تھام کررہ گیا۔ جب وہ پلٹا تو ایک مجسمے نے کہا۔

"کیا اب ہماری بات کا یقین آیا۔ تم نے دیکھ لیا نا وہ کس قدر حسین ہیں؟"

"کیا پانچ ہزار برس پہلے واقعی لڑکیاں ایسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جوان اور حسین ہوتی تھیں؟" پرکاش مہرہ نے پوچھا۔

"ہاں....." وہ مجسمہ بولا۔ "یہ حسن و شباب اور کشش اور جسمانی نشیب و فراز ماضی میں بے حجابی کے سبب بھی فتنہ اور بدچلنی کا سبب بنے..... یہ ایک جادو ہے جو مرد پر چل جاتا ہے۔ اس سے بڑا کوئی جادو، دنیا میں کوئی نہیں ہے..... ہر دور میں یہ جادو فساد کی جڑ بنا رہا ہے۔ آج بھی ہے..... اگر عورت اتنی خوب صورت اور پرکشش نہ ہوتی پھر آبروریزی، بے حرمتی اور بدکرداری دنیا میں جنم نہ لیتی..... اچھا..... اب خاموش ہو جا۔ ہم بھی ہو جاتے ہیں۔ کمرے کی طرف ایک لڑکی آ رہی ہے۔ شاید تجھے مہاراجا کے دربار میں پیش کرنے ساتھ لے جانے کے لئے....."

پرکاش مہرہ کو راہ داری میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک حسین لڑکی اس حالت میں نمودار ہوئی جس حالت میں اس نے سمندر میں دیکھا تھا۔ اس حالت میں دیکھ کر اس پر کوئی بجلی سی آ گری۔ وہ دل فریب انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ دل پر قیامت ڈھا گئی۔ پرکاش مہرہ اس کے سارے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ لباس میں بھی ہوتی تو پرکاش مہرہ بے قابو ہو جاتا..... پرکاش مہرہ کے جی میں آیا کہ آگے بڑھ کر وہ اسے اپنی آغوش میں لے لے۔

وہ اپنے ملک ہی میں نہیں جب بھی کاروباری دورے پر امریکہ اور یورپ..... کسی بھی غیر ملک کے شہر میں جاتا تو مقامی عورتیں اور لڑکیاں رات کی تنہائی میں اس کی بہترین رفیقہ ثابت ہوتی تھیں۔ شراب اور شباب سے اپنی راتیں رنگین کرتا تھا۔

پانچ ہزار برس قبل لڑکیاں کتنی حسین اور پرکشش ہوتی تھیں.....؟ اس نے لمحے کے لئے سوچا۔ آج کیوں نہیں ہیں؟ نہ امریکہ اور یورپ میں ہیں اور نہ ہی ایشیا میں..... اس کے سامنے قلوپطرہ بھی ماند تھی..... اسے ایسا لگ رہا تھا کہ بھگوان نے اس لڑکی کو کسی خاص سانچے میں ڈھال کر بڑی ذلت سے بنایا ہے۔ ایسا سانچہ اب کیوں نہیں.....؟ کیا بھگوان نے وقت کے ساتھ ساتھ سانچہ بدل دیا ہے..... آج اس دنیا میں اس قدر حسین لڑکیاں اور عورتیں نظر نہیں آتی ہیں..... بدصورت..... بے کشش، عیب دار اور ایسی لڑکیاں اور عورتیں جن کی طرف دیکھنے کو دل نہیں کرتا..... اس نے ان لڑکیوں اور عورتوں کو سمندر میں تیرتے دیکھا ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے کم نہیں تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر تھی۔

"آپ میرے ساتھ چلیں....." اس لڑکی نے قریب آ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے سوچا..... پوچھیے..... کہاں؟ اور کس لیے..... لیکن وہ اس لڑکی کے ہاتھ تھامنے سے ایسا سحر زدہ ہوا کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا ہاتھ چھوڑ کر دروازہ کھولا۔ جب وہ باہر آیا تو لڑکی اور دروازہ بند کر کے اسے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور سبک خرامی سے چلنے لگی۔ اس کے بجلی بھرے بدن کے پیچ و خم نے اسے بے قابو کر دیا۔ اس نے لپک کر لڑکی کو دبوچ لیا۔

لڑکی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اسے تھوڑی دیر تک خود سپردگی سے من مانی کرنے دیا۔ پھر وہ اسے سامنے والے کمرے میں لے آئی۔ یہ کمرا نہایت آراستہ خواب گاہ تھا۔ ایک کونے میں شان دار اور بہت بڑی مسہری تھی۔

"سنو....." وہ بولی۔ "بھٹکنے اور حد سے زیادہ تجاوز کرنے کی ضرورت نہیں..... ابھی مہاراجا کے دربار میں حاضری دینا ہے..... وہاں سے واپسی کے بعد تم اس کمرے میں آ جانا..... تم جب تک دل کرے مہمان رہو گے..... میرے کمرے کا دروازہ جو ہے اس کی پیشانی پر ناگن کی تصویر بنی ہوئی ہے..... چلو..... میں تمہیں دربار تک پہنچا آؤں..... مہاراجا تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"مہاراجا نے مجھے کس لئے بلایا ہے.....؟"

پرکاش مہرہ بولا۔ "اس نے کس لئے مجھے قید کیا ہوا ہے.....؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی اور نہ ہی میں جانتی ہوں کہ کس لئے قید کیا ہے؟" وہ بولی۔ "تم پہلے آدمی ہو جسے یہاں قید کیا گیا ہے؟"

"یہ مہاراجا کب سے اس محل میں حکومت کر رہا ہے.....؟" پرکاش مہرہ بولا۔

"تھوڑے دنوں سے....." وہ بولی۔ "جب سے اس مجسمے نے جنم لیا ہے..... اسے سری لنکا سے یہاں لایا گیا ہے تب سے وہ یہاں حکومت کر رہا ہے..... وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے..... انتہائی طاقت ور ہے..... اس لئے ہم سب اس کے محکوم ہیں۔"

"وہ مجسمہ ہے یا انسان ہے.....؟" پرکاش مہرہ نے سوال کیا۔

"وہ کسی بھی روپ میں ظاہر ہو سکتا ہے..... اس وقت وہ انسان کے روپ ہی میں ہے۔"

کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پرکاش نے سوال کیا۔ "کیا وہ تم لوگوں کو تنگ اور پریشان کرتا ہے....."

"نہیں....." اس نے کہا۔ "ہم پر جو پانچ ہزار برسوں سے سمندر کی حدود کے اندر رہنے کے لئے جو پابند کیا گیا ہے اسے اس نے برقرار رکھا ہوا ہے....."

پرکاش مہرہ اس سے اور بھی بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ چوں کہ دربار کا دروازہ آ گیا تھا۔ لڑکی نے رک کر کہا۔

"تم مجھ سے بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتا ہو..... اگر مہاراجا نے تمہیں شما کر دیا اور یہاں رہنے کی اجازت دے دی تو تم میرے کمرے میں آ جانا..... میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گی..... تمہیں ہر طرح سے اس طرح خوش کر دوں گی کہ تم اپنی دنیا میں جا کر مجھے کبھی بھی میری معیت میں گزارے لمحات بھول نہ سکو گے۔"

پھر اس نے پرکاش مہرہ کی بات کا انتظار کئے بغیر بڑھ کر دربار کے دروازے پر تین مرتبہ دستک دی اور پھر اس کے سونے کا لٹھ تھام کر اسے گھمایا۔ دروازہ اتنا کھولا کہ اس میں سے صرف وہ گزر سکتا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

پرکاش مہرہ نے دربار میں قدم رکھتے ہی دیکھا کہ یہ نہایت وسیع و عریض، بے حد کشادہ اور آراستہ و پیراستہ ہال ہے۔ اس کے کونے میں سامنے ایک بہت بڑا تخت تھا جس میں بہت ہی بڑے بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے چمک رہے تھے۔ اس تخت پر تنگا رام کا مجسمہ بڑی شان اور کروفر سے بیٹھا ہوا تھا..... اس نے دس اور مجسموں کو دیکھا جو سب کے سب سونے کے تھے۔ وہ آمنے سامنے مودب، انسانوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ تنگا رام کا مجسمہ اسے گھورنے لگا۔

"ادھر آؤ..... لالچی انسان....." مجسمہ نے اسے گرج دار آواز میں مخاطب کیا۔

اس کے سارے بدن میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے سارے جسم کی طاقت جیسے سلب ہو گئی تھی۔ وہ تخت کی طرف بڑھا تو اسے اپنے پیر منوں بھاری لگ رہے تھے۔ وہ تخت کے سامنے جا کر رکا۔

"تم مجھے دولت کمانے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔" مجسمہ نے کہا۔ "کیا تمہارے پاس دولت کی کوئی کمی ہے؟"

"نہیں..... یہ بات نہیں۔" پرکاش مہرہ ہمت کر کے بولا۔ "دنیا والوں کو اور اپنے دیش میں یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ دو ہزار برس پہلے مہاراجا تنگا رام نے سری لنکا میں حکومت کی..... اس کے سورگ باش ہونے کے بعد وہاں کی روایت کے مطابق اس کے پتا جی نے اس کا مجسمہ سونے کا بنا کر سمادھی میں دفن کر دیا تا کہ اس کی آتما شانتی سے رہ سکے....."

"دو ہزار برس پہلے کی یہ کہانی تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوئی.....؟" تنگا رام کے لہجے میں حیرت اور تجسس بھی تھا۔

"اس دنیا میں ایسے ماہر آثار قدیمہ موجود ہیں جو اپنے علم کی بدولت کچھ چیزوں سے ماضی کا کھوج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگالیتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا تھا۔ ''تمہارے بارے میں سادھی سے برآمد والی اشیا اور تمہارے مجسمے سے تمہارا نام وغیرہ معلوم کیا۔''

''حیرت کی بات ہے۔'' مجسمہ نے کہا۔ ''کیا یہ جادو ہے جو ماضی کی بات معلوم کرلی جاتی ہے؟ میرے خیال میں جادو سے بھی معلوم کرنا مشکل کیا بلکہ ناممکن سی بات ہے..... مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آیا۔''

''یہ جدید دور کا سائنسی علم اور جادو ہے۔'' پرکاش مہرہ کہنے لگا۔ ''دو ہزار برس کیا..... دس ہزار..... لاکھوں برس کی باتیں بھی کسی ایک شے کو دیکھ کر بتائی جاسکتی ہے..... وہ آدمی کا ڈھانچا ہو..... برتن اور ہیرے جواہرات ہوں..... جیسا کہ تمہارے بارے میں بھی یہ بات علم میں آئی کہ دو ہزار برس قبل کے دور کے مہاراجا تھے۔''

مجسمہ بڑا حیران ہوا۔ اسے اب بھی پرکاش مہرہ کی کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ بولا۔

''تمہارے دور کا یہ جادو جسے تمہیں سائنس اور اس کا علم کہہ رہے ہو وہ مجھ پر قابو نہیں پاسکتا اور نہ میں تمہارے ہاتھ آنے سے رہا ہوں۔ تم اپنا سائنس مجھ پر چلا کر دیکھ لو..... میں یہ بات جان چکا ہوں کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میرا مجسمہ ساری دنیا میں دکھا کر دولت کماؤ۔ پھر مجھے پگھلا کر میرا سونا بیچ دو..... لیکن تمہارا یہ خواب، یہ خواہش اور حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی..... میں نے یہ جنم کیوں اور کس لئے لیا ہے بتادوں..... میں خون کا پیاسا ہوں..... انتقام کا پیاسا ہوں..... مجھے انتقام لینا ہے..... تم لوگوں نے اچھا کیا ہے مجھے سادھی سے نکال کر..... سادھی سے نہ نکالتے تو میں دوسرا جنم لے نہیں پاتا..... میں چاہتا تو تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ اس لئے نہیں اتارا کہ تمہیں بتاؤں کہ میں کیا ہوں..... تم اس محل میں تین دن تک قید رہو گے..... لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ تم یہاں سے نہ تو ہیرے جواہرات لے جاسکتے ہو، نہ موتی اور مجسمہ..... نہ کسی لڑکی یا عورت کو..... یہ ساری لڑکیاں اور عورتیں تمہارا ہر طرح سے دل خوش کریں گی۔ جی بھر کے عیش کرلو..... معلوم نہیں کیوں مجھے تم پر رحم آگیا ہے..... اور ہاں..... میری سادھی سے جو خزانہ لائے ہو..... تم اس سے بھی محروم ہوجاؤ گے..... اب تم جاؤ..... جس لڑکی اور عورت کے کمرے میں جانا چاہے جاؤ.....''

اس مجسمے کا ایسا رعب، خوف اور دبدبہ پرکاش مہرہ پر طاری ہوا کہ وہ ایک لفظ بول سکا اور نہ ہی بحث و تکرار کرسکا۔ وہ ایک مجسمے کو زندہ ہو کر انسانوں کی طرح بولتے دیکھ کر بھونچکا سا تھا۔

جب وہ دربار سے باہر آیا تو وہ لڑکی راہ داری میں کھڑی اس کا انتظار کررہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر پرکاش مہرہ کا ہاتھ تھام لیا اور اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو پرکاش مہرہ بولا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ کمرے میں انتظار کروں گی..... لیکن تم میرے انتظار میں یہاں کیوں کھڑی ہو.....؟''

لڑکی دل فریب انداز سے مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

''اس لئے کہ کہیں کوئی اور لڑکی یا عورت تمہیں اپنے کمرے میں نہ لے جائے.....؟ میرا پہلا حق تم پر ہے۔''

وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ پرکاش مہرہ خود پر قابو نہ پاسکا۔ جذبات کا طوفان آیا اور پھر تھم نہ سکا۔ طوفان گزرنے کے بعد پرکاش مہرہ میں اتنی طاقت، سکت اور توانائی نہیں رہی تھی کہ وہ جنبش تک کرسکے۔

لڑکی نے الماری میں سے ایک بہت بڑی بوتل نکالی۔ اس میں لال رنگ کا عرق نظر آرہا تھا۔ اس نے گلاس میں عرق انڈیلا۔ نصف گلاس تک بھرا..... پھر اسے سہارا دے کر بٹھایا..... پھر گلاس اس کے منہ سے لگادیا۔ یہ عرق بڑا میٹھا، عجیب و غریب خوشبو لئے ہوئے ذائقہ دار تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی فرحت

دوڑ گئی۔ اس کی ساری کھوئی ہوئی توانائی، طاقت اور جان لوٹ آئی تھی۔ کم زوری کا دور دور تک نام و نشان نہیں رہا۔ وہ پھر سے اپنے آپ کو ایک نوجوان کی طرح محسوس کرنے لگا۔ اس نے کبھی ایسی طاقت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے نس نس میں خون دوڑتا ہوا محسوس کیا۔

☆.....☆.....☆

پرکاش مہرہ تین دن تک ان تمام لڑکیوں اور عورتوں کے سنگ جشن مناتا رہا۔ ان میں سے اسے کسی نے نامراد اور مایوس نہیں کیا۔ ان کی معیت میں گزرا ایک ایک لمحہ یادگار اور ناقابل فراموش بن گیا تھا.....

پرکاش مہرہ تیسرے دن رات رنگ رلیاں منا کر سو گیا..... جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ساحل سمندر کی ریت پر پڑا پایا۔ اس وقت خالی الذہن تھا..... چند لمحوں کے بعد اسے یاد آیا کہ اسے مجسمہ نے پنڈال سے اٹھا کر سمندر میں پھینکا تھا۔ پھر اس نے خود کو ایک محل کے کمرے میں پایا تھا..... یہ محل سمندر میں بنا ہوا تھا..... اس کمرے میں ہیرے جواہرات، نوادرات ایک الماری میں تھے۔ اس کمرے میں مجسمے بھی تھے۔ اس نے ایک ہیرا اٹھا کر جیب میں رکھنا چاہا تو ہیرے نے اس کا ہاتھ جھلسا دیا تھا..... تمام مناظر ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے..... کیا یہ حقیقت تھی.....!

نہیں..... نہیں..... اس نے دل میں کہا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سمندر کی گہرائی میں شاہی محل ہو..... اس محل کے ایک کمرے میں نہایت قیمتی، نایاب اور انمول قسم کے ہیرے جواہرات اور موتی..... اتنے بڑے بڑے ہیرے کہیں ہوتے ہیں اور موتی بھی جن کی آب و تاب آنکھوں کو خیرہ کردے.....؟ اور پھر ہیرے کو اس نے چوری کے ارادے سے اٹھایا تو اس کا ہاتھ جھلس گیا..... اور پھر ان مجسموں کو انسانوں کی طرح پراسرار اور عجیب و غریب باتیں کرنا.....؟

اور پھر بیس عدد عورتیں جن میں دس عدد دوشیزائیں جو پانچ ہزار برس پہلے کے دور کی تھیں.....

قارئین متوجہ ہوں

قارئین کرام!

آئندہ ماہ سے غزلوں اور اشعار کے علاوہ لطائف، سبق آموز تحریریں، معاشرتی اور اسلامی تراشے بھی بھیجا کریں۔ جسے پڑھ کر ہمیں خوشی ہو اور رہنمائی بھی حاصل کرسکیں۔

ادارہ

ایک سے ایک حسین..... پانچ ہزار برسوں کے دور کی ہونے کے باوجود وہ جوان کی جوان تھیں۔ زندہ تھیں اور ان پر عمروں کی چھاپ نہیں تھی..... وہ کیسے وہ پانچ ہزار برسوں سے زندہ ہوں..... انہوں نے اپنے پاپوں اور سزاؤں کے بارے میں بتایا تھا وہ ناقابل یقین تھا..... پانچ ہزار برس قبل جو تہذیب تھی وہ یہ تھی کہ انسانیت نے تہذیب کو چھوا نہیں تھا..... وہ سب فطری حالت میں تھیں۔ اس کے ساتھ جس طرح پیش آئی تھیں وہ حیوانوں کو شرما دینے والی حرکت تھیں..... یورپ اور امریکہ بلکہ دنیا میں ممنوعہ قسم کی فلمیں دھڑا دھڑ بن رہی تھیں۔ ان میں اور ان فلموں کے کرداروں میں کوئی فرق نہیں تھا..... لیکن وہ کس قدر حسین تھیں؟ تصور سے کہیں بڑھ کر..... سپنوں میں ایسی حسین عورتوں کا نظر آنا.....؟ اور پھر اس کا سپنا کیسا نشاط انگیز تھا..... نہ بھولنے والا..... اور پھر وہ مجسمہ..... اس کی دھمکیاں.....

وہ ساحل سمندر پر اکیلا پڑا تھا۔ اس کے کپڑے خشک تھے۔ اس مجسمے نے اسے اٹھا کر نہیں پھینکا تھا..... بلکہ اس کے کسی دشمن نے اسے ہپناٹائز کر کے یہاں لا ڈالا..... دشمن کون ہوسکتا ہے.....؟ کون ہوسکتا ہے.....! سری لنکا کی حکومت کے سوا..... اس کا ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آدمی اس ملک کی نمائندگی کررہا ہے۔ اس کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ مجسمہ اور کھدائی اور سادھی سے برآمد ہونے والا خزانہ اور نوادرات اس کے ملک کو واپس مل جائیں..... اب اسے کیا کرنا اور کون سا قدم اٹھانا چاہئے.....؟

☆.....☆.....☆

شاستری نے جو یہ واقعہ دیکھا تھا وہ کسی ڈراؤنے خواب سے کہیں خوف ناک اور دہشت ناک تھا۔

اس کے بدن پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔ ان کی نس نس میں خون برف کی طرح یخ ہونے لگا۔ وہ اپنی جگہ کسی مجسمہ کی طرح ساکت وجامد ہوگیا۔

لمحے کے لئے اسے ایسے لگا تھا کہ..... جیسے وہ کوئی سنسنی خیز، تحیر انگیز اور دل دہلا دینے والی فلم دیکھ رہا ہو۔ ہارر قسم کی فلموں میں رونگٹے کھڑے کردینے اور بھونچکا کردینے والے مناظر کی بھرمار ہوتی تھی۔ دل دھڑکنا بھول جاتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ فلم ہے۔ ان مناظر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی تماشائی کی حالت غیر ہوجاتی تھی۔ اس وقت وہ بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا تھا۔ اندر سے اس کی حالت بڑی غیر ہورہی تھی۔

اس کا بھی یہی خیال تھا کہ مجسمہ کو کسی سازش یا منصوبے کے تحت تابوت سے غائب کردیا گیا.....؟ لیکن جب اس نے مجسمہ کو اچانک اور غیر متوقع سامنے پایا تو اس کی سٹی گم ہوگئی تھی..... جب کہ پرکاش مہرہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ پرکاش مہرہ نے چوں کہ اس کے ساتھ بدتمیزی اور بداخلاقی اور غرور وتکبر کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے مجسمہ نے اسے مزا چکھادیا تھا۔

جب مجسمہ نے پرکاش مہرہ کو کرکٹ کی گیند کی طرح پنڈال سے باہر پھینکا تو اس کا خیال تھا کہ اس کی بھی شامت آگئی..... جب مجسمہ نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا تو اس کی جیسے جان نکل گئی۔ وہ دل میں اس خیال سے ڈر اور خوف سے کانپ گیا کہ کہیں وہ اسے بھی پرکاش مہرہ کی طرح پھینک نہ دے..... لیکن مجسمہ نے اسے ایک لحظہ اوپر سے نیچے دیکھا۔ پھر وہ ایک دم سے اس کی نظروں کے سامنے گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہوگیا۔ ایسا لگا تھا کہ اس کا وجود تھا ہی نہیں.....؟ تب شاستری کی جان میں جان آئی اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اس کا سارا بدن پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

شاستری کے نزدیک خوف ودہشت کی بات تھی کہ اس مجسمہ میں دو ہزار برس کے بعد اس مجسمہ میں اس کی آتما آگئی تھی جس سے اس نے دوسرا جنم لے لیا تھا۔ اس میں زندگی آگئی تھی..... وہ زندہ ہوگیا تھا۔ کیوں اور کس لئے.....؟ اس نے یہ دوسرا جنم کس لئے لیا..... اب وہ اس دور میں کیا کرے گا.....؟ اس کی زندگی کس کام کی..... دو ہزار برس پہلے کے دور اور آج کے دور میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

شاستری نے مجسمہ کی حرکت سے اندازہ کیا کہ وہ خونی بن گیا ہے..... کیا وہ انسانیت کا خون خرابا کرے گا.....؟ اگر ایسا ہوا تو یہ بہت ہی برا خوف ناک ہوگا..... اس لئے بھی کہ اس سے مقابلہ آسان ہوگا۔ ایک تو وہ طاغوتی طاقت کا مالک ہے۔ جدید سائنس پر اسرار علوم پر یقین نہیں رکھتی ہے اور نہ ہی اس کا توڑ اور مقابلہ کرسکتی ہے..... جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اسی طرح اس خونی مجسمے سے پراسرار علوم سے ہی مقابلہ کیا جاسکتا ہے..... ایسا کوئی مہا جادوگر یا سنیاسی اور سادھو مہاراج کو تلاش کرنا ہوگا جو اس سے مقابلہ کرسکے..... لیکن ایسا آدمی ملے گا کہاں.....؟ ہندوستان میں آج بھی پائے کے جادوگر، سنیاسی، سادھو موجود ہیں۔ اصل کام انہیں تلاش کرنا اور ان کی خدمات حاصل کرنا ہے۔

پھر اسے ایک دم سے نقش کا خیال آیا۔ اس نے سوچا۔ کاش!..... نقش اس کے ہاتھ سے نہ جاتا..... کاش! نقش اسے مل جائے.....؟ نقش کے ملنے سے وہ اس کی مدد سے اس خونی مجسمہ پر قابو پاسکتا تھا..... اگر

نقش نہ ملا تو پھر بڑی تباہی وبربادی ہوگی..... جانے وہ کتنی جانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائے.....؟ ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں معصوم اور بے گناہ اس کی بھینٹ چڑھ جائے..... اسے ہر قیمت پر نقش کرنا ہوگا۔

کاش..... یہ مجسمہ ملتا اور نہ لایا گیا ہوتا..... اور نہ ہی یہ سونے کا ہوتا..... سارے فساد کی جڑ اس لئے ہے کہ یہ سونے کا ہے..... پرکاش مہرہ دولت کے حصول کے اندھے جنون..... زیادہ سے زیادہ کمانے کے چکر میں اس نے نہ صرف اپنے سر مصیبت مول لی بلکہ اور لوگوں کو بھی ایک عذاب اور اذیت میں مبتلا کردیا۔

نقش اسے کہاں سے اور کیسے مل سکتا ہے.....؟ کہیں یہ سنیل داس کی حرکت تو نہیں ہے.....؟ سنیل داس کو شاید اس بات کا علم ہوگا کہ نقش کی مدد سے مجسمہ حاصل کیا جاسکتا ہے..... وہ اس مقصد سے تو سری لنکا سے ہندوستان آیا ہے..... یقیناً اس نے کسی ایسے جادوگر کی خدمات حاصل کی ہوگی جو اس کا ہم وطن ہے..... اس نے نقش حاصل کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو نقش کے بارے میں جانتا ہو..... اب اسے سنیل داس کو تلاش کرنا ہوگا جو پراسرار بنا ہوا ہے۔

سنیل داس کی تلاش میں جانے سے قبل وہ پرکاش مہرہ کی خبر لینا چاہتا تھا..... وہ کیا سمندر میں گرا ہے یا خشکی پر..... اگر خشکی پر گرا ہے تو زندہ ہے یا مردہ.....؟ اسے پرکاش مہرہ کی زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی..... وہ اپنے لوگوں کو اس خونی بلا سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ خون ریزی اور موت سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

وہ پنڈال سے نکل کر سمندر کے کنارے آیا۔ اس وقت اندھیرا سا تھا۔ چاند کے نکلنے میں دیر تھی۔ دائیں جانب قدرے فاصلے پر اسے ریت پر کوئی پڑا دکھائی دیا۔ صاف اور واضح نہیں تھا۔ ساحل سنسان اور ویران پڑا تھا۔ رات کے اندھیرے میں لوگ نہیں آتے تھے۔ چاندنی راتوں میں بہت سارے جوڑے رنگ رلیاں منانے اور دل کے ارمان پورے اور جذباتی محبت میں ڈوب جانے اور تیرنے اور بنانے بھی آتے تھے..... لہٰذا پرکاش مہرہ کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا اس کی طرف بڑھا۔ وہ قدرے پہنچ کر ٹھٹک کے رک گیا..... وہ پرکاش مہرہ نہ تھا..... ایک جوان لڑکی اور تیس برس کا مرد تھا۔ دنیا ومافیہا سے بے نیاز جوانی کے جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ انہیں اس کی آمد کا احساس نہ ہوسکا اس نے اندازہ کرلیا کہ یہ مرد اس لڑکی کو پھانس کر لایا ہے اور محبت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ان کی سرگوشیوں سے اسے یہی اندازہ ہوا تھا اس بے شہر میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نوجوان لڑکیاں خوابوں کے سراب کے پیچھے بھاگ کر آلودہ ہوجاتی تھیں..... ہورہی تھیں..... وہ واپس لوٹ آیا..... اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا پرکاش مہرہ سمندر میں غرق ہوگیا ہے..... پہلے تو اس نے سوچا کہ وہ ساحل سمندر کی انتظامیہ کو خبر کردے کہ پرکاش مہرہ سمندر میں غرق ہوگیا ہے..... اگر وہ انہیں بتاتا کہ پرکاش مہرہ کو ایک مجسمہ نے پنڈال میں سے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا ہے تو اس کی بات کا یقین نہ کرتے..... ہنستے اور پاگل سمجھتے..... کیوں کہ سمندر پنڈال سے کوئی نصف فرلانگ پر نصب کیا ہوا تھا..... ''ایک آدمی فضا میں کسی کے پھینکنے سے اڑتا ہوا سمندر میں کیسے گرسکتا ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''پرکاش مہرہ مرچکا ہوگا..... اس کا مرجانا ہی بہتر ہے..... اس کی لاش کو مچھلیاں کھاجائیں گی..... یا پھر کسی دور مقام پر سمندر کی لہریں پھینک دیں گی..... زندگی رہے گی تو بچ جائے گا..... لہٰذا اب اسے پرکاش مہرہ کی فکر کرنے کے بجائے نقش کی تلاش میں سنیل داس کے پاس جانا چاہئے..... نقش یقیناً سنیل داس کے پاس ہی ہوگا۔''

☆.....☆.....☆

آشا محل ایک ہوسٹل تھا۔ یہ چار منزلہ پرانی لیکن مضبوط اور لمبی چوڑی عمارت تھی۔ اس میں بیرون اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندرون ملک سے ممبئی میں ملازمت کے لئے جوڑ کیاں، عورتیں اور مرد..... ملازم پیشہ میاں بیوی بھی ٹھہرتے تھے..... اس کے علاوہ اس میں ان مردوں اور عورتوں اور لڑکیوں نے کمرے کرائے پر لے رکھے تھے جو آشنائی رکھتے تھے۔ یہاں وقت گزاری کرتے تھے..... یہاں سب کچھ چلتا تھا۔ چل رہا تھا..... اس کا مالک اندرون ملک کے ملازم پیشہ مرد، عورتوں کو لڑکیوں کو ترجیح دیتا تھا۔ انہیں رعایتی کرایہ پر دے دیتا تھا۔ یہ ایک کمرے کے فلیٹ تھے۔ اس میں ملحق واش روم..... کشادا کچن اور لاؤنج بھی تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

شاستری جب گراؤنڈ فلور پر پہنچا تو اس کا دفتر استقبالیہ بند تھا۔ یہ اس وقت کھلا رہتا تھا جب کوئی کمرا خالی ہوتا تھا۔ اس کے کسی بورڈ پر مالک عمارت کا فون نمبر رابطہ کے لئے لکھا ہوا تھا۔ سیاحوں کے لئے بھی کمرے کرائے پر دیئے جاتے تھے۔ اس وقت چوکی دار نہ تھا۔ شاید تھا ہی نہیں..... زینے اور سیڑھیاں سنسان اور ویران تھیں..... لفٹ پر ایک کارڈ لٹکا ہوا تھا۔ خراب اور ناقابل استعمال ہے..... لیکن اس وقت ایک امریکی سیاح عورت جو چالیس برس کی ہوگی ایک ہندوستانی بیس برس کے لڑکے کے ساتھ محبت بھرے جذبات میں گم تھی۔ نہایت آزادی اور بے باکی سے اظہار محبت مغربی انداز سے ہو رہا تھا۔ لیکن ان دونوں نے لفٹ کو ناقابل استعمال بنا دیا تھا۔

شاستری کے لئے یہ بڑا مسئلہ تھا کہ سنیل داس کا کمرا معلوم کرے۔ اس وقت نو بج چکے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس سے سنیل داس کا فلیٹ معلوم کرے۔ اس کے لئے بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ کیوں کہ بہت سارے کمروں کے نمبر اس قدر دھندلے اور مٹیالے ہو گئے تھے کہ راہ داری کی ملگجی روشنی میں صاف پڑھے نہیں جا رہے تھے۔

اس کے علم میں جو فلیٹ نمبر تھا۔ اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس نے پہلی منزل کے کمرا نمبر بارہ پر دستک دینے کے لئے جو ہاتھ رکھا تو وہ چوں کہ بھڑا ہوا تھا وہ ذرا سا کھل گیا۔ لاؤنج اور کچن میں اندھیرا تھا لیکن بیڈ روم میں روشنی تھی۔ بیڈ روم کا منظر اس روشنی میں نہار رہا تھا۔ راہ داری اور فلیٹ میں سناٹا تھا۔ اس نے بستر پر مرد اور عورت کو غلاظت کے دلدل میں دھنسا دیکھا۔ عورت کہہ رہی تھی۔

"نریش..... ! تم مجھے اس بات سے نہ روک سکتے ہو اور نہ منع کر سکتے ہو کہ میں اپنے افسر کو خوش کرتی ہوں..... ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے وہ یہ کہ ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے..... میں نے کبھی اس بات پر تمہیں ٹوکا نہیں کہ تم اپنی افسر شتی کلا کے ساتھ جو تم سے بیس برس بڑی ہے عشق لڑا رہے ہو اور اس کی ہر خواہش پوری کرتے ہو..... میں تمہارے لئے کھانا پکاتی ہوں..... کپڑے دھوتی ہوں۔ جب اور جس وقت تمہیں میری طلب ہوئی انکار نہ کیا..... تم ستر فیصد اخراجات برداشت کرتے ہو..... اگر میں بار گراں ہوں تو معاہدہ ختم کر دو..... اس لئے کہ مین اس سے زیادہ ایک فیصد بھی تمہیں نہیں دے سکتی۔ کیوں کہ سات ماہ بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ اگر میں مطلوبہ جہیز نہیں لے گئی تو ساس، نندیں مجھے زندہ جلا دیں گی..... اس لئے میں اس بات کی کوشش کرتی ہوں کہ اپنے آپ کو جتنا کیش کر سکوں کر لوں..... پائی پائی جمع کر رہی ہوں۔ میرے لئے سو روپے کی رقم بھی بہت بڑی ہے..... یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرا بوڑھا افسر مجھ پر ریشہ خطمی ہوا ہے۔ میں نے اسے اس فریب میں رکھا ہوا ہے کہ میں اس سے شادی کروں گی..... مجھے یہ بات پسند نہیں کہ وہ اپنی پتنی کو طلاق دے دے..... اس کی دو جوان لڑکیاں بھی ہیں، میں جیسی بھی ہوں..... جو بھی ہوں..... لیکن میرے اندر عورت تو ہے....."

"آئی ایم ساری.....!" مرد نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے شیلا.....! ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم نہیں جانتی ہو کہ

اس بوڑھی کو خوش کرتے سے مجھے کس اذیت اور کرب سے گزرنا پڑتا ہے..... وہ چڑیل میری وجاہت پر مرمٹی ہے..... مہنگائی کس قدر بڑھ گئی ہے..... جب بھی میری پتنی کی چٹھی یا فون آتا ہے تو اس میں اس کا ایک ہی رونا ہوتا ہے..... اس لئے میں تم سے کہتا رہتا ہوں کہ پانچ سو روپے بڑھا دو..... اب میں نہیں کہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری زندگی میں بدمزگی پیدا ہو....."

شاستری نے ایک لحظہ کے لئے سوچا کہ کیسی کیسی کہانیاں جنم لیتی ہیں..... دونوں ہی بہت خوب صورت تھے..... اس نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھینچ لیا۔ اس نے کسر پھسر اور آہٹ سی سنی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ نصف سا کھلا تو ایک چالیس برس کا مرد کھڑا تھا۔ وہ صرف تہبند میں تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری اور جن جھلاہٹ تھی۔ آنکھوں میں غصے کی سرخی تھی۔ لیکن شاستری کی نگاہ اس کے عقب پر پڑی۔ وہ عورت جو بیس بائیس برس کی ہوگی چادر سے بدن ڈھانپ رہی تھی۔ اس کے ریشمی سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ شاستری کو افسوس ہوا کہ وہ کیوں کباب میں ہڈی بن گیا۔

مرد نے شاستری کو خشمگیں نظروں سے اوپر سے نیچے دیکھا۔ پھر غرایا۔

"کون ہو تم.....؟ یہ کوئی وقت ہے جو دروازہ کھٹ کھٹا کر دوسرے کے آرام میں خلل ڈالا جائے۔ تمہیں تمیز نہیں۔"

"میں معافی چاہتا ہوں کہ..... میں نے آپ کو ناوقت ڈسٹرب کیا....." شاستری نے معذرت خواہانہ انداز سے کہا۔ "میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ ایک تو چوکی دار ہی نہیں ہے اور کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو میری رہنمائی کر سکے..... بہت سارے دروازوں پر نمبر اس قدر دھندلے اور مٹیالے ہیں کہ پڑھے نہیں جا رہے ہیں..... اس عمارت میں کمرا نمبر بتیس میں ایک سری لنکن باشندہ سنیل داس ٹھہرا ہوا ہے....." پھر اس نے توقف کر کے حلیہ بتایا اور پھر کہا۔ "کیا آپ یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ وہ کمرا کدھر ہے....."

"کیا میں تمہارا نوکر، چوکی دار اور فالتو آدمی ہوں۔" وہ بھنا کر بولا۔ "دفع ہو جاؤ....."

شاستری نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو سو سو کے وہ نوٹ آ گئے۔ مجبوری تھی۔ سنیل داس کا ہر قیمت پر پتا چلانا تھا۔ وہ پچاس پچاس کے دو نوٹ نکالنا چاہتا تھا۔ دو سو کی رقم بڑی تھی۔ اس نے نوٹ مرد کی نظروں کے سامنے لہرائے۔ وہ عورت چادر میں ملبوس آئی تو اس کا بھڑکیلا جسم ابل رہا تھا۔ انگ انگ میں بجلی بھری تھی۔ وہ اسے روشنی میں بے حجاب دیکھ چکا تھا۔ لیکن چادر میں بھی ملبوس قیامت ڈھا رہی تھی۔ شاستری نے دل میں سوچا..... مرد نے کیا اچھا ہاتھ مارا ہے۔ اس عورت نے شاستری کے ہاتھ میں نوٹ دیکھے تو مرد کو پیچھے کر کے اس کے ہاتھ سے نوٹ اچک لئے۔ پھر بولی۔

"آپ نے جو حلیہ بتایا ہے سری لنکن باشندے کا..... اسے میں نے دیکھا ہے..... وہ کوئی تین چار دن سے شاید ٹھہرا ہوا ہے..... کمرا نمبر بتیس اس لائن میں سب سے آخر میں ہے..... چوکیدار کہہ رہا تھا کہ وہ کرکٹر ہے..... "اس شہر کی کسی ٹیم میں شامل ہونے آیا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ....." شاستری نے ممنونیت سے کہا۔ "میں ایک بار پھر ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔"

مرد دروازہ بند کرنے کے بجائے عورت کے ہاتھ سے نوٹ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا..... عورت نے ہاتھ پیچھے کئے تو چادر کے کونے ہاتھ سے نکل گئے۔ شاستری کی نظروں کے سامنے ایک کوندا سا لپکا۔ ان دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو عورت نے سرخ ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ مرد کو پتا نہیں چلا کہ شاستری نے عورت کو کس حالت میں دیکھ لیا ہے..... دروازہ بند ہوتے ہی مرد ہذیانی لہجے میں بولا۔

"تم مجھے اس میں حصہ دو..... ایک سو روپے پر میرا بھی حق ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں کیوں دو.....؟" عورت تیز لہجے میں بولی۔ "تم اسے پتا اور اس شخص کے بارے میں بتانے کے بجائے تم اس سے بدتمیزی سے پیش آئے اور غصے سے کہا تھا کہ دفع ہو جاؤ..... میں تمہارا نوکر یا چوکیدار نہیں ہوں..... اس نے دو سو روپے لہرائے تو تب بھی تم نے نوٹ لئے..... میں نے نوٹ لے کر کرے اور اس شخص کے بارے میں بتایا تو تم دعوے دار بن رہے ہو....."

"مجھے اس پر غصہ اس لئے آیا تھا کہ اس نے ڈسٹرب کر کے سارا مزا کرکرا کر دیا تھا....." وہ مفاہمانہ لہجے میں بولا۔ "جب کہ ہم ہر معاملے میں ففٹی ففٹی کر رہے ہیں تو اس میں بھی ففٹی ففٹی کرلو..... کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس نے صرف کمرا نمبر معلوم کرنے کے لئے دو سو روپے دے دیئے....." "ففٹی ففٹی نہیں....." عورت نے کہا۔ "صرف تھرٹی پرسنٹ..... میں تمہیں صرف تھرٹی پرسنٹ دوں گی۔"

مرد نے کیا کہا اس نے سنا نہیں..... کیوں کہ وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ لیکن اس نے جو ہیجان خیز نظارے دیکھے تھے اس نے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی.....

شاستری نے نیم اندھیرے کے باعث غلطی سے برابر والے کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک عورت نے جو شب خوابی کے لباس میں تھی اس کے گلے میں بانہیں حمائل کر کے بولی۔ "رندھیر! میں سمجھی تھی تم نہیں آؤ گے..... میرے شوہر کو تو نائٹ ڈیوٹی پر گئے آدھا گھنٹے سے زیادہ ہو گیا..... تمہارے انتظار میں میرا برا حال ہو گیا....."

اس عورت کے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو بولنے نہیں دیا۔ ایک طویل بوسے کے بعد عورت بولی۔ "اندر چلو....."

"میں رندھیر نہیں ہوں محترمہ.....! کمرا نمبر بتیس کون سا ہے.....؟" شاستری نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"رندھیر نہیں ہو.....؟" عورت نے چونک کر آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ "چلو..... کوئی بات نہیں..... وہ ڈرپوک اور بزدل ہے نہیں آئے گا..... یہ کمرا نمبر اکتیس ہے..... اس میں کوئی عورت نہیں رہتی ہے..... تم آجاؤ..... تم تو رندھیر سے لاکھ درجے بہتر ہو..... وہ آئے گا تو اسے گھسنے نہیں دوں گی۔"

اگر وہ سنیل داس کی تلاش میں نہ آیا ہوتا تو اس عورت کی دعوت قبول کر لیتا۔ وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ اس کا حسن و شباب اور جسم بے مثال تھا..... اس کے چہرے کی معصومیت نے اسے اور حسین بنا دیا..... اسے بڑا دکھ ہوا کہ پستی اور غلاظت میں کیسی عورتیں گری ہوئی ہیں۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ بہ مشکل انیس برس کی ہوگی۔

"بہتر ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" شاستری نے کہا۔ "مجھے تمہاری دعوت قبول نہیں ہے.....؟"

"کیا تم مرد نہیں ہو.....؟" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی اور مسکرا دی۔

"یہی سمجھ لو....." وہ بولا۔ پھر اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ ایک کیس کی تفتیش کے لئے آیا ہوں۔"

پولیس انسپکٹر کا سنتے ہی عورت کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے غڑاپ سے اندر ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

اس نے جیب سے لائٹر نکال کر روشن کیا..... اس کی روشنی میں اس نے برابر والے کمرے کا دروازے پر دیکھا۔ اس کی پیشانی پر نمبر صاف تھا۔ لائٹر بجھ گیا..... اس نے وقفے وقفے سے دروازے پر تین مرتبہ دستک دی..... تیسری دستک قدرے تیز تھی۔ اتنی تیز کہ گہری نیند سونے والا بھی بیدار ہو جائے..... شاستری کو سب سے پہلے خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ کہیں وہ کسی لڑکی کے ساتھ غلاظت کے دلدل میں دھنسا ہوا دنیا و مافیہا سے بے نیاز اور کسی بات کا ہوش و حواس نہ رہا ہو..... شاید اس لئے نہ تو جواب مل رہا ہے اور نہ ہی دروازہ کھل رہا ہے..... جو مرد بھی اندرون یا بیرون ملک

سے آتا ہے وہ عورت اور مشروب سے وقت گزاری کرتا تھا۔ اس لئے کہ اس شہر میں ہر رنگ و نسل، قوم اور مذہب کی اور ہر قیمت کی لڑکیاں اور عورتیں دستیاب تھیں۔ اس طرح شراب بھی تھی۔

شاستری کو اندازہ ہو گیا کہ اندر نہ تو سنیل داس ہے اور نہ ہی کوئی لڑکی..... پھر بھی اس نے اپنا اطمینان کرنے کے لئے دروازے سے کان لگا دیئے..... نہ تو اسے اندر کوئی سرگوشی، سرسراہٹ اور آہٹ سنائی دی..... اندر گہرے اور پراسرار سناٹے کے راج کا بسیرا محسوس ہوا۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر چند لمحوں کے بعد راہداری کا جائزہ لیا۔ راہ داری ویران اور سنسان پڑی تھی۔ اس نے زینے پر چاپیں سنیں..... زینہ بیس قدم پر تھا۔ دراز قد امریکی عورت اور وہ لڑکا نمودار ہوا جو لفٹ میں مستیاں کر رہے تھے۔ لڑکے کا ایک ہاتھ اس عورت کی نرم و نازک اور چمکیلی کمر پر تھا۔ دوسرے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ عورت کے بازو میں لڑکا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ وہ دونوں دوسری منزل پر چلے گئے تو شاستری نے دروازے کے ہینڈل کے لٹو کو تھام کر بے آواز گھمایا۔ پھر غیر محسوس انداز سے دروازے کو اندر کی طرف دھکا دیا..... دروازے کو اندر کی طرف دھکیلتے ہوئے اسے اچانک ایک دہشت ناک خیال آیا تو اس کے سارے بدن پر ایک سرد سفاک لہر دوڑ گئی۔ پھر اس کا بدن لرز گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس خونی مجسمہ نے آ کر سنیل داس کو موت کی بھینٹ چڑھا دیا ہو.....؟ وہ خونی مجسمہ کچھ بھی کر سکتا ہے.....؟ اس خیال نے اس کے جسم کی ساری طاقت جیسے سلب کر لی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس گیا۔

کمرے میں اس قدر گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا..... اس نے کمرے میں ایک عجیب سی وحشت اور پراسراریت محسوس کی..... اسے ایسا لگا خونی مجسمہ آیا اور سنیل داس کو موت سے ہم آغوش کر کے چلا گیا..... یا پھر اس اندھیرے میں کھڑا اس کی حرکات و سکنات کو نوٹ کر رہا ہے اور اسے دبوچ کر گلا دبا کر مار دے گا۔ اس خیال سے اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ لیکن اس نے بہت سا کام لیا اور اس خیال کی نفی کر دی۔ اس نے اندازے سے سوئچ بورڈ تلاش کیا۔ لیکن اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے۔

پھر اس نے جیب سے لائٹر نکالا۔ اس کے ننھے سے شعلہ کی روشنی میں دیکھا کہ کہیں خونی مجسمہ موجود تو نہیں ہے؟ وہ نظر نہ آیا۔ البتہ اس کی نظر سوئچ بورڈ پر نظر پڑی جو دروازے کے قریب نصب تھا..... اس نے سوئچ آن کیا تو کمرا تیز روشنی میں نہا گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بستر اور کمرے کا جائزہ لیا کہ کہیں بستر یا کمرے کے فرش پر سنیل داس کی لاش تو نہیں پڑی ہے..... اس نے سنیل داس کی لاش نہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ پھر باتھ روم غسل خانے اور پلنگ کے نیچے دیکھا۔ وہ خالی تھے۔

پھر اس نے کمرے کی تلاشی لینا شروع کیا..... اسے پوری پوری امید تھی کہ نقش کمرے میں ہی اور اس کے سامان میں ہوگا۔

لیکن سنیل داس اس وقت کہاں گیا ہوگا.....؟ اور پھر اس نے کمرا مقفل بھی تو نہیں کیا.....؟ سنیل داس کا سامان ایک درمیانہ سائز کے اٹیچی میں تھا..... اس میں دو تین جوڑے اور زیر جامے تھے۔ ایک جوڑا غسل خانہ میں ہک میں لگا ہوا تھا۔ کمرے میں فرنیچر مختصر سا تھا۔ کمرے میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی کوئی چیز چھپائی جا سکے۔ نقش اتنا بڑا تو نہ تھا کہ اس کے لئے بڑی جگہ چاہئے۔ وہ تو جیب میں بھی آسانی سے آنے والی چیز تھی۔ وہ بستر کے پاس جا کر گدا الٹ کر دیکھنے لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ عقب میں کوئی دبے قدموں، بے آواز اور غیر محسوس انداز سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے فوراً ہی بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر دیکھا تو اسے نظروں پر یقین نہیں آیا۔

سنیل داس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا خوف ناک خنجر چمک رہا تھا..... اس کے چہرے پر سفاکی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی..... اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ شاستری کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سینے میں خنجر بھونکنے کے ارادے سے اس پر خنجر تانے کھڑا ہے۔

"مسٹر شاستری.....! تم ایک عادی چور کی طرح بڑے پراسرار انداز اور خاموشی سے میرے فلیٹ میں بغیر اجازت گھس آئے.....؟" سنیل داس نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں قتل کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ تم چوری کے ارادے سے میرے فلیٹ میں گھس آئے تھے۔ اس خنجر سے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تو میں نے خنجر تمہارے ہاتھ سے چھین کر اپنا دفاع کیا تو تم مارے گئے۔"

شاستری نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ وہ سنیل داس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"ابھی یہ کہانی سنانے کا وقت آیا ہے اور نہ آئے گا..... فضول باتیں نہ کرو۔ یہ لاحاصل ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں یہاں کس لئے آیا ہوں..... میں نے دو تین منٹ تک دروازے پر تین بار زور زور سے دستک دی..... جواب نہ ملا اور دروازہ نہ کھلا تو میں نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ میں وہ چیز تلاش کر رہا تھا جس کے لئے آیا تھا۔ تم آگئے..... اصل بات یہ ہے۔"

سنیل داس نے خنجر لہرا کے اس کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ پھر اس نے سختی سے کہا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کس لئے میرے فلیٹ میں چوروں کی طرح گھسے..... تمہاری صفائی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"تم کوئی بچہ نہیں ہو..... تم میرے آنے کا مقصد خوب سمجھتے ہو..... باتیں نہ بناؤ۔ یہ بتاؤ کہ نقش کہاں ہے۔"

"نقش.....؟" سنیل داس ایک دم سے چونکا۔ پھر وہ حیرت سے بولا۔ "کیا وہ نقش اس شہر میں موجود ہے۔"

"ہاں..... وہ تمہارے پاس موجود ہے..... اسے تم نے چرایا ہے۔" شاستری نے اس پر الزام لگایا۔

"میرے پاس موجود ہے..... اسے میں نے چرایا ہے..... مسٹر شاستری! کیا تم ہوش میں ہو؟" سنیل داس بولا۔

"ہاں..... میں اس کی تلاش میں پی کر نہیں آیا ہوں۔" شاستری نے تلخی سے کہا۔ "تم انجان نہ بنو..... کیا تم نے مجھ پر عقب سے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش نہیں کیا۔ اور نقش لے کر بھاگ گئے؟"

سنیل داس نے اس کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ اسے چند لمحوں تک ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ اس نے یک بارگی پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے خنجر کو میز پر رکھا اور دروازہ بند کر کے آیا۔ پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"یہ کس قدر عجیب اور حیرت کی بات ہے کہ ہم دونوں ہی اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔" تنگا رام کا نقش..... کیا تمہیں اس نقش کے پس پردہ کیا اسرار پوشیدہ ہیں معلوم ہیں؟"

"نہیں....." شاستری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے کچھ خبر نہیں....."

"جب اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہو تو پھر کس لئے اس کے حصول کے لئے کوشاں ہو؟" سنیل داس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ اس نقش کی بدولت خونی مجسمہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے....." شاستری نے جواب دیا۔ "میں اس نقش کی شکتی اور اسرار کو سمجھ رہا تھا کہ نقش سے محروم ہوگیا۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کا پس منظر کیا ہے....." سنیل داس کہنے لگا۔ "تنگا رام کا مقدس نقش..... جس پر اس کا بھائی مسرت چندر کمار کے حاصل کرنے میں بری طرح ناکام و نامراد رہا تھا..... مسرت چندر کمار کے پالتو قاتلوں نے اسے بھاری انعام و اکرام کے لالچ میں تنگا رام کو موت کے گھاٹ بڑی شقاوت سے اتار دیا تھا..... انہوں نے مسرت

چندر کمار کو اس کی موت کے ایسے ثبوت دیئے تھے جس کی سچائی سے وہ انکار نہ کرسکا۔ یہ ٹھوس ثبوت تھے..... لیکن انہیں تنگا رام کی سب سے بڑی ملکیت کا قطعی علم نہ تھا۔ وہ اس سے بے خبر اور لاتعلق تھے۔"

مجھے تم پر شک و شبہ تھا کہ تم تنگا رام کمار کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو اور مجھ سے دانستہ چھپا رہے ہو..... یہ بات تم اس وقت سے جانتے ہو جب تنگا رام کا مجسمہ سادھی سے برآمد ہوا تھا..... جب میں یہ سب کچھ جاننے کے قریب پہنچا تھا کہ تم نے....."

"تم شکی اور وہمی ہو....." سنیل داس نے اس کی بات کاٹی۔ "تمہارے خیال میں کیا میں کوئی دیوتا یا بھگوان..... مہان جادوگر ہوں جو مردوں اور مجسموں میں کسی کی آتما کو ڈال کر انہیں جنم دے دوں..... اگر میں یہ شکتی رکھتا ہوتا تو میں کیا تمہیں بے ہوش کر کے نقش لے جاتا.....؟ تمہارے ذہن میں یہ بچکانہ خیال کیوں آیا..... اور پھر کیا یہ مجسمہ کو جادو کے زور پر واپس نہیں لے جاتا؟"

شاستری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ سنیل داس نے جو کچھ بتایا اس کی بات کیا کہے۔ تمام واقعات کے پیش نظر شاستری نے کہا۔

"پرکاش مہرہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے پاس تمہارا پتا ہے میں فوراً جا کر تم سے ملوں....."

پرکاش مہرہ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا دانستہ اس نے نہیں بتایا تھا۔ اس واقعہ کا صرف وہ عینی گواہ تھا۔ پنڈال میں اس وقت صرف وہ دونوں موجود تھے..... اگر وہ بتاتا تو سنیل داس پرکاش مہرہ کی لاش ملنے پر اسے قاتل قرار دیتا۔ خاموش اور انجان رہنا ہی بہتر اور دانش مندی بھی تھی۔

"میرا پتا.....؟" سنیل داس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ "یہ کیسے پتا چلا.....؟ اس نے تمہیں یا پرکاش مہرہ کو تو بتایا نہیں تھا۔"

"پولیس والوں سے تمہارا پتا ملا..... کیوں کہ جو لوگ پرکاش مہرہ کے جہاز میں نوادرات اور مجسمہ لائے تھے اور جن کا تعلق سری لنکا سے تھا اور وہاں کے پاسپورٹ پر آئے تھے ان کے پاسپورٹ اور ممبئی میں قیام کے پتے نوٹ کئے..... یہ فلیٹ تمہارے سری لنکن دوست کا تھا اور تم نے یہاں کا پتا لکھوایا تھا..... تم نقش سے نہ صرف لاعلمی ظاہر کر رہے ہو بلکہ فریب بھی دے رہے ہو۔ اپنی باتوں..... کیا تم حملہ آور نہیں تھے....."

"نہیں....." سنیل داس نے کہا۔ "میرے ہاتھ نقش لگ جاتا تو کیا میں یہاں بیٹھا رہتا.....؟ میں مجسمہ کو قابو میں کر کے تمام نوادرات سمیت غائب ہو کر سری لنکا پہنچ چکا ہوتا..... احمقوں کی طرح یہاں نہیں رہتا۔"

☆.....☆.....☆

پرکاش مہرہ نے ساحل سمندر کی حدود سے نکل کر سوچا کہ اب وہ گھر جا کر آرام کرے گا۔ بستر پر دراز ہو کر حالات کا جائزہ لے گا۔ کل وہ پولیس ہیڈ کوارٹر جا کر پراسرار طور پر غائب اور نمودار ہونے اور ایک شخص کا مجسمہ کا بہروپ بھر کے اسے اٹھا کر پھینکنے کے بارے میں بتائے گا..... پولیس سے کہے گا کہ اسے ہپناٹائز کر کے بے ہوش کر کے ساحل سمندر پر ڈال دیا تھا۔ پارکنگ پر اس کی گاڑی نہیں تھی۔ یوں بھی وہ پیدل جانا اور راستہ بھر سوچنا چاہتا تھا..... اس وقت فرحت بخش ہوا چل رہی تھی جس سے اس کے دل و دماغ کو ایک عجیب طرح کا سکون مل رہا تھا۔ وہ سوچتا چلتا چلا گیا۔

رات اندھیری تھی۔ جس سڑک سے وہ گزر رہا تھا۔ ویران اور سنسان تھی۔ لیکن بلند و بالا عمارتوں کے فلیٹوں میں روشنی تھی اور ٹی وی کے پروگرام دیکھنے میں مگن منہمک تھے۔ گویا سارا شہر ٹی وی کی بدولت جاگ رہا تھا۔

وہ ایک قدرے تنگ گلی میں آیا۔ وہاں روشنی تھی۔ ایک مکان کے اندر سے ایک نوجوان عورت نے نکل کر اس کا راستہ روک لیا۔ وہ نشے کی حالت میں لگ رہی تھی۔ اس کا لباس نہایت نامناسب تھا۔

"میں نے تمہیں سو روپے دیئے تھے کہ گنگا رام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی دکان سے ایک ٹرے کی بوتل لاؤ..... تم بوتل نہیں لائے۔"

"تم نشے میں ہو..... میں وہ نہیں ہوں جسے تم نے سو روپے دیئے تھے..... مجھے جانے دو....." پرکاش مہرہ نے کہا۔

"عورت نے قریب آ کر اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔" تم مجھے سو روپے دو۔ تمہیں جانے نہیں دوں گی....."

"میں سو روپے کیا..... ایک روپیا نہیں دوں گا....." پرکاش مہرہ اپنی گردن آزاد کرانے لگا۔

"لیکن ان بانہوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ کام یاب نہ ہو سکا۔" تم سو روپے نہیں دو گے تو شور مچاؤں گی..... سب کو بلالوں گی..... محلے والوں سے کہوں گی کہ میرے سو روپے لے کر بھاگ رہا ہے۔ پھر تمہاری پٹائی ہو جائے گی۔"

پرکاش مہرہ بہت پریشان ہو گیا۔ اس نے بٹوے سے سو کا ایک نوٹ نکال کر بڑھایا تو وہ نوٹ لے کر بولی۔

"اچھا..... اب ایک سو روپے اور دے دو....."

"وہ کس بات کے.....؟" پرکاش مہرہ کو غصہ آ گیا۔

"وہ جو میں نے تمہاری دو گھنٹے سیوا کی ہے..... کیا میں نے مفت میں کیا ہے؟"

"دفع ہو جاؤ..... مکار عورت..... تم اس بہانے مجھے لوٹ رہی ہو؟" پرکاش مہرہ دہاڑا۔

"رام لعل..... جسونت..... وشوا ناتھ....." وہ ہذیانی انداز سے چیخنے چلانے لگی۔

پرکاش مہرہ نے مزید سو کا ایک نوٹ دے کر اسے اس مکان کے اندر دھکیل دیا جس سے وہ باہر آئی تھی۔ پھر باہر سے کنڈی لگا کر تیزی سے چل پڑا۔

پرکاش مہرہ کو اس بات کا ڈر اور خوف تھا کہ یہ کہیں بدمعاش یا وہ عورت اس کے تعاقب میں نہ آ گئی..... وہ مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ سراسیمگی کی وجہ سے اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کدھر نکل آیا ہے..... اس کے دفاتر دہلی، کولکتہ اور ممبئی میں تھے۔ لیکن مرکزی دفتر دہلی میں تھا۔ وہ ممبئی کاروباری دورے اور دفتر کی کارکردگی کا جائزہ لینے آتا رہتا تھا۔ وہ اس شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔

مجسمہ اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مجسمہ اگر اسے مل گیا تو اس کی پبلسٹی جو ہو چکی ہے اس واقعہ سے اور زیادہ ہو جائے گی..... جو پراسرار اور چونکا دینے والا واقعہ پیش آیا ہے اس نے لوگوں میں یقیناً ہل چل مچا دی ہو گی۔

وہ اس مجسمہ کو پولیس کی مدد سے ہی ڈھونڈ نکال سکتا تھا۔ جب تک مجسمہ نہ ملے اس وقت تک نمائش کا سوچا بھی نہیں جا سکتا..... وہ سر توڑ کوشش کرے گا کہ مجسمہ شہر سے باہر یا سری لنکا نہ جا سکے..... اسے سب سے زیادہ شک سنیل داس پر تھا..... اس نے چلتے چلتے دو ایک جہازوں کے بھونپر سنے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس پورٹ کے علاقے میں دھکے کھا رہا تھا۔

پھر ایک تنگ و تاریک راستے پر آ گیا۔ چند قدم چل کر ٹھٹک کے رک گیا اور اس کے سارے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے ایک ہیولا دیکھا۔ اسے شک ہوا کہ یہ مجسمہ ہے۔ لیکن دوسرے لمحے اسے لگا کہ یہ مجسمہ نہیں کوئی آدمی ہے۔

اس نے بلند آواز اس ہیولے سے کہا۔ "کیا آپ میری رہنمائی کر سکتے ہیں.....؟ میں راستہ بھول گیا ہوں۔"

وہ شاستری تھا اس نے دور سے ہی پرکاش مہرہ کو اس کی جسامت، قامت اور چال سے پہچان لیا تھا۔ اسے حیرت اس بات کی تھی کہ وہ کہاں سے برآمد ہوا ہے۔ اور زندہ سلامت ہے..... اور اکیلا پیدل آ رہا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

"مسٹر پرکاش.....!" شاستری نے حیرت اور تجسس بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ خیریت سے تو ہیں نا.....؟ آپ کہاں تھے.....؟ میں نے آپ کو ساحل

تلاش کیا..... شاید اندھیرے کے باعث نظر نہیں آئے۔"

"میں اتنے بڑے ساحل پر اندھیرے میں کیسے نظر آتا.....؟" وہ بولا۔ "مجھ پر دو گھنٹے بے ہوشی طاری رہی..... جس نے مجھے اٹھا کر پھینکا وہ مجسمہ نہیں تھا..... شعبدہ باز تھا۔ مجسمہ کا بہروپ بھرا ہوا۔ اس نے ہم دونوں کو ہپناٹائز کر دیا تھا۔ تم کیا کہتے ہو؟"

شاستری اس سے کسی بات پر بحث و تکرار کرنا اور الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ پرکاش مہرہ ابھی تک احمقوں کی دنیا میں تھا۔ اس لئے اس نے کہا۔

"اب آپ بتائیں..... کیا کیا جائے..... میں اس شعبدہ باز کو جانتا ہوں اور نہ ہی اس کی شکل یاد ہے۔"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ ابھی اور اسی وقت پولیس کوارٹر تک چلو..... کیا تمہارے پاس وقت ہے۔ وہاں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"میں ضرور چلوں گا....." شاستری نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ آپ کی پریشانی کو سمجھتا ہوں..... قانونی کارروائیوں اور آپ کو تباہی سے محفوظ رکھنے کے لئے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ میں کروں گا۔"

شاستری نے ایک خالی ٹیکسی روکی۔ وہ دونوں پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ ٹیکسی سے اترنے کے بعد پرکاش مہرہ نے کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ کس کی سازش یا حرکت تھی.....؟ سنیل داس کو جو سری لنکا حکومت کا نمائندہ ہے۔"

"اگر آپ تلخ سچ اور سنگین حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو خود فریبی سے نکلنا ہو گا۔" شاستری کہنے لگا۔ "آپ کی کسی بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا..... محسوس کیا اور میرے تجربے اور علم میں آیا وہ یہ کہ خونی مجسمہ ایک حقیقت ہے۔ اس مجسمہ میں آتما اور زندگی آ گئی ہے..... اس نے دوسرا جنم لیا ہے..... میرے خیال میں نہ تو سنیل داس کا اس میں ہاتھ ہے اور نہ ہی سری لنکا کا..... اس کے پس پشت پر اسرار اور طاغوتی طاقتیں کام کر رہی ہیں ان کے آگے جدید سائنس علوم کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے..... وہ ناکارہ سی نظر آتی ہے۔"

☆.....☆.....☆

جگن ناتھ کو پینے کی طلب ہونے لگی۔ اس نے بہت دیر سے اپنی اس طلب کو دبائے رکھا تھا۔ آخر اس سے برداشت نہ ہو سکا تو الماری سے وہسکی کی بوتل نکالی، اسے میز پر رکھ کر گلاس کو قدرے ہٹا کر رکھ دیا۔ وہ مزید طلب کو دبائے رکھنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس کا دماغ تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا اور وہ اس سے بہت سارے اہم کام لینا چاہتا تھا تاکہ یکسوئی سے انہیں انجام دے سکے۔ وہ شاستری کی صلاحیت اور قابلیت کا شروع ہی سے معترف تھا۔ وہ ایک ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ جب شاستری اس سے ملنے آیا تھا تو تب اس نے اپنے شکوک و شبہات کا ذکر کیا تھا اسے سن کر وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا تھا کہ وہ اپنی جگہ سو فیصد درست ہے۔ صحیح سمت جا رہا ہے۔ اسے سراہا بھی ہے..... اب ایک ایسے متحرک کا کام تھا کہ اس کی رہنمائی میں چلتا رہے۔

شاستری کے سر پر جب کسی نادیدہ شخص نے چوٹ لگا کر اسے بے ہوش کیا تھا تب شاستری نے کچھ کاغذات چھوڑے تھے..... جگن ناتھ نے مطالعے کی غرض سے اٹھا لئے۔ شاستری نے جو پوائنٹ لکھے تھے وہ انہیں ایک دوسرے سے مربوط کر کے ان کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی جدوجہد، کوشش اور مغز پاشی کے بعد آخر کار ایک جملہ اس کی سمجھ میں آ گیا..... زندگی کے مقدس الفاظ..... وہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا..... پھر اسے وہسکی کی طلب ستانے لگی اور لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی..... لیکن وہ اپنی اس ترغیب کو کچل دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ نہ صرف قدیم ہندوستان، ایشیا..... بلکہ مصر سے لے کر افریقہ کے بھی اسراروں کو سمجھ سکتا ہے..... وہ شاید دنیا میں ایک ایسا شخص ہے کہ ماضی کی ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گتھی کو آسانی سے سلجھا سکتا ہے۔

جگن ناتھ لکھنے کی میز پر آ بیٹھا..... وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کا دماغ چوں کہ تیزی سے کام کر رہا ہے تو کیوں نہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ پیش آنے والے ممکنہ خطرات اور ان پراسرار قوتوں سے آگاہ کرے جو کسی بھی وقت انسانیت کے خلاف برسرِ پیکار ہو سکتی ہیں..... خونی مجسمہ کا تابوت میں سے پراسرار طور پر غائب ہو جانا ایک ایسا واقعہ تھا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اسے ایک عام سی بات سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔

وہ شاستری کے دیئے ہوئے اشاروں اور علاقوں پر لکھنے میں منہمک ہو گیا۔ جیسے جیسے ان کے اسرار عیاں ہوتے گئے۔ وہ انہیں تحریر میں لاتا گیا۔ حیرت اور تجسس اور پراسراریت کے انکشافات نے اس کی دلچسپی بڑھا دی۔ وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت اور اس سے یہ سب کچھ لکھوا رہی ہے۔

اچانک ایک دھماکا سا ہوا تو اس نے چونک کر اس سمت دیکھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ دریچے کے شیشے ایک زوردار آواز سے ٹوٹے تھے..... اس کی کرچیاں چاروں طرف کمرے میں بکھری نظر آئیں۔ اسے ایسے لگا تھا کہ کسی نے بڑے زور سے کوئی بڑا سا پتھر دے مارا ہو..... کمرا اس کے شور سے گونج اٹھا تھا۔

اس نے جو سر گھما کر دیکھا تو اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ کہیں وہ نشے میں تو نہیں ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے ایک گھونٹ بھی تو نہیں پی ہے۔ وہسکی کی بوتل میز پر دھری ہے اور گلاس میں ایک بوند بھی نہیں ہے۔

وہ حیرت اور خوف سے اچھل پڑا۔ اس کی رگوں میں لہو برف کی طرح منجمد ہونے لگا۔

کھڑکی کے باہر جنگلہ پر اسے خونی مجسمہ نظر آیا۔ جنگلا بہت مضبوط لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس کی سلاخیں بہت ہی موٹی تھیں۔ اسے ایک کیا دس آدمی بھی نکال کر پھینک نہیں سکتے تھے۔ لیکن اس مجسمہ نے ایک جھٹکے سے اس طرح سے ٹاک کر پھینک دیا جیسے وہ پلاسٹک کا ہو۔ پھر وہ اس راستے سے کمرے میں داخل ہونے لگا۔ اس کھڑکی میں سے دو تین آدمی بیک وقت اندر آ سکتے تھے۔

جگن ناتھ کو فوراً ہی اپنی حفاظت کا خیال آیا..... پھر اسے یاد آیا کہ میز کی اوپر والی دراز میں ایک بھرا ہوا غیر ملکی ساخت کا ریوالور رکھا ہے۔ اس کی صرف ایک گولی سے نہ صرف شیر بلکہ گینڈا اور تیندوا بھی ہلاک ہو سکتا تھا۔ ایسا ریوالور عموماً شکاری رکھتے تھے۔

وہ مجسمہ چوکٹ سے کود کر پروفیسر جگن ناتھ کے سامنے دو فٹ پر کھڑا ہو گیا۔

"تم.....؟" جگن ناتھ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر حیرت سے کہا۔ "تم نے دوسرا جنم پا لیا ہے.....؟ یقین نہیں آیا.....؟"

"تمہارے اس احمق مالک کو بھی یقین نہیں آیا۔" خونی مجسمہ غرا کر بولا۔ "میں نے اسے پنڈال سے نکال کر گہرے سمندر میں اس جگہ پھینکا تھا جو یہاں سے دو ہزار میل پر سمندر میں بنا ہوا ایک محل ہے..... یہ محل دس ہزار برس پہلے کا بنا ہوا طلسماتی محل ہے۔ اب وہ محل میری ملکیت میں ہے..... میں نے اسے موت کی نیند نہیں سلایا۔ اس لئے کہ اس نے مجھ پر بڑی دیا کی۔ احسان کیا..... سادھی سے جو میرا مجسمہ نکالا گیا اس کی بدولت..... اس محل میں پانچ برسوں پہلے کی حسین اور نوجوان لڑکیاں وہ اس قدر حسین ہیں کہ ایسی حسین ایک بھی اس دنیا میں نہیں ہے..... میں نے اس سے کہا کہ تم تین دن تک اس کے ساتھ وقت گزارو..... اس نے وقت گزارا..... پھر میں نے اسے واپس سمندر کے کنارے لا ڈالا..... وہ بے وقوف یہ سمجھتا ہے کہ وہ حقیقت نہیں تھی اور ایک سپنا تھا..... اسے ہپناٹائز کر کے یہاں لا ڈالا..... وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کسی نے ایک منصوبہ اور سازش کے تحت تابوت سے غائب کیا ہے۔ گدھا ہے..... الو کا پٹھا ہے..... اسے اس بات کا یقین

ہی نہیں ہے میں نے جنم لے لیا ہے اور میں نمائش میں تابوت سے غائب ہو گیا۔ وہ بڑا تمیں مار خان بنتا ہے..... میں اس کے دماغ درست کروں گا....."

"اس کے ساتھ جو کچھ بھی کرو میری بلا سے....." جگن ناتھ نے مجھے بے پروائی سے شانے اچکا کر کہا۔ لیکن اس کے لہجے سے خوف عیاں تھا۔ "لیکن تم یہاں کیوں اور کس لئے آئے ہو.....؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو.....؟"

"میں تمہیں موت کی نیند سلانے آیا ہوں۔" خونی مجسمہ غرایا اور اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک کوندی۔

"وہ کس لئے.....؟" جگن ناتھ نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ "میں نے تمہارا کیا بگاڑا؟"

"اس لئے کہ تم جتنے بوڑھے ہو اتنے ہی خطرناک بھی....." خونی مجسمہ نے جواب دیا۔ "تم نے میرا کچھ بگاڑا تو نہیں..... لیکن تم زندہ رہے تو بہت کچھ بگاڑ سکتے ہو..... تم پراسرار علوم سے واقف ہو۔ میرے راستے کا کانٹا بن سکتے ہو..... تم اپنی ذات سے مجھے جو نقصان پہنچا سکتے ہو..... وہ کوئی اور نہیں....."

"میں نے اپنی زندگی میں کسی کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو تمہیں کیا پہنچاؤں گا.....؟" جگن ناتھ بولا۔

"میں تم سے بحث و تکرار کرنے نہیں بلکہ تمہاری جان لینے آیا ہوں۔" خونی مجسمہ نے سرد سفاک لہجے میں کہا۔

خونی مجسمہ نے اس کی طرف قدم بڑھایا تو جگن ناتھ نے اس کا ریوالور سے نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "خبردار!..... میرے قریب نہ آنا..... یہ ریوالور دیکھ رہے ہو۔ بے حد خطرناک ہے۔ جس طرح آئے ہو۔ اسی طرح واپس چلے جاؤ۔"

"ریوالور.....؟" وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ "تم مجھے اس کھلونے سے ڈرا رہے ہو.....؟ تم ایسا کرو..... پہلے تم مجھ پر گولی چلاؤ..... دل کی حسرت پوری کر لو..... پھر میں تم سے نمٹتا ہوں۔"

جب اس نے جگن ناتھ کی طرف قدم بڑھایا تو جگن ناتھ نے اس کے سینے پر دل کی جگہ گولی داغ دی..... جب اس نے دیکھا کہ خونی مجسمہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے فوراً ہی دوسری گولی اس کی گردن میں اتار دی..... دوسری گولی بھی پہلی گولی کی طرح جسم کے آر پار ہو گئی تو اس نے تیسری گولی اس کی کھوپڑی میں اتار دی۔ لیکن وہ کھوپڑی میں سوراخ کرتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ خونی مجسمہ کا بال تک بیکا نہیں ہوا تھا۔ وہ نہایت سکون و اطمینان سے کھڑا قہقہہ لگاتا اور ہنستا رہا۔

"جتنی گولیاں چلا سکتے ہو چلاؤ....." خونی مجسمہ نے استہزائی لہجے میں بولا۔ "کیا تم نہیں جانتے ہو کہ میں ایک مجسمہ ہوں..... میرے جسم پر نہ تو کوئی اثر کر سکتی ہے اور نہ ہی خنجر اور تلوار..... اگر تلوار اور خنجروں سے بھی حملہ کیا جائے تو وہ ٹوٹ جائیں گی....."

جب وہ اس کی طرف بڑھنے لگا تو جگن ناتھ نے دہشت زدہ ہو کر باقی تینوں گولیوں سے اس کی آنکھوں کو نشانہ بنایا۔ گولیاں آنکھوں میں سے گزر گئیں..... پھر جگن ناتھ نے اس پر ریوالور دے مارا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

پھر مجسمے نے اسے لپک کر دبوچ لیا جو مڑ کر تیزی سے بھاگا تھا۔ اس میں اب اتنا دم خم نہیں رہا تھا اور خونی مجسمہ نے اسے دہشت زدہ کر کے اس کی حالت غیر کر دی تھی۔ پھر اسے اس طرح سے فرش پر دے مارا تھا جیسے وہ کوئی ننھا سا بچہ ہو۔

"سنو..... سنو..... مجھے نہ مارو....." جگن ناتھ گڑگڑایا۔ "میں بوڑھا آدمی ہوں۔ کچھ دنوں کا مہمان ہوں..... مجھے طبعی موت مرنے دو..... اس بے دردی سے تو نہ مارو....."

"اچھا....." خونی مجسمہ نے جو اپنے ہاتھ اس کا گلا دبانے کے لئے بڑھایا تھا ایک دم سے روک لیا۔

"ہاں:..... ہاں..... تم بوڑھے ہو....." خونی مجسمہ بولا تو اس کے لہجے میں نرمی تھی۔ "تمہاری عمر کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے.....؟"

"میں اسی برس کا ہو رہا ہوں۔" جگن ناتھ نے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اسی برس کے.....؟" خونی مجسمہ نے کہا۔

"میرے دور میں..... دو ہزار برس پہلے ایک آدمی کی عمر سو دو سو برس سے زیادہ ہوتی تھی..... وہ دو سو برس کی عمر میں بھی ایسا جوان، طاقت ور اور وجیہہ اور خوب صورت ہوتا تھا کہ وہ دس دس لڑکیوں اور عورتوں سے دل بہلاتا تھا..... تین سو برس کی عمر میں بھی وہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا اور نہ اس کے چہرے پر ایک جھری تک ہوتی تھی۔

صرف اسی برس کی عمر میں تم بوڑھے کیوں اور کس لئے ہو گئے.....؟" وہ ہنسا۔ "تمہارا یہ دور تو بڑا جدید ہے۔ سائنس کے جادو نے دنیا کو جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا..... کیا اس نے تمہاری صحت قابل رشک نہیں بنائی..... یہ کیا جادو ہے جو تم بوڑھے ہو۔ ہمارے ہاں جو تین چار سو برس کے بوڑھے ہوتے ہیں وہ تم سے لاکھ درجے بہتر ہوتے تھے۔"

"اس لئے کہ اس دور میں ایک آدمی کو اس قدر فکر، پریشانیاں، معاشی اور مالی حالت آدمی کو وقت سے پہلے بوڑھا اور کمزور کر دیتے ہیں اور اسے یہ ساری پریشانیاں دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ جاتی ہیں..... میں نے ساری زندگی بڑے دکھ اٹھائے۔ فاقے بھی کئے لیکن میری زندگی میں کبھی سکھ نہیں آیا..... میرے علم کی بہت ہی کم لوگوں نے قدر کی..... اگر میں امریکہ یا یورپ میں ہوتا تو میری بڑی قدر ہوتی..... میں اس عمر میں بھی جوان رہتا..... اپنے دکھوں اور احساس محرومیوں کو مٹانے کے لئے شراب کا سہارا لیا..... شراب پی کر میں سب کچھ بھول جاتا ہوں..... دکھ اور ناقدری....."

خونی مجسمہ نے بوتل اٹھا کر اس کا منہ کھولا اور اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ پھر اس نے بوتل ایک طرف پھینک کر کہا۔

"یہ شراب ہے.....؟ اس سے اچھی شراب تو ہمارے دور میں ہوتی تھی..... اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری زندگی میں کوئی عورت آئی.....؟ کیا تم نے اس سے جی بہلایا.....؟"

"جب میں تیس برس کا تھا میں نے ایک بہت حسین اور جوان لڑکی جس کی عمر بیس برس کی تھی شادی کی تھی۔" جگن ناتھ نے جواب دیا۔ "لیکن وہ ڈیڑھ برس کے بعد اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی..... اس کا آشنا دولت مند تھا۔ میں اسے وہ سب کچھ نہیں دے سکتا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اسے شوہر کی نہیں دولت کی ضرورت تھی۔"

"پھر تم نے دوسری شادی کی؟"

"نہیں....."

"وہ کس لئے.....؟" خونی مجسمہ نے حیرت سے کہا۔ ہندوستان میں عورتیں اور لڑکیاں مردوں سے زیادہ ہیں۔"

"اس لئے کہ مجھے عورت سے نفرت ہو گئی تھی....." اور آخر کار ایک دن وہ بھاگ گئی....."

"مجھے تمہاری درد بھری کہانی سن کر جانے کیوں بڑا ترس آیا ہے..... اگر میں تمہیں پھر سے بیس برس کا جوان بنا دوں..... تمہیں ایسی جوان اور شکتی دے دوں کہ تم جب تک زندہ رہو گے یہ قائم رہے گی..... تم کبھی بوڑھے نہ ہو گے..... تم ایک رات میں جتنی لڑکیوں اور عورتوں سے دل بہلانا چاہو بہلا سکو گے..... وہاں ایسی شراب ہو گی تم نے کبھی پی نہیں ہو گی..... اس کا ذائقہ..... لذت..... سرور جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے..... تمہاری سیوا کے لئے عورتیں ہوں گی۔"

"ہاں..... ہاں..... مجھے منظور ہے....." جگن ناتھ خوش ہو کر بولا۔ "میں سکھ سے بھری زندگی گزارنا چاہتا ہوں..... لیکن کیسے.....؟"

"اس کے لئے تمہیں میرے ہاتھوں مرنا ہو گا....." خونی مجسمہ نے جواب دیا۔

(جاری ہے)

حیوان

محمد عثمان علی۔ میاں چنوں

"رزق کی فراوانی انسان کے حیوانی خصائل کو اجاگر کر دیتی ہے اور جو انسان نعمت خداوندی کھا کر اطمینان کی نیند سوتا ہے اس کے لئے عیش و عشرت اور بے حیائی کے دروازے کھول دیتی ہے۔" ابلیس کے چیلے نے کہا۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ شیطان کمزور انسان کو دین و دنیا میں عبرت کا نشان بنوا دیتا ہے

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے نیم سرکش اور دھیمی دھیمی قلقاریاں لگاتے ہوئے جھونکے ماحول میں گردش کرتے پھر رہے تھے۔ سورج کی تپش انگیز دھوپ ایسے سرد یلے موسم میں سوندھی سوندھی بن کر مترشح ہوتے ہوئے بے حد دلکش، بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ساری رات مغرب کی آغوش میں سونے کے بعد اب جاگ کر سورج نے مشرق کی ٹھٹھرتی آغوش میں سے سر ابھار کر بیداری کے عالم میں اپنی سنہری آنکھیں کھولیں تھیں۔ صبح کا وقت ہو چکا تھا۔ رات بیت چکی تھی۔ سرد یلا اور سحر انگیز، فرحت بخش دن طلوع ہو رہا تھا۔ لوگ علی الصباح اپنے اپنے کاموں پر نکلنے کی غرض سے پیٹ پوجا کرتے ہوئے گھروں سے روانہ ہو رہے تھے۔ روس کا یہ شہر جس کا نام چیچر کا تھا۔ شمالی پہاڑی علاقے سے دو میل دوری پر واقع تھا۔ یہاں کے تمام لوگ اپنے اپنے کاموں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگن رہنے والے تھے۔ چیچکا شہر کا رہنے والا میکسم ایلگوری ایک غریب کسان تھا۔ وہ اپنے کھیتوں میں تمام دن محنت کرنے کے بعد واپس گھر آ جاتا۔ اکثر راستے میں اس کے چند دوست مل جاتے۔ جن سے کچھ دیر گپ شپ لگانے کے بعد وہ گھر میں داخل ہوتا۔ گھر میں اس کی اکلوتی بیوی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، نہ کوئی بچہ اور نہ کوئی بزرگ ہستی......

آج بھی وہ حسب معمول علی الصباح کھیتوں کی طرف چل دیا تھا۔ اس نے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں بکس تھا۔ جس میں دوپہر کا کھانا موجود تھا۔ شوربہ سالن کے سامان کے ساتھ چند روٹیاں موجود تھیں۔ کھیتوں میں پہنچ کر کام کا آغاز کرنے سے پہلے اس نے اپنا اوور کوٹ اتار کر اس کے بیچ میں لنچ بکس چھپا کر کھیت کے کنارے مخصوص جگہ پر نہایت احتیاط سے رکھ دیا۔ پھر وہ سب سے پہلے ہل چلانے کی غرض سے اپنے کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ وہ کام کرتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ سورج مشرق کی آغوش سے چڑھتے ہوئے آسمان کے سینے پر سے پھسلتے ہوئے کھسکتا رہا......

آخر کار دوپہر ہو گئی۔ سورج مستعول پر آن پہنچا۔ کسان میکسم ایلگوری کی طبیعت جب تھکان سے بوجھل بوجھل سی اور بھوک کا جہنم چمک اٹھا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر گھنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر روٹی کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ مگر جب اس نے کوٹ اٹھا کر لنچ باکس کھولنا چاہا تو اسے حیرت کا زبردست جھٹکا لگا۔ خالی کوٹ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ لنچ باکس کا کہیں وجود نہیں تھا۔ وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

''ہائیں۔ یہ میرا لنچ باکس کدھر غائب ہو گیا؟''

میکسم ایلگوری نے حیرت بھرے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا۔ ''ادھر سے ابھی تک کوئی گزرا بھی نہیں ہے۔ تو پھر یہ......؟''

میکسم ایلگوری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تاہم وہ [illegible] اس نے آخر کار خود کو تسلی دی

۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔ گاڈ نے شاید آج کا کھانا میری قسمت میں نہیں لکھا تھا۔''

میکسم ایلگوری کے کھیتوں کے پاس سے ابلیس کا ایک چیلا گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر میکسم ایلگوری پر پڑی۔ جو بڑی محنت سے اس سرد یلے موسم میں اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ ابلیس کا چیلا وہیں ٹھٹکتے ہوئے رک گیا۔

''اوہ۔ یہ کیسا انسان ہے؟ اتنی سردی میں بھی اتنی ایمانداری سے محنت کر رہا ہے۔ اسے تو چاہیے کہ اس سردی میں محنت کرنے کی بجائے حرام کی کمائی کر لے۔ جس میں اسے نہ محنت زیادہ کرنا پڑے گی اور نہ سردی میں اتنا سخت کام کرنا پڑے گا۔'' ابلیس کے چیلے نے میکسم ایلگوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔ تاکہ یہ انسان ایمانداری اور حصول رزق حلال کے راستے سے ہٹ کر بے راہ روی پر آ جائے۔ اور حرام کی زندگی گزارے۔ حرام رزق کھائے۔''

ابلیس کا وہ چیلا غیبی حالت میں آگے بڑھا اور اس نے میکسم ایلگوری کا لنچ باکس چپکے سے اٹھا لیا اور پھر وہ جھاڑی کے عقب میں آ بیٹھا۔ وہ کسان میکسم ایلگوری کا انتظار کرنے لگا۔ جب میکسم ایلگوری کو اس طرف بڑھتے دیکھا جہاں خالی اوور کوٹ پڑا تھا تو ابلیس کے چیلے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ سوچنے لگا کہ ''اب یہ کسان گالی گلوچ اور بدزبانی سے اپنی پریشانی کا مداوا کرے گا تو اس کا اعمال نامہ سیاہ ہونے کا کچھ سامان تیار ہو جائے گا۔''

لیکن اس وقت اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب کسان اطمینان سے اٹھا اور رہٹ سے اپنی پیاس بجھائی...... تھوڑی دیر تک حسب عادت سستایا اور پھر حسب سابق اٹھ کر کھیتوں میں چلا گیا۔ اور اپنا کام شروع کر دیا۔ ابلیس کے چیلے کو شدید مایوسی ہوئی۔ وہ فوراً وہاں سے پلک جھپکتے اپنے شیطان آقا کے پاس پہنچ گیا اور اسے تمام بات من و عن سنا دی۔ ابلیس نے اسے سخت سست، نااہل قرار دیتے ہوئے ڈانٹا۔

''ناخلف۔ نالائق۔ اپنی نالائقی کا حل مجھ سے پوچھتے ہو۔'' ابلیس نے ترش لہجے میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ پھر قہقہہ لگایا۔ ''اگر تین سال کے اندر اندر تم نے اس فاش غلطی کا ازالہ نہ کیا تو تجھے شدید ترین سزا کا مستحق سمجھا جائے گا۔ اور تمہیں ایسی سخت سزا دی جائے گی کہ تم پورے دس سالوں تک تڑپتے اور بلکتے رہو گے۔''

''آقا آپ ناراض مت ہوں۔ میں نے یہ غلطی کی ہے۔ مگر میں ان تین سالوں کے اندر اندر ضرور اس فاش غلطی کا ازالہ کر کے آپ کی نظروں میں سرخرو بنوں گا۔'' ابلیس کا چیلا یہ کہتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔

☆......☆......☆

ابلیس کے چیلے نے اپنے آپ کو انسانی روپ میں لا کر ایک عام کسان کے قالب میں ڈھال لیا۔ اور پھر اسی کسان کے پاس چلا گیا۔ اس نے کسان کے کام میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کی جس کی پیش کش کو کسان میکسم ایلگوری نے قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے شیطان کے چیلے کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔

پہلے سال اس نے کسان کو مشورہ دیا کہ وہ (میکسم ایلگوری) نشیبی علاقے میں بیج کاشت کرے۔ اس کی ہدایت پر عمل کیا گیا۔ اس سال بارش بالکل نہ ہوئی۔ چونکہ گرمی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے سورج کی تپش سے فصلیں خاکستر ہو گئیں۔ کسان کو تو مطلق نقصان نہ پہنچا اور پہلے سے زیادہ جھاڑ ہاتھ لگا۔ وہ شیطان کے چیلے سے از حد خوش تھا۔ جبکہ بقیہ تمام کسان افسردہ تھے۔

اگلے سال شیطان کے چیلے نے اسے پہاڑی ڈھلان پر کاشت کرنے کا مشورہ دیا۔ جس پر میکسم ایلگوری نے بخوشی عمل کیا۔ اس بار بارشیں ضرورت سے کہیں زیادہ ہوئیں اور علاقے بھر کی فصلیں پانی میں ڈوب کر برباد ہو گئیں۔ مگر کسان میکسم ایلگوری کو بیش از بیش فائدہ پہنچا اور غلے سے کمرے بھر گئے۔ اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ منڈی میں بھاؤ تیز اور خوب بڑھ گئے تھے۔ غلے کی ضرورت کے بعد بھی اتنا کچھ بچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا کہ اناج کی کھپت کے لئے کوئی دوسری راہ تلاش کی جانے لگی۔

اس مشکل کا حل شیطان کے چیلے نے پہلے ہی تلاش کر رکھا تھا۔ سو اس نے بولتے مشورہ بتایا۔ ”جناب گندم سے خاص طریقے کے ذریعے ”ووڈکا“ یعنی روسی شراب تیار کی جائے۔ اس سے خوب کمائی ہوگی۔“

میکسم ایلگوری نے اس کے اس مشورے پر بھی ہاتھوں ہاتھ عمل کیا۔ جب ووڈ کا شراب تیار ہوئی تو میکسم ایلگوری نے اسے خود بھی ٹیسٹ کیا اور پھر بطور کاروبار سے فروخت کرنا شروع کر دیا۔ دولت کی ریل پیل نے اس دماغ سے مفلسی اور غریبی اور تنگ دستی کے ایام کی یادیں اسی طرح محو کر دیں جیسے وہ دور کبھی اس پر گزرا ہی نہ ہو۔ اس کے بعد چیلا یہ خبر دینے کے لئے اپنے سردار ابلیس کے پاس حاضر ہوا۔

”آقا۔ جس مقصد میں پہلے ناکامی ہوئی تھی۔ اب اس میں خوب کامیاب ہو چکا ہوں۔“ اس نے ابلیس کو بتایا۔

”میں جب تک اپنی آنکھوں سے یہ کامیابی نہ دیکھ لوں گا۔ اس وقت تک یقین نہیں کروں گا۔“ ابلیس نے اپنے چیلے سے کہا۔

”ٹھیک ہے آقا۔ آپ آیئے میرے ساتھ اور چل کر دیکھ لیجئے آج کیا ہونے والا ہے۔“ چیلے نے سردار ابلیس سے کہا۔ پھر وہ دونوں زمین کی طرف بڑھ گئے اور کسان میکسم ایلگوری کے گھر چھپ کر بیٹھ گئے۔

وہاں ایک چھوٹی سی میز کے گرد مختلف قبائل کے سردار اور بڑے بڑے زمیندار براجمان تھے۔ کسان میکسم ایلگوری کی بیوی ووڈ کا شراب کے جام بھر بھر کر انہیں پیش کر رہی تھی۔ جب وہ میز کے پاس سے گزرنے لگی تو ایک گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ گرا ساری شراب فرش پر بہہ گئی۔

”اے پاگل عورت! کیا یہ کوئی غلیظ پانی ہے۔ جسے تو بے دردی کے ساتھ ضائع کر رہی ہے۔“ کسان میکسم ایلگوری اپنی بیوی پر غضب ناک آواز میں دہاڑا تھا۔ چیلے نے شیطان کو اشارہ کیا اور پھر وہ دونوں مسکرانے لگے۔

”خوب۔ آہستہ آہستہ یہ نیک آدمی ..... مختی انسان برا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے اندر کا حیوان جاگ رہا ہے۔“ ابلیس خوش ہوتے ہوئے بولا۔

اتفاق سے اچانک ایک تھکا ہارا غریب انسان اپنی پیاس بجھانے کی غرض سے ادھر آ نکلا۔ اور میکسم ایلگوری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جناب ووڈکا کی ایک بوتل یا ایک جام ہی دے دیجئے۔“

میکسم ایلگوری بھڑکتے ہوئے بولا۔ ”چلو چلو۔ بھاگو یہاں سے اور اپنی راہ ناپو۔ میں نے کوئی سرائے نہیں کھول رکھی کہ ہر آنے جانے والے کی بھوک و پیاس کا خیال رکھوں۔“

”حلق خشک ہو رہا ہے۔ ایک آدھا جام ہی دے دو۔ مہربانی ہوگی۔“ وہ آدمی رحمانہ لہجے میں بولا تھا۔

”تم نے سنا نہیں۔ میں نے ایک بار جو کہہ دیا۔ سو کہہ دیا۔ اب دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔“ میکسم ایلگوری نے حقارت بھرے لہجے میں اس سے کہا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے جام کو ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتار لیا اور خالی گلاس ٹھک کی آواز کے ساتھ ٹیبل پر رکھ دیا، میکسم ایلگوری نے ایک آدمی کو اشارہ کیا تو وہ کھڑا ہوا اور پھر اس نے اس آدمی کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ وہ آدمی جھینپتے ہوئے باہر نکل گیا۔

شیطان یہ دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے مسکرایا تو اس کا چیلا دوبارہ بولا۔ ”آقا۔ ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ انتظار فرمایئے۔ ان کے اندر کا حیوان جاگ چکا ہے۔ اب تو قابل دید ہوگا کہ وہ کیا کیا کرے گا۔“

چیلے کی یہ بات سن کر شیطان نے اثبات میں سر ہلایا۔

پہلا دور چلا تو وہ سب ایک دوسرے کی تعریفیں کرنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے لئے ایسی تقاریر کیں جو جھوٹ کا پلندہ تھیں ..... جس میں ایک دوسرے کے لئے حتمی طور پر خوشامد، جھوٹی تعریف شامل

تھی۔

”اگر یہ لوگ ایک دوسرے کو اسی طرح دھوکا دینے لگے ہیں تو یہ شراب بہت ہی مفید چیز ہے۔ اس طرح یہ ہمارے کارکنوں میں اضافہ کرنے کا موجب بنے گی۔“ ابلیس نے مسکراتے ہوئے اپنے چیلے سے کہا۔ ”بے شک یہ انسانی ہاتھوں سے تیار کی گئی یہ شراب ان کے لئے بے حد نقصان دہ ہے۔ یہ تو انسان کے اندر چھپے ہوئے حیوان کو بیدار کرنے کا سب سے اچھا موجب ہے۔“

ابلیس کا چیلا خوش ہو کر فوراً بولا۔ ”آقا۔ ابھی تو یہ لوگ لومڑیوں کی طرح جھوٹی تعریفیں کر کے ایک دوسرے کو خوش کر رہے ہیں، جلد ہی یہ بھیڑیوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔“

پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ دوسرا دور چلتے ہی کسانوں نے بکواس شروع کر دی۔ جو آخر کار دست بدست جنگ پر منتج ہوئی۔ وہ سب آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ مہمان نواز کسان کی خوب مرمت ہوئی۔ لکڑوں، مکوں، لاتوں سے ان سب نے ایک دوسرے کی خوب دھلائی کی۔ سب کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ ہونٹوں، ناک، اور رخساروں سے خون ٹپک ٹپک آنے لگا تھا۔

”ہا ..... ہاہا ..... ہا ہا ہا ..... ہا ..... بہت خوب۔“ ابلیس مسرت بھرے لہجے میں قہقہے لگاتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”آقا۔ خاموشی سے انتظار کریں۔ ابھی یہ لوگ جنگلی سوروں کی حرکات کریں گے۔“ چیلا ابلیس کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

تیسرا دور چلا۔ انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ایک دوسرے کی بات سنے بغیر انہوں نے وہ طوفان بدتمیزی برپا کیا کہ الامان والحفیظ ..... برتن ادھر ادھر پھینکنے شروع ہو گئے۔ اس قدر افراتفری برپا ہوئی کہ جدھر کسی کا منہ اٹھا۔ بھاگ نکلا ..... کئی غنودگی کے عالم میں صحن اور کمرے کے فرش پر گر پڑے۔ باقی ماندہ لڑکھڑاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ کسان میکسم ایلگوری نے عالم بے خودی میں باہر کا رخ کیا ..... مگر صحن کی بدروحیں گر پڑا۔ اور کیچڑ اٹھا اٹھا کر اپنے جسم، چہرے اور بالوں میں ملنے لگا۔ غلاظت میں ٹھہرنے لگا۔ ساتھ ہی حیوانوں کی طرح چلاتا جا رہا تھا۔ اس کی حالت زار قابل رحم نہیں ..... بلکہ قابل نفرت تھی .....

ابلیس اس ساری کاروائی پر از حد خوش ہوا اور اس نے اپنے چیلے کو جی بھر داد دی۔ اس کی تعریف کی۔ پھر پوچھا۔ ”یہ عجیب و غریب مشروب تم نے کیسے تیار کیا۔ غالباً تم نے مختلف جنگلی جانوروں کا خون اکٹھا کر کے انسانوں کے اندر انہی جانوروں کے سے خصائل پیدا کئے ہیں۔ یہ مشروب ووڈکا، شراب کمال ہے۔ بہت کمال ہے۔“

”بالکل نہیں آقا۔ میں نے یہ کچھ نہیں کیا ..... میں نے تو صرف یہ اندازہ کر لیا تھا کہ کسان کے پاس اتنا غلہ ہو گیا۔ جس کی اسے ضرورت نہ تھی۔ جنگلی جانوروں کے خصائل کا مادہ انسان کے اندر ہوتا ہے۔ رزق کی فراوانی ..... حد سے زیادہ، زیادتی اس کے حیوانی خصائل کو اجاگر کر دیتی ہے، اور وہی خدا کی نعمت جسے کھا کر وہ اطمینان کی نیند سوتا ہے۔ اس کے لئے عیش و عشرت اور بے حیائی کے دروازے کھول دیتی ہے۔“ ابلیس کے چیلے نے بولتے ہوئے کہا۔

”یعنی ..... انسان اور حیوان کا یہ فرق اتنی آسانی سے مٹ جاتا ہے۔ واہ ..... کیسا خوب ہے؟“ ابلیس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”جی آقا“ ابلیس کے چیلے نے مؤدبانہ اور مسکراتے ہوئے انداز میں بولتے ہوئے اپنے سر کو خم کیا۔

”تم نے واقعی نا صرف اپنی غلطی کا ازالہ کیا ہے۔ بلکہ انسان اور حیوان کے فرق کی خاص جڑ بھی پکڑی ہے۔ اس لئے آج سے تم ہمارے نائب ہو۔“ ابلیس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیطانی کھیل

ایس حبیب خان۔ کراچی

نوجوان کی آنکھیں اچانک انگارہ اگلنے لگیں اس کے شانوں پر ایک عجیب بدھیت اور خوفناک جانور کا سر تھا جس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ نوجوان کا ہاتھ لمبا ہوا، اور سامنے کھڑے نوجوان کی آنکھ میں اس کی انگلیاں گھستی چلی گئیں۔

خوف کے لبادے میں لپٹی ہوئی..... ایک لرزہ خیز لہولہان..... اور دہشت ناک کہانی

گھر میں چاروں طرف شور مچا ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ آج آنند کی بہن نندنی کی بدائی تھی۔ سب کزنز جمع تھے۔ آنند، سنیل، مدھو اور ساکشی کی گہری دوستی تھی۔ اس شادی کو سب نے خوب انجوائے کیا اور اب بدائی کی گھڑی آ پہنچی تھی۔ آنند اپنی بہن کو بہت چاہتا تھا اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ کہ اس کی گڑیا اس سے دور ہو رہی ہے۔ نندنی تو بدا ہو کر اپنے گھر چلی گئی مگر اپنے گھر میں سناٹا کر گئی۔

کافی دن گزر چکے تھے مگر آنند ابھی تک اپنی روٹین میں واپس نہیں آیا تھا، اس وقت بھی وہ بستر پر پڑا کروٹیں لے رہا تھا اس کا موبائل بج اٹھا، اسکرین پر ساکشی کا نام نظر آیا۔ ''ہاں ساکشی''

''کیوں جناب کی تھکن نہیں اتری ابھی تک؟ آنند کاہلی کی بھی حد ہوتی ہے، شادی ختم ہوئے دنوں گزر گئے اور تمہارا آرام ابھی تک ختم نہیں ہو رہا، تمہیں تو''

''ارے یار وہ میں تو.....''

''بس بس سب پتا ہے۔'' ساکشی نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی اور آنند کی پوری بات بھی نہیں سن رہی تھی۔ ''سنیل کی طرف چکر لگاؤ ہم سب وہیں آتے ہیں۔'' اور رابطہ منقطع کر دیا۔ آنند نے مسکرا کر ایک لمبی سانس لی اور نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔

''کہاں تھا اتنے دنوں سے؟'' سنیل نے آنند کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا۔

''بس یار! میں اپنی گڑیا کے جانے سے بہت ڈاؤن ہو گیا ہوں۔'' آنند نے جذباتی ہو کر کہا۔

''نہیں آنند ایسا نہیں کہتے یہ تو نیئم ہے ہر لڑکی کو جانا ہوتا ہے۔ خیر تو بتا کیا کھائے گا؟'' سنیل نے پوچھا۔

''کیوں بھئی! ہم کیا سوتیلے ہیں؟ جو صرف یہ کھائے گا۔ ہم بھی کھائیں گے۔'' ساکشی اور مدھو نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اچھا تو تم ہو، ارے کچھ دن پہلے تو تم کافی اسمارٹ تھیں، اب اتنی موٹی؟ کم کھایا کرو!'' آنند نے سنیل کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''ویری فنی! لگتا ہے چشمے کی ضرورت ہے تمہیں۔'' ساکشی نے ترنت جواب دیا۔

''ارے ارے بالکوں! شانتی سے کام لو لڑائی کرنا گھور پاپ ہے۔'' مدھو نے دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''لو! پنڈت جی بھی بولے'' اور سب بے ساختہ ہنسنے لگے۔

آنند اب فریش لگ رہا تھا۔ ''یار کہیں کا پروگرام بنائیں؟'' سنیل نے آئیڈیا دیا۔

''وائے ناٹ۔'' مدھو جلدی سے بولی۔ ''پر کہاں؟'' آنند نے سینڈوچ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یار ڈیڈ کا جو فارم ہاؤس ہے ناں وہاں چلتے ہیں۔ بیچ بھی قریب ہے۔ اور اگر مزہ نہ آیا تو وہاں سے کہیں اور نکل جائیں گے۔ کیوں؟'' سنیل بولا۔

''اوکے ڈن۔'' سب نے کہا۔ اور دوسرے دن کا پروگرام بن گیا۔

چاروں جب فارم ہاؤس پہنچے تو تھکن سے چور ہو رہے تھے۔ سنیل نے پہلے ہی ملازموں کو انفارم کر دیا تھا۔ سب سیدھے اپنے اپنے روم میں جا کر بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ ان میں سب سے پہلے ساکشی کی آنکھ کھلی دن کے دو بج رہے تھے۔ اس نے مدھو کو کال کی اور نہانے چلی گئی۔ آہستہ آہستہ سب اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل پر جمع ہو گئے۔ وہاں ان سب نے گرم گرم آلو کے پراٹھوں سے پیٹ پوجا کی اور آپس میں مذاق کرنے لگے۔ پھر وہ لوگ بیچ کی طرف نکل گئے۔

دو، چار روز تک تو انہوں نے انجوائے کیا، مگر پھر ایک ہی روٹین سے بور ہونے لگے۔ ''یار کہیں اور چلتے ہیں کچھ ایڈونچر ہو جائے گا۔'' آنند نے سنیل سے کہا۔

''اوکے باس!'' سنیل نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر انہوں نے جیپ منگوائی اور ضرورت کی چیزیں رکھنے لگے۔

جیپ چلے جا رہی تھی مگر وہ کہیں نہیں رکے کیوں کہ کوئی رکنے کے لائق جگہ نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اب تو ڈرائیو کرتے کرتے وہ تھکنے لگے تھے، سنیل نے کہا ''وہ دیکھو!'' سامنے انہیں ایک ہوٹل سا نظر آیا، وہاں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ''چلو جگہ نہ سہی کھانا ہی سہی'' ساکشی بولی اور انہوں نے جیپ وہاں سائیڈ میں روک دی۔ پھر وہ چاروں وہاں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ایک لڑکا وہاں آ گیا۔

''جی کیا آڈر ہے؟''

''ہاں بھئی۔'' چھوٹے! دال مکھن، لسی اور گرم گرم روٹیاں لے آ، ذرا جلدی!'' آنند نے آڈر دیا اور چارپائی پر پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں لڑکا گرم گرم کھانا اور ٹھنڈی لسی لے آیا۔ کھانے کی خوشبو سے ان سب کی بھوک مزید چمک گئی۔ ساکشی نے جلدی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے نوالہ منہ میں رکھا اور بولی۔ ”کھانا بہت سوادشٹ ہے، اوپر سے یہاں کا ماحول بھی بہت شانت ہے۔“ ان لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور بل ادا کرنے لگے۔ ہوٹل کا مالک سکھ تھا۔ ”ہاں جی! کیسا لگا کھانا؟“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”سردار جی کھانے کا تو جواب نہیں!“ سنیل نے کہا۔

”شہری لگتے ہو کیسے آ گئے؟“ اس نے پوچھا۔

”بس سردار جی گھومنے نکلے ہیں۔ مگر یہاں کچھ ہے ہی نہیں، شاید آگے کوئی جگہ مل جائے!“ مدھو بولی۔

”باؤ جی آگے تو بس ویرانہ ہے۔ کوئی گھومنے کی جگہ نہیں ہے! اور ویسے بھی آگے جا کر تو ایک۔“

”پاپا جی! اتھے آنا ذرا۔“ بچے نے اسے آواز دی۔ ”جی میں آیا۔“ کہہ کر وہ چلا گیا۔

”چل بھئی سنیل! ورنہ اور دیر ہو جائے گی۔“ آنند نے کہا اور وہ سب جیپ میں سوار ہو گئے۔ آگے ویرانہ ہی ویرانہ تھا مگر وہ چلے جا رہے تھے۔ ”یار مجھے نہیں لگتا کہ آگے کچھ ملے گا۔ سردار جی ٹھیک کہہ رہے تھے۔“ سنیل نے کہا۔

اچانک ساکشی نے سب کی توجہ دور سامنے دلوائی انہیں دور سامنے کوئی بڑی چیز دکھائی دی۔ ”اب لگتا ہے مزہ آئے گا! یہاں ضرور کچھ ہوگا۔“ سنیل نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ جیسے جیسے وہ قریب ہوتے گئے انہیں معلوم ہوا کہ وہ کوئی بڑا پہاڑ نما پتھر تھا۔ وہ لوگ جیپ سے اتر کر اس کے دوسری طرف آ گئے۔ وہاں ایک بہت بڑی چٹان نظر آ رہی تھی جس پر جانے کیسی نحوست چھائی ہوئی تھی۔ ”میری مانو تو یہاں وقت ضائع نہ کرو! نہایت فضول سی جگہ ہے یہاں دیکھنے جیسا کچھ بھی تو نہیں ہے۔“ مدھو نے منہ بنا کر کہا۔ ”خاموش! مدھو“ ساکشی نے کہا اور پھر وہ لوگ چٹان پر چڑھ گئے۔

چٹان کے ایک طرف ایک گہرا گڑھا نما سا حصہ تھا جس میں کائی جما پانی بھرا ہوا تھا، وہ سب نیچے کا جائزہ لیتے ہوئے اوپر کی طرف جانے لگے۔ ”آنند!“ میری ایک بات مانو گے؟“ مدھو نے کہا۔ ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے! پتہ نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہمیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا، آنند پلیز واپس چلتے ہیں۔“ مدھو نے آنند کا بازو پکڑ کر کہا۔ اس کے انداز میں ایک انجان سا خوف نمایاں تھا۔

”کم آن مدھو ڈونٹ بی سلی! انجوائے کرو، ہم نے کونسی زندگی گزارنی ہے یہاں، ویسے بھی یہاں ایسا کیا ہے جس سے تم خوف زدہ ہو۔“ آنند نے اس کو سمجھایا۔

وہ لوگ اوپر پہنچ گئے ”یار یہ جگہ مجھے تو عجیب ہی لگ رہی ہے۔“ سنیل نے کہا۔

”آنند اس طرف چلتے ہیں۔ جہاں پانی جمع ہے۔“ ساکشی نے کائی جمے پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ سب آگے بڑھنے لگے۔ چلتے چلتے سنیل کو جو کہ سب سے آخر میں تھا ایک دم زوردار ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑا، اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون کی ایک پتلی لکیر تیزی سے بہہ کر زمین پر ٹپک گئی۔ سنیل نے اٹھ کر آستین سے ہونٹ کو دبایا، مگر اس نے یہ نہیں دیکھا کہ ”زمین پر ٹپکنے والی خون کی بوندیں غائب ہو چکی تھیں۔“ سنیل نے اپنے دوستوں کو بتانا چاہا مگر وہ ان لوگوں سے پیچھے رہ گیا تھا اور وہ سب اسے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ”کس طرف گئے ہونگے یہ لوگ؟“ اور اندازے سے بائیں جانب بنی ڈھلان پر سنبھل کر اترنے لگا۔ کافی نیچے جا کر اسے ایک بڑا سا پتھر نظر آیا جو کہ سیاہ تھا۔ غور کرنے سے سنیل کو معلوم ہوا کہ وہ جل کر سیاہ ہوا تھا۔“

یہاں زبردست آگ لگی ہو گی پورا پتھر سیاہ ہو گیا۔ مگر اس ویرانے میں آگ کیسے لگ سکتی ہے؟“ اور اس پتھر کے اطراف میں بھی جلے ہوئے سیاہ پتھر کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور ان جلے ہوئے تمام پتھروں کے گرد چونے سے ایک سفیدی لکیر کھینچی ہوئی تھی وہ قریب آیا تو اس کے جو گرز سے وہ لکیر تو نہ مٹی مگر اس کا پیر اس لکیر کے پار چلا گیا تھا۔ آنند نے کوئی پانچویں بار سنیل کو آواز

دی مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ سنیل کو دھیان ہی نہیں تھا کہ وہ سفید لکیر کیوں ہے؟ وہ تو اس کے اندر چلا گیا تھا اور اس کا ہاتھ ابھی تک اپنے ہونٹ کو دبائے ہوئے تھا۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو خون پھر نکل آیا۔ ”لگتا ہے گہری چوٹ لگ گئی ہے۔“ اس نے خود سے کہا اور خون کی چند ننھی منھی بوندیں زمین پر گرتے ہی غائب ہو گئیں۔ اچانک ایک بہت ہی چھوٹا سا تراشا ہوا پتھر لڑھک کر سنیل کے قدموں میں آ گرا۔ سنیل نے چونک کر اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو وہ ”ایک پتھر کا ٹکڑا تھا، جس میں کالا ڈورا ڈالا ہوا تھا، سنیل نے جھک کر اسے اٹھایا اور قریب سے دیکھا تو اس پر ایک بھیانک شکل بنی ہوئی تھی کسی جانور سے ملتی، جسکے سینگ بھی تھے جو مڑ کر پورے پتھر پر پھیلے ہوئے تھے۔ سنیل کو اپنی کمر پر زور سے سانس لینے کی آواز آئی اسے ایکدم جھرجھری سی آ گئی۔ وہ بے اختیار پلٹا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

سنیل نے خاموشی سے اس پتھر کے لاکٹ کو جیب میں رکھ لیا۔ تو وہ آگے کو بڑھا تو اسے آنند نظر آیا۔ ”چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ گیا مگر تم نے جواب دینے کی زحمت تک نہیں کی۔“ سنیل آنند سے بولا۔

”میری جان! یوں اکیلے نہ پھرا کرو کہیں کوئی چڑیل تم پر عاشق نہ ہو جائے۔“ آنند نے سنیل کو چھیڑتے ہوئے کہا مگر اس کی ہنسی رک گئی جب اس نے سنیل کا ہونٹ پھٹا دیکھا۔ ”اوہ بھگوان! یہ کیا ہوا جلدی چل گاڑی میں فرسٹ ایڈ باکس ہے۔“ آنند نے سنیل سے کہا اور پھر آنند نے ساکشی اور مدھو کو آواز دے کر بلا لیا اور وہ چاروں جیپ میں آ گئے۔ ساکشی نے سنیل کے دوا لگا دی۔ ”تو پیچھے بیٹھ میں ڈرائیو کرتا ہوں۔“ آنند نے سنیل سے کہا۔ اور سنیل پیچھے ساکشی کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”کیوں سنیل کیا اپنا دل وہیں چھوڑ آئے ہو ویرانے میں؟“ مدھو نے ہنستے ہوئے کہا۔ مگر سنیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چاروں جب فارم ہاؤس پہنچے تو رات ہو گئی تھی۔ سب کا بھوک سے برا حال تھا۔ وہ سب سیدھے ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے اور بنا رکے کھانا شروع ہو گئے۔ مگر سنیل کا دھیان کہیں اور تھا۔ کھانا کھانے کے بعد سب اپنے اپنے روم میں چلے گئے۔ سنیل نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور لاکٹ نما پتھر کو نکال کر غور سے دیکھنے لگا اور دیکھتے دیکھتے اس نے دوبارہ لاکٹ نما پتھر کو گلے میں ڈال لیا۔ لاکٹ کو گلے میں ڈالنا تھا کہ سنیل کو لگا اس کے سینے پر بوجھ ہو رہا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

اگلے روز انہوں نے واپسی کا پروگرام بنایا فارم ہاؤس سے گھر کے لئے نکل پڑے۔

رات بارہ بج رہے تھے سنیل اپنے کمرے میں تھا اچانک اسے لگا کہ اس کے سینے میں انگارے سے دہک رہے ہوں اس کا دم گھٹنے لگا، وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر پا رہا تھا، ایک نامعلوم چبھن تھی اس کے سینے میں۔ وہ کمرے کی گیلری میں آ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مگر بوجھ کی شدت بڑھے جا رہی تھی اور جب اس کے برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

صبح جب اس کے ماتا پتا آئے تو اس کو اسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر سنیل میں خون کی کمی ڈاکٹرز نے بتائی۔ مگر سنیل کی ماں کو یقین نہیں آ رہا تھا، انہوں نے سنیل کے پتا سے کہا۔ ”ابھی پچھلے ویک ہی تو پوری فیملی کے روٹین ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ سب نارمل تھے۔ یہ سنیل کو کیا ہو گیا اچانک؟“

آنند نے نہاتے ہوئے شاور بند کیا، اسے لگا کہ اس کا موبائل بج رہا ہے۔ اور واقعی اس کا موبائل بج رہا تھا۔ وہ باہر آیا۔ ”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے گھڑی کی جانب نگاہ کی تو بارہ بج رہے تھے۔ جب وہاں پہنچا تو فون بند ہو گیا تھا اس نے اسکرین دیکھی تو سنیل کی آٹھ مس کالز تھیں۔ آنند نے جلدی سے سنیل کا نمبر ملایا۔ ”سوری یار! میں باتھ روم میں تھا، ہاں بول کیا بات ہے؟“ آنند نے تولئے سے سر رگڑتے ہوئے کہا۔

”بس تو ابھی میرے پاس آ جا!“ سنیل نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روکھے انداز سے کہا۔

"سنیل آر یو او کے مائی فرینڈ" آنند پریشان ہو کر بولا۔

"بس تو آجا، اور ہاں گھر نہیں، میں کالج کے پاس ہوں، ذرا جلدی سے آجا!" سنیل یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"میں بس ابھی آیا۔" کہہ کر آنند نے کپڑے پہنے اور گاڑی لے کر نکل گیا۔

آنند جب کالج کے پاس پہنچا تو سنیل کو وہاں موجود پایا پھر سنیل چلتا ہوا اس کی برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

"چل!" اس نے کہا۔

"کہاں چلنا ہے کچھ بول تو سہی!" آنند جھنجھلا گیا۔

"تو گاڑی بڑھا میں بتاتا ہوں۔" اور آنند نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی جب سنیل نے رکوائی تو وہ ایک اونچائی کے پاس تھی۔ "یہاں کیا کام ہے تجھے؟ سنیل آخر ہوا کیا ہے؟" آنند نے نظریں سامنے جمائے ہوئے پوچھا۔

"تیری موت کا سبب ہوا ہے۔" سنیل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اور آنند کو گھورنے لگا۔ "مذاق چھوڑ۔" آنند نے جو سنیل کی طرف دیکھا تو اس کی ہنسی کو اچانک بریک لگ گئے اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کیونکہ سنیل کے شانوں پر جو سر تھا وہ تو کوئی اور ہی چہرہ تھا بے حد خوفناک کسی جانور نما چیز کا۔

سنیل نے اپنا ہاتھ بڑھا کر آنند کا گلا دبانا شروع کر دیا۔

"چھو..... چھوڑ مجھے!" آنند کی آواز گھٹتی جا رہی تھی اور پھر وہ بھی بند ہو گئی اور گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

سنیل نے آنند کی لاش کو اپنی جانب کھینچا اور ناخن سے اس کی آنکھ نکال کہ چبانے لگا اور پھر اس نے آنند کا سینہ چاک کر کے اندرونی عضاء کو مزے سے کھانا شروع کر دیا۔ جب اس کا کام ختم ہو گیا تو گاڑی سے باہر آ گیا اور گاڑی کی جانب نگاہ کی تو وہ خود بخود چلنے لگی اور رفتار پکڑ کر اونچائی سے نیچے جا گری اور پھر دھماکے سے گاڑی میں آگ لگ گئی۔ سنیل وہاں سے پلٹ گیا۔

موبائل کی بیل سے سنیل کی آنکھ کھلی۔ اس کا سر منوں بھاری ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے فون ریسیو کیا۔ "سنیل وہ آنند....." کہہ کر ساکشی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کیا ہوا آنند کو؟" سنیل کو ایک دم کرنٹ سا لگا۔ اور ساکشی کی کال کٹ ہو گئی۔ سنیل ایک دم بستر سے کودا اور گاڑی لے کر آنند کے گھر کے لئے نکل پڑا۔ راستے میں اس نے آنند کا فون ٹرائی کیا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ جب وہ آنند کے گھر پہنچا تو وہاں سب سفید کپڑوں میں تھے۔ وہ آنند کے پتا کے پاس آیا تو معلوم ہوا کہ آنند کی کار کو حادثہ پیش آیا۔ "اور اس کی مرتیو ہو گئی ہے۔" سنیل کا سر سائیں سائیں کرنے لگا، "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کل دوپہر میں تو ہماری ملاقات ہوئی تھی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور آنند کو یاد کر رہا تھا۔ دو ہفتے گزر گئے مگر آنند اپنے کزنز کے دل سے نہ نکل پایا۔ اس کے تینوں کزنز اس کے لئے دن رات روتے تھے۔

ایک دن مدھو ڈائننگ ٹیبل پر کسی گہری سوچ میں گم تھی، کھانا لگ چکا تھا مگر وہ کہیں اور تھی آخر مدھو کی ماں نے خود اس کی پلیٹ میں چاول نکال کر کہا۔ "لو بیٹا کھاؤ تمہاری پسند کی ڈش بنی ہے۔" اور مدھو نے خاموشی سے پلیٹ لے کر آہستہ آہستہ کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے بعد وہ اپنے روم میں آ گئی اور بستر پر لیٹ کر آنند کے بارے میں سوچنے لگی اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ روتے روتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ موبائل کی بیل مدھو کے دماغ پر لگ رہی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔ موبائل تھا کہ بجے جا رہا تھا۔ مدھو نے موبائل کی اسکرین پر دیکھا تو سنیل کا نام چمک رہا تھا۔

"ہاں بولو سنیل!" مدھو نے بوجھل آواز میں کہا۔

"مدھو یار! ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے تو جلدی سے آ!"

"کیا ہوا سنیل؟" مدھو کی نیند ایکدم سے غائب ہو گئی۔

"بس تو باہر آ، میں یہیں ہوں بس دو منٹ کی بات ہے۔" کہہ کہ سنیل نے فون کاٹ دیا مدھو بستر سے نکل کر باہر آئی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی اس نے سوچا دو منٹ کی بات ہے۔ پر کسی کو کیا بتانا۔ سب کی نیند خراب ہو گی اور مین گیٹ کھول کر باہر آ گئی۔ گھر سے دور تھوڑے فاصلے پر سنیل کار لے کر موجود تھا۔ مدھو جب قریب آئی تو سنیل بولا۔ "اندر بیٹھو۔" مدھو دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ بس اس کا بیٹھنا تھا کہ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"سنیل کہاں جا رہے ہو؟" مگر سنیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "سنیل گاڑی روکو!" مگر سنیل نے گاڑی نہیں روکی۔ "آئی سیڈ اسٹاپ دی کار!" مدھو نے غصے سے پھر کہا مگر سنیل نے نظریں سامنے کرے ہوئے کار کی اسپیڈ اور بڑھا دی اور جب راستہ ویران ہونے لگا تو اس نے ایکدم بریک لگا دیئے۔ مدھو اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھی اس کا سر زور سے سامنے ٹکرایا اور وہ چکرا کر رہ گئی۔ اس کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔ اس نے باہر نکل کر زور سے دروازہ بند کیا سنیل بھی باہر نکل آیا۔

"سنیل یہ کیا بدتمیزی ہے؟ مذاق کی بھی کوئی لمٹ ہوتی ہے۔ اس طرح مجھے یہاں لانے کا کیا مطلب ہے۔ اور وقت دیکھا ہے تم نے؟" مدھو نے غصے سے کہا۔

"بالکل صحیح وقت ہے کیوں کہ اسی سے تمہاری مرتیو ہونی ہے!" سنیل نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"بند کرو اپنا یہ گھٹیا مذاق! اور گھر چلو، وہاں کسی کو میرے آنے کا نہیں پتہ۔" یہ کہہ کر مدھو پلٹ کر گاڑی کی طرف آنے لگی۔ مگر اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ قدم آگے نہ بڑھا سکی۔ سنیل نے پیچھے سے اس کی شرٹ کھینچ لی تھی۔ مدھو غصے سے جھنجھنا گئی اس کا دل پلٹ کر سنیل کے منہ پر تھپڑ لگانے کا چاہا اور وہ جیسے ہی پلٹی۔ "لوہے کی راڈ جو کہ سنیل کے ہاتھ میں تھی زور سے اس کے چہرے پر پڑی! مدھو کا جبڑا ٹوٹ گیا اور وہ زمین پر جا پڑی اور پھر ایک لمحے کو اس کی آنکھ کھلی تو سنیل کے چہرے کی جگہ انتہائی خوفناک جانور نما چہرہ نظر آیا۔ پھر اس درندے نے ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پوری طاقت سے "مدھو کے سر پر وار کیا! مدھو کی کھوپڑی چکنا چور ہو گئی اور بھیجا باہر نکل آیا۔" پھر وہ وہیں مدھو کے قریب بیٹھ گیا اور راڈ کی جانب نگاہ کی تو وہ غائب ہو گئی پھر "اس نے مدھو کا بھیجا مٹھی میں بھرا اور کھانے لگا، بھیجا چٹ کر جانے کے بعد وہ مدھو کے سینے کو چاک کر کے اندرونی عضاء مزے سے کھانے لگا۔

اگلے دن سنیل کی ماں کے پاس مدھو کی ماں کا فون آیا کہ "مدھو وہاں تو نہیں ہے؟" سنیل کی ماں نے بتا دیا کہ "مدھو تو یہاں نہیں ہے۔ اور سنیل سو رہا ہے۔ جب وہ اٹھے گا تو میں پوچھ لوں گی۔"

تھوڑی دیر بعد ناشتہ کرتے ہوئے سنیل نے اپنی ماں سے پوچھا "مام۔ کیا باتیں چل رہی ہیں۔"

"کچھ نہیں بیٹا، مدھو کی تم سے کب ملاقات ہوئی تھی؟"

"کل شام میں ہوئی تھی، کیوں کیا ہوا؟" سنیل نے چونک کر سوال کیا۔

"بیٹا اس کی ماں کا فون آیا تھا وہ گھر پر نہیں ہے! انہوں نے ساکشی سے بھی معلوم کر لیا، وہاں بھی نہیں ہے۔"

"مام آپ نے مجھے اٹھا دیا ہوتا!" سنیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا بس ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے اور ناشتہ تو کر لو! کہاں جا رہے ہو؟" وہ جلدی سے بولیں۔

"نہیں مام! ابھی نہیں۔" کہہ کر سنیل جلدی سے نکل گیا۔ مدھو کے گھر پر ساکشی بھی موجود تھی۔ سنیل نے مدھو کے ماتا پتا سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صبح جب وہ ناشتے پر نہیں آئی تو ہم اس کے کمرے میں گئے مگر وہ کمرے میں نہیں تھی۔ سب جگہ معلوم کرلیا مگر اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا ہے۔

''آنٹی ہمیں پولیس کو انفارم کرنا چاہئے!'' سنیل نے کہا۔

پولیس نے آکر انویسٹیگیشن شروع کردی، مدھو کے موبائل کا ریکارڈ چیک کیا مگر موبائل کی میموری بالکل خالی تھی نہ کسی کال کا ریکارڈ تھا نہ میسج کا۔

تین دن بعد پولیس اسٹیشن سے کال کرکے ان لوگوں کو بلایا گیا۔ مدھو کے ماتا پتا کے ساتھ سنیل بھی چلا گیا۔ وہاں سے ان لوگوں کو انسپکٹر اپنے ساتھ ایک جگہ لے کر آیا۔ وہاں بھی کافی پولیس موجود تھی۔ ''دیکھئے مسٹر مہر! آپ ہمت سے کام لیں! دراصل پولیس کو ایک لڑکی کی لاش ملی ہے اور آپ کو کنفرم کرنے کیلئے بلوایا ہے۔ آیا یہ مدھو ہے یا نہیں؟'' ان تینوں کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ مشکل سے وہ لاش کے قریب گئے۔ ''لاش کی حالت انتہائی خراب ہورہی تھی! اس میں سے سڑاند اٹھ رہی تھی اور گوش کو مردہ خوروں نے نوچ لیا تھا، لڑکی اوندھے منہ پڑی تھی۔

جب لاش کو سیدھا کیا گیا تو اس کو دیکھ کر مدھو کی ماں زمین پر بیٹھتی چلی گئی اور اس کے پتا نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا، چہرے پر گوشت موجود تھا مگر سر کا کچھ حصہ نکلا ہوا تھا، جبڑا ابھی ٹوٹ کر الگ ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں میں خوف، حیرت، التجا تھی۔

مدھو کی ماں دھاڑے مار مار کر رو رہی تھی۔ انسپکٹر نے انہیں وہاں سے گھر جانے کا کہا اور لاش کو کارروائی کے لئے بھجوادیا۔

مدھو کو گزرے مہینے سے اوپر ہونے والا تھا۔ ساکشی لان میں ڈلے جھولے میں بیٹھی اپنی پرانی یادوں کو تازہ کررہی تھی اور آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ سنینا سے اپنی بہن کی یہ حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ ساکشی دیدی؟ کہاں ہیں آپ؟ یہ میں آپ کے لئے بنا کر لائی ہوں اور آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں اور آپ یہاں ہیں۔ لیجئے! گرم گرم ''فرنچ فرائز''

''تم نے بنائے ہیں؟'' ساکشی نے کہا۔ ''جی عالم پناہ! کنیز نے خود اپنے ان شبھ ہاتھوں سے بنائے ہیں۔'' سنینا نے شوخی سے کہا۔ ''تو پھر بھگوان میری اور میرے پیٹ کی رکشا کرے!'' ساکشی نے چپس منہ میں ڈالتے ہوئے کہا اور دونوں کھل کھلا کر ہنسنے لگیں۔

سنیل کا انداز کچھ عجیب سا ہوگیا تھا۔ سنیل جو گھر میں ٹکتا ہی نہیں تھا، وہ اب گھر تو کیا کمرے سے باہر بھی نہیں نکلتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ ٹھک، ٹھک، ٹھک کسی نے دروازہ ناک کیا، سنیل نے کوئی دھیان نہیں دیا اور لیٹا رہا۔ دروازہ دوبارہ ناک کیا گیا، سنیل نہیں اٹھا۔ جب تیسری مرتبہ جب دروازہ زیادہ زور سے ناک ہوا سنیل نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں اس کی گڑیا بہن نندنی کھڑی تھی۔ مگر اب وہ گڑیا نہیں رہی تھی وہ تو ساڑھی میں ملبوس، بالوں میں پھولوں کی لڑیاں سجائے، مانگ میں سیندور بھرے، ہاتھوں میں چوڑیاں اور گہنے پہنے نئی نویلی دلہن بنی کھڑی تھی۔ ''سنیل بھیا میں صبح سے آئی ہوئی ہوں مگر آپ میرے پاس آئے تک نہیں۔ کیوں اتنی جلدی بھلا دیا اپنی گڑیا کو؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''تم چلو میں آتا ہوں۔'' سنیل نے نارمل انداز سے کہا۔ نندنی حیران رہ گئی کہ یہ وہی سنیل ہے جو شادی کی بات شروع ہونے پر ہی اس سے لپٹ کر رویا تھا، جو ایک لمحہ اس کی جدائی برداشت نہیں کرتا تھا۔ نندنی تو نیچے آگئی مگر سنیل نہیں آیا۔ نندنی انتظار ہی کرتی رہ گئی۔ رات جب دوبارہ اسے کھانے کے لئے بلایا گیا تو وہ نیچے آیا۔

''سنیل آؤ! بیٹھو بیٹا! دیکھو تمہاری گڑیا نے تمہارے لئے اپنے ہاتھوں سے پوریاں بنائی ہیں۔'' سنیل نے پوری اٹھا کر خاموشی سے کھانا شروع کردیا۔ نندنی کی نظریں اپنے بھائی پر تھیں کہ وہ اس کی تعریف

کرے گا۔ مگر سنیل خاموشی سے منہ چلائے جارہا تھا۔ ''بھیا کیسی بنی ہیں پوریاں؟''

آخر نندنی کے صبر کا بان ٹوٹ گیا۔ ''ٹھیک، سنیل نے روکھے سے انداز میں جواب دیا۔ اور کھانا ختم کرکے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ''ماں بھیا کو کیا ہوا ہے؟'' نندنی نے پریشانی سے کہا۔

''بیٹا! اتنے گہرے دوست جدا ہوگئے اس کے وہ بھی ایک کے بعد ایک پہلے آنند پھر مدھو۔ کچھ وقت تو لگے گا ناں اس کو اس صدمے سے باہر آنے میں۔'' اور نندنی نے گردن ہلائی اور کھانا کھانے لگی۔

نندنی کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر نہیں تھی، جب اس نے غور کیا تو وہ کسی کچے حصے پر پڑی تھی سامنے ہی اسے سنیل نظر آیا۔ ''اچھا تو شام کی غلطی کا احساس کرکے اب آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ ''بڑا مزہ آتا ہے ناں اپنی گڑیا سے چھیڑ چھاڑ کرکے؟'' نندنی نے معصومیت سے سنیل کے کندھے سے لگ کر کہا۔ اور جب اس نے منہ اٹھا کر سنیل کی طرف دیکھا تو!

وہاں تو سنیل کی جگہ کوئی درندہ تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ سنیل نے اس کی ساڑھی کا پلو سختی سے پکڑ لیا۔ ایک درندے کے سامنے اس کی حالت پہلے ہی خراب ہورہی تھی۔ پھر اس نے اپنی پوری طاقت لگا کر اپنی ساڑھی کو کھینچا اور دوسری طرف سنیل نے بھی پلو چھوڑ دیا۔ نندنی پیچھے جا پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی سنیل اس کے سر پر پہنچ گیا۔ خوف سے نندنی کی جان نکل رہی تھی۔ سنیل نیچے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ نندنی گھسٹ گھسٹ کر پیچھے ہونے لگی۔ سنیل نے اپنے دونوں ہاتھوں کے ناخن نندنی کی پنڈلیوں میں پیوست کردیئے۔ تکلیف کی شدت سے نندنی کی چیخیں نکل گئی۔ سنیل نے پنڈلیوں پر سے گوشت ادھیڑنا شروع کردیا۔ نندنی نے ہمت کی اور ایک لات اس درندے کے ماری تو وہ پیچھے گر گیا۔ نندنی بڑی مشکل سے اٹھی اور بھاگنے لگی۔ مگر اس کی ساڑھی پر اس درندے نے پیر رکھ دیا۔ نندنی منہ کے بل زمین پر گر گئی پھر اسے گدی میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوئیں اور اس درندے نے نندنی کی گردن پیچھے موڑ دی کٹ کی آواز آئی نندنی ڈھیر ہوگئی۔ سنیل نے نندنی کے دونوں پیر پکڑے اور اسے گھسیٹتا ہوا اندھیرے میں لے گیا۔

کوئی تھا جو سنیل کو زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ یہ سنیل کی دوست ساکشی تھی۔ ''سنیل اٹھو آنٹی کی حالت بہت خراب ہورہی ہے!''

''مگر تم اس وقت یہاں؟ اور مام کو کیا ہوا ہے؟'' سنیل گھبرا گیا۔

''تم نیچے تو چلو سنیل شرٹ پہن کر نیچے آیا تو وہاں بہت رش تھا، محلے کے لوگ بھرے ہوئے تھے۔ وہ چلتا ہوا باہر آیا تو پولیس نظر آئی۔ جب وہ آگے بڑھا تو زمین پر نندنی کا مردہ وجود پڑا تھا، اس کی ساڑھی ایک جانب تھی گٹھری کی صورت میں جس کے اوپر نندنی کا سر پڑا تھا اور باقی.....

سنیل وہیں چکرا کر گر گیا، صبح سنیل کے پڑوسیوں کا بچہ اپنی بال لینے اس طرف گیا تھا اس نے سب کو بتایا اور پڑوسیوں نے پولیس کو انفارم کیا۔ جب پولیس آئی تو سنیل کے گھر والوں کو اطلاع دی۔ مدھو کی طرح نندنی کی موت کا کارن کسی کو نہ پتا چل سکا۔ اس کی رسومات جاری تھیں اور خاندان بھر کے لوگ سوگ میں آرہے تھے۔ ان میں ایک بہت اہم شخصیت ''تلسی داس'' کی تھی۔ وہ سنیل کے دادا کے زمانے کے تھے، بہت گیانی اور پہنچے ہوئے تھے گاؤں کے بڑے مندر میں رہا کرتے تھے۔ جب وہ آئے تھے سنیل کا ان سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ ایک رات رک کر انہوں نے سنیل کے ماتا پتا سے کہا۔ ''ابھی مجھے شما کرو! میں اپنا ایک کام ختم کرلوں تو واپسی پر ضرور رکوں گا'' اور چلے گئے۔

ساکشی کو نیند آنے لگی تو وہ سنینا کے پاس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سنینا بھی سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ موبائل کی بیل بجی اسکرین پر سنیل کا نام نظر آ رہا تھا۔ ''ہیلو! ساکشی؟ نہیں میں سنینا!'' اس نے کہا۔

''ہوں!..... اچھا چلو ساکشی نہیں تو تم ہی سہی'' سنیل نے عجیب بات کہی۔

''جی! کیا مطلب ہے آپ کا؟'' سنینا نے چونک کر کہا۔

''ارے بھئی! میں دروازے پر کھڑا ہوں۔ گیٹ کھلوانے کے لئے کال کی تھی اب ساکشی نہیں تو تم ہی کھول دو گیٹ۔''

''اچھا تو یوں کہیں ناں! آتی ہوں!'' سنینا ہنستے ہوئے گیٹ کھولنے چلی گئی۔ جیسے ہی اس نے گیٹ کھولا ایک زبردست قسم کا گھونسا اس کے منہ پر پڑا!! اور وہ پیچھے جا پڑی۔ سنیل نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کا منہ دبا کہ بند کر دیا اور اسے کھینچتا ہوا اس کے کمرے میں لے جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ سنیل نے اس کے منہ میں سامنے ٹیبل پر پڑے پیپرز ٹھوس دیئے اور دھکا دے کر اسے بستر پر پھینک دیا۔ اور اس کو پلٹ کر اس کی کمر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ سنینا کا دم نکل رہا تھا۔ پھر اس درندے نے اس کے ہاتھ کمر پر دوپٹے سے باندھ دیئے۔ اور سنینا کے چہرے کے قریب آ گیا۔ سنینا کی دل کی دھڑکن بند ہونے کے قریب تھی کیوں کہ یہ سنیل نہیں کوئی درندہ تھا بہت بھیانک! اس نے سنینا کے بالوں کو جھٹکا دے کر اس کی گردن اوپر کی، پھر اس کی گردن پر زبان پھیری اور دانتوں سے اس کا گلا ادھیڑنے لگا، سنینا چھڑک رہی تھی اور خون خرخر کی آواز کے ساتھ فوارے کی مانند اس کے گلے سے نکل کر بیڈ کو بھگو رہا تھا۔ پھر چند لمحوں میں وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ سنیل نے اس کو دھکیل کر بیڈ پر پھینکا اور خود اس پر ٹوٹ پڑا۔

ساکشی کے ماتا پتا صبح گھر آئے تو ساکشی نے گیٹ کھولا۔ ''کیسی ہو بیٹا سب ٹھیک ہے؟'' انہوں نے ساکشی کو پیار کیا ''اور وہ کہاں ہے۔''

کون ''زلزلہ'' ساکشی نے ہنستے ہوئے کہا ۔''اپنے روم میں ہے مام میں بلاتی ہوں!'' پھر ساکشی کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس کے ماتا پتا دوڑ کر گئے تو ان کے اوسان بھی خطا ہو گئے، سامنے بیڈ پر خون ہی خون تھا جو جم گیا تھا اور گوشت کے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے اور سنینا.....

تلسی داس جب سے سنیل کے گھر گئے تھے ایک عجیب نامعلوم سی بے چینی انہیں ہو رہی تھی، ان کا من بہت بھاری ہو رہا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے استھان پر بیٹھ کر اپنے گیان کی آنکھ کھولی اور پھر انہوں نے لرز کر آنکھیں کھول دیں۔ ''سنیل میرے بچے!'' وہ اتنا کہہ پائے اور سب برباد کئے بغیر ترنت سنیل کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے سنیل کے ماتا پتا کو ساتھ لیا اور کمرہ بند کر لیا۔ ''بات کیا ہے! بڑے باؤ جی؟'' سنیل کے پتا نے سوال کیا۔

''پتر جو بات اب میں کرنے جا رہا ہوں اسے تم دھیان سے سنو۔ ''یہ جو ساری مرتیوں ہوئی ہیں، یہ کوئی قتل یا حادثہ نہیں ہے۔ یہ شیطانی کھیل ہے۔ جو شروع ہو گیا ہے نہ رکنے کے لئے!''

''میں سمجھا نہیں بڑے باؤ جی۔'' سنیل کے پتا بولے۔

''دراصل ایک شیطانی بلا ہے جو سنیل کے ساتھ لگ کر یہاں آ گئی ہے۔ جلانے والے نے اپنی کوشش کی تھی مگر وہ چیز پوری طرح نشٹ نہ ہوئی اور خون ملنے سے اپنی حد سے باہر آ کر آزاد ہو گئی۔'' وہ رک کر پھر بولے۔ ''اس کے خون کی پیاس کبھی نہ بجھنے والی ہے۔ ہر اماوس کی رات کو ایک نوجوان خون اور گوشت اس شیطانی بلا کی طلب ہے۔ وہ بھی کبھی نہ ختم ہونے والی۔ پہلے تمہارے خاندان کے بچے، پھر آس پاس کے پھر اس کے آگے..... یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے کبھی نہ ختم ہونے کے لئے۔ اور اس کا شکار سنیل ہو گیا، یہ خود اس بارے میں بے خبر ہے۔ یہ تو بس اس شیطان کے حکم کی

پابندی کرتا ہے جو اس کے وجود میں سما جاتا ہے۔ اور ایک شریر اس کے لئے سات شکار کرتا ہے۔ سات اماوس تک پھر اس شیطانی بلا کا بوجھ اس شریر سے بھاری ہو جاتا ہے اور وہ اسے ختم کر دیتی ہے۔ یعنی سنیل نے اگر سات..... نہیں نہیں!!

''میرا بچہ سنیل'' اس کی ماں رونے لگی۔

''کچھ نہیں ہو گا بہو! ہم اپنے سنیل کو کچھ نہیں ہونے دیں گے۔'' پھر وہ اٹھ گئے ''چلو!'' اور سنیل کے کمرے میں چلے گئے۔

سنیل کو انہیں دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔ اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''کیوں سنیل ہم آئے ہیں تم سے ملنے اور تم دور بھاگ رہے ہو کیوں بھئی۔'' انہوں نے سنیل سے نارمل انداز سے کہا۔

''جی وہ، جی نہیں۔'' سنیل سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑ رہا تھا۔

''اچھا چھوڑو، چلو یہ لو! یہ ہم تمہارے لئے لائے ہیں۔'' انہوں نے ایک ''سنہرا کلش'' سنیل کی اور بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں چاہئے یہ!'' سنیل نے قدم اور پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

انہوں نے مسکرا کر سنیل کو دیکھا اور کلش میں ہاتھ ڈال کر پانی چلو میں لیا اور اس کو سنیل کے گرد چھڑکنے لگے۔ اور پورا چکر لگا کر اس کے گرد حصار بنا دیا۔

سنیل کو لگا کہ اس کے چاروں طرف آگ کی تپش ہو رہی ہے جو اس کی برداشت سے کہیں زیادہ تھی۔

''سنیل کیا ہوا بیٹا؟ یہ تو ''پوتر جل'' ہے!''

''مجھے نہیں پتا، بس میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' اس نے اپنا گلا پکڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا ایسا کر بیٹا کہ تو مجھے ''وہ دے دے میں تجھے یہاں سے جانے دوں گا!'' انہوں نے سنیل کے گلے میں پڑے لاکٹ کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' سنیل نے اپنے لاکٹ کی جانب ہاتھ بڑھانا چاہا مگر اس کے ہاتھ نے ایک انچ بھی حرکت نہ کی، اس نے دوبارہ کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا، اس نے پھر کوشش کی مگر اس کے ہاتھ نے حرکت نہیں کی۔ اس نے بے بسی سے تلسی داس کی جانب دیکھا۔ وہ چند لمحے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے رہے اور قدم سنیل کی طرف بڑھانے لگے۔ انہوں نے اپنی مٹھی میں موجود سیندور کو سنیل کے گلے میں پڑے کالے ڈورے پر چھڑکا تو وہ خود بخود کھل کر نیچے گر گیا۔ لاکٹ ابھی پوتر جل کے حصار میں تھا۔

''سنیل بیٹا! تم باہر آ جاؤ۔'' انہوں نے سنیل کو حکم دیا۔ سنیل حصار سے باہر قدم رکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر گیا۔

سنیل کے ماتا پتا آگے بڑھنے لگے تو انہوں نے اشارے سے منع کر دیا۔ پھر انہوں نے سنہرا کلش حصار کے باہر رکھا اور خود آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے فضا میں ہاتھ بلند کیا اور منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے مٹھی بند کر لی، پھر وہ اپنا ہاتھ نیچے لائے اور مٹھی میں موجود چیز کو اس لاکٹ پر چھڑک دیا۔ وہ کوئی مٹی تھی اور اس کا لاکٹ پر گرنا تھا کہ لاکٹ کا رنگ سرخ ہو گیا اور اس پر بنی شکل جیسے سانس لینے لگی۔ تلسی داس نے وہ کلش اٹھایا اور ہولے ہولے اس کو لاکٹ پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ پوتر جل کا لاکٹ پر پڑنا تھا کہ اس میں آگ بھڑک اٹھی۔ اور وہ جلتا رہا اور جل کر راکھ ہو گیا۔

تلسی داس نے پلٹ کر سنیل کے ماتا پتا کو دیکھا اور انہیں ان باتوں کو سنیل کو بتانے سے منع کر دیا کیونکہ سنیل کو اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اور پھر وہ واپس چلے گئے۔

تھوڑے دن بعد سنیل اور ساکشی کا وواہ ہو گیا اور دونوں آج بھی اپنے دوستوں کو اور سنیل اپنی بہن اور ساکشی اپنی بہن کو یاد کرتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موت کی لوری

صائمہ حمید۔راولپنڈی

اپنی جگہ بیٹھی ہوئی عورت کے گرد اچانک دھواں پھیلا پھر جب دھواں چھٹا تو وہ عورت چنگاری میں اور پھر بھڑکتے ہوئے شعلے میں تبدیل ہوگئی وہ شعلہ باہر کو لپکا اور سڑک پر موجود اوباش لڑکوں کو جلاکر خاکستر کردیا۔

خوف کے شکنجے میں جکڑی ہوئی دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی.....لرزہ خیز کہانی

میں لاہور شہر میں ملازمت کے سلسلے میں آیا تھا۔ جہاں اپنا گھر تو کیا؟ کسی رشتے دار کا گھر بھی نہ تھا۔ اس لئے میں نے رہائش کیلئے جگہ تلاش کرنی شروع کردی مجھے زیادہ وقت کا سامنا نہ کرنا پڑا اور ایک مکان مجھے بہت مناسب کرائے میں باآسانی مل گیا۔ مکان کافی پرانا اور خستہ حالت تھا، ایسے جیسے یہاں صدیوں سے کوئی آباد نہ ہوا ہو۔ لیکن مجھے اس چیز سے کوئی مطلب نہ تھا۔ مجھے تو بس رہائش کے لئے جگہ چاہیے تھی۔ چاہے وہ نئی ہو یا پرانی۔ خیر جب میں اس مکان میں شفٹ ہونے لگا تو محلے میں اس مکان کے پاس پڑوس کے لوگ مجھے روک کر طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔

"صاحب! آپ اس مکان میں رہیں گے.....؟"

ایک عمر رسیدہ مزدور آدمی نے کہا۔

"ارے یہ مکان تو آسیبوں کا ٹھکانہ ہے۔"

ایک پاس سے گزرتی ہوئی بوڑھی عورت بولی۔

"بھئی اس مکان میں رہنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ آدھی رات کو یہاں لوری اور سسکیوں کی عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں، اور اکثر لوگ ترس کھا کر اندر چلے جاتے ہیں کہ شاید کوئی مشکل میں ہے اور مدد کا طلب گار ہے۔ لیکن اندر جانے کے بعد بھی کوئی واپس نہیں آیا اور اگر آیا بھی تو چیتھڑے ہوئی لاش کی صورت میں یوں لگتا ہے جیسے بڑی بے رحمی سے کسی نے اس انسان کو مار ڈالا ہے۔" ایک نوجوان لڑکے نے باقاعدہ میرے بہت قریب آکر کہا۔

"آپ اس میں رہنا بھی نہیں، ورنہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے میرے کئی دوست اِس تجسس میں کہ آخر یہ کیا چکر ہے؟ اندر گئے لیکن مرے ہوئے اس مکان کے باہر کے دروازے پر پائے گئے۔"

میں حیران و پریشان اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟ مجھے تو یہاں رہائش چاہئے۔" میں پریشان ہوکر بولا۔

"آپ اگر ایک آدھ دن ہمارے ہاں قیام کریں، میں اپنے گھر والوں سے بات کرلیتا ہوں پھر آپ اپنا کوئی اور بندوبست کرلینا۔" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ لیکن مجھے کچھ سازش سی محسوس ہوئی کہ کہیں نوجوان لڑکے کی میرے سامان پر تو نظر نہیں ہے۔ میرے پاس ایک بیگ اور ایک بریف کیس تھا جس میں اپنے اخراجات کے لئے میں نے ٹھیک ٹھاک کیش رکھا

ہوا تھا۔

"یار میں سارا شہر گھوم چکا ہوں۔ کرائے اور جگہ کے لحاظ سے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔" میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"بہت پچھتاؤ گے بھائی صاحب۔" وہ کہنے لگا۔

"یار میں تو مالک مکان کو ایڈوانس کی رقم بھی دے چکا ہوں اور چوکیدار سے بھی مل چکا ہوں۔"

"کیا.....؟" وہ حیران ہوکر بولا۔

"بھائی یہ سب نظر کا دھوکہ ہے یہاں کوئی مالک مکان یا چوکیدار وغیرہ نہیں۔" وہ بولا۔

مجھے لڑکا واقعی سازشی لگا کیونکہ میں ان لوگوں سے دن میں بات کرچکا تھا یہاں یہ الگ بات ہے کہ اس دوران مجھے کسی نے دیکھا نہ تھا۔

"بھئی آج کے دور میں یہ سب باتیں دقیانوسی مانی جاتی ہیں۔ تم اب جاؤ اور اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔" میں اس کے کندھے پہ تھپکی دیتے ہوئے کچھ بے زار سا ہوکر بولا۔ "ویسے بھی میں ایڈوانس کی رقم دے چکا ہوں۔"

"بھائی آپ کی اپنی مرضی ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ اب بھی مجھے سمجھا رہا تھا۔ لیکن میں نے اسے نظر انداز کیا اور چابی سے تالا کھول کر مکان کے اندر چلا گیا۔

شام میں میری آنکھ کھلی، مجھے بھوک محسوس ہوئی۔ کیونکہ یہاں آنے کے ساتھ تھکاوٹ کی وجہ سے میں ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھا اور پھر میں سو گیا تھا۔ بھوک کی شدت جب زیادہ محسوس ہوئی تو میں اٹھا اور کچھ تلاش کرنے لگا۔

کچن جلد ہی مل گیا، اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ کچن میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی، میں نے پانی پیا اور پھر فریج میں سے کچھ فروٹ وغیرہ نکال کر کھائے۔ تھوڑی سی طبیعت بحال ہوئی تو میں نے سارے گھر کا جائزہ لیا۔ تین کمرے، ڈرائنگ روم اٹیچڈ باتھ کے ساتھ کچن، لان، گیلری، فرنٹ ڈور ٹھیک ٹھاک زبردست مکان تھا۔ ہر کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ مکان ٹھیک ٹھاک آباد لگ رہا تھا۔ باہر کے منظر سے تو یہی لگ رہا تھا کہ یہاں سالوں سے کوئی نہیں آیا اور یہ مکان خالی ہے۔ بہرحال میں نہا دھو کے فریش ہوا۔

"جن بھوت، لوری کی آواز، خوفناک ڈراؤنی سسکیوں کی آوازیں۔ ان باتوں سے تو یوں لگتا ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ لوگ مجھے بیوقوف بنا کر شاید یہاں سے بھگانے کی کوشش کررہے تھے۔'' میں سوچتے ہوئے مسکرایا۔

تھوڑی دیر بعد شام گہری ہونے لگی ہر طرف اندھیرا چھانے لگا، میں نے ٹی وی آن کیا اور آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ ادھر ادھر ریموٹ دیکھا پر نظر نہ آیا۔ میں وہی پروگرام دیکھنے لگا جو کے ٹی وی میں نظر آرہا تھا۔ ایک رومینٹک سین چل رہا تھا۔ مجھے فوراً اپنی بیوی نادیہ کی یاد آگئی۔ جو آبائی گاؤں میں میرے ایک بیٹے اور بیٹی کے ساتھ اور باقی فیملی کے ساتھ تھی اور میں یہاں لاہور ملازمت کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ شادی شدہ جوڑے کا سین تھا۔ محبوبہ اپنی نرم و نازک انگلیاں محبوب کے سر میں پھیرتے ہوئے اسے سلا رہی تھی۔

دِن ڈھلا رات پھر آگئی سو رہو سو رہو
منزلوں پر چھا گئی خاموشی سو رہو سو رہو
سارا دن تپتے سورج کی گرمی میں جلتے رہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھر چلی سو رہو سو رہو
دور شاخوں کے جھرمٹ میں جگنو بھی گم ہوگئے
چاند میں سوگئی چاندنی سو رہو سو رہو

عورت اپنے شوہر کے پہلو میں نیم دراز ہونے لگی اور ساتھ ہی پروگرام ختم ہوگیا۔ تو میں سوچنے لگا کہ کرائے کے لئے دیئے جانے والا مکان ایسا ہے جیسے کرائے کے اس مکان میں یہ لوگ خود بھی آباد ہیں۔ کیا پتہ مجھے کہیں اور جگہ دیں۔ فی الحال یہاں رہنے کو کہا۔ خود مالک مکان مجھے چابی دے کر رات کا آنے کا کہہ کر چلا گیا تھا۔ خیر میں کافی تھک چکا تھا سو میں نے ٹیلی ویژن کا سوئچ آف کیا اور کمرے میں جا کر سوگیا۔ میں کافی پرسکون تھا۔ لیٹتے کے ساتھ ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں نے خواب میں دیکھا۔

عجیب سا علاقہ ہے جیسے کہ کوئی جنگل جہاں سے عجیب قسم کی لوری کی آوازیں آرہی ہیں میں نے غور کیا۔

گرم سنسان منزلوں کی دھرتی مہکنے لگی
خاک رشک ارم بن گئی سو رہو سو رہو
رزم گاہ جہاں بن گئی سور ہو سو رہو
ہے یہی وقت کی راگنی سو رہو سو رہو
کیسا سنسان آسمان چپ کھڑے ہیں مکان
ہے فضا اجنبی اجنبی سو رہو سو رہو
تھک گئے ناقہ و ساربان تھم گئے کارواں
گھنٹیوں کی صدا سوگئی سو رہو سو رہو

عجیب سا دہشت پھیلاتا، اور خوف وہراس پیدا کرتا منظر تھا۔ میری ایک دم آنکھ کھل گئی۔ لائٹ جا چکی تھی۔ کمرے میں جو زیرو کے بلب کی روشنی تھی وہ بھی ختم ہوچکی تھی۔ میں نے بستر پر ادھر ادھر ٹٹول کر دیکھا ٹارچ لائٹ نہ جانے کدھر تھی۔ کمرے کے روشندان سے کچھ روشنی اندر آرہی تھی۔ میرے دل کو تھوڑا سکون تو ہوا لیکن تھوڑا غور کرنے پر میں نے محسوس کیا کہ ''وہ لوری، وہ آوازیں میرے خواب کا حصہ نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ ڈرائنگ روم سے لوری کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید میں بے دھیانی میں ٹیلی ویژن بند کرنا بھول گیا تھا۔ اور پھر وہی پروگرام دوبارہ لگا ہوا ہے اور خواب میں بھی مجھے ویسے ہی لوری کی آوازیں آرہی تھیں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے میں نے اٹھ کر ٹی وی بند کرنا بھی گوارا نہ کیا۔

اچانک میرے دماغ میں آیا کہ جب لائٹ بند ہے تو ٹیلی ویژن کیسے آن ہوسکتا ہے۔ اب بھی آوازیں بدستور آرہی تھیں بلکہ اب بڑھنے لگیں تھیں۔

''کہیں یہاں کے لوگ مکان کے بارے میں ٹھیک تو نہیں کہہ رہے تھے۔'' سوچتے ہی میں چند لمحوں میں پسینے میں ڈوب گیا۔ پھر حوصلہ اکٹھا کیا اور سوچا کہ شاید مالک مکان آگیا ہوگا اور اس نے ٹی وی لگایا ہوگا۔ شاید لائٹ بھی آگئی ہے۔ میں نے فوراً اٹھ کر لائٹ چیک کی لائٹ ابھی بھی بند تھی۔ مالک مکان ابھی تک نہیں آیا تھا۔

میں خوف کے مارے پسینے میں شرابور تھا۔

کمرے سے باہر ڈرائنگ روم میں مجھے روشنی کا احساس ہوا اور مجھے لگا کہ اب واقعی مالک مکان آگیا ہے۔ میں دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا۔ لیکن وہاں اندھیرا تھا۔ میرے کمرے کے سامنے والے کمرے سے آوازیں آرہی تھیں۔ روشنی بھی اسی سمت سے آرہی تھی۔ میں خوف کی حالت میں دبے دبے پاؤں اس کمرے کی طرف بڑھا اور آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے کمرے کے دروازے تک جا پہنچا آوازیں کمرے کے اندر سے مسلسل آرہی تھیں۔ مجھ میں دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ بالآخر اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہوئے میں نے دروازہ کھول دیا۔

''چاندنی اور دھوئیں کے سوا دور تک کچھ نہیں
سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو''

رات ٹیلی ویژن پر سارا منظر کمرے میں براہ راست میرے سامنے تھا۔

''یا اللہ! یہ سب کیا چکر ہے۔''

میری ٹانگیں خوف سے کانپنے لگیں پھر ایک خیال نے ذرا سنبھالا کہ ''ممکن ہے کہ ان لوگوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور ٹی وی جب میں نے آن کیا تو وہی مووی چل رہی تھی۔ کسی نے چیک کرنے کے لئے لگایا ہوگا۔ پھر خیال آیا وہ تو بیڈ روم کا منظر تھا اور وہ شاعری۔'' میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ وہ ٹی وی والی عوت جو سرتاپا سرخ جوڑے میں ملبوس زیور سے لدی تھی فوراً میرے پاس آئی اور مسکرا کر کہنے لگی۔

''آیئے تشریف لایئے..... آپ بھی ہماری خوشی کا حصہ بنئے۔'' وہ بڑے دلبرانہ انداز میں کہنے لگی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے نقوش کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ بے پناہ حسن کی مالک۔ میری نظریں چند لمحے کے لئے اس پر ٹک کر رہ گئیں۔

میں نے فوراً اپنے دماغ کو جھٹکا اور حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ ''یہ سب کیا ہے؟''

میں نے غور کیا کہ عورت کے ساتھ موجود مرد مالک مکان تھا اور وہ فلم بھی ان دونوں کی تھی۔ مگر میں نے ٹی وی دیکھتے وقت اتنا غور نہیں کیا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ کاروباری لوگ ہیں۔ پہلے فلم دکھا کر اگلے کی ذہن کو گندگی کی طرف مائل کرتے ہیں اور پھر اپنا اصلی روپ سامنے لے آتے ہیں اور اپنا گھٹیا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتی ہو؟''

''جان ابھی بھی تم نہیں سمجھے تو پھر کب سمجھو گے؟'' وہ بہت ہی دلبرانہ انداز سے میرے گلے کے گرد اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہنے لگی۔

گردشِ وقت کی لوریاں رات کی رات میں
پھر کہاں یہ ہوا، یہ نمی سو رہو سو رہو

اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھ میرے کندھوں سے کمر تک پھیرے، میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، اس کا بے پناہ حسن جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کرچکا ہوں کہ اس کے حسن کو بیان کرنے سے میں قاصر ہوں۔ عجیب متوحش کرنے والا حسن۔

لیکن اچانک ہی میں میرے دل میں خدا کا نام آگیا اور میں نے اپنے جسم سے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر ہٹایا اور اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا۔ اور غصے سے بولا۔

''گھٹیا عورت تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ میں صرف اور صرف اپنی بیوی سے پیار کرتا ہوں۔ جو میری شرعی بیوی ہے۔ جو میرے نکاح میں ہے اور میرے بچوں کی ماں ہے اور بس۔'' میں نے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

اکثر ایسے موقعوں پر یہی کہا جاتا ہے کہ مرد بہک جاتے ہیں لیکن میرے ساتھ شیطان کے شر سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ تھی جو میں ہر وقت اللہ سے پناہ مانگتا تھا۔ کیونکہ اپنی ذرا سی غلطی سے آج سے چند سال پہلے میں اپنی وفاشعار بیوی کو دھوکہ دے چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اللہ کی مہربانی سے میں کسی بڑے گناہ سے بچ گیا تھا اور آئندہ کے لئے میں نے توبہ کرکے اپنے آپ کو مزید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گناہگار ہونے سے بچالیا تھا۔

"تم تو نابلہ مرد نکلے اپنی بیوی کے پاس جا کر تم کیا کرتے ہو گے؟" وہ زور سے ہنس کر بولی۔

"جس کے لئے مجھے مرد بننا ہے وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہے اور میرے لئے یہی کافی ہے۔ تم جیسی گھٹیا عورت کے لئے میں نابلہ مرد ہی اچھا ہوں۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ میرے سینے سے لگ کر مجھے چومنے لگی۔ تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور میں نے فوراً اس کی چٹیا زوردار انداز میں کھینچ ڈالی تو وہ بلبلا اٹھی۔

"چھوڑو..... خدا کے لئے مجھے چھوڑو۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"منہ بند کرو اپنا اور اپنی گندی زبان سے خدا کا نام مت لو۔" میں غصے سے بولا۔ اب کی بار وہ آدمی بھی بستر سے اٹھ آیا۔ میں نے عورت کو دھکیلا تو عورت نیچے گر پڑی۔ اس آدمی نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ لیکن اس عورت نے بڑی عجیب سی بات کہی "مولا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کتنے سالوں سے مجھے کسی نیک انسان کی تلاش تھی۔ آخر وہ مجھے آج مل ہی گیا۔"

ساتھ ہی فجر کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ ایک دم کمرے میں دھواں سا چھا گیا۔ دونوں دیکھتے ہی دیکھتے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ "میں اب کل رات میں آؤں گی۔" کمرے میں آواز گونجی تو میں چکرا سا گیا اور بے ہوش ہو کے گر پڑا۔ جب مجھے ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی۔ ہر طرف آسمان پر سورج کی کرنیں پھیلی ہوئی تھیں۔

اٹھنے کے ساتھ ہی میں رات کے واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہاں کے لوگ اس مکان کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ رہے تھے کیا وہ سب سچ تھا کیونکہ بے ہوش ہونے سے پہلے کا منظر کچھ ایسا ہی اشارہ کر رہا تھا۔ لیکن میں پھر زندہ کیسے بچ گیا۔ یہ کیا راز ہے؟"

کیونکہ لوگوں کے کہنے کے مطابق آج صبح تک میری لاش مکان کے گیٹ پر بری حالت میں پڑی ہونی چاہئے تھی۔ لیکن میں زندہ ہوں اور فوراً سے پہلے مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے۔" میں سوچنے لگا۔

"نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا، یہاں جو بھی آیا اگلے دن مرا ہوا ملا اس کا کوئی راز ہے اور میں بھی آیا لیکن زندہ ہوں اس بات کے پیچھے بھی کوئی گہرا راز ہے۔ میں یہ راز جان کر ہی دم لوں گا اور اس کے لئے میرا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔"

مالک مکان ابھی تک نہیں آیا ہے۔ بس رات یا اس سے پہلے ٹی وی کے منظر میں اس کو دیکھا تھا۔ جگہ کے حوالے سے بات ہونے کے بعد سے اب تک وہ یہاں نہیں آیا تھا' میں مکان کے گیٹ سے باہر نکلا تو ارد گرد کے لوگ مجھے دیکھنے لگے۔ جیسے کسی کے انتظار میں ہوں۔ ایک بزرگ وہاں سے گزرے اور مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے۔

"بیٹے تم زندہ ہو؟" وہ عجیب گھبرائے ہوئے انداز میں بولے "بزرگو! زندہ سلامت ہوں اور آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔" میں مسکرا کر بولا۔

"لیکن آپ لوگوں کی بات میں بھی وزن ہے۔" ابھی میں نے اتنا ہی بولا تھا کہ مکان کے اندرونی حصے سے کسی چیز کے دھڑام سے گرنے کی آواز آئی اور میں بزرگ سے ادھوری بات چھوڑتے ہوئے مڑا اور مکان کے اندرونی جانب بڑھا۔ ساری جگہ دیکھ ڈالی مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ آخر کس چیز کے گرنے کی آواز تھی۔

خیر میں دوبارہ مکان سے باہر آیا اور بزرگ سے تھوڑی دیر تک بات چیت کرنے کے بعد میں اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔

سارا دن خیر خیریت سے گزرا۔ شام کو جب میں واپس آیا تو کچھ دیر آرام کیا۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ ڈھلنے لگے تو مجھے بھوک محسوس ہونے لگی میں کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لئے کچن میں گیا۔

"عجیب پراسرار مکان ہے۔ ہر چیز جادوئی سی لگتی ہے۔ خیر میں کھانے پینے کا انتظام کرنے لگا اور پھر

کھانے سے فارغ ہو کر کمرے میں جا کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ مجھے پھر عجیب عجیب سی آوازیں محسوس ہونے لگیں۔ اس کمرے سے جہاں کل والا واقعہ ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے سے دوسرے کمرے میں جہاں کل رات لوری کی آوازیں سن کر گیا تھا۔ چل پڑا لوری کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے تیز روشنی میں ایک منظر دیکھا۔ ایک پچیس سے تیس سالہ عورت بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کے پہلو میں تقریباً ڈیڑھ سے دو سال تک کا بچہ تھا جسے وہ سلانے میں مصروف تھی۔ وہ وہی عورت تھی جسے کل رات میں نے حسینہ کے روپ میں دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت وہ بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے مامتا ٹپک رہی تھی۔ لوری کے بول دل دکھا دینے والے تھے۔

"گھر کے در و دیوار راہ تک تک کے شل ہو گئے
اب نہ آئے گا شاید کوئی سو رہو سو رہو
سست رفتار تارے بھی آنکھیں جھپکنے لگے
غم کے ماروں گھڑی دو گھڑی سو رہو سو رہو
منہ اندھیرے ہی ناصر کسے ڈھونڈنے چل دیئے
دور ہے صبح روشن ابھی سو رہو سو رہو"

ساتھ ہی وہ سسکیاں لینے لگی اور بچے کو زور زور سے ہلانا شروع کر دیا۔ "فہد، فہد، میرے بچے فہد، اٹھو فہد، اٹھو میرے بیٹے، اٹھو....." وہ اسے زور زور سے جھنجھوڑ رہی تھی اور اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن بے سود کیونکہ وہ بچہ مرا ہوا تھا۔ میں وہ منظر دیکھتے دیکھتے اس کے کافی قریب چلا گیا۔ وہ عورت زور زور سے، رونے لگی "میرا بیٹا چلا گیا..... ہائے میرا بیٹا چلا گیا۔" وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

"ک..... کیا ہوا آپ کے بیٹے کو۔ یہ تو ابھی سو رہا تھا اور آپ اس کو لوری دے رہی تھیں۔ پھر اچانک اسے کیا ہوا؟" میں بے اختیار سا ہو کر بولا۔

اس عورت نے کمرے کی ایک جانب ہاتھ سے اشارہ کیا تو سامنے جیسے ایک ویڈیو چل پڑی تین اوباش شخص اس کے کمرے میں کھڑکی توڑ کر داخل ہوئے۔ جس پر عورت گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"کون ہو تم.....؟"

"ایک بولا۔" تمہارے دیوانے....." وہ تینوں اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت گھر میں وہ اپنے اکلوتے بچے کے ساتھ اکیلی تھی۔ وہ ان کے ارادے سمجھ گئی تھی۔

"دیکھو یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔ میں ایسی ویسی نہیں ہوں میں ایک شادی شدہ عورت ہوں، تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ میرا بیٹا جاگ جائے گا۔"

"تم بے فکر رہو ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ ہمیں تو صرف تم سے کام ہے۔" اور آہستہ آہستہ اس کے مزید قریب آتے گئے۔ وہ چیخنے چلانے لگی۔ مدد کیلئے لیکن کوئی گھر میں ہوتا تو مدد کو آتا۔

"تمہیں خدا کا واسطہ۔"

لیکن شیطانوں کی شیطانی پورے جوبن پر تھی۔ وہ عورت بھاگنے کیلئے کمرے میں راستہ تلاش کرنے لگی۔ بچہ بھی شور سے جاگ چکا تھا۔ ان میں سے ایک نے عورت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور کمرے میں لے گیا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ بستر پر پڑا بچہ اندر ہی چیختا رہا، دوسری طرف بڑا بھیانک منظر تھا۔ حوا کی بیٹی کی عزت و آبرو کو بری طرح روندا گیا۔ اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی تھی۔ وہ تینوں اس کی عزت کو تار تار کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے تھے جو کہ ان کا مقصد تھا، میں سر جھکا کر رہ گیا۔ بچہ ماں کے لئے تڑپ رہا تھا۔ بالآخر خوف دہشت اور سب سے بڑھ کر تنہائی اور قید کے خوف نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا بچے نے خوف کے مارے رو رو کر وہیں دم توڑ دیا۔ اتنا بھیانک اور دل دہلا دینے والا منظر تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

پھر میں نے کیا دیکھا کہ وہی عورت سفید لباس میں ملبوس روتے سسکتے اپنے بچے کے پاس آئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں سے اس کے لباس کے چیتھڑے اڑے ہوئے ہیں۔ وہ تڑپ کر اپنے بچے کو اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن بچہ تو کب کا مر چکا تھا اور اس کی ننھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی روح اس کے جسم سے کب کی پرواز کر گئی تھی۔ ماں تڑپ کر بین کرنے لگی۔ عورت کی نہ عزت بچی تھی اور نہ ہی بچہ بچا تھا۔ اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اب سوائے ماتم کے اور کچھ نہ بچا تھا۔ معصوم بچے کی لاش دیکھ کر ماں جیسے پاگل ہوگئی۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ ایک چنگاری اور بھڑکتے شعلے کی طرح اٹھی۔ اس کا چہرہ انتہائی وحشت ناک ہوگیا تھا۔ جس کمرے کا منظر تھا وہاں کی وہ کھڑکی جہاں سے وہ اوباش مرد داخل ہوئے تھے ایک جھونکے سے کھڑکی کے پٹ زور سے کھل گئے اور وہ عورت ہوا میں اڑنے لگی۔ سامنے سڑک پر وہ اوباش اپنی بے غیرتی کا جشن منا رہے تھے اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگے۔

عورت کا وجود ہوا میں یوں اڑ رہا تھا جیسے کوئی پتنگ ہو۔ وہ ایک ہی جھونکے میں نیچے جھکی اور چند ہی لمحوں میں تینوں کو ایک ایک کر کے چیتھڑے چیتھڑے کرتے ہوئے ہوا میں اچھال دیا۔ کسی کی ٹانگ، تو کسی کا سر، کسی کا بازو، بس یوں ہی کٹے پھٹے اعضاء ہوا میں اڑ رہے تھے۔

"ظالمو!..... نہیں چھوڑوں گی تمہیں، میں نے اور میرے بچے نے تمہارا کیا بگاڑا تھا، میں نے تمہیں سمجھایا، تمہاری منت کی، تمہیں خدا کا واسطہ دیا۔ لیکن تم کو خدا کا خوف نہ آیا۔ اب وہ ماں جس کی مامتا کو تم نے تکلیف دی ہے۔ اس سے اس کا بیٹا چھینا اب اپنا انجام بھگتو!" یوں اس نے ایک ایک کا خاتمہ کردیا۔

بڑا بھیانک انجام میں نے ان لوگوں کا دیکھا پھر وہ واپس اپنے بیٹے کے پاس آ کر دھاڑے مار کر رونے لگی۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں۔ جب آپ نے اتنی ہمت کر کے اپنی عزت لٹ جانے کا اور اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ لے لیا تو پھر اب آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ آپ کا بیٹا دور آسمانوں میں آپ کا انتظار کر رہا ہو گا آپ خواہ مخواہ خود کو یوں تکلیف دے رہی ہیں۔ جب آپ کا بدلہ پورا ہو چکا ہے تو پھر یہاں رہنے کا کیا فائدہ؟" میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں ..... ابھی میرا بدلہ پورا نہیں ہوا، میرا بدلہ ابھی پورا نہیں ہوا۔" وہ چلا کر کہنے لگی۔ میں حیران و پریشان اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس دنیا میں ابھی بھی ایسے لوگ باقی ہیں جو گندے ارادے رکھتے ہیں اور غلط کام کرتے ہیں۔ ان سب کا خاتمہ میرا مقصد ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری زندگی کا راز بھی یہی ہے کہ یہاں اس جگہ آنے کے بعد بھی تم زندہ ہو۔ کیونکہ تم ایک اچھے انسان ہو۔ میں یہاں آنے والے ہر انسان کو ہوس کی لوری سناتی ہوں۔ اور ان کے نفس کو بھڑکاتی ہوں اور اب تک جتنے لوگ یہاں آئے وہ میری ہوس کا نشانہ بنے اور میں نے انہیں موت کی نیند سلا دیا۔ ان کے لئے میری ہوس کی لوری موت کی لوری بن جاتی ہے۔ ورنہ یہ تو میری مامتا کی لوری ہے جو میں اپنے بچے کو سلانے کے لئے سناتی ہوں۔

دن ڈھلا رات پھر آ گئی سو رہو سو رہو
منزلوں پر چھا گئی خاموشی سو رہو سو رہو"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، میرا ذہن اس کی بات سن کر پہلے دن کے واقعات کی جانب چلا گیا۔ یہاں کے لوگوں نے کہا تھا "یہاں جو آیا بچ کر نہیں گیا۔"

"تم تمام لوگوں سے مختلف ہو۔ یہاں سب لوگ آ کر ہوس کا نشانہ بن جاتے ہیں اور میں انہیں اپنے بے پناہ حسن سے ہوس کا نشانہ بناتی ہوں اور ان کے کردار کو آزماتی ہوں۔ لیکن تم سے پہلے تک سب لوگ ہوس کا شکار ہو کر میرے ہاتھوں بھیانک موت کا نشانہ بنے ہیں۔"

میں اس کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے پہلے آہستہ آہستہ اپنی ہر سوچ کا جواب مل رہا تھا۔ لیکن اس کی اس بات سے ہر بات واضح ہوگئی تھی کہ پہلے دن اس نے

مجھے بھی آزمایا تھا اور میں ہوس کا شکار نہ ہوا تھا اور یہی راز تھا دوسروں کے مرنے اور میرے بچ جانے میں۔

وہ اب بھی اپنے ساتھ ہوئی زیادتی اور اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ لے رہی تھی۔ اس کی روح کو ان ظالموں سے بدلہ لے کر بھی قرار نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی جو لوگ غلط کام کرتے یا ایسا ارادہ بھی رکھتے ان کا خاتمہ کردیتی۔

یہاں اپنے بارے میں ایک ضروری بات بتاتا چلوں کہ میں ایک نہایت شریف اور سلجھا ہوا انسان تھا، اور ہمیشہ رہوں گا۔ لیکن کبھی کبھی شریف اور اچھے انسان بھی دھوکے میں آ کر اپنی بیوقوفی سے ایسی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ جو حقیقت میں انہیں بالکل زیب نہیں دیتی۔ میرا ایک دوست تھا، اس کی فیملی کا اور میری فیملی کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی اور ان کا ایک بیٹا تھا۔ میں دو بیٹوں کا باپ تھا، ہم لوگوں میں اچھی سلام دعا تھی لیکن کہیں نہ کہیں میرے دوست کی بیوی کو ہماری فیملی کا آپس میں ملنا جلنا پسند نہیں تھا اس نے بہت سارے حربے بھی آزمائے اس لئے اس نے مجھ دو بچوں کے باپ کو اپنی باتوں سے اپنے اشاروں کنایوں سے، اٹھنے بیٹھنے کے انداز اور اپنی اداؤں سے اپنے جال میں پھسانے کی کوشش کی۔ میں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ یہ حرکتیں تقریباً ایک سال تک میرے ساتھ کرتی رہی تھی۔ لیکن میں نے کبھی پرواہ نہ کی۔

میں اور میری بیوی اپنی بچیوں کے ساتھ نہایت ہی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ میاں بیوی کے رشتے میں نوک جھونک تو چلتا ہی رہتا ہے۔ اور پھر ایک دن آپس میں ہم میاں بیوی کا جھگڑا ہوگیا۔ جھگڑا بہت طول اختیار کر گیا۔ اور اسی جھگڑے کا اس عورت نے بہت فائدہ اٹھایا اور میرے ساتھ میری بیوی کے رویے کے لحاظ سے ہمدرد بننے لگی۔ مجھے اس سے اپنائیت کا احساس ہوا۔ ایک دو دفعہ میں اس سے اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں بھی ملا۔ اس نے باتوں باتوں میں مزید ہمدردی ظاہر کی تو میرا دل مزید اس کے لئے پگھلا۔

مجھے اس کی شکل میں ایک ہمدرد اور غمگسار ساتھی نظر آیا جو میری بیوی سے زیادہ میری پرواہ کرتا ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہوا اور جانے انجانے میں، میں اسے چاہنے لگا۔ وہ اکثر میرے سامنے اپنے شوہر کا مذاق اڑاتی اور اسے کبھی کسی مزاحیہ فنکار سے ملاتی اور میری شخصیت کی تعریف کرتی جب وہ یعنی میرا دوست سامنے نہ ہوتا۔ اور پھر ایک دن اس کی اداؤں کے جال میں پھنس کر میں نے اس کے ساتھ ایک دو غلط اور غیر مہذب حرکتیں کر ڈالیں۔ وہ اکیلے میں مجھ سے اپنے سسرال والوں کی برائیاں کرتی۔ اپنے شوہر کا مذاق اڑاتی اور میری شخصیت پر واہ واہ کہتی۔

اور پھر ایک دن نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے فوراً اپنے شوہر کو اس کے آفس میں فون کر کے یہ کہہ ڈالا کہ "آج تمہارا دوست آیا تھا اور جب میں نے اسے چائے دی تو اس نے میرے ساتھ بدتمیزی اور غلط باتیں کرنے لگا۔"

بس اس کے بعد کیا تھا۔ پکی دوستی، بدترین دشمنی میں تبدیل ہوگئی۔ مجھے میرے دوست نے بہت ذلیل و رسوا کیا اور مجھ سے نفرت کرنے لگا، ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔

یہی نہیں بلکہ دوست کی بیوی نے یہ بات اوروں سے بھی کہی تو میری بیوی بھی مجھ سے متنفر ہوگئی۔ میں نے اس سے بھی معافی مانگی۔ بہرحال اس کی مہربانی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے احساس ہوگیا ہے کہ میں واقعی برا انسان نہیں ہوں۔ بس مجھ سے بھولے میں غلطی ہوگئی۔ آئندہ کبھی میں ایسی حرکت کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔ کہیں نہ کہیں وہ بھی سارے حالات کا اندازہ لگا چکی ہے کہ کوئی سامنے سامنے اچھا بننے کا ڈرامہ کر کے اندر ہی اندر ہماری جڑیں اکھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بہرحال میری فیملی کا' دوست کی فیملی کے ہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنا جانا بند ہوگیا ہے۔ اور اللہ کی مہربانی سے میرا گھر اجڑنے سے بچ گیا اور اب ہم ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ بس اکثر اوقات میری بیوی اس واقعہ کا کسی نہ کسی انداز میں اظہار ضرور کردیتی ہے۔

"جان بچی سو لاکھوں پائے
لوٹ کے بدھو گھر کو آئے"

اب اصل کہانی ہے۔

"اچھا تو اس سارے مسئلے کا کیا حل ہے۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟ آپ کس طرح یہ دنیا چھوڑیں گی۔ جس سے اب آپ کا واسطہ نہیں۔ آپ کے بیٹے کو دوسری دنیا میں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ یہاں سے چلی جائیں اصل گنہگاروں سے تو آپ انتقام لے ہی چکی ہیں۔"

"نہیں۔ جب تک اس برائی کا جڑ سے خاتمہ نہیں ہوجاتا میرا انتقام پورا نہیں ہوگا۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ میرا معصوم بچہ ظلم کے ہاتھوں مرا میرے ساتھ میرا شوہر بھی اس دنیا میں نہ رہا، جب میری موت کے بعد میرے شوہر گھر آئے تو صدمہ برداشت نہ کرسکے اور دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ میرے بیٹے کو اس دنیا میں میری ضرورت تھی تو اسے ماں نہیں ملی۔ وہ ماں کے مامتا کے لئے خوف سے تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ اب صرف میرا انتقام زندہ ہے اور جب تک برے لوگ ہیں۔ میں ادھر ہی ہوں۔" وہ غضب ناک ہورہی تھی۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ اپنے انتقام کے بعد بھی مردوں کو بہکاوے میں لاکر غلط کام پر آمادہ کرتی ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ ہر انسان برا نہیں ہوتا۔ میں بھی برا انسان نہیں ہوں لیکن شاید میں بھی آپ کے بہکاوے میں آکر کچھ غلط کر بیٹھتا تو آپ مجھے بھی ختم کرڈالتیں لیکن میں بچ گیا۔ اس لئے کہ پہلے بھی زندگی میں ایک دفعہ دھوکا کھا چکا ہوں اور سبق حاصل کرچکا ہوں۔"

"خوب بہت خوب! جو شیطان کے بہکاوے میں آکر برا کام کرتا ہے وہ برا انسان نہیں ہوتا۔ مجھے یہ بتاؤ۔ وہ اچھا انسان کبھی شیطان کے بہکاوے میں آکر گناہ کرتا ہے۔ نہیں نا..... اس لئے کہ اس کو پتہ ہے کہ اس سے میں گناہگار ہوجاؤں گا۔ جب اچھے انسان کا نفس اسے بھڑکا کر کسی غلط کام پر آمادہ کرتا ہے تو وہ شیطان پر سارا الزام لگا دیتا ہے۔ اپنے گندے نفس کو ملامت نہیں کرتا اپنے ضمیر کو لعن طعن نہیں کرتا۔ اچھا کام کیا تو اپنی محنت ہے، اس کو اس وقت اللہ کی عنایت یاد نہیں رہتی، برا کام کیا تو شیطان کا قصور ہے اور کہتا ہے میں تو ایک اچھا انسان ہوں۔ یہ سب شیطان کا کیا دھرا ہے؟" وہ غصے سے بھڑکنے لگی۔

"وہ سامنے موم بتی رکھی ہے جو جل رہی ہے، جاؤ تم اس جلتی موم بتی پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔ جاؤ..... جاؤ نا۔"

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"نہیں ناں..... تم ایسا نہیں کروگے کیونکہ تمہیں پتہ ہے ایسا کرنے سے تمہارا ہاتھ جل جائے گا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن خدا کے لئے میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ حضرت آدم وحوا ہمارے باپ اور ماں ہیں جن کے ذریعہ اللہ نے یہ کائنات بنائی ہے۔ آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی جانتا ہوں۔ ان لوگوں سے بھی شیطان کے بہکاوے میں آکر غلطی ہوئی تھی۔ اور ان سے خدا کے حکم کے خلاف ورزی ہوئی تھی۔ لیکن وہ برے انسان تو نہیں تھے۔"

"ہاں تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، پھر تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ انہیں اس غلطی کیلئے جنت سے بے دخل کیا گیا تھا اور زمین پہ انہوں نے دربدر کی ٹھوکریں کھائی تھیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگی، تب کہیں جاکے ان کی توبہ قبول ہوئی۔"

"وہ خدا کا فیصلہ تھا..... سزا کا بھی اور معافی دینے کا بھی ہم اس ذات کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ سزا وجزا سب کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باوجود آپ نے اپنے دشمنوں سے اپنی بے حرمتی اور اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ لیا اور اب تک آپ انسانوں کو آزما کر

ان کو سزا دیتی ہیں۔ یہ غلط ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں مجھے کسی طور چین نہیں آتا۔ وہ وقت، وہ دردناک لمحہ یاد کرکے میری روح تڑپتی ہے۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا یہ کام میں اپنے ذمے لیتا ہوں۔ میں ایسے لوگوں کو پکڑوں گا۔ کیونکہ میں خود ایک دفعہ شیطان کے بہکاوے میں آکر غلط کام کا ارادہ کرچکا تھا۔ لیکن اللہ نے مجھے، بچالیا۔ ہر انسان برا نہیں ہوتا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ میں صحیح اور غلط کو پرکھوں گا اور اگر کوئی واقعی برا ہوا تو اسے کیفر کردار تک پہنچاؤں گا اور اگر وہ ٹھیک ہوا اور وقتی طور پر برا ہوا یعنی وقتی طور پر شیطان کے قبضے میں ہوا تو اسے ٹھیک راستہ دکھاؤں گا، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ کی مدد کروں گا لیکن یہ جو آپ کررہی ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔"

"تم کیا کرسکتے ہو میرے لئے؟"

"میں غلط انسان کو روکوں گا اور اگر وہ باز نہ آیا تو اسے قانونی طور پر سزا دوں گا۔ کچھ بھی کروں گا لیکن مسئلے کا حل ضرور نکالوں گا۔"

"اچھا....." وہ طنزاً مسکرائی۔ "تم واقعی کچھ کرسکتے ہو؟"

"ہاں..... ہاں میں کرسکتا ہوں۔"

"اچھا تو کچھ کرسکتے ہو تو کرو اس محلے میں ایک لڑکی کی عزت پر بری طرح سے ہاتھ ڈالا گیا ہے۔ وہ مری تو نہیں لیکن آدھی پاگل ہوگئی ہے۔ اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں، کوئی بھائی بھی نہیں ہے۔ وہ بہت حسین ہے۔ لیکن برے لوگوں نے اسے میلا کردیا ہے۔ اب کوئی اس سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کیا تم اس سے شادی کروگے؟"

"ی..... ی..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ بھلا میں ایسا کیسے کرسکتا ہوں۔ میں تو شادی شدہ ہوں۔ بچوں والا ہوں اور میں آپ کو پہلے بھی بتاچکا ہوں کہ اپنی بیوی کو ایک دفعہ پہلے بھی دھوکہ دے چکا ہوں۔ وہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اب میں دوبارہ ایسا نہیں کرسکتا۔"

"تم اتنی سی بات پر پریشان ہوگئے تو پھر آئندہ اس حوالے سے تم کیا کرسکتے ہو یا کیا کرلوگے۔ چلے جاؤ یہاں سے بس مجھے میرا کام کرنے دو۔"

"دیکھیں میں اس لڑکی سے شادی تو نہیں کرسکتا لیکن میں اس کے لئے کوئی رشتہ کوئی اچھا انسان تو تلاش کرسکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں ایک ماہ کی مہلت دیتی ہوں، آج یکم دسمبر 2011ء ہے اور تمہارے پاس 30 دسمبر 2011ء تک کا ٹائم دیتی ہوں۔ اس میں تمہاری آزمائش ہے کہ تم کس طرح میری مدد کرسکتے ہو اگر تم اس کام میں کامیاب ہوجاتے ہو تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی، ورنہ....." اس کی آنکھیں قہر آلود ہونے لگیں تھیں۔ "اب چلے جاؤ یہاں سے۔"

پھر مجھے دور سے فجر کی اذانوں کی صدا آئی۔ کھڑکی میں پہلی رات سادھواں چھاچکا تھا وہ عورت اس میں ہی ایک دم غائب ہوگئی تھی۔ میں چکرا کے رہ گیا۔

صبح ہوئی رات کا واقعہ میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا، میں اپنے کام سے فراغت کے بعد جس لڑکی کے متعلق اس نے بتایا تھا، میں اسے تلاش کرنے میں لگ گیا۔

خیر اللہ اللہ کرکے مجھے اس لڑکی کا گھر جس کے ساتھ بدسلوکی ہوئی تھی۔ بالآخر پتہ چل ہی گیا۔ لیکن اب مسئلہ سارا یہ تھا کہ ایک ماہ میں کیسے ان لوگوں کے متعلق معلومات لی جائیں اور پھر سب کچھ جان لینے کے بعد اگلا کام جو کہ ایک مشکل مرحلہ تھا یعنی اس لڑکی کی شادی کا انتظام کیسے کیا جائے۔ میں گھر کے سامنے کھڑا تھا اور یہی سوچتے سوچتے میں نے گھر کی ڈور بیل بجادی۔

لیکن باہر کوئی نہ آیا۔ میں نے دوبارہ بیل بجائی تو ایک بزرگ نے دروازہ کھولا۔

"کون ہے.....؟" انہوں نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بابا جی میں یہاں ایک ہیلتھ ورکر کے طور پر آیا ہوں اور گھر گھر جا کر صفائی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ اس لئے آپ کے گھر بھی آیا ہوں۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" میں نے بہانہ بنایا۔

"ٹھہرو برخوردار! میں دوسرے کمرے کا دروازہ کھولتا ہوں۔" وہ ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ میں نے بھی مثبت میں سر ہلا دیا اور سوچنے لگا کہ شریف اور غریب لوگ جلد باتوں میں آجاتے ہیں اس لئے کیونکہ غریب لوگ لالچ میں آ کر بے وقوف بنتے ہیں اور شریف اپنی شرافت کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتا ہے۔ بہر حال بابا جی کے ڈرائنگ روم کھولنے کے بعد میں اندر جا کر بیٹھا۔ میں نے سرسری سا کمرے کا جائزہ لیا۔ ہیلتھ ورکر کا سامان میں نے ایک دوست جو یہاں اسی شہر میں چھوٹا سا کلینک رکھتا تھا۔ وہاں سے لے آیا تھا۔ اسی لئے یہاں مجھے اس گھر کے لوگوں تک رسائی کے لئے یہی کام ٹھیک لگا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور میں آفس کے کام سے فارغ تھا بابا جی مجھے بٹھا کر باہر چلے گئے۔ شاید وہ چائے پانی کا انتظام کرنے کے لئے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بابا جی اندر آ گئے۔

"کہو برخوردار! کیا پوچھنا ہے تم نے؟"

"بابا جی آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کا نام کیا ہے اور آپ کے گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟"

"برخوردار میرا نام اللہ بخش ہے اور ہم گھر میں تین لوگ رہتے ہیں۔ میری بیوی، بیٹی اور میں۔"

"اچھا بابا جی آپ سے میرا اگلا سوال یہ ہے کہ آپ کونسا صابن استعمال کرتے ہیں؟"

"بیٹا ہم لوگ زیادہ تر سیف گارڈ یا تبت استعمال کرتے ہیں۔"

"اچھا، ٹھیک ہے .....! اچھا آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ سیف گارڈ یا تبت سے جو کہ آپ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے آپ دن میں کتنی مرتبہ ہاتھ دھوتے ہیں؟"

"برخوردار ہاتھ ہزار دفعہ بھی دھولیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ جب ایمان ہی میلا ہے لوگوں سے اگر کچھ دھلوانا ہی ہے تو ان سے کہو کہ اپنا ایمان دھوئیں۔ کیونکہ صابن سے بدن کا میل تو اتر سکتا ہے۔ لیکن ایمان میلا ہو تو صابن اس کا کیا بگاڑے گا۔ لوگوں کو تعلیم دینی ہے تو ایمان کی دو کردار کی دو۔ باہر سے زیادہ اندر، ظاہر سے زیادہ باطن کی صفائی ضروری ہے۔ اگر انسان کا اندر صاف ہے تو سب کچھ صاف ہے۔ اور اگر اندر میلا ہے، دل ہی میلا ہے، ذہن ہی میلا ہے، گندہ ہے تو باہر کی صفائی سے کیا فائدہ۔ باہر کی گندگی اتارنے سے کیا ہوگا۔" بابا جی بہت جذباتی ہو گئے اور میرے سوال درمیان میں ہی رہ گئے اور یہی موقع تھا جو شاید مجھے اللہ نے دیا تھا کہ بابا جی سے مزید بات ان کے گھر کے حوالے سے کر سکوں۔

"کیا ہوا بابا جی! آپ ایک دم غصے میں کیوں آ گئے؟"

"غصے میں نہ آؤں تو کیا کروں۔ جس شخص کی نوجوان بیٹی کی عزت کو کوئی کمینہ روند کر چلا جائے وہ غصہ نہیں کرے گا تو پھر اور کیا کرے گا۔ میری معصوم بچی کالج جا رہی تھی تو کوئی زبردستی میری بچی کو اغواء کر کے لے گیا اور اس کے دامن کو داغدار کر کے چھوڑ گیا۔ میری بیٹی صدمے سے پاگل ہو گئی۔ یہ اب زندوں میں ہے اور نہ مردوں میں۔ ہم بوڑھے ماں باپ کب تک اس درد کو سنبھالے گے۔ آج نہیں تو کل ہم نے مرنا بھی تو ہے۔ کون اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ کون اس کی ذمہ داری سنبھالے گا، کون اس سے شادی کرے گا۔" بابا جی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ مجھ سے ان کی بے بسی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"بابا جی اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا تو بابا جی غصے سے گھورنے لگے۔ "نہیں بابا جی، میرا وہ مطلب نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کی بیٹی کے لئے کوئی رشتہ

دیکھوں۔

"کون کرے گا اس سے شادی بیٹے، اس کا دامن داغدار ہو چکا ہے اور ہمارے معاشرے میں ایسی لڑکی کو گندگی نظر سے تو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پر ترس کھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی عزت کا رکھوالا کوئی انسان نہیں بنتا۔ اس سے شادی کوئی نہیں کرتا۔" بابا جی مایوس ہو کر کہنے لگے۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن ابھی بھی دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو اچھے برے کی پرکھ رکھتے ہیں، اور جن میں آج بھی انسانیت موجود ہے اور وہ کسی کی بہن بیٹی کو ویسی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس طرح سے اپنی بہن بیٹی کو، میرا ایک دوست ہے جو بہت ہی نیک اور شریف انسان ہے۔ اس کی بیوی آج سے تقریباً چار پانچ سال قبل کینسر جیسے موذی مرض میں گرفتار ہو کر موت کا شکار ہو گئی اور اب اس کی تین سال کی بیٹی ہے۔ اسے بیٹی کے لئے ماں چاہئے اور آپ کی بیٹی کو شوہر۔"

"مگر بیٹا اس کی عزت۔"

"بس بابا جی، یہ بات آپ نہ کریں میں نے تھوڑا بہت آپ لوگوں کے حوالے سے سنا تھا۔ تو میں نے اپنے دوست سے بات کی تھی۔ اس نے رضامندی دے دی تھی لیکن اگر مزید تسلی چاہتے ہیں تو آپ میرے ساتھ چل کر خود اس سے بات کر لیں۔ اس کے دو اور بھائی ہیں۔ جو شادی شدہ ہے اور اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ اسے اپنے اور اپنی بیٹی کے لئے سہارا چاہیے اور آپ کی بیٹی کو آئندہ کی زندگی کے لئے ایک اچھے جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ میری بات مانیں تو آپ انکار نہ کریں اور خود چل کر اپنی تسلی کر لیں۔"

"چلو ٹھیک ہے مجھے تم وہاں لے چلو۔ لیکن وہ تمہارا صحت وصفائی کا کام.....؟"

"وہ بھی ہو جائے گا بس ایک دو دن تک آپ تیاری کر لیں۔" میں انہیں کہہ کر آ گیا اور پھر ایک دو دن بعد دوست سے پروگرام طے کرنے کے بعد انہیں راولپنڈی لے آیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ آپس میں بات چیت ہوئی جس کا مثبت نتیجہ نکلا۔ بابا جی بھی اس رشتے سے خوش ہوئے اور شادی کے لئے میرے دوست نے بھی آمادگی ظاہر کر دی۔ اور یوں چند دن بعد بابا جی کی بیٹی 15 دسمبر کو بیاہ کر میرے دوست کے گھر چلی گئی اور میں 16 دسمبر کو واپس لاہور آ گیا۔

یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ عارف میرا بہت پرانا دوست تھا۔ وہ راولپنڈی میں رہتا تھا اور پڑھائی کے سلسلے میں اسلام آباد ہاسٹل میں آیا تھا۔ ہم دونوں نے کچھ عرصہ پڑھائی کے سلسلے میں اسلام آباد ہاسٹل میں اکٹھے وقت گزارا تھا۔ اسی دوران ہم دونوں میں اچھی سلام دعا ہو گئی۔ پھر ہاسٹل کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد جاب نے اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف کر دیا۔ وہ جاب کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر چلا گیا۔ پھر اسی دوران شادیاں ہوئیں دونوں کے بچے ہوئے پھر اچانک ایک جاب کے دوران راولپنڈی میں پھر ملاقات ہوئی اور مجھے عارف ملا لیکن وہ مجھے کافی افسردہ نظر آیا۔ اس نے مجھے اپنے حالات سے آگاہ کیا کہ اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی ایک سال کی بیٹی ہے۔ میں نے اس کے حالات کا جائزہ بھی لیا۔ وہ جاب پر جاتا تو بچی رشتے داروں کے حوالے کر جاتا۔ اور رات گئے تک گھر جاتا تو اس کی بیٹی اس کے لئے بے قرار ہوتی۔ وہ مجھے اکثر بتاتا مجھے بہت دکھ ہوتا۔ وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی خلوص نیت سے ذمہ داری لینے کو تیار نہ تھا۔ ورنہ رشتے تو بہت تھے۔

پھر اس کی یہ ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی۔ اور پھر میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ تو میں نے فون کر کے اس سے بات کی اور ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے بھی اعتراض نہ کیا۔ بابا جی کی بیٹی حقیقت میں پاگل نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک نارمل لڑکی تھی لیکن اس حادثے نے اس کی زندگی کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اللہ کی مہربانی سے یہ معاملہ تو حل ہوا اور اک پندرہ دن باقی رہ گئے تھے میری آزمائش کے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں عارف کی شادی سے فارغ ہو کر مکان میں آ چکا تھا۔ اور رضا کارانہ طور پر میں نے خود کو تحفظ عامہ نسواں کی تنظیم سے بھی منسلک کر لیا تھا۔ ساتھ ساتھ جاب بھی چل رہی تھی۔ عارف کی شادی کے لئے میں نے چند دن کی کام سے چھٹی لے لی تھی۔ میں ان دنوں کافی تھک چکا تھا۔ سو لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔

میں نے دیکھا کہ وہی عورت سفید لباس میں ملبوس میرے بستر کے ایک طرف کھڑی مسکرا رہی ہے اور آنکھوں میں تشکر آمیز چمک ہے جیسے وہ میرا شکریہ ادا کر رہی ہو ساتھ ہی مجھے ایسا لگا کہ میرے پیروں والی سائیڈ پر کوئی موجود ہے۔ ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ جاگنے کے بعد خواب والا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہی سفید لباس، وہی عورت، وہی شکریہ ادا کرتی آنکھیں، میں بھی زیر لب مسکرا دیا۔

"تم نے واقعی مجھے خوش کر دیا لیکن تمہارا امتحان ابھی باقی ہے۔ اور اب اس سے بھی مشکل مرحلہ ہے اور تمہیں ابھی، اسی وقت جانا ہوگا۔"

"کیا مطلب.....؟ میں سمجھا نہیں۔"

"وہ دیکھو سامنے گلی میں اس لڑکی کو گھسیٹ کر لے جایا جا رہا ہے۔ وہ لٹیرے اس کی عزت لوٹنے لگے ہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "تمہیں اسے بچانا ہے اور یہی تمہارا آخری امتحان ہوگا لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کام میں تم اپنی جان نہ گنوا دو۔ شاید اس معاملے میں تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ وہ دیکھو ان لوگوں کے پاس پسٹلز بھی ہیں جاؤ..... جلدی جاؤ اس کو بچاؤ۔" اس نے تڑپتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں شدید تھکان کے باوجود بستر سے اٹھا اور پاؤں میں جوتے ڈالے بغیر، گلی کی طرف بھاگا اور اس لڑکی کو ان بے غیرتوں سے بچانے لگا، لڑکی نے۔ "بچاؤ..... مجھے بچاؤ۔" کا شور مچا رکھا تھا۔ اردگرد اور بھی لوگ جمع تھے۔ جو صرف تماشائی بنے ہوئے تھے۔ کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ میں اس لڑکی کو ان سے بچانے لگا۔ میں نے ایک کو دھکا دے کر پیچھے کیا۔ پھر تیزی سے دوسرے پر جھپٹا۔ ان میں سے ایک میری طرف لپکا تو میں نے اس کے منہ پہ مکا مارا۔ وہ دھڑام سے نیچے جا گرا۔ وہ تین چار تھے اور میں اکیلا۔ لیکن میں پھر بھی سر توڑ کوشش کرتا رہا اور برابر کا مقابلہ کرتا رہا۔ میں نے ایک ایک کو پکڑ کر مار گرایا، لڑکی کو میں نے وہاں سے بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ بعد میں ان میں سے ایک نے بالآخر پسٹل نکالا اور اس کا رخ میری طرف کر دیا اور نشانہ لیتے ہوئے مجھ پر فائر کر دیا۔ گولی سیدھا میرا سینہ چیرتی ہوئی پیٹھ سے باہر نکل گئی اور میں موت کی وادی میں کھو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو صبح کا وقت تھا۔ سورج کافی دیر پہلے طلوع ہو چکا تھا۔ سورج کی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ میں کمرے میں بستر پر لیٹا تھا اور بالکل صحیح سلامت تھا۔ میں پچھلے واقعات کو یاد کرنے لگا اور ان حالات کے مطابق تو میں مر چکا تھا۔ پھر یہ سب کیا تھا، میں بہت حیران تھا۔ میں نے اپنے سینے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ جہاں پر گولی سے سوراخ تو دور کی بات، ہلکی سی خراش تک نہ تھی۔

"اوہ میرے خدایا! یہ سب کیا ماجرا ہے؟ اب یہ کونسی نئی آزمائش ہے۔" میں خود کلامی میں مصروف تھا کہ میری نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کھول کر دیکھا۔ وہ ایک خط تھا جو شاید میرے نام تھا۔

میرے عزیز محسن!

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے۔ تم نے ایک عورت کی حفاظت اور ماں کی ممتا کے سکون کے لئے جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کی لیکن تمہارا ارادہ اور عزم پکا اور سچا تھا۔ اس لئے تم جیت گئے۔ اس لئے اب تمہیں بتاتی چلوں کہ آج سے پندرہ دن پہلے جو واقعہ پیش آیا تھا، وہ حقیقت میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ محض صرف تمہاری نظر کا دھوکہ تھا۔ تمہیں گولی نہیں لگی تھی، وہ لڑکی اور اسے اغوا کرنے والے کارندے اصلی نہیں

تھے۔ اردگرد کے جو لوگ تھے وہ بھی سب نظر کا دھوکہ تھا۔ تمہیں ایسا منظر دکھایا گیا تھا کہ تم ان لوگوں کو دیکھ کر اپنا ارادہ بدل تو نہیں لو گے کہ یہ لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے اس لڑکی کی مدد کرنے کی۔ لیکن تم نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور تم اپنے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ تم اپنی دھن کے پکے تھے۔ لیکن زیادہ کام اور تھکاوٹ نے تمہیں ہلکان کر دیا تھا، اپنی جاب، لڑکی کی تلاش، لڑکی کے والد کی دوست سے ملاقات، شادی کی ذمہ داری، تنظیم سے وابستگی اور واپسی پر لڑکی کی عزت کی حفاظت کی تگ و دو نے تمہیں سخت تھکا دیا تھا۔ جب تم ان لوگوں سے لڑ رہے تھے اور لڑائی کے دوران گولی لگنے سے تم گر پڑے تھے اور بے ہوش ہو گئے تھے اور پھر پندرہ دن تم شدید بخار میں تپتے رہے۔

میں اور میرا شوہر تمہاری دیکھ بھال کرتے رہے۔ اب تم ٹھیک ہو۔ لیکن اس واقعے سے تم نے اپنی قابلیت پندرہ دن پہلے یعنی مہینہ پورا ہونے سے دو ہفتے قبل ہی دکھا دی ہے۔ اس خط کے ذریعے ہم تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اب ہم بھی کافی تھک چکے تھے اور واپس اپنی اصلی دنیا میں جا رہے ہیں ہمیشہ کیلئے جہاں ہمارا بیٹا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ آج مہینہ پورا ہوا اور ہمیں بھی اپنے وعدے کے مطابق یہاں سے جانا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔

اللہ تمہارا نگہبان اور حامی و ناصر ہو۔

میں نے جلدی سے اپنا موبائل اٹھایا تو اس پر تاریخ 31 دسمبر 2011ء تھی جبکہ سولہ دسمبر 2011ء کو وہ لڑکی والا واقعہ پیش آیا تھا، جب میں سولہ دسمبر کو شادی سے واپس آیا تھا یعنی میں پندرہ دن سے بے ہوش ہوں اور میرا موبائل بھی فل چارجڈ تھا۔ میں حیران رہ گیا پھر بھی مجھے تسلی نہ ہوئی تو میں دیوانوں کی طرح باہر بھاگا، لوگ مجھے دیکھ کر ڈر سے گئے۔ کئی تو میرے قریب آنے سے ہچکچانے لگے جیسے کہ شاید میں کوئی روح تو نہیں۔ پھر وہی بزرگ جنہوں نے دو تین مرتبہ مجھے اس مکان میں رہنے سے منع کیا تھا مجھ سے ملے۔ "بیٹا تم زندہ ہو؟"

"جی میں زندہ ہوں اسی لئے تو آپ کے سامنے ہوں لیکن آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" میں نے کہا۔

"بیٹا میں اس لئے پریشان ہوں کہ محلے کے کئی لوگوں نے تقریباً پندرہ دن پہلے تمہیں اس مکان کے اندر جاتے دیکھا۔ لیکن اس کے بعد تم باہر نہیں آئے۔ ہم لوگ بہت پریشان تھے۔ بلکہ ہمارا خیال تھا کہ تم بھی شاید خدانخواستہ باقی لوگوں کی طرح جو اس مکان میں گئے۔ کہیں موت کا شکار تو نہیں ہو گئے۔"

"کیا مطلب، پندرہ دن پہلے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ اس عورت والی بات بالکل ٹھیک ہے، اور مجھے یوں لگا کہ جیسے چند گھنٹوں کے بعد سو کے اٹھا ہوں۔" میں نے دل میں سوچا۔

"انکل آج کیا تاریخ ہے؟"

"آج 31 دسمبر 2011ء ہے اور کل نیا سال شروع ہو جائے گا۔ یعنی یکم جنوری 2012ء"

"آپ کو نئی زندگی اور نیا سال مبارک ہو۔" میں نے بھی اس کو نئے سال کی مبارک باد دی لیکن ساتھ ہی بڑی عجیب سی بات ہوئی۔ وہ بزرگ کہنے لگے۔

"بھئی اب صرف تمہارا ہی نیا سال اور نئی زندگی ہے۔" یہ کہہ کر بزرگ ایک دم چل دیئے۔ میں حیران ہو کر ان کے پیچھے بھاگا لیکن وہ ایک دم ہی گلیوں کے بیچ غائب ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں کافی ڈھونڈا پر وہ مجھے کہیں نہ ملے۔ خیر میں نے اس محلے کو چھوڑ دیا جہاں ہر طرف موت کی لوری کا بسیرا تھا۔

نیا سال واقعی شروع ہو چکا تھا۔ تو مجھے یاد آیا کہ کیوں ناں مبارک باد دی جائے۔

سو میرے محترم مینجمنٹ آف ڈر ڈائجسٹ، مصنفین ڈر ڈائجسٹ اور قارئین ڈر ڈائجسٹ آپ سب کو نیا سال 2012ء بہت بہت مبارک ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

دوستو کیا خوب چاہتوں کا صلہ دیتے ہیں
ہر ایک گام پہ پھر زخم نیا دیتے ہیں
آپ سے تو چند دنوں کی دوستی ہوئی
لوگ برسوں کی محبت کو بھلادیتے ہیں
محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد

درد اب اور کیا اٹھاتے ہم
یہی بہتر تھا تجھ کو بھول جاتے ہم
آج رونا پڑا ہے جی بھر کے منیر
کاش کبھی اتنا نہ مسکراتے ہم
منیر احمد ساغر.....میاں چنوں

یادوں میں آپ کی ہر بات رہے گی
زندگی آپ کی محبت سے آباد رہے گی
چاہے بھلادیں زمانے کو ہم
آپ کی یہ پیاری سی مسکان ہمیشہ یاد رہے گی
لاہوتی عمار.....آھدی موڑ دولتالہ

میں جلوۂ حسن ازلی ہوجاتا
پیتل سے میں سونے کی ڈلی ہوجاتا
تمہاری جگہ کرتا میں اپنے خدا کی عبادت
تو میں اپنے دور کا ولی ہوجاتا
محمد عثمان علی.....میاں چنوں

کبھی سمویا، کبھی ڈبویا، کبھی نکال باہر پھینکا
اے سمندر عشق تیری ادائیں میرے یار جیسی ہیں
بھول کر بھی محبت کے جنگل میں نہ آنا اے دوست!
یہاں سانپ نہیں انسان ڈسا کرتے ہیں
رانا ظفر اقبال.....جنڈانوالہ

دیکھنے میں محو تھے ہم اور منظر بدل گیا
نگاہ پڑی ایسی اس کی کہ پتھر پگھل گیا
ہم کہ پروانے کے نقش پا پہ چلنے ہی کو تھے
شمع محفل! تیرے قدموں میں وہ رہبر جل گیا
انتخاب: محمد انجم نوید.....سوہاوہ چکوال

قدم قدم ہواؤں سے رابطہ رکھنا
خزاں کی رت میں بہاروں کا آسرا رکھنا
ہماری یاد کی خوشبو ضرور آئے گی
تم اپنے دل کا دریچہ ذرا کھلا رکھنا
شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار

چوٹ لگ جائے تو کیا ہوتی ہے دل کی حالت
اک آئینے کو پتھر پہ گرا کر دیکھو
ریحانہ تبسم.....حیدرآباد

دیکھا تو وہ حسین لگا سارے شہر میں
سوچا تو وہ ظالم ذہین بھی بلا کا تھا
اس کو غلاف روح میں رکھا تھا سنبھال کے
محسن وہ زخم بھی تو کسی آشنا کا تھا
صباء محمد اسلم.....گوجرانوالہ

اسی لئے مانگا نہیں اسے خدا سے کبھی
دعائیں ہوتی ہیں مغموم بے ثمر ہو کر
بجھا بجھا اسے پایا تو کچھ ہوئی تسکین
کہ خوش تو وہ بھی نہیں ہم سے بے خبر ہو کر
شعیب شیرازی.....جوہرآباد

اشک آنکھوں میں سجائے بیٹھے ہیں
درد سینے سے لگائے بیٹھے ہیں
ہجر کی ہر آشوب فضاؤں میں
تیری یادوں کے چراغ جلائے بیٹھے ہیں
محمد بشیر احمد پرواز.....جنڈانوالہ

مجھے بھی ضبط گریہ سے پشیمانی تو ہے لیکن
وہ شخص اس طور سے بچھڑا میرے آنسو نکل آئے
تصدق حسین.....کلرسیداں، ضلع راولپنڈی

خون کیسا لبوں سے پھوٹا ہے
سانس ٹوٹی کہ کانچ ٹوٹا ہے
ساری دنیا اجڑ گئی جیسے
اس طرح تیرا ساتھ چھوٹا ہے
محمد آصف شہزاد الہ آبادی.....ٹھینگ موڑ قصور

وہ جو رہتا تھا اس دل میں کبھی اپنوں کی طرح
ایسا بھولا کہ ملتا ہے اب سپنوں کی طرح
پل پل کرتا تھا جو ساتھ نبھانے کی باتیں
چھوڑ گیا ہم کو پرانی رسموں کی طرح
انتخاب: شفیق رضا.....میاں چنوں

☆☆

مزاج بدلا دلوں کا تو چاہتیں بھی گئیں
کسی کے حسن و نظر کی عنایتیں بھی گئیں
مجھے ہی اپنے لہو کا بنادیا قاتل
مرے خلاف ہی میری شہادتیں بھی گئیں
تعلقات کو توڑا کچھ اس طرح اس نے
وفا کے ساتھ دلوں سے عداوتیں بھی گئیں
ہماری زیست میں اب انقلاب کیا آئے
بڑھا ستم تو دلوں سے بغاوتیں بھی گئیں
غریب شہر کو ملتا نہیں ہے حق اس کا
ضمیر بدلا جب اپنا عدالتیں بھی گئیں
میں دشمنوں کے مقابل حکیم کیا آیا
تمام شہر کی مجھ سے حمایتیں بھی گئیں
(حکیم خان حکیم.....کامل پور موسیٰ)

بھرے زمانے میں کون اپنا دکھائی دیتا ہے
جو سو کے اٹھوں تو خواب جھوٹا دکھائی دیتا ہے
اے چارہ گر دیکھ کر نگاہیں کیوں پھیری ہیں
یہ زخم دل ہے جو تم کو بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے
میں جب بھی سوچوں ہوں طور کے باب میں کبھی تو
کسی کے جلوے کا ایک تماشا دکھائی دیتا ہے
یہ وہ ہے جس سے تمہاری شہرت ہے چار سمت
جو کہ آج کیوں تم کو رسوا دکھائی دیتا ہے
ہر ایک کے لب پر سکوت طاری ہے اتنا ہم سے مت پوچھ
دھواں سا کیوں بستیوں سے اٹھتا دکھائی دیتا ہے
کوئی جو دیکھے بھی ہاتھ میرا بس یہی کہتا ہے
کہ میری آرزوؤں کا خون ہوتا دکھائی دیتا ہے
وہ جس کی خاطر ہوئی ہے تخلیق یہ دنیا
مجھے تو جنت میں بھی گھر ان کا ہی دکھائی دیتا ہے
اٹھا کے نظریں میں واجد جدھر دیکھتا ہوں
ہر ایک چہرے میں ان کا چہرہ دکھائی دیتا ہے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

نہ جانے کن خیالوں میں کھوئے رہتے تھے تم بھی ہم بھی
محبت اک دوجے سے پھر بھی کرتے تھے تم بھی ہم بھی
ملتے تھے تو کھوئے رہتے تھے چاہت کی باتوں میں
بچھڑتے تھے جب تو اداس رہتے تھے تم بھی ہم بھی
نغمے سنتے تھے محبت کے اور شعر لکھتے تھے
گلاب لا لا کر کتابوں میں رکھتے تھے تم بھی ہم بھی
عجب بے خودی تھی طبیعت میں یا عمر ہی ایسی تھی
چاہت کی سرشاری میں جانے کیا کچھ سہتے تھے تم بھی ہم بھی
باتیں بھی کرتے تھے عمر بھر ساتھ رہنے کی
اور جدائی کے خیال سے بھی ڈرتے تھے تم بھی ہم بھی
رکاوٹیں تو بہت تھیں مگر زمانے سے بے پروا ہو کر
اکثر ایک دوسرے سے ملنے کو نکل پڑتے تھے تم بھی ہم بھی
سمجھ میں ہی نہیں آتی تھیں باتیں تفریق و تقسیم کی
دل کی کہتے تھے اور دل کی سنتے تھے تم بھی ہم بھی
بہت اداس ہیں تم بن ہو سکے تو مل لو ایک بار
آج پھر وہی لکھتا ہوں جو کبھی لکھتے تھے تم بھی ہم بھی
(ذیشان اقبال عظمی.....کراچی)

کبھی نہ ختم ہوئیں گو شکایتیں اپنی
اسی عروج پر ہیں اب بھی چاہتیں اپنی
گئے وہ دن کہ تنک تم مزاج رکھتے تھے
تمہی نہیں تو کہاں کی عداوتیں اپنی
مٹے جو تم پہ انہیں لازوال کر ڈالا
دکھائیں عشق نہ کیا کیا کراماتیں اپنی
ہمیں تو فکر ہے اک دل کی اور محبت میں
شہنشاؤں نے لٹادیں حکومتیں اپنی
بہت بری تو نہ تھی شہر دل کی آب و ہوا
خراب کر گئیں محبت کو عادتیں اپنی
وہ اختلاف بڑھا قربتوں کے موسم میں
پڑوسیوں نے بدل لیں سکونتیں اپنی
تم اپنے حصے کی پیتے تو جام کیوں چھنتا
قتیل سامنے آتی ہیں نیتیں اپنی.....!
(انتخاب: انیلہ غزل.....حافظ آباد)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ پیار کا ثبوت دیا کرتا تھا
آنسو بہا کر مجھے منایا کرتا تھا
یہ زندگی صرف تم سے وابستہ ہے
اکثر یہ بات مجھے بتایا کرتا تھا
اس کی باتوں میں کچھ ایسا اثر تھا
میں بارش کے بنا ہی بھیگ جایا کرتا تھا
سونے کی فرصت کس کو تھی احسان
وہ مجھے ساری رات جگایا کرتا تھا
بے چینی جب حد سے بڑھ جاتی تھی
وہ جی بھر کے گلے لگایا کرتا تھا
وہ اتنی محبت کرنے والا بدل گیا احسان
وہ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھایا کرتا تھا
(احسان سحر.....میانوالی)

ایک غزل لکھ رہا ہوں
تیرے نام لکھ رہا ہوں
ملے اگر فرصت تو پڑھ لینا
کہ زندگی کا سب کچھ تیرے نام لکھ رہا ہوں
بہار کا موسم ہے آیا ہوا
ہر ایک پھول تیرے نام لکھ رہا ہوں
شب تنہائی میں آتی ہے تیری یاد بہت
ہر ایک یاد کا انداز تیرے نام لکھ رہا ہوں
چاند کی چاندنی، پھول کی خوشبو
شبنم کی بوندیں تیرے نام لکھ رہا ہوں
چہچہاتے ہوئے بلبل کے نغمے
ایک آس کے ساتھ تیرے نام لکھ رہا ہوں
ایک غزل لکھ رہا ہوں
تیرے نام لکھ رہا ہوں
ڈوبتے سورج کی کرنوں کا
دن بھر وفا کا انداز لکھ رہا ہوں
جلتے ہوئے شمع پر قربان ہوا پروانہ
پروانہ کی زندگی کا حال لکھ رہا ہوں
اتنے پیار سے پالے تھے باغباں نے پھول
ستم خزاں کی روداد لکھ رہا ہوں
کس قدر پیار سے دیکھتا تھا حسن اس کو
نگاہ یار کی نفرت کا انداز لکھ رہا ہوں
ایک غزل لکھ رہا ہوں
تیرے نام لکھ رہا ہوں
(محمود الحسن.....چارسدہ)

روز تاروں کی نمائش میں خلل پڑتا ہے
چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے
اس کی یاد آئی ہے سانسو! ذرا آہستہ چلو
کیونکہ دھڑکنوں سے بھی یادوں میں خلل پڑتا ہے
(تصدق حسین.....کلر سیداں ضلع راولپنڈی)

حیراں نہ ہو کہ خواب کی تکمیل کررہا ہوں
اس سے بچھڑ کے خود کو بھی تبدیل کررہا ہوں
چاہت کا درس اہم ہے وہ بھی اگر سمجھ سکے
اس کے لئے کتاب دل انجیل کررہا ہوں میں
اشکوں سے لکھ رہا ہوں میں ہر داستان غم ابھی
مطلب کہ اس کی ذات کو تحلیل کررہا ہوں میں
اس نے کہا تھا جنوری کی شام پھر ملیں گے ہم
شاید کہ اپنے وصل کی تشکیل کررہا ہوں میں
اس سے بچھڑ کے ذکر بھی اس کا نہ کرسکا کبھی
اس کے ہر ایک حکم کی تعمیل کررہا ہوں میں
شاید کہ گھر کی تیرگی اب کے برس ہی مٹ سکے!
آنگن کے ہر مقام کو قندیل کررہا ہوں میں
اس کو اگر ہے شوق تو اترے وہ میری آنکھ میں
راشد اسی لئے نظر کو جھیل کررہا ہوں میں
(راشد ترین.....مظفر گڑھ)

پیار میں جب کچھ لوگ مسکراتے ملے ہیں
تیری یادوں کے کیا کیا پھول کھلے ہیں
یہ انداز وفا کا یہ تیرے بدلے ہوئے تیور
کانٹوں سے بھی مہربان، کہیں زخم سلے ہیں

میرے لئے تو سب کچھ تیرے حسن کی دولت سہی
تجھ کو تو میری بے رخی کے پھر سے گلے ہیں
خاموش احباب تمنا پہ نہ ہم کبھی مسکرائیں گے
دل میں تو بہت کچھ سہی مگر ہونٹ سلے ہوں گے
سنتے ہیں کہ اس بار بھی آئی تھیں بہاریں
تیرے گلشن میں اس بار بھی کچھ پھول کھلے ہیں
آیا ہے بہت یاد جاوید پھر سے ان کا تبسم
جب بھی بہت گہرے داغ زمانے سے ملے ہیں
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

اب عرض بھی کریں کیا حکم ہے ہمارے لئے
میں سر قلم نذرانہ کروں یا جان دے دوں
تحفہ عشق ہوگا گر جناب قبول کریں
سینہ چاک کرکے دل اپنا جو پیش کروں
محبت ہے عشق ہے پیار آئے فقط تم پہ
خیال غلطاں مت لانا خواہش جسم جو کروں
جلوہ حسن دیدار خود بھی کرادیا کریں
وگرنہ لب جاں آئے تختہ موت چڑھا کروں
درد زیست کیا کروں بہتر ہے موت اچھی
گھٹ گھٹ کر جو تم سے جدا تڑپا کروں
عرض کچھ نہیں بس عشق ہے آپ سے ورنہ
گلی گلی کوچہ کوچہ مجنوں بنے چلا کروں
(محمد عثمان علی.....میاں چنوں)

تمہاری یاد آتی ہے تو ہم آنسو بہاتے ہیں
گزارے تھے کبھی جو ساتھ دن وہ یاد آتے ہیں
اسی امید پہ ہم نے کھلا رکھا ہے دروازہ
سنا ہے شام ہوتے ہی بچھڑے لوٹ آتے ہیں
حقارت سے نہ دیکھو اہل ساحل طوفاں کو
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کنارے ڈوب جاتے ہیں
کسی سے کیا گلا وصی یہ دستور زمانہ ہے
نئے جب دوست ملتے ہیں پرانے بھول جاتے ہیں
(رانا ظفر اقبال.....جنڈانوالہ)

کبھی جل اٹھی شمع جان کبھی چراغ دل جلادیا
کبھی مسکرا کے بھی رو دیئے کبھی رو کے بھی مسکرادیا
کبھی کہہ دیا ہر ایک لفظ کبھی کچھ بھی ہم سے کہا نہ گیا
کبھی بیٹھے جو اپنی موج میں تو ہر قصہ غم بھی سنادیا
کبھی دکھ ملا کسی چوک میں کبھی بچھڑ گئے کسی موڑ پر
کبھی راہیں جدا ہوئیں اپنی کبھی پھر سے ہم کو ملادیا
کبھی اشک آنکھوں سے بہہ گئے کبھی آنکھیں پتھر ہوگئیں
کبھی آہ کوئی نکل گئی کبھی ہونٹوں کو ہم نے دبادیا
منیر کبھی درد دل میں ٹھہر گیا کبھی درد دل سے نکل گیا
اسی کشمکش میں کئی زندگی اسی کشمکش نے رلادیا
(منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

کتنی بیکار امیدوں کا سہارا لے کر
میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمناؤں کے مبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر
مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو کہ میں نے انہیں چاہا ہی نہیں
اور وہ مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں
مجھے کو کہنے دو کہ میں آج بھی جی سکتا ہوں
عشق ناکام ہی سہی زندگی ناکام نہیں
ان کو اپنانے کی خواہش انہیں پانے کی طلب
شوق بے کار سہی سعی غم انجام نہیں
وہی گیسو وہی نظریں وہی عارض وہی جسم
میں جو چاہوں تو مجھے اور بھی مل سکتے ہیں
وہ کنول جن کو کبھی ان کے لئے کھلنا تھا
ان کی نظروں سے بہت دور بھی کھل سکتے ہیں
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

آنکھ کا ساتھ میرے خواب میں رہ جاتا ہے
اک دیا گنبد محراب میں رہ جاتا ہے
پار کرجاتا ہے ہر رات وہ میری آنکھیں
ہاں مگر لمس کے تالاب میں رہ جاتا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وجہ تسکین سمجھ کر میں جسے چاہتا ہوں فیاض
درد بن کے میرے اعصاب میں رہ جاتا ہے
(ڈاکٹر محمد ریاض قریشی تھینکا.....میاں چنوں)

دعا گو ہوں فقط تیری ذات کے آگے
بس میرا چلتا نہیں چشم برسات کے آگے
اس امید پر بجھادیئے سب چراغ میں نے
کبھی تو ہوگی طلوع سحر رات کے آگے
ہمیں اک خوشی ملی بھی تو خیرات کی صورت
پھر گلہ کیا کرتے غم سوغات کے آگے
سنا ہے تیرے گھر دیر ہے اندھیر نہیں
تبھی تو جھکے نہیں ہم حالات کے آگے
ہم گونگے، بہرے لوگ کیا سمجھیں بات تیری
کیا ہستی ہماری تیری ذات کے آگے
ہزار پرواز ہم بے ادب بے شعور دیوانے لوگ
ہمارا اک درجہ تیرے درجات کے آگے
(محمد بشیر احمد پرواز.....جنڈانوالہ)

وہ روٹھ جاتا ہے اکثر شکوہ کئے بغیر
ہم بھی تو سہہ جاتے ہیں شکایت کئے بغیر
ہم سوچتے رہے محبت بے لوث ہوتی ہے
یہ یوں ہی ہوجاتی ہے عنایت کئے بغیر
قصور ان کا نہیں قصور تو ہمارا ہے
ہم نے محبت بھی کی تو ان کی اجازت کئے بغیر
تو کتنا نادان ہے واصی یہ سوچ لے
جنت کب ملتی ہے عبادت کئے بغیر
(انتخاب: شفیق رضا.....میاں چنوں)

میں کہ بکھر نہ جاؤں ذرا سی چوٹ پر
آ کہ مجھے اپنی مرمریں سی بانہوں میں سنبھال جاناں
ذرا سا تھام لے اس دل ناداں کو تو
مجھے آرزو ہے تیری کبھی دل سے مجھے دے آواز جاناں
تیری زلفوں کا میں کچھ اس طرح اسیر ہوا ہوں
کہ چھاجاؤ کسی دن بن کے گھنگھور گھٹا جاناں
یہ زندگی یہ دلکشی یہ دور جمال جاناں
یہ اٹکھیلیاں یہ شوخیوں کا ہے جو حال جاناں
میں جو کھوگیا تجھ میں، مرمٹا تیری عاشقی میں
کبھی تو بھی تو پوچھ مجھ سے میرا احوال جاناں
(شاہد حسین.....لاہور)

وہ اکثر مجھ سے کہتی تھی وفا ہے ذات عورت کی
مگر جو مرد ہوتے ہیں بڑے بے درد ہوتے ہیں
کسی بھنور کی صورت، گل کی خوشبو لوٹ جاتی ہے
سنو! تم کو قسم میری، روایت توڑ دینا تم
تنہا چھوڑ کر جانا نا یہ دل توڑ کر جانا
مگر پھر یوں ہوا محسن! مجھے انجان رستے پر
اکیلا چھوڑ کر اس نے میرا دل توڑ کر اس نے
محبت چھوڑ دی، اس نے، وفا ہے ذات عورت کی
روایت توڑ دی اس نے، روایت توڑ دی اس نے
(شعیب شیرازی.....جوہرآباد)

نہ حسن یار سے پوچھو نہ زلف یار سے پوچھو
میری زندگی کا حال بس ٹوٹی دیوار سے پوچھو
آتا نہیں ہمیں پیار میں بات کرنے کا گر
سب کچھ ان کے اقرار سے پوچھو
چھپی ہوئی ہے کب سے میرے دل میں حسرتیں
گر جاننا چاہتے ہو تو ان کے اظہار سے پوچھو
ان کو پا کر بھی نہ آسکا میرے دل کو قرار
ایسی ہی بے قراری دل بے قرار سے پوچھو
ٹوٹے ہوئے دل میں کتنا درد ہوتا ہے تمہیں کیا معلوم
اگر جاننا چاہتے ہو تو شام طوفان میں کسی کے انکار سے پوچھو
ہم سے کیوں پوچھتے ہو درد دل کی کیفیت
رضا سب کچھ جان جاؤ گے کسی بیمار سے پوچھو
(سکندر علی رضا.....فیصل آباد)

☆☆

تیری پیاری پیاری آنکھیں
سارے جگ سے نیاری آنکھیں
جب دیکھا محسوس ہوا ہے
سب سے خوب تمہاری آنکھیں
پھولوں کا گلدستہ ہیں یہ
خوشبو سی دلداری آنکھیں
تاروں جیسی چمکیں ہر دم
روشن دیپک، خماری آنکھیں
تیری آنکھوں جیسی کب ہیں
ہم نے لاکھ سنواری آنکھیں
قاتل جیسے نین تمہارے
جیسے تیز کٹاری، آنکھیں
دے ہے، دعائیں خانم کا دل
غم سے ہوں یہ عاری آنکھیں
(فریدہ خانم.....لاہور)

غموں کی دھار پر رکھا ہوا ہے
مجھے انگار پر رکھا ہوا ہے
میری الجھن بڑھا رکھی ہے تم نے
لب انکار پر رکھا ہوا ہے
بھروسا میں نے اپنے جیتنے کا
ہمیشہ ہار پر رکھا ہوا ہے
نظر آتا ہے مجھ کو سر یہ میرا
تیری تلوار پر رکھا ہوا ہے
ہمیشہ ہار ہی ہوتی ہے اپنی
کہ سب سالار پر رکھا ہوا ہے
مقابل چاند کے میں نے بھی اب کے
دیا دیوار پر رکھا ہوا ہے
اجالا چار سو واجد پھیلا ہوا ہے
دل کیا دار پر رکھا ہوا ہے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

محبت چیز ایسی ہے
کبھی ہوتی ہے اپنوں سے
کبھی ہوتی ہے سپنوں سے
کبھی انجان راہوں سے
کبھی گمنام ناموں سے
محبت چیز ایسی ہے
کبھی ہوتی ہے پھولوں سے
کبھی بچپن کے جھولوں سے
کبھی بے اختیاری میں
کبھی پکے اصولوں سے
محبت اک محبت ہے
محبت اک صداقت ہے
محبت اک عبادت ہے
محبت چیز ایسی ہے
دکھوں میں روں دیتی ہے
درد انمول دیتی ہے
زہر بھی گھول دیتی ہے
محبت چیز ایسی ہے
(لاہوتی عمار.....آھدی موڑ دولالہ)

جس کو بھول کے سکھ نہ پایا
یار اس ہرجائی کی آئی
میرے گھر برپا ہے ماتم
اس کے گھر گونجی شہنائی
اس کا مداوا کون کرے گا
عشق میں ایسی چوٹ ہے کھائی
پاگل کہلاتا ہے عاشق
عشق کا حاصل ہے رسوائی
میں نے گھر کو چھوڑ دیا ہے
کیا کہتی ہوگی ماں جائی
اس کا ذکر قمر نے چھیڑا
آج کیوں آنکھ تیری بھر آئی
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

کچھ بھی باقی بچا نہیں سنانے کو
مہرباں آئے تھے پھر منانے کو
تجھ سے کس نے کہا پلٹ آنے کو
رہ گئیں دل میں پھر یادیں ستانے کو
دل تو جل کے راکھ ہوچکا
اور کیا رہ گیا بتا جلانے کو
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

اب کبھی فرصت ملے تو آنا وہاں
جہاں ہماری یادوں کی گٹھری
پڑے پڑے بوسیدہ ہوچکی ہے
جہاں دریا، آزاد پرندے
وہ یادوں کا ساماں
پھر سے یاد کریں ہم زیدی
اب تک کیا کھویا، کیا پایا؟
کس نگری سے گزرے
کس آنچل میں سوئے
پھر سے یاد کریں ہم زیدی
پھر سے یاد ہم کریں ہم زیدی
(حافظ محمد زید زیدی.....میاں چنوں)

لوگوں نے برسائے پتھر
ہم کو بھی نہیں بھائے پتھر
جس کو میں نے جان سے چاہا
اسنے بھی برسائے پتھر
کوئی نہیں تھا پھول آنگن میں
میرے تھے ہمسائے پتھر
عشق کی راہ میں جو بھی آئے
اپنے ساتھ سلائے پتھر
میری راہ میں نوکیلے سے
تم نے خوب اگائے پتھر
اس کی خاطر رانا ہم نے
اپنے جسم پہ کھائے پتھر
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بدروح کی تلاش

محمد عرفان رامے-لاہور

خوبرو حسینہ ستون کے پیچھے گئی اور پھر اچانک غائب ہوگئی، کیا اسے زمین نگل گئی، لیکن پھر جب اس کی قبر کھودی گئی تو وہ مجسم قبر میں لیٹی تھی ایسا لگتا تھاکہ یہ ابھی ابھی آکر قبر میں لیٹ گئی ھے اور پھر.....

رات کی تاریکی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں رونگٹے کھڑے کرتی دہشت ناک کہانی

پہاڑوں کے دامن میں واقع یہ عالیشان حویلی کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لینے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔ یہ حویلی گہرے سرخ پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے تین اطراف میں چٹانیں اور ایک جانب تا حد نظر جنگل پھیلا ہوا تھا۔

یہ جنگل اتنا گھنا تھا کہ بعض حصوں میں دن کے وقت بھی تاریکی چھائی رہتی تھی۔ جنگل کے بیچوں بیچ سانپ کی طرح بل کھاتی پگڈنڈیاں بھی نامعلوم وقتوں سے علاقے کے لوگوں کے لئے منزل تک پہنچنے کا ذریعہ تھیں۔ آبادی سے ہٹ کر بنی اس منفرد حویلی میں اُس دور کے مطابق زندگی کی ہر سہولت میسر تھی، لیکن مکینوں کی تعداد بہت مختصر تھی۔

یہ ٹھاکر رنجیت کی آبائی حویلی تھی۔ جس میں وہ اپنی جواں سال بیٹی کلپنا کے ہمراہ زندگی گزار رہا تھا۔ وہ لوگ دنیا کے شور شرابے سے دور اس پرسکون جگہ پر رہنے کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ انہیں شہر کی تیز رفتار زندگی سے الجھن محسوس ہوتی تھی۔

ٹھاکر رنجیت مہینے میں ایک بار قریبی قصبے میں جا کر ضروریات زندگی کی تمام اشیا لے آیا کرتے تھے۔ اسی طرح سال میں ایک دو چکر شہر کے بھی لگ جاتے تھے جہاں سے کلپنا اپنی ضرورت کی اشیا خرید لیا کرتی تھی۔

ٹھاکر رنجیت کی بیوی، کلپنا کو جنم دے کر دنیا سے سدھار گئی تھی۔ اس کے بعد ٹھاکر رنجیب نے کلپنا کی دیکھ بھال کے لئے ایک نہایت سلجھی ہوئی خاتون سیتا کو اپنے ہاں مستقل ملازم رکھ لیا تھا۔ سیتا نے کلپنا کی تربیت بہت اچھے انداز میں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ٹھاکر رنجیت خود بھی سیتا کی بہت عزت کرتے تھے اور اسے حویلی کے فرد کی حیثیت حاصل تھی۔

حویلی کے گرد و نواح میں کوئی آبادی نہیں تھی۔ البتہ شہر کو جانے والی بڑی سڑک کے پار چند میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ضرور موجود تھا جس کا فاصلہ وہاں سے کم و بیش دس میل تھا۔ روزمرہ زندگی کا سامان اسی قصبے سے لایا جاتا تھا۔

اس حویلی کو ایک انگریز ماہر نباتات مائیکل جانسن نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انگیز صرف سیاحت کے لئے ہی برصغیر کا رخ کیا کرتے تھے۔ مائیکل جانسن جنگل میں رہ کر یہاں کی مقامی جڑی بوٹیوں پر تحقیق کر رہا تھا اور اس نے رنجیت کے دادا موتی لال کو دیگر معاملات نمٹانے کے لئے ملازم رکھ لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن پھر بمشکل ایک دہائی گزرنے کے بعد ہی عجیب وغریب واقعات رونما ہوئے اور مائیکل جانسن کا مختصر خاندان کسی نامعلوم بیماری کی وجہ سے موت کے منہ میں چلا گیا۔ اس خاندان کے تمام افراد یکے بعد دیگرے دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ عام رائے یہی تھی کہ اس خاندان پر کوئی آسمانی آفت نازل ہوئی تھی جو ان سب کی موت کا باعث بنی۔

مرنے والوں کو حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک سرسبز میدان میں دفنایا گیا اور وہاں ایک چرچ بھی تعمیر کیا گیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کھنڈر کا روپ دھارتا چلا گیا۔

لوگوں کا خیال تھا جانسن خاندان کی روحیں آج بھی اس علاقے میں بھٹک رہی ہیں۔ وہ آبادی میں زندہ لوگوں کی طرح مجسم حالت میں گھل مل کر رہتی ہیں اور موقعہ ملتے ہی مقابل کو شدید نقصان پہنچا کر نیا روپ دھار لیتی ہیں جب کہ لوگ انہیں پرانے روپ میں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔

اس خاندان کے آخری شخص نے مرتے وقت یہ حویلی موتی لال کو اس کی خدمات کے صلے میں انعام دے دی تھی۔ لیکن یہ خاص خدمات کیا تھیں ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ البتہ یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ حویلی کی ملکیت حاصل ہونے کے کچھ ماہ بعد ہی موتی لال کا پر اسرار قتل ہو گیا تھا۔ اس کی لاش نہایت بھیانک حالت میں اس کی خواب گاہ سے ملی تھی۔

ٹھاکر رنجیت کی عمر ساٹھ کے قریب تھی اور وہ اپنے ساتھ ہمیشہ اسلحہ رکھتے تھے لیکن استعمال کی نوبت بہت کم پیش آتی تھی۔ حویلی سے قریب ترین گاؤں دس میل دور تھا جہاں ٹھاکر رنجیت کا اکلوتا دوست شنکر رہتا تھا جو اپنے علاقے کا مشہور شکاری تھا۔

جانسن خاندان کے وحشت ناک بوسیدہ مقبرے گردونواح کے لوگوں کے لئے دہشت کی علامت تھے۔ کیوں کہ یہ خاندان لوگوں پر مظالم ڈھانے اور سفاکی کا مظاہرہ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ سینہ بہ سینہ سفر کرتی روایات کے مطابق اس خاندان کے مرد ہی نہیں عورتیں بھی دہشت کی علامت تھیں۔ ان کے بارے مشہور تھا کہ یہ لوگ آدم خور تھے اور انسانوں کو چیر پھاڑ کر کچا چبا ڈالتے تھے۔

ٹھاکر رنجیت کو ان باتوں پر قطعاً یقین نہیں تھا اور نہ ہی اس حویلی میں رہتے ہوئے ان کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا۔ تاہم جانسن خاندان کے قبرستان کی طرف جانے میں وہ بھی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ کیوں کہ شام ڈھلتے ہی وہاں مکروہ قسم کی چمگادڑیں آن دھمکتی تھیں۔ ان کی آوازیں اتنی دہلا دینے والی ہوتی تھیں کہ سننے والا دل تھام کر رہ جاتا تھا۔

اس سارے علاقے میں سرِ شام ہی ویرانی چھا جاتی تھی اور حویلی کا ماحول بھی پراسرار بن جاتا تھا۔ لمبی راہداریوں میں نحوست سی برسنے لگتی تھی اور کوئی بھی مکین بنا ضروری کام کے حویلی سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

کلپنا کی عمر بمشکل بیس برس تھی۔ ایک رات وہ اپنی خواب گاہ میں گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ حالانکہ سیتا اس کے کمرے میں شمع بالکل نہیں بجھنے دیتی تھی۔ کلپنا کو بچپن ہی سے رات کو ڈر جانے کی عادت تھی اس لئے ٹھاکر رنجیت کی خصوصی ہدایت کے مطابق سیتا بھی کلپنا کے کمرے میں ہی سویا کرتی تھی۔

جانے یہ رات کا کون سا پہر تھا۔ کلپنا آنکھ کھلنے کے بعد دیر تک خاموش لیٹی تاریکی کی وجہ سوچتی اور پھر اٹھ کر خوف زدہ لہجے میں سیتا کو آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ چند منٹ بعد اس کی آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سیتا کمرے میں موجود نہیں ہے۔

تنہائی کا احساس ہوتے ہی خوف کی تیز لہر اس کے تن بدن کے آر پار ہو گئی اور اس نے گھٹی گھٹی آواز میں سیتا کو دوبارہ آواز دی۔ مگر بدستور خاموشی رہی۔

وہ گھبرا کر مسہری سے اترنے والی تھی کہ اسے اپنے بہت قریب کسی وجود کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جیسے کوئی گہری سانس لے رہا ہو۔ پھر ایک عجیب سی مہک اس کی

ناک سے ٹکرائی اور ایک انتہائی حسین لڑکی اپنے قریب بیٹھی دکھائی دی۔

اس لڑکی کا چہرہ اندھیرے میں صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ سرتاپا سیاہ لبادے میں ملبوس تھی۔ اس کی حیرانی دیکھ کر لڑکی دھیرے سے مسکرائی تو کلپنا نے ہمت کر کے سوال کیا:

"کون ہو تم اور سیتا دیوی کہاں ہے؟"

"وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ تم مجھے اپنا دوست سمجھ سکتی ہو۔"

اجنبی لڑکی نے مختصر جواب دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کے مزید قریب آ گئی اور اپنی بانہیں کلپنا کے گلے میں حمائل کر کے اسے گلے سے لگا لیا۔ اسی لمحے کلپنا کو اس قدر دہشت محسوس ہوئی کہ وہ پوری قوت سے چیختے ہوئے سیتا اور دیگر ملازموں کو مدد کے لئے پکارنے لگی۔

کلپنا کے اچانک واویلا کرنے پر اس پراسرار لڑکی نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بانہیں واپس کھینچ لیں اور چند قدم دور جا کر اندھیرے میں گم ہو گئی۔

دہشت زدہ کلپنا آنکھیں بند کیے پوری قوت سے چلا رہی تھی۔ اسی لمحے سیتا بھی اپنے بستر پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی دوسرے ملازمین بھی مدد کے لئے کمرے میں آن دھمکے۔

فوری طور پر کمرے میں شمع روشن کر کے کلپنا کو دلاسہ دیا گیا اور ساری تفصیل سن کر کمرے، راہداریوں، حتیٰ کہ ساری عمارت کی تلاشی لی گئی مگر وہ پراسرار لڑکی کسی کو دکھائی نہ دی اور نہ ہی چوکیدار نے اسے حویلی میں آتے یا جاتے دیکھا تھا۔

سب لوگوں کا خیال تھا کہ کلپنا نے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہے۔ تاہم اس کی حالت دیکھ کر ہر فرد پریشان تھا۔

دفعتاً سیتا کی نظر بیڈ کے دائیں جانب زمین پر پڑی تو خوف سے اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ کیوں کہ وہاں ایک ایسا سفید رومال پڑا تھا جو کبھی بھی کلپنا نے استعمال نہ کیا تھا۔ سیتا نے آگے بڑھ کر وہ رومال اٹھایا تو کمرے میں موجود سب لوگوں کے چہرے فق ہو گئے۔ یہ کسی کے کمرے میں آنے کی ایسی شہادت تھی جس سے انکار ممکن نہیں تھا۔

وہ رات سب لوگوں نے اسی کمرے میں گزاری اور اگلی صبح ٹھاکر رنجیت کو اس واقعہ سے آگاہ کیا گیا۔ انہوں نے یہ سب کلپنا کا وہم قرار دیا اور رومال کے ثبوت کو بھی اتفاق قرار دے کر رد کر دیا۔

یہ واقعہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کلپنا کے ذہن میں دھندلا ضرور گیا تھا مگر وہ اس لڑکی کو بھلا نہیں پائی تھی۔ اس کا چہرہ ہر وقت کلپنا کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا اور وہ ہلکی سی آہٹ پر بھی کانپ اٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تنہائی سے خوف کھانے لگی تھی۔

اسی خوف نے دھیرے دھیرے اس کے اعصابی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اس کی گرتی ہوئی صحت سے پریشان ہو کر ٹھاکر رنجیت نے ڈاکٹر سے بھی مشورہ کیا جس نے کلپنا کا معائنہ کرنے کے بعد چند ضروری ادویات لکھ دی تھیں۔

اس واقعہ کو دو برس گزر چکے تھے۔

گرمیوں کی ایک خوشگوار شام کلپنا نے اپنے والد کے ہمراہ حویلی سے باہر جنگل کی سیر کا پروگرام بنایا اور وہ دونوں سیتا اور ایک ملازم کے ہمراہ باہر نکل گئے۔ ان دنوں کلپنا کو اپنے والد کے دوست شنکر سنگھ کا شدت سے انتظار تھا۔ شنکر کی بیٹی کلپنا کی ہم عمر اور گہری سہیلی تھی اور وہ سال میں ایک مرتبہ ان کے ہاں کچھ دن گزارنے کے لئے آیا کرتی تھی۔ ان دنوں بھی شنکر اسے لے کر آنے والا تھا۔

سیر کے دوران کلپنا نے محسوس کیا کہ ٹھاکر رنجیت خلاف معمول الجھے ہوئے اور خاموش ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ بتانا چاہ رہے ہوں مگر تذبذب میں ہوں۔

"خیریت تو ہے بابا۔"

"ہاں ہاں..... سب ٹھیک ہے۔" وہ جیسے گہری نیند سے جاگے تھے۔

"شنکر چاچا کب آ رہے ہیں....."

"بیٹا مجھے افسوس ہے کہ شنکر فی الحال ہمارے ہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں آسکے گا..... وہ ان دنوں کچھ پریشان ہے۔"

"کیا ہوا؟" کلپنا نے چونک کر پوچھا۔

"اس کی بیٹی کا انتقال ہوگیا ہے....." ٹھاکر رنجیت نے نہایت دکھ بھرے لہجے میں کہا تو کلپنا کو اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہوا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" بمشکل اس کے منہ سے نکل پایا تھا۔

"یہ سچ ہے بیٹی..... مجھے معلوم ہے کہ تمہیں یہ خبر سن کر بہت دکھ پہنچا ہے مگر یہ تلخ حقیقت ہے۔ اس کی بیٹی کو کوئی پراسرار بیماری لاحق ہوگئی تھی..... جس کے نتیجے میں اچھی بھلی صحت مند بچی کچھ ہی دنوں میں سورگ باش گئی۔

یہ خبر سن کر کلپنا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اور وہ جنگل میں موجود ایک ٹوٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔ ٹھاکر رنجیت کی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سیتا بھی نہایت غمزدہ دکھائی دے رہی تھی کیوں کہ سب ہی شنکر کی اکلوتی بیٹی کو بہت پیار کرتے تھے اور اس کی آمد کے منتظر تھے۔ یہ خبر ٹھاکر رنجیت کو خط کے ذریعے موصول ہوئی تھی جو شنکر کا ملازم حویلی کے چوکیدار کو تھما کر واپس لوٹ گیا تھا۔

خط کی تحریر میں شنکر نے اپنی بیٹی کی موت کو قتل قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ وہ قاتل کی تلاش میں اپنے گھر سے بہت دور جارہا ہے اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی ان کے پاس حویلی کا چکر لگائے گا۔

وہاں بیٹھ کر ٹھاکر رنجیت نے انہیں شنکر کا خط پڑھ کر سنایا تو وہ سب لوگ مزید الجھ گئے۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور قتل کا شبہ کس پر کیا جارہا ہے۔

"سمجھ نہیں آرہا کہ شنکر کسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے بیٹی کے صدمے سے اس کا ذہن ماؤف ہوگیا ہے۔"

"بہرحال ان باتوں کی تفصیل تو شنکر چاچا کے آنے کے بعد ہی معلوم ہوسکے گی کہ اصل واقعہ کیا تھا؟"

کافی دیر گھوم پھرنے کے بعد وہ واپس حویلی کی جانب چل پڑے۔ ابھی وہ حویلی کے مین گیٹ سے کافی فاصلے پر تھے کہ اچانک گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

"جانے اس وقت کون گھنے جنگل سے گزر رہا ہے۔ حالانکہ موسم بھی خراب ہورہا ہے اور ممکن ہے بارش شروع ہوجائے؟"

"میں نے سنا ہے کہ چاندنی راتوں میں بدروحیں آزاد ہوجاتی ہیں اور انسانی روپ دھار کر زندہ لوگوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔" سیتا نے زیرلب کچھ پڑھتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آتی چلی جارہی تھی۔

"بدروحیں چاندنی راتوں میں سفر بھی کرتی ہیں۔ ان میں سے اکثر خون آشام چڑیلیں ہوتی ہیں۔" سیتا نے نیا انکشاف کیا تو ٹھاکر رنجیت کو غصہ آگیا:

"کیوں فضول بولے جارہی ہو سیتا۔ اتنا بھی خیال نہیں کہ بچی خوف زدہ ہوجائے گی۔"

ٹھاکر رنجیت نے یہیں تک کہا تھا کہ عین اسی لمحے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز مزید تیز ہوگئی۔ اب معلوم ہوا کہ گھوڑوں کے ساتھ بگھی بھی موجود ہے۔ جو ان سے کچھ فاصلے پر موجود لکڑی کا خستہ حال پل عبور کررہی تھی۔ پھر ایک نیا سانحہ رونما ہوگیا۔ بگھی کے گزرنے سے خستہ حال پل کا ایک تختہ ٹوٹ گیا اور بگھی اپنا توازن کھو کر الٹی ہوگئی۔

یہ حادثہ اتنا اچانک تھا کہ سب لوگ سٹپٹا گئے تھے۔ بگھی کے ساتھ موجود دو ملازم اندر سے زخمی خواتین کو نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب کہ ٹھاکر رنجیت اور ان کا ملازم بھی ان کی مدد کو پہنچ چکے تھے۔

ٹھاکر رنجیت نے ملازم کے ساتھ مل کر پہلے ایک عورت کو بگھی سے باہر نکالا اور پھر دوسری کو جو یا تو بے ہوش تھی یا مر چکی تھی۔ انہوں نے بے سدھ عورت کو زمین پر لیٹا دیا۔ ساتھ موجود زخمی خاتون نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے اچھی طرح چھپایا ہوا تھا۔ اور وہ ایک لمبا سیاہ چوغا پہنے

ہوئے تھی اور مسلسل روئے چلی جارہی تھی۔ جب کہ زمین پر بے ہوش پڑی لڑکی کی عمر بمشکل بیس سال تھی۔

ٹھاکر رنجیت نے اسے دلاسہ دے کر یقین دلایا کہ بے ہوش لڑکی زندہ ہے تو اس کے رونے دھونے میں کمی واقع ہوئی اور وہ اپنی بدحواسی پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی۔

کلپنا نے شام کی دھندلی فضا میں قریب پہنچ کر دیکھا کہ وہ عورت نہایت حسین ہے اور اس کے چہرے کی رنگت دودھ کی مانند سفید ہے۔ لیکن جیسے ہی اس عورت کی دہکتی ہوئی نظریں کلپنا پر پڑیں اس کا دل انجانے خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔

اس سے نظریں چرا کر کلپنا نے زمین پر بے ہوش پڑی لڑکی کو قریب سے دیکھا تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ اور ارد گرد کھڑے درخت گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ کیوں اس کی شکل ہو بہو اس لڑکی جیسی تھی جو اسے ایک رات خواب میں دکھائی دی تھی۔ لیکن چند ہی لمحوں میں کلپنا اپنی حیرت اور خوف پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے موقع پر کسی شخص سے اس بات کا تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔

باوقار عورت نے بتایا کہ یہ بے ہوش لڑکی اس کی بیٹی ہے اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ جواباً ٹھاکر رنجیت نے اسے اپنا تفصیلی تعارف کروایا اور ان لوگوں کے علاج معالجے اور شب بسری کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔

"میں آپ کے خلوص کی دل سے قدر کرتی ہوں ٹھاکر صاحب۔ مگر مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ہرصورت اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس حادثے کے بعد میری بچی سفر کرنے کے قابل نہیں رہی ہے..... کیا آپ مجھے کسی قریبی گاؤں کا پتا سمجھا سکتے ہیں جہاں میں اپنی بیٹی کو کچھ عرصہ کے لئے کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ کر آگے بڑھ سکوں اور واپسی پر اسے اپنے ہمراہ لے لوں۔"

اس کی بات سنتے ہی ٹھاکر رنجیت نے کلپنا کی جانب دیکھ کر اس کی رائے معلوم کرنا چاہی۔ گو کلپنا اس لڑکی کو دیکھ کر کچھ خوف زدہ تھی مگر تجسس کے ہاتھوں مجبور بھی تھی۔ وہ کسی بھی طرح اس لڑکی کا مکمل تعارف چاہتی تھی جس نے خواب میں آکر اس کی راتوں کی نیند برباد کردی تھی۔ چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اپنے والد کو اشارے سے اپنا مثبت ارادہ ظاہر کردیا۔

"یہ حادثہ میرے گھر کے قریب پیش آیا ہے اور میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ آپ اپنی بیٹی کو اگر میرے گھر میں چھوڑ جائیں تو میں اور میری بیٹی آپ کی اس مہربانی پر مشکور ہوں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی..... ویسے بھی جہاں تک قریبی گاؤں کا تعلق ہے تو وہ یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ جہاں مسافروں کے رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ اسے یہیں چھوڑ جائیں۔"

ٹھاکر رنجیت کی پیش کش سن کر خاتون کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار نمودار ہوئے۔ اسی دوران ملازمین بگھی سیدھی کرکے سفر کے قابل بنا چکے تھے۔

"میں آپ کی بے حد مشکور ہوں ٹھاکر صاحب۔ اگر آپ بخوشی میری بیٹی کو اپنے ہاں رکھنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن میں چاہوں گی کہ آپ میری ایک گزارش سن لیجیے۔"

یہ کہہ کر وہ ٹھاکر رنجیت کو کچھ فاصلے پر لے گئی اور دبے الفاظ میں کچھ کہتی رہی جسے کوئی اور نہ سن سکا۔

بات کرنے کے بعد وہ دونوں واپس لوٹ آئے تو خاتون نے اپنی بیٹی کے قریب بیٹھ کر اپنے ہونٹ بے ہوش لڑکی کے کان پر رکھ دیے اور کچھ بڑبڑانے کے بعد اس کے ماتھے کا بوسہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ بگھی میں سوار ہوئی اور سب لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے الوداع کہہ کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔

تاریکی بڑھ چکی تھی اس لئے ٹھاکر رنجیت کے حکم پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملازمین اس لڑکی کو ایک چارپائی پر لٹا کر حویلی میں لے آئے اور اسے ایک خوبصورت خواب گاہ میں بستر پر لٹا دیا گیا۔

کچھ دیر بعد سیتا نے اس کے کمرے سے نکل کر بتایا کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنی ماں کی روانگی کے بارے میں سن کر بہت پریشان ہوگئی تھی لیکن اس کے تسلی دینے پر دوبارہ سو گئی ہے۔ اسی دوران ٹھاکر رنجیت نے ایک ملازم کو قریبی گاؤں سے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے بھیج دیا تھا۔

سیتا اس لڑکی کے حسن کی تعریفیں کرتی نہیں تھک رہی تھی۔ ٹھاکر رنجیت نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور بولے:

"یہ درست ہے کہ لڑکی اور اس کی ماں دونوں بہت خوبصورت ہیں..... مگر ان کا ملازم اور گاڑی بان کچھ عجیب سے تھے۔ کیسے پیلے چہرے تھے ان دونوں کے اور ہاتھ پاؤں جیسے لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ جب حرکت کرتے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ڈھانچے گھوم پھر رہے ہوں۔"

"جی ہاں ٹھاکر صاحب! میں نے تو یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی مالکن سے بہت ڈر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے گھوڑے بھی سہمے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔" سیتا نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میرا خیال ہے، ہم یہ سب کچھ اس لڑکی سے پوچھ لیں گے کہ وہ لوگ کون ہیں اور کہاں جا رہے تھے؟"

کلپنا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور پھر کچھ سوچ کر بولی: "بابا! اس عورت نے آپ کو الگ لے جا کر کیا بات کی تھی؟"

"وہ کہتی تھی کہ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ ہمارے بارے میں میری بیٹی سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر آپ نے کوئی سوال کیا بھی تو وہ جواب میں ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالے گی۔ کیوں کہ میں نے اسے سختی سے منع کر دیا ہے۔"

تعجب ہے..... آخر بے ہوش لڑکی سے کچھ کہنے کا کیا فائدہ۔؟" سیتا نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس لڑکی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہے ہاں اگر وہ خود کچھ بتانا چاہے تو الگ بات ہے مگر اسے مجبور نہیں کیا جائیگا۔"

اسی دوران ملازم ڈاکٹر کو لے آیا۔ ٹھاکر صاحب نے مختصر طور پر سارا واقعہ ڈاکٹر کو سنایا اور اسے سیتا کے ہمراہ لڑکی کے کمرے میں بھجوا دیا۔

کافی دیر بعد وہ لوگ واپس لوٹے تو ڈاکٹر نے بتایا کہ لڑکی بالکل صحت مند ہے اور اسے کوئی گہری چوٹ نہیں آئی البتہ وہ اپنی ماں کے چلے جانے سے خاصی پریشان ہے۔

"ڈاکٹر صاحب کیا میں اس سے مل سکتی ہوں۔"

"کیوں نہیں..... وہ تمہاری ہم عمر ہے اور یقیناً تم سے مل کر خود کو بہتر محسوس کرے گی۔"

پھر اس سے قبل کہ ٹھاکر رنجیت اسے صبح تک انتظار کا مشورہ دیتے کلپنا تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی دوسری منزل پر موجود اس کمرے کے سامنے جا پہنچی۔ وہ ہر صورت اس لڑکی سے اس خواب کے بارے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ چنانچہ اپنا سانس درست کرنے کے بعد اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اجازت ملتے ہی اندر داخل ہوگئی۔

وہ لڑکی پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور اس کا سیاہ گاؤن گردن تک لپٹا ہوا تھا۔ کلپنا کے قدموں کی آہٹ پاتے ہی اس نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا۔

وہی چہرہ وہی آنکھیں، وہی لباس اور وہی سرخ دہکتے ہوئے ہونٹ، اسے تنہائی میں دیکھ کر کلپنا کے دل میں نہ جانے کیسا خوف پیدا ہوا کہ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑی۔

چند لمحے بعد اسے خود ہی ہوش آیا تو وہ اس کے پاس فرش پر بیٹھی تھی۔ پھر ایک مترنم اور دل کش آواز کلپنا کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اٹھو سہیلی..... کیا تم مجھ سے ڈر گئی ہو۔"

اس نے کلپنا کا ہاتھ پکڑا تو جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ اس وقت خوف سے کانپ رہی تھی۔

"کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ چند سال قبل میں نے تمہاری شکل خواب میں دیکھی تھی اور اس کے بعد آج تک بھلا نہیں پائی ہوں۔"

یہ کلمات سن کر کلپنا کو اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہوا۔

"یہ کیسے ممکن ہے..... بالکل یہی بات تو میں سوچ رہی تھی؟" کلپنا زیر لب بڑبڑائی اور پھر اس کی جانب دیکھ کر حیرت سے بولی:

"مجھے بھی تعجب ہے کہ چند برس قبل میں نے تمہارا چہرہ اپنی خواب گاہ میں دیکھا تھا۔ پھر تم میری پاس بیٹھ گئیں..... اور آج میں تمہیں دوبارہ دیکھ رہی ہوں۔ یہ کیسا عجیب و غریب واقعہ ہے۔" یہ سن کر وہ بے اختیار مسکرا دی:

"ہاں بہت عجیب بات ہے۔ میں نے تمہیں خواب میں دیکھا اور تم نے مجھے بیداری میں اور اب قسمت نے مجھے تمہارے پاس پہنچا دیا..... کیا نام ہے تمہارا؟"

کلپنا..... اور تمہارا؟"

مجھے انیتا کہتے ہیں"

بہت پیارا نام ہے۔ تم بہت خوبصورت ہو انیتا۔"

تعریف سن کر انیتا کے رخسار سرخ ہوگئے اور اس نے محبت سے کلپنا کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور یوں پیار کرنے لگی جیسے برسوں بعد ملی ہو۔

انیتا کے بدن سے ایک عجیب سحر انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جس نے کلپنا کو مدہوش سا کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ پھر وہ تیزی سے کلپنا کی گردن پر جھکی اور اس کے لمبے نوکیلے دانت جلد میں گھستے چلے گئے۔

اس غیر متوقع حرکت پر کلپنا اس کی بانہوں میں تڑپ کر رہ گئی۔ جس پر انیتا نے فوراً اپنے ہونٹ اٹھا کر اسے اپنے حصار سے آزاد کر دیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی:

"مجھ سے وعدہ کرو کلپنا کہ تمہاری میری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔"

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔" کلپنا نے عجیب میکانکی انداز میں جواب دیا۔ پھر وہ دونوں دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ دفعتاً جنگل میں کسی گیدڑ کے بولنے کی آواز سنائی دی تو انیتا چونک کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی:

"کلپنا بہن اب تم جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے..... باقی باتیں کل ہوں گی۔"

"معاف کرنا مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ صبح ہونے والی ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تمہارے کمرے میں کسی ملازمہ کو سونا چاہیے۔ میں اسے بھجواتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں کمرے میں اکیلی سونے کی عادی ہوں۔ کسی دوسرے کی موجودگی میں مجھے نیند نہیں آتی۔ میں اپنا کمرہ ہمیشہ اندر سے مقفل کر کے سوتی ہوں۔ امید ہے تم میری اس حرکت کا برا نہیں مانو گی۔"

اس کی بات سن کر کلپنا نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اگلے روز انیتا دوپہر کے بعد اپنے کمرے سے برآمد ہوئی۔ ناشتہ صبح سویرے ہی ایک ملازم اس کے کمرے میں رکھ آیا تھا اس وقت اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا شاید وہ غسل خانے میں تھی۔

دن کے اجالے میں انیتا کا حسن مزید نکھر گیا تھا اس کی شخصیت بہت پرکشش تھی۔ لیکن جب کلپنا نے اسے اپنے پالتو کتے سے ملوانے کی کوشش کی تو کتا اسے دیکھ کر بری طرح خوفزدہ ہوگیا اور وہاں سے بھاگ کر دور جا کھڑا ہوا۔ وہ غیر متوقع طور پر مسلسل بھونکے چلا جا رہا تھا۔

انیتا حویلی کے ہر گوشے میں یوں بے تکلفی سے گھوم رہی تھی جیسے اسی گھر میں پیدا ہوئی ہو۔ یہاں تک کہ جب کلپنا نے اسے اپنے والد کے کمرے میں لے جانا چاہا تو وہ اس سے بھی دو قدم آگے چل رہی تھی

مگر کلپنا نے اس لمحے انیتا کی اس صلاحیت پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اسے دل سے اپنی سہیلی تسلیم کر چکی تھی اور اس کے ساتھ سے خوش تھی۔

دن کا بڑا حصہ انہوں نے گھومتے پھرتے گزار دیا تھا۔ اس دوران کلپنا نے کھانا کھایا اور پانی بھی پیا مگر انیتا نے کچھ بھی کھانے پینے سے انکار کر دیا تھا۔

بقول اس کے وہ صرف صبح کا ناشتہ کرتی تھی اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کھاتی تھی۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر قبل وہ خاصی مضطرب دکھائی دی۔ کلپنا نے سوچا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاید گھومنے پھرنے سے تھک گئی ہوگی۔ اسے آرام کرنے کے لئے اس کے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔

"کلپنا اگر تم برا نہ مناؤ تو میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں....." اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بولو۔" کلپنا نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"تم یہ بات گھر کے سب افراد کو سمجھا دینا کہ کوئی بھی بنا اجازت میرے کمرے میں داخل نہ ہوا کرے۔ میں بہت تنہائی پسند ہوں اور اپنے آرام میں خلل پسند نہیں کرتی۔ میں دیر سے بیدار ہوتی ہوں اس لئے دوپہر کو خود ہی تمہارے پاس آجایا کروں گی۔ اس کے علاوہ نوکر سے کہہ دینا کہ وہ میرا ناشتہ کمرے کے باہر رکھ دیا کرے۔ میں خود اٹھا لیا کروں گی..... امید ہے تم میری باتوں کا برا نہیں مانو گی۔"

کلپنا کو اس کا انداز تخاطب پسند نہیں آیا تھا۔ مگر اس نے میزبانی کا حق ادا کرتے ہوئے انیتا کے لہجے کو نظر انداز کر دیا۔ مگر اپنے کمرے میں پہنچ کر دیر تک انیتا کی عادات پر غور کرتی رہی۔

"انیتا کی شخصیت میں ایک عجیب و غریب بات یہ بھی تھی کہ اس کی سانسوں سے کچے گوشت یا خون کی بو آیا کرتی تھی۔ وہ اکثر پیار سے کلپنا کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیتی اور پھر اس کی گردن پر بوسے لینے لگتی۔

اس وقت کلپنا پر خوف کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی جانور اپنی کھردری زبان سے اس کی گردن چاٹ رہا ہو۔ مگر چند لمحے بعد ہی اس پر ایک مدہوشی سی طاری ہونے لگتی اور وہ سر انیتا کے شانے پر رکھ کر آنکھیں موند لیتی۔

انیتا کو حویلی میں آئے کئی دن گزر چکے تھے لیکن وہ صرف سیاہ لباس ہی پہنتی تھی۔ یہی نہیں اسے روشنی سے بھی شدید نفرت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دن کے وقت بھی وہ پائیں باغ کے اسی حصے میں ہی جایا کرتی تھی جہاں گھنے درختوں کی شاخیں۔ آپس میں اس طرح ملی ہوئی تھی کہ سورج کی کرنیں بمشکل زمین تک پہنچتی تھیں۔

ایک روز وہ دونوں لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ ارتھی کا ایک جلوس آتا دکھائی دیا۔ یہ ارتھی چوکیدار کی بیٹی کی تھی جسے شمشان گھاٹ لے جایا جا رہا تھا۔ کلپنا ارتھی کا جلوس دیکھ کر اس کے احترام میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور مرنے والی لڑکی کے لئے اپنے مذہبی کلمات بدبدانے لگی جسے سن کر انیتا کو شدید غصہ آگیا حیرت انگیز بات یہ کہ انیتا کو اس کا یوں ارتھی کے احترام میں کھڑے ہونا بالکل پسند نہیں آیا تھا:

"کلپنا خاموش رہو۔ اور واپس بینچ پر بیٹھ جاؤ۔" اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور سرخ ہونٹوں کے درمیان نوکیلے سفید دانت عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔

"مگر کیوں..... ہمیں مرنے والے کے حق میں اپنے مذہبی کلمات ضرور ادا کرنے چاہیے یہ ہمارا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے۔" کلپنا کو اس کی بات سن کر حیرت ہو رہی تھی۔

"معاف کرنا کلپنا..... میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی۔ تم خفا تو نہیں؟"

"ارے نہیں..... میں خفا تو نہیں ہوئی۔ مگر دعائیں پڑھنے سے تم چڑیں کیوں۔

"ہمارے خاندان میں ایسا رواج نہیں ہے۔" انیتا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ان دعاؤں سے بھلا کیا فائدہ۔ ہر شخص کو جلد یا بدیر مر جانا ہے۔ خیر آؤ اب نیچے چلیں ٹھاکر صاحب کے ساتھ باتیں کریں گے۔"

"بابا شمشان گھاٹ گئے ہیں۔ چوکیدار کی بیٹی کی موت انتہائی غیر متوقع تھی۔

"یہ لڑکی نہایت تندرست اور خوش و خرم تھی مگر چند دن کے اندر اندر سوکھ کر کانٹا ہو گئی اور پھر موت کے خونی پنجے نے اس کا گلہ دبا دیا..... مرنے سے پہلے لڑکی یہی کہتی رہی کہ "ایک چڑیل روز رات کو اسے تنگ کرتی ہے۔" اس کی بات سن کر انیتا نے قہقہہ لگایا اور پھر بولی:

"احمق ہیں یہ لوگ بھی۔ بھلا چڑیلیں زندہ نسانوں کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔" اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں واپس نیچے پہنچ گئیں۔

شام قریب تھی اس لئے انیتا اپنے کمرے میں چلی گئی

شمع بک ایجنسی کی مفید کارآمد اور دلچسپ کتابیں

برج سنبلہ	25/-	ٹیلی پیتھی سیکھئے	50/-	نوجوانوں کے مسائل	25/-
برج میزان	25/-	ٹیلی پیتھی کیا ہے؟	40/-	پرسکون زندگی	25/-
برج عقرب	25/-	ٹیلی پیتھی اور مراقبہ	30/-	خود سے محبت کیجئے	25/-
برج قوس	25/-	ہپناٹزم سیکھئے	30/-	آئیڈیل جیون ساتھی	25/-
برج جدی	25/-	مسمریزم سیکھئے	40/-	دوستی ایک فن ہے	25/-
برج دلو	25/-	علم النفس سیکھئے	40/-	ترقی کا راستہ	25/-
برج حوت	25/-	فن دست شناسی	75/-	پرکشش شخصیت	25/-
علم نجوم سیکھئے	60/-	پامسٹری گائیڈ	30/-	خوشگوار زندگی	25/-
برجوں کا انسائیکلوپیڈیا	60/-	آسان یوگا	30/-	تعلقات بڑھائیے	25/-
شمع اسٹار گائیڈ	40/-	یوگا سیکھئے	45/-	بچوں کی نگہداشت	60/-
اعداد میں قسمت	35/-	فن جادوگری	30/-	بچوں کی تعلیم و تربیت	60/-
علم الاعداد	20/-	عالم ارواح	40/-	اخلاقیات کے اصول	30/-
علم الاعداد کی روشنی میں آپ کیا ہیں؟	30/-	چھ پراسرار علم	40/-	ترقی کیسے کریں؟	30/-
نگینے بولتے ہیں	60/-	کامیابی کا راز	25/-	بچوں کی نفسیات	30/-
پتھروں کے خواص اور فوائد	50/-	پریشان ہونا چھوڑیئے	25/-	خواتین کے مسائل	30/-
انسان اور قدرتی پتھر	75/-	ذہنی دباؤ سے نجات	25/-	کامیابی کا سفر	30/-
خوابوں کے اسرار	25/-	گفتگو کا فن	25/-	کامیاب لوگ	30/-
خواب اور تعبیر خواب	25/-	زندگی گزارنے کے اصول	25/-	بے مثال زندگی	30/-
خواب نامہ (درمیانہ)	30/-	ناکامی سے بچنے کا فن	25/-	خوشی کیا ہے؟	30/-
خواب اور تعبیر	40/-	ترقی کے پندرہ اصول	25/-	الجھن سلجھن	75/-
خواب نامہ یوسفی	90/-	قوت ارادی کا جادو	25/-	اسلامی نام	20/-
مدنی خواب نامہ	100/-	ازدواجی تعلقات	25/-	اسلامی نام	40/-
شمع فالنامہ	90/-	دوسروں پر جادو کیجئے	25/-	اسلامی نام (دو ٹائٹل)	30/-
شعبدہ بازی کے کھیل	40/-	خود اعتمادی بڑھائیے	25/-	بابرکت اسلامی نام	25/-
شعبدہ بازی سیکھئے	30/-	دولت و شہرت کا زینہ	25/-	شاہکار اسلامی نام	30/-
شعبدہ بازی	60/-	ڈپریشن	25/-	اسلامی نام (23x36=16)	75/-

شمع بک ایجنسی، نوید اسکوائر اردو بازار کراچی Ph:32773302

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور کلپنا سیتا کے پاس بیٹھ گئی جو اسے علاقے میں رونما ہونے والے دیگر پراسرار واقعات کے بارے بتانے لگی تھی۔ اسی دوران ٹھاکر رنجیب بھی آ گئے۔ وہ کافی افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر کلپنا پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"بابا آپ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔"

"ہاں بیٹی بات ہی کچھ ایسی ہے۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا ہوا؟"

"آج گاؤں میں ایک اور پراسرار موت ہوگئی ہے۔ جس کی تمام علامات چوکیدار کی بیٹی سے ملتی ہیں۔ معاملہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جان کے نکلتے ہی مردہ ایک دم سے ہشاش بشاش کیسے ہو جاتا ہے۔ چوکیدار کی بیٹی بھی مرنے سے پہلے سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی مگر مرنے کے فوراً بعد اس کی لاش نہایت ہشاش بشاش دکھائی دینے لگی تھی ..... میں نے ایک آدمی کے ہاتھ ڈاکٹر کو پیغام بھیج دیا ہے اور چاہتا ہوں کہ مرنے والی کی آخری رسوم ادا ہونے سے قبل ڈاکٹر ایک مرتبہ لاش کا معائنہ ضرور کرے۔"

"کل میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ قبرستان۔" کلپنا نے اصرار کیا کیوں کہ مرنے والی لڑکی عیسائی تھی اور اسے دفنایا جانا تھا۔"

"ہاں ضرور لے چلوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی کم ہمت اور بزدل بن جائے۔" انہوں نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔

اگلے دن وہ دونوں ڈاکٹر کے ہمراہ قبرستان پہنچ گئے۔

قبرستان میں گورکن اور کسانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ ان کا منتظر تھا۔ تابوت گورکن کی کوٹھری میں رکھا تھا۔ وہ تینوں کوٹھری میں پہنچ گئے۔ ٹھاکر اور ڈاکٹر نے مل کر تابوت کا ڈھکن اٹھا کر نیچے رکھا اور سب دم بخود رہ گئے۔ کلپنا نے بھی دھڑکتے دل سے تابوت میں جھانکا تو بمشکل اپنی چیخ روکنا پڑی۔

تابوت کے اندر موجود لڑکی کسی طور لاش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں اتنی چمک تھی کہ نظر ملانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کفن سے باہر تھے اور ہونٹ نہایت سرخ اور تر تھے۔ ڈاکٹر نے جھک کر لاش کے دل پر ہاتھ رکھا پھر جسم کے مختلف حصے ٹٹولے او مایوس ہو کر گردن نفی میں ہلا دی۔

"اس میں زندگی کی رمق نہیں ہے۔ مگر بظاہر حالت ایسی ہے کہ اسے مرا ہوا نہیں کہا جا سکتا۔ دل کی حرکت بند ہے۔ اسے دفن کر دیا جانا چاہیے۔"

تدفین کے بعد وہ لوگ واپس حویلی میں آ گئے۔ اور ڈاکٹر کچھ دیر ٹھاکر رنجیت سے تنہائی میں گفتگو کرنے کے بعد واپس لوٹ گیا۔

اسی دوران ایک ملازم نے آ کر خبر دی کہ شہر سے تصاویر آ گئی ہیں۔ اور ایک آدمی بھی ساتھ آیا ہے تاکہ انہیں اپنی اصل جگہ پر لگا دے۔ یہ وہ تمام نادر تصاویر تھیں جو ان کی حویلی میں صدیوں سے آویزاں تھیں اور اپنی خوبصورتی کھو دینے کے باعث بہت دھندلی دکھائی دینے لگی تھیں چنانچہ ٹھاکر رنجیت نے شہر میں ایک مصور کو بھجوا دی تھیں تاکہ وہ ان کی اصل خوبصورتی بحال کر سکے۔ جب ٹھاکر رنجیت نے لسٹ کے ذریعے تصویروں کی پڑتال شروع کی تو اسی دوران انیتا بھی ان کے ساتھ آ بیٹھی اور دلچسپی سے تصاویر دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ تروتازہ دکھائی دے رہا تھا اور لبوں کی سرخی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ان میں سے اکثر تصاویر دو سے تین سو سال پرانی تھیں۔ تمام تصاویر کی پڑتال مکمل ہوئی تو ایک تصویر کم تھی۔ ٹھاکر نے ساتھ آنے والے شخص سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ آخری تصویر بھی صندوق سے نکال لایا۔ ٹھاکر رنجیت نے جب اس تصویر کو ایک نظر دیکھا تو بری طرح چونک پڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ مگر پھر چند لمحے بعد وہ سنبھل کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارے یہ تو انیتا کی تصویر ہے۔"

کلپنا نے بھی جلدی سے آگے بڑھ کر تصویر دیکھی تو حیران رہ گئی۔ تصویر میں دکھائی دینے والی لڑکی کے نین نقش ہو بہو انیتا جیسے تھے۔

ان دونوں کو حیران دیکھ کر انیتا نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ خوشگوار حیرت چہرے پر سجائے دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔

"حیرت انگیز مشابہت ہے ان دونوں میں۔" کلپنا نے دونوں کا موازنہ کیا۔ اور پھر دوبارہ بولی: "دیکھیے اس تصویر کے کونے میں لکھا نام بھی اب صاف پڑھا جا رہا ہے نینی جانسن۔"

انیتا نے کرسی پر پہلو بدلا افسردہ لہجے میں بولی۔ ہاں میرا تعلق بھی اسی خاندان سے جا نکلتا ہے۔ ہماری اس خاندان سے دور کی رشتہ داری تھی۔"

پھر وہ سب بیٹھے جانسن خاندان کے بارے باتیں کرتے رہے لیکن تصویر کی مماثلت سب کے لئے حیران کن تھی۔ کچھ دیر بعد ٹھاکر رنجیت اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تو انیتا چند لمحے توقف کے بعد بولی۔

"تمہیں وہ تصویر اچھی لگی جو مجھ سے ملتی ہے۔"

"ہوں..... اور میں اسے اپنے کمرے میں لٹکاؤں گی۔" کلپنا مسکرائی۔ جواباً انیتا نے فرط جذبات سے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور اپنی زبان اس کی گردن پر رگڑنے لگی۔

"کلپنا تم کتنی اچھی ہو۔ ہم دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ مجھے ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے اور تم بھی مجھ پر مرتی ہو۔"

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ کلپنا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اور وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ انیتا کی حالت اچانک غیر ہونے لگی تھی اور رنگ یک دم زرد پڑ گیا تھا۔

"مجھ پر کپکپی سی کیوں طاری ہو رہی ہے کلپنا۔ مجھے کمرے تک چھوڑ آؤ۔"

اس کی حالت دیکھ کر کلپنا گھبرا سی گئی تھی۔ گردونواح میں پراسرار بیماری کا زور تھا۔ رہ رہ کر خیال آتا انیتا کہیں اس وبا کا شکار نہ ہو گئی ہو۔ لیکن باوجود اصرار کے وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

رات کے کھانے پر انیتا خلاف توقع ان کے ساتھ موجود تھی مگر وہ کچھ کھا نہیں رہی تھی۔ کھانے کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو انیتا نے کہا۔

"میں کل یہاں سے کوچ کر جاؤں گی ..... مجھے یقین ہے کہ جلد ہی کسی نہ کسی طرح اپنی والدہ تک پہنچ جاؤں گی۔ لیکن کیسے اس کا جواب سر دست میرے پاس موجود نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں ..... جب تک تمہاری والدہ خود یہاں نہیں آ جاتیں میں تمہیں واپس جانے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تو میں تمہاری والدہ کو کیا جواب دوں گا۔"

اپنے والد کا جواب سن کر کلپنا بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ کیوں کہ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ انیتا ابھی یہیں قیام کرے۔

جواباً انیتا نے مناسب الفاظ میں ٹھاکر رنجیت کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کلپنا بھی اس کے ساتھ چل دی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر بیٹھ گئیں۔

گفتگو کے دوران میں انیتا کی تیز نظریں برابر کلپنا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کمرے میں جدھر جاتی اس کی نظریں تعاقب میں رہتیں۔ آج اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

جب کلپنا کو اس کے رویے سے وحشت ہونے لگی تو وہ اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس رات کلپنا نے پھر وہی بھیانک خواب دیکھا جو وہ بچپن میں دیکھا کرتی تھی۔

اب دھیرے دھیرے اس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی تھی۔ وہ رات کو نہایت پرسکون نیند سوتی تھی مگر صبح اٹھنے پر سارا بدن ٹوٹ رہا ہوتا تھا۔ اور ایک بے نام سی تھکن طاری ہوتی تھی۔ جس کے باعث سارا دن بدمزگی اور اداسی طاری رہتی تھی۔

اب رات کو بھرپور نیند لینے کے باوجود اس کا وجود گھلنے لگا تھا بے نام سی نقاہت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ چند دنوں میں کلپنا کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کے خدو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خال اس قدر بدل گئے تھے کہ آئینے کے سامنے کھڑا ہونے اپنا ہی چہرہ اجنبی لگنے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آہستہ آہستہ موت کے منہ میں جارہی ہو۔

ٹھاکر رنجیت اپنی بیٹی کی پراسرار بیماری سے بے خبر تھا کیوں کہ وہ اب اپنے باپ کے سامنے جانے سے بھی کترانے لگی تھی۔ ایک دن اچانک آمنا سامنا ہوا تو وہ اس کی زرد رنگت اور دھنسی ہوئی آنکھیں دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ لیکن کلپنا نے موسمی بخار کہہ کر فی الوقت اپنی جان چھڑالی تھی۔ مگر صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اس کے جواب سے مطمئن نہیں۔

کلپنا کو بظاہر کوئی درد تکلیف نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا روگ جسمانی نہیں روحانی ہے۔

اس روگ میں مبتلا ہوئے اسے کئی دن گزر گئے تھے۔ لیکن اپنی ضدی طبیعت کے باعث والد کو کچھ بتانے پر آمادہ نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کردی ہو۔

ادھر انیتا بھی کئی روز سے ڈراؤنے خوابوں کی وجہ سے پریشان تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کلپنا رات کو جو سپنا دیکھتی صبح انیتا بالکل وہی خواب سنانے لگتی تھی۔

☆.....☆.....☆

کلپنا کی صحت روز بروز گرتی چلی جارہی تھی۔ ادھر ٹھاکر رنجیت بھی خود ہی خطرے کی گھنٹی سن چکا تھا چنانچہ اس نے کلپنا کو بتائے بغیر ہی ڈاکٹر کو اس کے معائنہ کے لئے بلوالیا۔

جب وہ سیتا کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ڈاکٹر نے محبت بھرے لہجے اس کا استقبال کیا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے بیٹی۔ تمہارے والد بھی کافی پریشان ہیں اس لئے میں نے سوچا ایک بار خود تم سے مل لوں۔"

ڈاکٹر کا رویہ اس قدر مشفقانہ تھا کہ کلپنا نے اسے خود ہی ساری تفصیل سے آگاہ کردیا۔

کلپنا کا بیان سننے کے بعد وہ کچھ پریشان سا ہوگیا۔ اور پھر کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد ٹھاکر رنجیت کو کمرے سے بلا بھیجا۔

ٹھاکر رنجیت اپنے کمرے میں تھے پیغام ملتے ہی فوراً چلے آئے اور ڈاکٹر کو پریشان پاکر اس کا منہ تکنے لگے۔ پھر ڈاکٹر ان کا ہاتھ تھام کر کونے میں لے گیا اور باتیں کرنے لگا۔ وہ نہایت مدھم آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ٹھاکر رنجیت نے آوز دے کر کلپنا کو اپنے پاس بلایا۔ اور ڈاکٹر سے بولے:

"میری تو عقل کام نہیں کررہی۔" پھر انہوں نے اپنا چہرہ کلپنا کی جانب گھمایا اور بولے۔ "بیٹی ڈاکٹر تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں اچھی طرح یاد کرکے بتانا۔"

کلپنا نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈاکٹر کی جانب متوجہ ہوگئی۔

"بیٹی ذرا سوچ کر بتانا پہلی مرتبہ جب تم نے ڈروانا خواب دیکھا تھا اور گردن میں سوئیاں چبھتی محسوس کیں تھیں کیا وہاں اب بھی درد ہوتا ہے؟"

"جی نہیں؟" کلپنا نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا انگلی رکھ کر اپنے والد کو وہ مقام بتاؤ جہاں درد اور چبھن محسوس ہوتی تھی۔"

"گلے سے ذرا نیچے ٹھیک اس جگہ۔"

کلپنا نے ٹٹولتے ہوئے گردن پر ایک جگہ انگلی رکھ دی۔ گردن کا یہ حصہ ساڑھی کے پلو کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ ٹھاکر رنجیت نے ذرا سا پلو ہٹا کر گردن پر دیکھا تو یوں تڑپ کر پیچھے ہٹے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور قدرے پر سکون لہجے میں بولے:

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈاکٹر..... لیکن اب کیا ہوگا۔"

ڈاکٹر کے جواب دینے سے پہلے کلپنا بھی گھبرا گئی تھی:

"بابا بتایئے نا میری گردن پر کیا ہے۔ والد خاموش رہے تو ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر نہایت شفقت سے کہا۔

"ارے کچھ نہیں بیٹی بس ایک نیلا سا نشان ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد اس نے سیتا کو بلا کر ہدایت کی کہ کلپنا کی

طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی مکمل دیکھ بھال کی جائے اور اسے ایک پل کے لئے بھی تنہا نہ چھوڑ جائے۔ تمہیں ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنا ہے۔

ٹھاکر رنجیت انیتا کو بھی چیک کروانا چاہ رہے تھے مگر وہ سو رہی تھی اس لئے ڈاکٹر واپس لوٹ گیا۔

ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد ٹھاکر رنجیت دیر تک باغ میں ٹہلتے رہے اور پھر کلپنا کو پریشان دیکھ کر بولے۔

"آپ جانسن خاندان کے قبرستان میں تاکہ ان کی بوسیدہ قبروں کی حالت دیکھ کر مرمت کا بندوبست کرسکوں۔ میرا خیال ہے تم بھی ساتھ چلو واپسی پر کسی پرسکون جگہ پکنک بھی منائیں گے۔ ویسے بھی مجھے قبرستان میں واقع چرچ کے فادر سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے..... اور انیتا؟"

"وہ بیدار ہونے کے بعد سیتا کے ساتھ وہیں آجائے گی دوسری بگھی حویلی میں تیار ہے۔" ٹھاکر رنجیت نے جواب دیا اور کلپنا سر ہلا کر روانگی کی تیاری کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

کچھ دیر بعد وہ قبرستان کی طرف رواں دواں تھے۔

راستے میں ایک موڑ پر ان کی ملاقات غیر متوقع طور پر شنکر سے ہوگئی جو انہی کی حویلی کی جانب محو سفر تھا۔ ٹھاکر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بگھی سے اتر کر بغل گیر ہوگئے۔

"تم حویلی میں جاکر آرام کرو ہم ذرا جانسن خاندان کے قبرستان سے ہو کر آتے ہیں۔"

جانسن خاندان کا نام سنتے ہی شنکر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ اور وہ بھی ان کے ساتھ جانے کے لئے بگھی میں سوار ہوگیا۔

شنکر کافی کمزور اور تھکا تھکا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید بیٹی کی موت نے اسے اندر سے توڑ ڈالا تھا۔ ٹھاکر نے مناسب الفاظ میں بیٹی کی موت پر تعزیت کی تو وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور پھر سر اٹھا کر بولا:

"میں عجیب و غریب افتاد کا شکار ہوں۔ بچی کی پراسرار بیماری اور موت نے مجھے بہت سی نئی باتیں سکھا دی ہیں۔ میں جب تک اس کی موت کا انتقام نہ لے لوں چین سے نہ بیٹھوں گا۔"

"کیسا انتقام؟" کلپنا نے متجسس انداز میں پوچھا تو شنکر نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا:

"میری بدقسمتی کا آغاز ایک دوست کی ضیافت سے ہوا۔ وہاں ہماری ملاقات ایک ادھیڑ عمر عورت سے ہوئی جس نے باتوں سے ثابت کیا کہ وہ ہماری پرانی شناسا ہے..... اس عورت کے ساتھ ایک حسین و جمیل لڑکی نینی بھی تھی۔ جو پہلی ہی ملاقات میں میری بیٹی سے گھل مل گئی تھی اور دونوں آپس میں گہری سہیلیاں بن گئیں تھیں۔ ادھر میں اس ادھیڑ عمر عورت سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت پر اسرار گفتگو کررہی تھی پھر اچانک کچھ سوچ کر مجھ سے مخاطب ہوئی:

"اگلے چند ہفتے ملاقات نہ ہوسکے گی۔ مجھے آپ کی قیام گاہ کا علم ہے۔ جب بھی موقع ملا چکر لگاؤں گی۔ نینی چند دن پہلے گھوڑے سے گر گئی تھی۔ اسے کمر میں چوٹ آئی ہے۔ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔ اسے ڈاکٹر نے لمبا سفر کرنے سے منع کردیا ہے۔ جب کہ مجھے رات دن سفر کرنا ہوگا جو اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے میں چاہوں گی کہ جب تک میں واپس نہیں آجاتی یہ نینی آپ کے پاس رہے۔"

میں نینی کو رکھنے کے لئے دل سے رضامند نہیں تھا۔ مگر بیٹی کے اصرار پر ہاں کرنا پڑی۔

مبری رضامندی حاصل کرتے ہی اس نے اپنی بیٹی کو قریب بلا کر اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور جلد واپس لوٹ آنے کا وعدہ بھی کرلیا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے نینی کے کان میں کوئی بات کہی اور پھر میری جانب متوجہ ہوکر بولی:

"آپ سے میری آخری درخواست یہی ہے کہ میرے بعد نینی سے میرے بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے۔ کیوں کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر میری شخصیت کا راز رہنا ضروری ہے۔" پھر الوداعی کلمات کے بعد اس نے رخت سفر باندھا اور بیٹی کو تسلی دے کر بگھی میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں سے رخصت ہوگئی۔

نینی کو ہم اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ لیکن چند روز بعد ہی عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے۔ سب سے پہلے نینی نے غنودگی کی شکایت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ حالیہ بیماری کا اثر ہے۔ وہ دن چڑھے تک اپنے کمرے میں سوئی رہتی تھی اور دوپہر سے پہلے کبھی کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔

چند دن بعد اس کے بارے میں کچھ مزید انکشافات ہوئے کہ وہ ہمیشہ اندر سے کمرہ مقفل رکھتی تھی۔ دوپہر سے قبل کوئی نوکر اس کے کمرے میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک ملازم نے اسے کئی مرتبہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے صبح صادق کے وقت باہر گھومتے دیکھا تھا۔ اس کے دونوں بازو ہمیشہ پہلوؤں کی طرف جسم کے ساتھ چپکے رہتے تھے اور وہ ناک کی سیدھ میں چلتی درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوجاتی تھی۔

مجھے اس بات کا علم ہوا تو سوچا کہ شاید وہ نیند میں چلنے کی عادی ہے۔ لیکن معمہ یہ تھا کہ وہ مقفل دروازے سے باہر کیسے چلی جاتی ہے؟ لیکن مجھے اس بات پر غور کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور جلد ہی نئی مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔

اچانک انکشاف ہوا کہ میری بچی کی صحت تیزی سے گرنے لگی ہے۔ چند ہی دنوں میں وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ مگر کوئی اس کے مرض کی تشخیص نہ کرسکا تھا۔

ابتدا میں وہ رات کے وقت سوتے ہوئے ڈراونے خواب دیکھا کرتی تھی۔ پھر خیالی پیکر بھی نظر آنے لگے۔ جو کبھی نینی اور جنگلی درندے میں۔ یہ ہیولے ہمیشہ اسے اپنی پالکی کی طرف بے قراری سے چکر کاٹتے دکھائی دیتے تھے۔ اس دوران میں اس پر غشی طاری ہونے لگتی اور پھر گلے پر چبھن کا احساس ہوتا جیسے کسی نے تیز اور نوکیلی چیز گھونپ دی ہو۔ وہ درد کی شدت سے تڑپ کر اٹھ بیٹھتی اور چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی۔"

کلپنا خاموش بیٹھی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خود اپنی کہانی شنکر کی زبان سے سن رہی ہو۔ بھیانک خواب، خیالی پیکر، اور گردن میں سوئیاں چبھنا..... اتنی حیرت انگیز مماثلت۔ جب کہ نینی کی عادتیں بالکل ہماری انیتا جیسی تھیں۔

اسی لمحے بگھی رکی تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ قبرستان پہنچ چکے ہیں۔ کلپنا سہمی سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی نیچے اتری اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باقی لوگوں کے ہمراہ چرچ کے کھنڈر کے پاس جا پہنچی۔

"اچھا تو یہ ہے جانسن خاندان کا قبرستان۔"

"ہاں۔" ٹھاکر رنجیت نے مختصر جواب دیا۔

"ہمیں سب سے پہلے اس خاندان کی خبیث ترین عورت نینی کے مقبرے تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ کیوں کہ میرے یہاں آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔" شنکر نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "کیوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری بیٹی کی قاتلہ کا تعلق کسی نہ کسی طرح اسی نینی جانسن سے جاملتا ہے جو صدیوں پہلے موجود تھی۔"

"ہمارے پاس گھر میں اس کی اصل تصویر بھی موجود ہے۔" ٹھاکر رنجیت نے انکشاف کیا۔

"مجھے تصویر کی ضرورت نہیں، میں اسے اصلی حالت میں دیکھ چکا ہوں۔" شنکر نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"ناممکن..... اسے مرے کئی صدیاں بیت چکی ہیں۔ آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" کلپنا نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"بیٹی تمہارے ذہن میں اس کی موت کا جو تصور موجود ہے حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ نینی کے جسم اور روح کا رشتہ ابھی پوری طرح منقطع نہیں ہوا ہے۔ وہ ابھی زندہ ہے اور میرے یہاں آنے کا اصل مقصد اسی چیز کا کھوج لگانا ہے۔"

یہ بات شنکر نے اتنے پرجوش لہجے میں کہی کہ سب لوگ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے پھر ٹھاکر رنجیت نے اپنے ملازم کو چرچ کے فادر کو بلانے کے لئے قریبی آبادی میں بھیج دیا۔ کیوں کہ چرچ کے کھنڈر بن جانے کے بعد وہ یہاں سے گاؤں منتقل ہوگیا تھا۔

اس معاملے کو نمٹانے کے بعد ٹھاکر رنجیت، شنکر کی جانب متوجہ ہوئے تو اس نے اپنی بات کا دوبارہ آغاز کیا:

"بیٹی کی بگڑتی ہوئی صحت سے پریشان ہو کر میں نے دوسرے قصبے سے ایک مشہور ڈاکٹر کو بلوایا۔ جس کے آنے میں کئی روز لگ گئے۔

اپنی آمد کے فوراً بعد اس نے بچی کا مکمل معائنہ کیا اور پھر مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر بتانے لگا:

"میں اپنے نظریات کا تفصیلی ذکر بعد میں کروں گا۔ لیکن مختصراً اتنا بتائے دیتا ہوں کہ بچی کی بیماری عام بیماریوں سے یکسر مختلف ہے۔ آپ نے خاصی دیر کردی ہے۔ مریضہ صرف ایک دو روز کی مہمان ہے..... ممکن ہے میری صاف گوئی آپ کو بری لگے لیکن اگر آپ اس کی جان بچانا چاہتے ہیں تو حملہ آور ہستی کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کریں۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

"بچی کی بیماری کا اصل سبب ویمپائر ہے۔ جو اس کا خون چوس رہی ہے۔ گردن پر ہلکا سا نیلا نشان اور مرض کی دوسری علامات بھی میرے خیال کی تصدیق کررہی ہیں۔ ویسے طب کی پرانی کتابوں میں بھی اس قسم کے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔"

میرا ذہن ڈاکٹر کی توہم پرستانہ تشریح قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس رات بندوق سنبھال کر بیٹی کے کمرے سے ملحق کمرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

جب رات کے بارہ بجے تو مجھے اس کے کمرے میں ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی میں نے غور سے دیکھا تو اس کی پالکی کی طرف کوئی وجود حرکت کررہا تھا۔ اس کے خدوخال غیر واضح تھے میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ وجود آگے بڑھ کر بچی کی گردن سے لپٹ گیا۔

یہ منظر دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ پھر میں اپنے آپ پر قابو نہ پاسکا اور تیزی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

آہٹ پاتے ہی وہ مکروہ جسم بھی پھرتی سے بچی کو چھوڑ کر پالکی کی طرف آن کھڑا ہوا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر غور سے دیکھا تو پیروں تلے سے زمین کھسک گئی کیوں کہ میرے سامنے کوئی اور نہیں، نینی کھڑی تھی اور اس کے منہ سے تازہ خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بندوق سیدھی کرکے اس پر فائر کردیا۔ لیکن وہ گولی سے بھی تیز ثابت ہوئی اور پلک جھپکتے ہی کمرے سے غائب ہوگئی۔

اگلے دن میری بیٹی کا انتقال ہوگیا۔ نینی اس کے بعد مجھے کبھی دکھائی نہیں دی اور میں آج تک اس بدروح کی تلاش میں جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھان رہا ہوں۔

شنکر کی داستان ختم ہوئی تو ماحول بہت سوگوار ہوچکا تھا اور قبرستان کے وحشت ناک سناٹے میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا۔

سب لوگ اداس تھے کہ اچانک انیتا کسی بات پر ہنستی ہوئی سیتا کے ہمراہ قبرستان میں داخل ہوئی اور ان کے قریب آن پہنچی۔ اس کے آنے سے کلپنا کو اپنی وحشت میں کچھ کمی محسوس ہوئی تھی۔

لیکن جیسے ہی ایک شکستہ محراب کے پیچھے سے انیتا کا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا تو قریبی درخت کی اوٹ میں کھڑے غم زدہ شنکر کی آنکھوں میں حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ انیتا پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا تھا اور چہرے پر چٹانوں کی سی سختی نمودار ہوگئی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ کلپنا، انیتا کو اپنی جانب متوجہ کرکے شنکر کا تعارف کرواتی، شنکر نے قریب پڑا کلہاڑا اٹھایا اور ایک گرجدار آواز میں دھاڑتے ہوئے اس پر حملہ کردیا۔

آواز سن کر انیتا نے اس کی جانب دیکھا اور پھر یک دم سٹپٹا کر رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر شنکر کے لئے شدید نفرت کے آثار ابھر آئے اور چہرے کے خدوخال اس قدر بھیانک روپ اختیار کرگئے کہ وہ یکسر مختلف شخصیت دکھائی دینے لگی۔

شنکر نے اس پر کلہاڑے کا وار کردیا۔ لیکن انیتا نے پھرتی سے جگہ بدل کر وار کو ناکام بنادیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شنکر دوبارہ حملے کے لئے پر تول رہا تھا کہ بپھری ہوئی انیتا ایک لمبی جست لگا کر قبر کی محراب کے پار غائب ہو گئی۔ وہ چھلاوے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

شنکر نے دیوار کے پار جا کر اچھی طرح جائزہ لیا مگر وہ کہیں موجود نہیں تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی اور رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔

"کیا اس لڑکی کا نام انیتا ہے؟" اس نے کلپنا سے پوچھا۔

"جی ہاں....."

"لیکن یہی تو نینی ہے، میری بیٹی کی قاتلہ۔" شنکر نے نیا انکشاف کر کے سب کو مزید حیران کر دیا۔

اتنے میں چرچ کا فادر بھی پہنچ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد سنجیدہ گفتگو چھڑ گئی۔ فادر نے جیب سے تہہ کیا ہوا ایک بوسیدہ کاغذ نکال کر قریبی پتھر پر بچھایا اور پھر سب لوگ اس پر جھک گئے۔

یہ قبرستان کا تفصیلی نقشہ تھا۔ فادر اس پر پنسل سے آڑھے ترچھے نشان لگا رہا تھا جب کہ کلپنا قریب بیٹھی ان کی بحث سن رہی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے نقشہ لپیٹ دیا اور ایک قبر کو مرکزی نقطہ قرار دے کر مغربی سمت میں مختلف زاویوں سے زمین ناپنے لگے۔ اور پھر کافی دیر بعد ایک قبر کے سرہانے جا کھڑے ہوئے۔

یہ ٹوٹی پھوٹی بے نام قبر تھی جس کے سرہانے کا کتبہ بھی غائب تھا۔ فادر کے کہنے پر قبر کی کھدائی شروع کر دی گئی۔ شنکر خود بھی پر جوش انداز میں ملازم کے ہمراہ کھدائی میں شریک تھا۔

کھدائی مکمل ہوئی تو نیچے سے بھاری بھرکم تابوت برآمد ہوا۔ سب نے مل کر تابوت کو باہر نکالا اور پھر دعائیہ کلمات کی ادائیگی کے بعد تابوت کو کھولنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔

اس زنگ آلود تابوت کو کھولنے میں خاصی مشکل پیش آئی لیکن کوشش کامیاب ثابت ہوئی ..... پھر جیسے ہی تابوت کا ڈھکنا سرکا کر اندر جھانکا گیا سب لوگوں کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

تابوت کے اندر خون ہی خون تھا اور اس کے درمیان میں حسین و جمیل انیتا پرسکون انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھیں یوں کھلی ہوئی تھیں جیسے سب کو دیکھ رہی ہوں اور ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے گی۔

شنکر کا اصرار تھا کہ یہ نینی ہے جب کہ ٹھاکر رنجیت اسے انیتا قرار دے رہے تھے۔ پھر بوڑھے پادری نے انہیں بتایا کہ انیتا اور نینی ایک ہی عورت کے دو نام ہیں اور یہ جانسن خاندان کی ظالم ترین عورت تھی جس نے عشق میں ناکامی پر خودکشی کر لی تھی اور انسانوں سے انتقام لینے کے لئے بدروح کا روپ دھار لیا۔

پادری کی معلومات کو علاقے کی تاریخ کے بارے میں سند مانا جاتا تھا۔ اس کے پاس لاتعداد پرانی کتابیں اور جانسن خاندان کی ذاتی خطوط محفوظ تھے۔ چنانچہ ان کی حتمی رائے سن کر مزید بحث ختم ہو گئی اور سب لوگ دوبارہ تابوت کی طرف متوجہ ہو گئے۔

انیتا کی لاش بالکل صحیح حالت میں تھی۔ اس کے اعضاء زندہ انسانوں کی طرح لچک دار اور چہرہ ہشاش بشاش تھا۔

فادر کے مطابق یہ سب اس کے ویمپائر ہونے کی واضح علامات تھیں۔ پھر پادری نے اپنا عمل شروع کیا اور بہت کچھ بدبدانے کے بعد ایک نوکیلا کھونٹا لاش کے دل کے مقام پر ٹھونک دیا۔

انیتا کے منہ سے فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی اور اس کا چہرہ اپنی خوبصورتی کھو کر اصل روپ میں آ گیا۔ اس کے بعد انیتا کی گردن تلوار سے کاٹ کر الگ کر دی گئی۔ اور پھر اس کے جسم کو سر سمیت آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر پادری نے اختتامی دعا کی اور سب لوگ حویلی واپس لوٹ گئے۔ اس رات بھی انیتا کا معصوم چہرہ کلپنا کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکا..... مگر آج اس کا دل و دماغ ہر خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk